پسِ آئینہ
سرفراز بیگ

پسِ آئینہ

سرفراز بیگ

پسِ آئینہ

سرفراز بیگ

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

والدِ محترم

مرزا سلطان بیگ

کے نام

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

فانی بدایونی

اشاعت : 2013ء

کتاب : پس آئینہ

مصنف : سرفراز بیگ

ناشر : محمد عابد

تزئین : عبدالحفیظ

قیمت : 600روپے

مطبع : بی ایچ پرنٹرز، لاہور

Pas-e-Aaina
By
Sarfraz Baig
Edition 2013

اهتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Moh:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

نشرو زوم

مثال کتاب گھر صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، جھنگ محلہ امین پور بازار فیصل آباد

۔۔۔میں ہوں نیائش خان!

ستمبر ۲۰۰۲ء کی چمکیلی صبح میری زندگی کے ایک اور یوم تازہ کے خیر مقدم کو تیار تھی۔ جیسے ہی میری آنکھ کھلی میں نے اپنے بستر کے ساتھ ملحق میز پہ رکھی ہوئی گھڑی پہ نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق میں پانچ دن کام کرتا ہوں، صبح سویرے کام پہ چلا جاتا ہوں۔ ہفتے اور اتوار کو میری چھٹی ہوتی ہے۔ اس لیے جمعے کو رات گئے تک دوستوں کے ساتھ گپ شپ رہتی ہے۔ کبھی ٹی وی پہ کوئی پروگرام دیکھ لیا کبھی تاش سے اپنا دل بہلا لیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں تاش کھیلنا زیادہ پسند نہیں کرتا۔ زیادہ تر ٹی وی دیکھ لینے یا کوئی کتاب پڑھ لینے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ٹی وی یا کتاب جب بھی مجھے اُکتا دینے پر بضد ہو جائیں تو پھر میں جی بھر کے سوتا ہوں۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ سب سے پہلے سنک میں پڑے ہوئے برتن دھوئے اور ساتھ ہی چولہے پہ چائے بھی رکھ دی۔ اس دوران میرے دوست فرشتہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اس نے الماری سے دو کوآساں (corissant) نکالے ان کو چھری کی مدد سے درمیان سے کاٹا، ان کے اندر مکھن لگایا اس کے بعد ان کو مائیکروویو اوون میں رکھ دیا۔ چائے تیار ہو چکی تو میں نے اس کو پیالوں میں ڈالا اور اس نے پلیٹ میں دونوں کوآساں (corissant) رکھے۔ ہم دونوں نے ابھی ناشتہ شروع ہی کیا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ میں آدھا کوآساں کھا چکا تھا۔ باقی ماندہ کوآساں پلیٹ میں رکھتے ہوئے انٹر کام پہ آنے والے سے پوچھنے لگا کہ کون ہے۔ دوسری طرف سے جواب آیا

''پری پیکر''۔ میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ چند لمحوں میں پری پیکر ہمارے سامنے موجود تھا۔ میں نے حسبِ عادت اس سے چائے کا پوچھا لیکن وہ کہنے لگا کہ میں بار (bar) سے کافی پی کر آیا ہوں۔ فرشتہ تو اپنی چائے اور کوآساں لے کر ایک طرف ہو گیا لیکن میں اور پری پیکر ہمیشہ کی طرح گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ میرا دوست پری پیکر، فرشتہ کو بالکل پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ فرشتہ کو بہت زیادہ منہ پھٹ اور بدلحاظ خیال کرتا ہے۔

پری پیکر کا اصل نام ثقلین ہے لیکن میں اس کو پری پیکر کہتا ہوں کیوں کہتا ہوں؟۔۔۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن پہ کافی عرصہ پہلے ایک ڈرامہ چلا تھا جس میں ایک کردار کا نام ثقلین پری پیکر تھا۔ اب جب بھی کسی کا نام ثقلین ہو، پری پیکر برجستہ و بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ اب اریزو میں سارے اسے پری پیکر کے نام سے ہی جانتے ہیں پری پیکر کو اس کے اصل نام ثقلین سے کوئی نہیں بلاتا۔ ثقلین پاکستان میں کسی معروف اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ادب و ثقافت اور دیگر فنون لطیفہ کی بیٹ تھی۔ جو لوگ اخبار سے منسلک ہیں وہ اس بات سے خوب واقف ہوں گے کہ جرنلزم کی زبان میں بیٹ کیا ہوتی ہے۔

ثقلین پری پیکر نے صحافت میں ایم اے کیا اور کئی اخباروں کے لیے مفت کام کرتے کرتے آخر کار اسے ایک ایسے اخبار میں کام مل گیا جو اسے فی خبر سو روپے دیتا تھا۔ جب اس کو تھوڑا بہت تجربہ ہو گیا تو اسے ایک معروف اخبار میں نوکری مل گئی۔ ادارہ نے اس کی تنخواہ پانچ ہزار مقرر کی۔ شروع میں تو ثقلین بسوں اور ویگنوں پہ خوار ہوتا ہوا جائے وقوع پہ پہنچا کرتا لیکن پھر اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لی۔ موٹر سائیکل کا اسے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے ادارہ نے اسے پٹرول کے پیسے بھی دینے شروع کر دیے۔ اس کے علاوہ اس کے موبائل فون کا بل بھی ادا کر دیا جاتا، بشرطیکہ وہ ایک ہزار روپے تک ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسے اخبار میں بطور صحافی کام کرنے کا طور آ گیا۔ جو مشکلات اسے شروع میں پیش آئیں وہ اب ان سے آزاد ہو چکا تھا۔ اخبار کے لیے کام کرتے ہوئے ایک دفعہ کسی حساس معاملے کی بابت کوئی غیر مصدقہ خبر شائع ہو گئی جو بعد از اں غلط ثابت ہوئی۔ ایڈیٹر نے اپنی جان بچانے کے لیے ثقلین کا نام دے دیا حالانکہ اس خبر کا ثقلین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ اخبار کی نوکری چھوڑ کے ایک نیوز ایجنسی سے وابستہ ہو گیا۔ ثقلین کو نیوز ایجنسی میں آئے ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ اسے جرمنی میں انعقاد پذیر کسی کانفرنس کا دعوت نامہ ملا۔ ویزہ ملنے میں اسے کوئی

وقت پیش نہ آئی اور ٹکٹ اس نے اپنی جیب سے خریدا۔ اس طرح ثقلین جرمنی آ گیا اور جرمنی سے اٹلی۔ اس نے نیوز ایجنسی کو فون کر دیا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ یہ پہلا شخص نہیں تھا۔ اخبار میں کام کرنے والے اکثر باہر جانے کے لیے یہی وطیرہ اختیار کرتے ہیں۔

ثقلین کی عمر تقریباً تیس سال ہے۔ قد پانچ فٹ سات انچ، رنگ گورا، سر پہ گھنے کالے بال، چہرے پہ گھنی داڑھی اور آنکھیں قدرے اندر کو دھنسی ہوئی۔ وہ پری پیکر بالکل نہیں لگتا لیکن اریزو میں سبھی لوگ اسے اسی نام سے بلاتے ہیں۔ وہ ہر موضوع پہ بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ شاعری، نثر، ڈرامہ، فلم قریباً وہ ادب کی تمام اصناف سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ چند سال مختلف اخباروں کے ساتھ گزارنے کے بعد اور صحافت کی گرم سرد ہوائیں کھانے کے بعد اسے حالاتِ حاضرہ کے موضوع پر بھی کافی ملکہ حاصل ہو گیا ہے۔

ثقلین نے اپنا پہلا قدم اٹلی کے شہر میلانو میں رکھا۔ جیسے ہی اسے پر میسو دی سجورنو (اٹلی میں رہنے کا اجازت نامہ) ملی میلانو چھوڑ کر میرے پاس اریزو آ گیا۔ پہلے پہل تو اسے یہاں کا ماحول پسند نہ آیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ آج کل ثقلین پری پیکر ایک فاؤنڈری میں کام کرتا ہے۔ پانچ دن کام اور دو دن فراغت۔ لوگ کہتے ہیں جسے ایک دفعہ صحافت کا چسکا پڑ جائے وہ زندگی میں کوئی اور کام نہیں کر سکتا یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی کام کا نہیں رہتا لیکن ثقلین نے اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا۔ وہ پانچ دن فاؤنڈری میں کام کرتا ہے اور بقیہ دو دن دیگر سرگرمیوں میں گزارتا ہے۔ وہ کبھی کبھار روم سے جاری ہونے والے اردو اخبار "آزاد" کی "اردو نیوز" کے لیے کالم لکھتا ہے۔ چند ایک آن لائن اخباروں کے لیے لکھتے ہوئے اور وہ اپنا شوق بھی پورا کر لیتا ہے اور اس کی علم و ادب کی پیاس بھی بجھتی رہتی ہے۔ ثقلین مختلف قسم کی تقریبات میں ضرور شامل ہوتا ہے۔ ایسی تقریبات سے اسے کوئی نہ کوئی ایسا موضوع مل جاتا ہے جس پر لکھتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو آگے بڑھایا جا سکے۔ پری پیکر کا خیال ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیے کیونکہ مقصدیت ہی انسان کو حیوانی سطح سے اوپر اٹھاتی ہے۔ آج جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جس سے حوالہ جاتی اعتبار سے اکتساب کرتے ہوئے وہ آزاد اخبار کے لیے کوئی مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ میں چونکہ ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں اس لیے وہ اپنے دل کی بات مجھ سے برملا کر لیتا ہے۔

میں نے پوچھا "پری پیکر تم مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔"

کہنے لگا ''نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ روم سے ایڈیٹر کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اخبار چھپنے کے لیے جا رہا ہے۔ تمہارے مضمون کا انتظار ہے۔ اب مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا لکھوں۔''

''تمہارے آس پاس کتنے موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ کسی ایک چیز کے بارے میں لکھ دو۔ اخبار کا پیٹ ہی تو بھرنا ہوتا ہے۔ تمہیں کون سا کالم لکھنے کے پیسے ملتے ہیں۔''

''یار پیسوں کو چھوڑو۔۔۔ میں اپنا شوق پورا کرتا ہوں اور اس طرح اُردو زبان کی خدمت بھی ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کو نفع نقصان کے ترازو میں نہیں تولنا چاہیے۔''

''تم اریزو کے حوالے سے کچھ لکھ دو۔''

''وقت ملا تو اریزو کی تاریخ کے بارے میں ضرور لکھنا چاہوں گا۔''

فرشتہ نے دور سے کہا ''کسی چوہدری کا انٹرویو کر دیں ثقلین صاحب۔ وہ آپ کو پیسے بھی دے گا اور دیگر با اثر، با رسوخ لوگوں سے آپ کو متعارف بھی کروا دے گا۔''

''فرشتہ صاحب مشورے کا شکریہ۔ لیکن آپ کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس وقت میں پاکستانی معاشرہ اور جغرافیے کی حدود سے بہت دور اریزو کے مقام پر قیام پذیر ہوں۔۔۔ جہاں تک تعلقاتِ عامہ کا سوال ہے میں عام فرد کے طور پر معاشرتی تعلق کی بنا رکھنے کا قائل ہوں۔ تعلقات کی استواری میں، میں نے صحافت کو کبھی اپنا حوالہ نہیں بنایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے اریزو میں ہر طبقے کے لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ لوگ مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' ثقلین اس بات پہ بڑا حیران تھا کہ سارا اریزو اسے پری چیکر کہہ کر بلاتا ہے اور یہ شخص جسے وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا وہ اسے ثقلین کہہ کر بلاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ستائش بھی تھی اور حیران کن بھی۔

''فرشتہ صاحب آپ کے ذہن میں اس کے علاوہ کوئی خیال ہو تو بتائیں۔''

''میری کہانی لکھ دیں شاید لوگوں کو دلچسپ لگے۔''

''میں کوئی چیستان کا باب نہیں کھولنا چاہتا اور نہ کوئی معمہ حل کرنا چاہتا ہوں آپ تو جانتے ہیں کہ ''آزاد'' اُردو زبان کا ایک سادہ سا اخبار ہے جس کے لیے کوئی عام فہم سی چیز ہونی چاہیے۔''

''کسی ادیب پہ مضمون لکھ دیں۔''

''کس پہ لکھوں۔''

''ظاہر ہے مجھ پہ تو لکھیں گے نہیں۔ فیض پہ لکھیں، منٹو پہ لکھیں، انتظار حسین پہ لکھیں یا جیسا

کہ فلمی صحافی کرتے ہیں، کسی خوبصورت اداکارہ پہ لکھیں۔"

"آپ کیا جانتے ہیں پاکستان کے بارے میں۔ فیض اور منٹو کے بارے میں۔ میں نے پاکستان کے ریگزار صحافت کی ایک عرصہ خاک چھانی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملا ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں میں وقت گزارا ہے۔ ہفتے میں ایک دفعہ اکیڈمی ادبیات جاتا ہوتا تھا۔ مقتدرہ قومی زبان کا دفتر بھی میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس جاتا تھا۔ آپ کا خیال ہے میں ایسے ہی منہ اُٹھا کے پاکستان سے اٹلی آ گیا ہوں۔"

"ثقلین صاحب، آپ تو ناراض ہو گئے۔ میرا مطلب آپ پہ طنز کرنا نہیں تھا۔"

"نیا ئش خان میں اسی لیے تمہارے گھر آنے سے اجتناب کرتا ہوں۔"

فرشتہ چائے کا کپ لے کر ایک دفعہ پھر تھوڑا پرے ہو گیا۔

فرشتہ کو لوگ کیوں پسند نہیں کرتے، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مزاجاً ذرا کھردرا سا رویہ رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی اس سے اس کا اسم گرامی یا حسب نسب پوچھے تو جواباً اسے یہ شعر سناتا ہے کہ:

ے ہے بتانے کی بھلا چیز کوئی نام و نسب
ہم نے پوچھا نہ کبھی نام و نسب بتلایا

دوسری بات یہ کہ وہ اپنے سر کے بال منڈوا کر ٹنڈ منڈ رہنا پسند کرتا ہے۔ کچھ تو وہ قدرتی طور پہ گنجا ہے اور باقی ماندہ بال وہ ہر دوسرے تیسرے دن صاف کر دیتا ہے۔ داڑھی اس نے فرنچ انداز کی رکھی ہوئی ہے۔ جس کو وہ ہفتے دس دن بعد بلیچ سے سفید کر لیتا ہے۔ اس کا ایک کان چھدا ہوا ہے۔ جس میں اس نے سونے کی بالی پہن رکھی ہے۔ وہ فارغ وقت میں اس بالی سے کھیلتا رہتا ہے۔ جسامت کے لحاظ سے وہ دبلا پتلا ہے لیکن بالکل سوکھا پتلا نہیں لگتا۔ لباس بھی عجیب طرز کا پہنتا ہے۔ جسم کے ساتھ چپکی ٹی شرٹ اور پھٹی جینز۔ عام طور پہ لوگ سفید بال کالے کرتے ہیں لیکن یہ اپنی طرز کا انوکھا شخص ہے کالے بال سفید کرتا ہے۔ دیکھنے میں برا نہیں لیکن اپنی وضع قطع سے عجیب سا لگتا ہے۔ مجھے اس کے اس حلیے پہ کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے جاننے والے مجھے بارہا متنبہ کر چکے ہیں کہ اس کی حرکات معقول نہیں ہیں اس لیے اس سے پیچھا چھڑا لو۔ اس کو اپنے ساتھ رہنے کی دعوت میں نے خود ہی دی ہے میں اس کو کیسے منع کر سکتا ہوں۔ وہ گھر کے کرائے میں، کھانے پینے میں اور دیگر اخراجات

میں میری مدد کرتا ہے اس کے علاوہ وہ گھر کی صفائی، کھانا پکانے سمیت گھر کے تمام کاموں میں بھی میری مدد کرتا ہے۔ صاف ستھرا شخص ہے۔ میری نظر میں اس کی جن باتوں پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں وہ ذاتیات کے زمرے میں آتی ہیں۔ میرے ساتھ اس نے آج تک مخرب الاخلاق تو کجا، ناشائستگی سے گفتگو نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ذو معنی گفتگو کا ماہر ہے۔ میرے ساتھ ادب پہ میر حاصل گفتگو کرتا ہے۔ میں پری پیکر کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن وہ تھوڑا سا لکیر کا فقیر ہے۔ جب کہ فرشتہ آزاد ذہن کا مالک ہے۔ آپ اسے لبرل کہہ سکتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں اس کے خیالات بہت مختلف ہیں۔ وہ کہتا ہے چیزیں ہمارے لیے بنی ہیں ہم چیزوں کے لیے نہیں۔ زندگی کو ہم گزاریں، زندگی ہمیں نہ گزارے۔ میرے خیال میں فرشتہ کے بارے لوگوں کو غلط فہمی ہے۔ لوگ اس کی شخصیت کے بارے میں غلط رائے قائم کرتے ہیں۔ اس میں فرشتہ کی اپنی بھی غلطی ہے کیونکہ وہ پہلی ملاقات میں لوگوں پہ ہیئتی اعتبار سے کچھ اچھا اثر نہیں چھوڑتا۔ وہ لگی لپٹی باتیں نہیں کرتا۔ سیدھی بات منہ پہ کہہ دیتا ہے۔ مجھے نہیں یاد جب سے وہ اریزو وارد ہوا ہے کوئی پاکستانی اس کے طنزیہ جملوں سے بچا ہو۔ میں نے تو لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا ہے کہ فرشتہ بہت بدتمیز انسان ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ کئی ایک لوگ تو اسے دور سے آتے ہوئے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ میں نے اسے ایک دو دفعہ سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے کہ:

بہت خوش خلق تھا میں بھی مگر یہ بات جب کی ہے
نہ اوروں ہی سے واقف تھا نہ خود کو جانتا تھا میں

جواباً کہتا ہے کہ مجھے نیکی کا سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے۔ لوگ جو بھی رائے قائم کرتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کبھی بھی کسی کی سوچ پہ پابندی نہیں لگا سکتے۔ بعض لوگ اس بات پہ حیران ہیں کہ میرے جیسا سنجیدہ انسان فرشتہ جیسے بذلہ سنج مگر تلخ مزاج انسان کے ساتھ کیسے گزارا کرتا ہے۔ میں فرشتہ کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں وہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی کہانی چھپائے بیٹھا ہے۔ نہ اس نے کبھی مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو نہ ہی کبھی مجھے اس سے جاننے کا خیال آیا۔ میرے خیال میں کسی کو ذاتیات کے حوالے سے کریدنا مناسب نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی خود اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند نہ کرے۔

میں نے چائے ختم کی اور خالی کپ ایک طرف رکھ دیا۔ فرشتہ جو کہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا،

اپنی کرسی سے اُٹھا اور اس نے تمام کپ اور چائے کی کیتلی دھو کر رکھ دی۔

مجھے اٹالین طرز کے باورچی خانوں میں ایک چیز بڑی پسند ہے وہ یہ کہ یہاں سنک کے اُوپر ایک چھنا سا لگا ہوتا ہے۔ آپ برتن دھودھو کے اس کے اوپر رکھتے جاتے ہیں اور برتنوں کا پانی نچڑ نچڑ کر نیچے سنک میں گرتا رہتا ہے اس طرح برتن بھی سوکھ جاتے ہیں اور کھانے پکانے والے چولہے کے آس پاس جگہ بھی سوکھی اور صاف ستھری رہتی ہے۔

جس گھر میں، میں اور فرشتہ رہتے ہیں تین کمروں پر مشتمل ہے لیکن بہت روشن و ہوادار ہے۔ ایک خواب گاہ، ایک ڈرائنگ روم، باتھ روم اور باورچی خانہ۔ کرایہ بھی مناسب ہے۔ یہ علاقہ اریزو شہر سے تھوڑا ہٹ کے ہے اس لیے گاڑی پارک کرنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ویسے بھی ہمارے گھر کے نیچے کومونے دی اریزو (Comune di Arezzo) کی طرف سے مفت پارکنگ کی سہولت موجود ہے۔ اس لیے آس پاس کے لوگ جن کو کہیں بھی پارکنگ نہیں ملتی وہ یہاں اپنی گاڑی پارک کر دیتے ہیں۔ پارکنگ کے لیے یہاں کئی دفعہ تھوڑی بہت دقت بھی ہوتی ہے لیکن قابلِ برداشت۔ اس کے علاوہ کئی دفعہ لوگ اپنے کیراوان بھی یہاں لا کر کھڑے کرتے ہیں۔ یہاں وہ ان کی صفائی کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے کیراوان کے اندر رات بھی گزار لیتے ہیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں لکڑی کی ہیں لیکن ان میں جو شیشہ لگا ہوا ہے بہت پتلا ہے بالکل ایسا لگتا ہے جیسے ٹرانسپیرنٹ کاغذ کا بنا ہوا ہو۔ کھڑکی کے باہر جو چھوٹی سے کارنس ہے وہاں پر چھوٹے چھوٹے گملے پڑے ہیں۔ سال کے چھ مہینے ان میں لال رنگ کے پھول اُگتے ہیں اور چھ مہینے یہ بالکل سوکھ جاتے ہیں۔ کچن اور ڈرائنگ روم کی دیوار کے ساتھ ایک خودرو بیل پوری دیوار کو سارا سال ڈھکے رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے تتلیاں اور دیگر پتنگے تو منڈلاتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کے ساتھ بعض اوقات کیڑے مکوڑے بھی گھر کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

میں نے گھر کی آرائش و زیبائش اپنے انداز سے کی ہے۔ گو کہ یہ گھر کرائے کا ہے لیکن میں نے گھر کو سجانے سنوارنے پر بہت محنت کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے فرشتہ بھی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم ہو تو خان لیکن کام سارے خانم جیسے کرتے ہو۔ وہ مجھے بغیر نون کے نقطے والا خان بھی کہتا ہے یعنی خان کے بجائے خاں۔ جیسے کہ بڑے سلامت علی خاں، چھوٹے سلامت علی خاں۔ میں اُس کی اس بات کا بالکل بھی برا نہیں مناتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ محض چھیڑ چھاڑ کے

لیے ایسا کہتا ہے۔

ثقلین پری پیکر مجھ سے مخاطب ہوا "نیائش میں چلتا ہوں۔ اگر تمہارے ذہن پر کوئی موضوع کسی بھی عنوان سے دستک دے تو پلیز مجھے ضرور بتانا۔"

فرشتہ دور سے چلایا "ثقلین صاحب آپ کی اردو زیادہ اچھی ہے، نہ ہی آپ کے اخبار کی لیکن اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں نے چند صفحات لکھ رکھے ہیں۔ ہو سکے تو ان پر نظر ڈال کر اغلاط کی نشاندہی کر دیجیے گا۔"

"کیا لکھا ہے آپ نے۔ سیکس کے حوالے سے لکھا ہوگا، یا کوئی اُوٹ پٹانگ قسم کا سیاسی مضمون ہوگا۔"

آپ پڑھنے کی زحمت تو کریں۔ ہو سکتا ہے اس میں سے آپ کو اپنی دلچسپی کا کچھ مواد مل جائے۔

ثقلین نے بے دلی سے کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں تھاما اور فرشتہ سے مخاطب ہوا "کوشش کروں گا کہ آج رات پڑھ لوں۔ بقول آپ کے میری اردو بھی زیادہ اچھی نہیں لیکن پڑھنا لکھنا جانتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ اغلاط دور کر سکوں۔"

نیائش نے فرشتہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا "یہی بات ہے، اخباری اُردو کو معیاری اُردو تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ صحافی حضرات عموماً زبان و بیان، لغت اور انشا پردازی پہ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ نیائش صاحب آپ کی بات درست ہے لیکن آج کل لوگوں کو ایسی ہی زبان سمجھ آتی ہے۔ انگریزی کی ملمع شدہ نقل۔ ٹرانسلیشن کی صورت میں۔"

"پری پیکر ایک بات کہوں برا نہ منانا، فرشتہ جیسا نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں اور جیسا یہ ہے ویسا یہ نظر نہیں آتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

"ثقلین صاحب، میں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ مجھے بھی خدا حافظ کہہ دیا ہوتا۔ خیر میری طرف سے خدا حافظ۔ یہ پلندہ ضرور دیکھئے گا۔"

مجھے کہتے ہیں پری پیکر۔۔۔

میں شفقین ہوں، جسے لوگ پری پیکر کہتے ہیں۔ میں لوگوں سے جلدی متاثر نہیں ہوتا اور نہ میں لوگوں سے بے تکلف ہونے میں جلدی کرتا ہوں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے صحافت کے شعبے میں رہ کر پاکستان کی کئی نامور شخصیات سے ملاقات کی ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے ملا ہوں۔ ایسی کئی بااثر شخصیات سے ملاقات رہی جو حکومتیں بدل دینے کی طاقت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے حساس اداروں کے بارے میں، جو ملک کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے، بھی جاننے کا موقع ملا۔ عسکری اداروں کی بابت ایسے ایسے حقائق میرے علم میں آئے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں پانچ ہزار روپے ماہوار کی نوکری کرتا تھا۔ مگر میرے کئی کام بنا سفارش کے ہی ہو جاتے تھے۔ پاکستانی پولیس جس سے ہر شریف آدمی ڈرتا ہے، میں ان سے چائے پیتا تھا اور کبھی کبھی تحفے کی صورت میں تھوڑی رقم بھی مل جاتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسا میں صحافی کم اور بلیک میلر زیادہ ہوں۔ آمدن معقول اور شریفانہ نہیں تھی لیکن گزارا ہو جاتا تھا۔ صحافت کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں میں نے دیکھا ایک عام پاکستانی اور سیاسی نمائندگان کی زندگی میں کتنا فرق ہے۔ پاکستانی عوام کے نمائندوں کی اکثریت نہ بجلی کے بحران سے واقف ہے، نہ چینی، گیس کی عدم دستیابی سے اور نہ ہی آٹے کی قلت سے۔ ان سارے ذہنی خلفشاروں سے جان چھڑا کر میں اٹلی آ گیا۔ یہاں میں فیکٹری

میں پانچ دن اپنا کام کر کے دو دن فارغ ہوتا ہوں اور چند ایک اخباروں میں لکھ کر اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اطالوی حکومت میری تنخواہ سے ٹیکس کاٹتی ہے اور اس کے بدلے میں مجھے میڈیکل کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ مجھے کسی بھی سرکاری دفتر میں جانے کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اٹلی کا نظام دیکھ کر بڑا حیران ہوں کہ جو یورپ کا کرپٹ ترین ملک گنا جاتا ہے یہاں یہ حال ہے تو باقی یورپین ممالک اس سے کہیں زیادہ آگے ہوں گے۔

خیر جب سے میں یہاں آیا ہوں ایسے نکات پر ہر وقت سوچتا رہتا ہوں۔ مجھے فرشتہ کی شخصیت بھی عجیب سی لگتی ہے۔ میں نے اس کے دیئے ہوئے پلندے کو پڑھنا شروع کیا ہے۔ یہ خودنوشت کے انداز میں لکھی گئی کہانی ہے۔ فرشتہ اچھی اردو لکھ لیتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی کہانی پڑھ کر ہوا۔ ابھی میں نے اسے پورا نہیں پڑھا لیکن جتنا پڑھا ہے اس کو آپ کی نذر کرتا ہوں کیونکہ جو کچھ میں نے اب تک پڑھا ہے وہ فرشتہ کے بارے میں میری رائے بدلنے کے لیے کافی ہے۔

میرا نام فرشتہ ہے۔۔۔

میرا نام فرشتہ ہے۔ صرف نام ہی فرشتہ ہے میرے کام فرشتوں والے نہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میرے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے جس کی آگ بجھانے کے لیے کافی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، فرشتوں کی ہم نے صرف کہانیاں سنی ہیں لیکن ان کو آج تک نہیں دیکھا۔ جبکہ مجھے لوگ دیکھ سکتے ہیں چھو سکتے ہیں۔ میرے پر بھی نہیں ہیں جبکہ تصوراتی حوالے سے فرشتوں کے دو سفید پر ہوتے ہیں لیکن یہ تصور ہمیں الف لیلوی کہانیوں نے دیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دیو مالائی کہانیوں میں جانوروں کو پروں کے ساتھ دکھایا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ گھوڑے کی پروں والی تصاویر ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا تو پاکستان میں ٹرکوں کے اوپر پروں والا گھوڑا بنا ہوا دیکھ کر بڑا حیران ہوتا تھا۔ اس پروں والے گھوڑے کے منہ کے بجائے کسی خوبصورت لڑکی کی شکل بنی ہوتی تھی۔ میرے لیے یہ چیز بڑی حیران کن تھی۔ میں آج تک یہ سوچتا ہوں کہ ٹرکوں پہ پینٹنگ کرنے والوں نے یہ پروں والے گھوڑے کا تصور کہاں سے لیا ہے۔ اور اس گھوڑے یا یوں کہنا چاہیے کہ گھوڑی کی شکل کے بجائے اس پہ وہ لڑکی کی شکل کیوں بناتے ہیں۔ یقیناً اس کی کوئی استعاراتی توجیہ ہوگی۔ ٹرکوں پہ پینٹنگ کرنے والوں نے یہ تصور کہیں سے تو لیا ہوگا۔ کوئی تو پہلا شخص ہوگا جس نے عورت کی شکل والی گھوڑی بنائی ہوگی اور اس کے پر بھی ہوں گے۔

میرے دادا جی کو تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ کئی دفعہ ابوالقاسم فرشتہ کی تاریخ حوالے دیا

کرتے تھے۔ میرا نام فرشتہ بھی انہوں نے رکھا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا کافی حصہ اپنے دادا جی کی صحبت میں گزارا۔ اس محبت کے فیضان سے مجھے بھی تاریخ سے لگاؤ ہو گیا۔ تاریخ سے کیا لگاؤ ہوا دنیا کے دیگر علوم سے بھی دوستی ہو گئی۔ جن میں آثار قدیمہ، فنون لطیفہ، ادب، شاعری وغیرہ شامل ہیں۔

میرے دادا جی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس خمسہ سے نوازا ہے۔ اس طرح ایک انسان اپنے حواس خمسہ سے پانچ مختلف چیزیں محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنی ان حسوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ آنکھیں صرف دیکھنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ مشاہدے کے لیے بھی ہوتی ہیں۔ کان صرف سننے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ صوتی اثرات کی جانچ کرنے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ زبان صرف بولنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ آپ اسے ذائقہ محسوس کرنے کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ دیگر حسیات کے بارے میں نہایت فکر انگیز گفتگو کیا کرتے۔ ان کا خیال نہیں یقین تھا کہ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ زبانیں سیکھ لے تو اس کی طاقت دگنی تگنی ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص دو زبانیں جانتا ہے تو وہ محض ایک شخص نہیں رہتا بلکہ دو ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ زبانیں جانتا ہے تو وہ جتنی بھی زبانیں جانتا ہے اس کی علمی و فکری آسودگی اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ میرے دادا طالب علم تھے۔ صحیح معنوں میں علم کے طالب! ان کی صحبت میں وقت کیا گزرا میں نے بھی زبانوں سے دوستی کر لی۔ سب سے پہلے تو میں نے اُردو زبان پہ عبور حاصل کیا پھر انگریزی پہ۔ لیکن میرے دادا آخری وقت تک کہتے رہے کہ تمہاری انگریزی کمزور ہے۔ جب میں نے اپنی تعلیم مکمل کی تو میں نے سوچا کوئی نوکری کر لوں لیکن میرے دادا نے مجھے مشورہ دیا، بیٹا یا تو سی ایس ایس کی تیاری کر و یا کوئی زبان سیکھ لو۔ اس طرح میں نے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں فرنچ زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ شام کو فرنچ کلچرل سنٹر بھی جانے لگا۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ میں گرامر درست ہوئی اور فرنچ سنٹر میں بولنے کی استعداد بڑھی اس کے علاوہ میں نے فرنچ زبان کا صحیح تلفظ فرنچ کلچرل سنٹر سے ہی سیکھا۔

اب میں بقول اپنے دادا جی تین انسانوں کے برابر ہو چکا تھا۔ میں پنجابی بھی جانتا ہوں اس لیے یہ بھی ایک خوبی جانی جائے۔ عربی میں نے قرآن پاک پڑھنے کے لیے سیکھی لیکن میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جن دنوں میں نیشنل لینگویجز میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا ان دنوں میری ملاقات نعمان خان سے ہوئی۔ وہ بنوں کا رہنے والا تھا۔ وہ نیشنل لینگویجز میں جاپانی زبان سیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم یہ زبان کیوں سیکھ رہے ہو تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے پولیٹیکل سائنس میں ایم

اے کیا ہے لیکن کوئی نوکری نہیں مل رہی۔ اسے کسی نے مشورہ دیا کہ جاپانی زبان سیکھ لو تمہیں آسانی سے مترجم یا ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری مل جائے گی۔ وہ ایک سال سے جاپانی زبان سیکھ رہا تھا اور پڑھائی کے دوران ہی اسے فری لانس ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری مل گئی۔ اس نے جیسے ہی دو سال کا جاپانی زبان کا ڈپلومہ مکمل کیا اسے ٹورسٹ کمپنی نے مستقلاً بھرتی کر لیا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی فرنچ زبان میں ڈپلومہ مکمل کرنے کے بعد اس کمپنی میں فرنچ سپیکنگ گائیڈ کی نوکری کے لیے درخواست دوں۔ میں نے نعمان خان کے بارے میں اپنے دادا سے بات کی تو انہوں نے کہا اچھا مشورہ ہے لیکن میری مانو تو اپنے علم میں اضافہ کرو تاکہ تمہیں سیاحوں کو معلومات دینے میں دقت پیش نہ آئے۔

جب میں نے فرنچ زبان میں دو سال کا ڈپلومہ مکمل کیا تو میں نے نعمان خان سے رابطہ کیا۔ ہم دونوں کی ملاقات ٹورسٹ آفس میں ہوئی۔ اس نے مجھے ہیومن ریسورسز ڈیپارٹمنٹ کے افسر مبین صاحب سے متعارف کروایا۔ مبین صاحب پہلے سی ایس پی افسر تھے اور کراچی کے رہنے والے تھے۔ لمبے قد اور چوڑی چکلی جسامت کے مالک تھے۔ ناک نقشہ بھی ٹھیک تھا۔ جب انہوں بات کرنے کے لیے منہ کھولا تو ان کے دانتوں کی پیلاہٹ سے صاف دکھائی دیا کہ محترم پان اور سگریٹ کے شوقین ہیں۔ اردو بولنے کا انداز بہت ہی شائستہ تھا۔ مجھ سے کہنے لگے ہماری کمپنی میں گائیڈز کو زیادہ تنخواہ نہیں دی جاتی کیونکہ ان کو بخشش بھی ملتی ہے، ٹی اے، ڈی اے بھی۔ اس کے علاوہ کچھ گائیڈ کمیشن بھی لیتے ہیں۔ حالانکہ اصولاً یہ غلط ہے!۔۔۔ اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد مجھے اس کمپنی میں فرنچ اور انگلش سپیکنگ گائیڈ کی ذمہ داری مل گئی۔

گائیڈ کی جاب کافی دلچسپ تھی کیونکہ اس میں علم وادب، آثارِ قدیمہ، تاریخ اور مذاہب عالم کا گہرا دخل تھا۔ میں سیاحوں کو آئیٹنری (جن جن مقامات کے وزٹ پر جانا ہوتا ہے اس کا پورا پروگرام اس میں لکھا ہوتا ہے) کے مطابق ساری جگہیں دکھایا کرتا اس کے علاوہ کبھی بدھ مت کی بات ہوتی اور کبھی ہندومت کی۔ مجھے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے سدھارتھ گوتم بدھ کے بارے میں کافی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ پہلے میں اس بات سے واقف نہیں تھا کہ بدھ مت میں کتنے فرقے ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھ پہ یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ بدھ مت میں دو بڑے فرقے ہیں اور ان دو بڑے فرقوں کے ذیلی طور پر کئی چھوٹے چھوٹے فرقے مزید ہیں۔ ہنایانا، مہایانہ، وجرایانی، تانترک بدھ مت وغیرہ۔ ہنایانا اور مہایانا دو بنیادی فرقے ہیں۔ علاوہ ازیں مجھے آج تک یہ نہیں پتا تھا کہ ہندوازم

میں لاکھوں نہیں کروڑوں خدا ہوتے ہیں۔ کچھ میں رام بھگوان کی طرح پوجا جاتا ہے اور کچھ میں راون کی پوجا کی جاتی ہے۔ پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، بھوٹان، برما، سری لنکا اور افغانستان ان سارے ممالک میں اسلام کی آمد سے پہلے ہندوازم زیرِ عمل تھا اور اس کے بعد بدھ مت بھی رائج ہو گیا تھا۔

میں یہ جان کر بھی بڑا حیران ہوا کہ سوات اور پشاور ایسے قبائلی علاقے، جہاں آج اسلام کا بول بالا ہے، یہیں سب سے زیادہ بدھ مت کا پرچار کیا گیا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے سب سے زیادہ خانقاہیں یہیں دریافت کیں۔ بت کڑا یا بت کارائینی کالے پتھر کا بت، شنگردار سٹوپا، سفولہ سٹوپا۔ سوات تخت بائی اور پشاور میں بہت سے آثار اطالوی ماہرِ آثارِ قدیمہ، جناب جوزپے توچی نے دریافت کیے۔ ٹیکسلا میں بھی کئی قدیم شہر دریافت ہوئے۔ جن میں جولیاں، سری کپ، شہباز گڑھی، دھرم راج کا سٹوپا، برٹش آثارِ قدیمہ کے ماہر، سر جان مارشل نے دریافت کیے۔

میں نہایت محنت کے ساتھ سیاحوں کو ان تاریخی مقامات کی سیاحت کروایا کرتا اور ساتھ ساتھ ان کو تاریخی حقائق سے بھی آگاہ کرتا، جلد ہی مجھے تاریخِ پاکستان بالخصوص پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی تاریخ پر بڑی حد تک دسترس حاصل ہو گئی۔ میرے گروپ میں زیادہ تر یونیورسٹیز کے پروفیسر، سکالر اور فلاسفر ہوتے۔ میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے کمپنی نے میری تنخواہ بھی بڑھا دی اور مجھے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز اور پروفیسرز کے سیاحتی گروپس کے لیے مامور کیا جانے لگا۔

میں انھیں راولپنڈی سے ٹیکسلا لے کر جاتا۔ تمام تاریخی مقام دکھا کے بیشام لے جاتا۔ وہاں یہ لوگ رات گزار کے آگے چل دیا کرتے۔ صبح جب بیشام سے نکلتے تو ہمارا اگلا پڑاؤ چلاس ہوتا۔ یہاں ان کو ہائیروگلفس (Hieroglyphs) اور پکٹوگرام (Pictogram) دکھایا کرتا۔ شتیال کی یہ راک کارونگز پاکستان کے مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ، پروفیسر احمد حسن دانی کی دریافت ہیں۔ اس کے بعد ہم گلگت، سکردو۔ ہنزہ، چترال اور پشاور کی سیر کر کے واپس آجایا کرتے۔

گائیڈنگ کے دوران کئی چیزوں نے مجھے حیران کیا۔ میں نے حضرت موسیٰؑ کے بارے میں سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پتھر کی سل پہ لکھ کر دس کمانڈس بھیجی تھیں۔ پہلی سل ان سے ٹوٹ گئی۔ خدا نے دوبارہ انہیں اس طرح کی سل بھیجی۔ میں جب سیاحوں کو گلگت لے جایا کرتا تو بیشام سے پہلے ہمارا تھوڑی دیر کا پڑاؤ مانسہرہ کے پاس بھی ہوا کرتا۔ یہاں مانسہرہ میں پتھر کی بہت بڑی سل نصب

ہے۔ جس پر بدھ مت کی کمانڈمنٹس لکھی ہوئی ہیں۔ یہ پالی زبان میں لکھی ہوئی پتھر کی سل مہاراجہ اشوک نے لکھوائی تھی۔ اشوک جب کالنگا کی لڑائی سے واپس آیا اس نے جنگ وجدل سے توبہ کر لی۔ پھر اس نے پاٹلی پتر سے کنیا کماری تک جہاں جہاں اس کا راج تھا سب کے لیے بدھ مت مذہب لازمی قرار دے دیا۔ اس نے سدھارتھ گوتم بدھ کے استھیاء (راکھ) کو اس کے قدیم مدفن سے نکلوا کر ازسر نو اسی (۸۰) مختلف جگہوں پہ دفن کروایا۔ وہاں سٹوپے تعمیر کروائے گئے اور ان سٹوپوں کے اندر بدھا کی راکھ سونے کی ڈبیوں میں رکھوائی۔ اس طرح شنکر دار سٹوپا، دھرم راجکا سٹوپا اور سٹوپا اور مانکیلا سٹوپا وجود میں آئے۔ ان سٹوپوں کی اصل تعداد اسی تھی لیکن کئی صدیاں گزرنے کے بعد ان کی تعداد چھ سات رہ گئی۔ انگریز ان سٹوپوں سے سونا چاندی، ہیرے جواہرات نکال کے لے گئے اور خالی سٹوپے سیاحوں کی تفریح کے لیے چھوڑ گئے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے آخری امام، امام مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے دوبارہ آنا ہے۔ عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایک دفعہ پھر تشریف لائیں گے۔ بالکل اسی طرح بدھ مت میں بھی جب دنیا ختم ہو جائے گی تو میتریا تشریف لائے گا۔ بالکل اسی طرح کا فلسفہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سب نجات دہندہ کے انتظار میں ہیں۔

یہ تو تھی مذہب سے متعلق وہ آگہی جو مجھے بطور گائیڈ ملازمت کے دوران حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے جن باتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں سے ایک بات تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہمارے گروپ ہنزہ، چترال اور پشاور ضرور جایا کرتے۔ چترال شہر میں ایک چھوٹا سا گاؤں کہہ لیجئے یا قصبہ، اس کا نام ہے گرم چشمہ۔ امریکن سیاحوں کی سب سے زیادہ تعداد گرم چشمہ جایا کرتی۔ وہاں پہ باقاعدہ گرم پانی کا چشمہ ہے ایک ہوٹل کے اندر گرم پانی کا سوئمنگ پول ہے۔ اس ہوٹل کا شیف کینیڈین نیشنل تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تم یہاں کیوں رہتے ہو تو وہ کہنے لگا، کیونکہ یہاں کی چرس سب سے اچھی ہوتی ہے۔ وہ باورچی، پشتو، فارسی، چترالی اور انگریزی روانی سے بولتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے دیکھا کہ پاکستان کے کئی حساس علاقوں میں امریکہ اور دیگر یورپین ممالک کے لوگ بھیس بدل کر رہ رہے تھے۔ گرم چشمہ سے روس صرف پینتیس کلومیٹر دور ہے۔ اس چھوٹے سے حصے کو واخان کوریڈور کہتے ہیں۔ روس کی اس علاقے میں موجودگی امریکہ کو بہت کھٹکتی تھی۔ خیر اس کے علاوہ بہت سارے ٹورسٹ درہ آدم خیل جایا کرتے۔ میں اور میرے کئی ساتھی بلکہ

دیگر ٹورسٹ کمپنیوں کے لڑکے بھی خوشی خوشی ان سیاحوں کو اسلحے کی فیکٹریاں دکھلانے لے جایا کرتے۔ ہمیں اپنی تنخواہ اور ٹپ سے مطلب ہوتا۔ کبھی کبھی کمیشن بھی مل جایا کرتی۔ اب دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی ڈھانچے کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ہم لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔

درہ آدم خیل کی اسلحہ فیکٹریوں میں ہر طرح کی کلاشنکوف ہوتی۔ روسی، چینی اور پاکستانی۔ جب میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو گولیوں کے خالی کھوکھوں میں بارود بھرتے دیکھتا تو بڑا دکھی ہوتا۔ میں ہوٹل میں واپس آکے سوچتا کہ یہ عمر ان بچوں کے پڑھنے لکھنے کی ہے جانے کون انہیں مزدوری پہ مجبور کرتا ہے لیکن یہ سوچ بالکل ایسے ہی وقتی ثابت ہوتی جیسے انسان مردے کو قبر میں دفن کرنے کے لیے قبرستان جاتا ہے تو اس کے دل میں موت کا خوف طاری ہوجاتا ہے لیکن جیسے ہی وہ قبرستان سے باہر آتا ہے تو وہ دوبارہ اپنی دُنیاداری میں گم ہوجاتا ہے، قبر اور موت کے خوف کو بھول جاتا ہے۔

گائیڈ کی نوکری کرتے مجھے ابھی سال ہی گزرا ہوگا کہ پرویز مشرف نے نواز شریف کا تختہ اُلٹ دیا اور ہمارا ملک ایک دفعہ پھر مارشل لا کی زد میں آ گیا۔ میرے دادا مجھے اکثر کہتے تھے کہ جس ملک میں نواز شریف جیسا شخص پرائم منسٹر بن سکتا ہے وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بعض سیاسی لوگوں کی رائے ہے کہ نواز شریف کو سیاست میں لانے والا میاں اظہر تھا لیکن بعد میں ان دونوں بھائیوں نے مل کر اسے ہی سیاست سے علیحدہ کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواز شریف نے سیاست میں قدم رکھنے کے لیے ضیاء الحق کی بیٹی زین ضیاء کو ایک کروڑ روپے کا تحفہ دیا تھا۔ میرے دادا کو شریف برادران کی ترکیب لفظی بالکل پسند نہیں تھی کیونکہ انہیں اس ترکیب لفظی سے ایسا محسوس ہوتا جیسے بھولو برادران، صابری برادران وغیرہ کا ذکر خیر ہو رہا ہے۔

جب جنرل مشرف نے نواز شریف کا تختہ اُلٹا، یہ ۱۲ اکتوبر کا دن تھا۔ کارگل کا واقعہ جولائی میں پیش آیا۔ لوگوں نے کارگل کی کڑیاں تختہ اُلٹنے کے ساتھ ملا دیں۔ جس دن نواز شریف کا تختہ اُلٹا گیا اس دن پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات بھی پانچ گھنٹے تک بند رہی۔ اس ساری کارروائی کی نگرانی کور کمانڈر راولپنڈی کے ذمہ تھی۔ آرمی کے ایک میجر نے پورے ٹی وی سٹیشن پہ تھوڑی دیر میں قبضہ کرلیا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور پاکستان میں چھوٹے موٹے دھماکوں کے واقعات رُونما ہونے لگے۔ سردیوں میں ٹورزم کا دھندہ کم۔۔۔ یعنی سیزن آف ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنی کمپنی سے ایک مہینے کی تعطیل حاصل کی اور فرانس کا ویزہ لے کر پیرس آ گیا۔ گائیڈنگ کے دوران کئی غیر ملکی سیاحوں

سے اچھے تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ فرانس آنے کے بعد مجھے ان کی معاونت سے جو مراعات حاصل ہوئیں اُن میں کمپلی مینٹری (مفت) قیام وطعام کی سہولیات شامل تھیں۔ یورپ میں کھانا پینا اور رہائش آپ کو مفت مل جائے تو اس سے بڑھ کے اور کیا چاہیے۔ میں نے ایک مہینہ جی بھر کے پیرس کی سیر کی۔ ویزے کی معیاد ختم ہوئی تو میں واپس آ گیا۔ جیسے ہی پاکستان واپس آیا مجھے سب نے ایک ہی بات کہی، واپس کیوں آ گئے۔ وہیں رُک جاتے۔ میں ان کو کیسے یقین دلاتا کہ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں میں تو صرف سیر کی غرض سے گیا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔

جب میں واپس آیا تو میرے دادا نے مجھ سے پہلا سوال جانتے ہیں کیا کیا؟ بیٹا پیگال گئے تھے، اس کے علاوہ بھی انہوں مجھ سے بے شمار سوال کیے۔

میں نے دوبارہ ٹورسٹ کمپنی جوائن کر لی لیکن پرویز مشرف کے اقتدار میں آنے سے ہماری کمپنی کا بزنس ٹھپ ہو گیا تھا۔ بیشتر مغربی سیاح خیال کرتے ہیں کہ جن ممالک میں ڈکٹیٹرشپ ہو، وہ ممالک سیاحت کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ آہستہ آہستہ ہماری گائیڈنگ کمپنی کے ایک دولڑکوں نے مل کر الگ سے اپنی کمپنی کھول لی۔ اب مجھے بھی کمپنی انتظامیہ نے اشارے کنائے میں کہنا شروع کر دیا کہ اپنا کوئی بندوبست کرلو۔ میں ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری اس لیے نہیں کرتا تھا کہ اس سے میرا گھر کا خرچہ چلے بلکہ اس کام میں مجھے وہ کچھ سیکھنے کو ملے گا کہ جو کوئی شخص سکول، کالج اور یونیورسٹی میں ساری زندگی نہ سیکھ سکے۔ میرا خیال تھا کہ گائیڈنگ سیاسی، معاشی، سماجی تغیرات کے تجربات تک، سب کچھ کی آگہی دان کر سکتی ہے۔

سن ۲۰۰۰ ہزار میں اس کشمکش میں کہ کیا کیا جائے بسر کیا اور آخرکار ایک دفعہ پھر یورپ کی سیر کو نکلا۔ میں یہاں آپ کو ایک بات بتاتا چلوں کہ میں مالی طور پہ کافی آسودہ تھا۔ تنخواہ کی آمدن سے کبھی سیر کے لیے نہیں نکلا۔ سیر وتفریح کے لیے مجھے میرے دادا فنڈز مہیا کرتے۔ اس کے علاوہ میرے نام کافی زمین جائیداد ہے جس کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہوگا۔ اب کی بار میں نے اٹلی کی خاک چھاننے کی ٹھانی۔ جب میں پاکستان سے چلا تو نعمان خان نے کہا، اگر اٹلی گئے تو میرے چچازاد نیاش خان سے ضرور ملنا فلورنس کے پاس ایک چھوٹا سا شہر ہے اریزو، وہ آج کل وہاں قیام پذیر ہے۔ میں نے نیاش کا فون نمبر اور پتہ نوٹ کیا اور اٹلی آ گیا۔ یہاں میرے رہنے اور گھومنے پھرنے کا انتظام گراندی ویاجی (Grandi Viaggi) کی ڈائریکٹر نے کیا۔ میں تین چار دن میلان رہا۔ اس

کے بعد روم، وینس کی سیر کی۔ پیسا ٹاور دیکھا۔ فلورنس گھوما، چند ایام اریزو میں نیاٹش خان کے پاس گزارے، پھر واپس پاکستان آ گیا۔ ۲۰۰۱ء کے شروع میں مجھے بتایا گیا کہ اب کمپنی کو میری خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے افسوس تو ہوا لیکن اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ اس لیے معاشی طور پر کچھ زیادہ فرق نہ پڑا۔ اس دوران میرے جن کولیگز نے کمپنی بنائی تھی انہوں نے مجھے کام کی آفر کی جو میں نے منظور کر لی۔ تین چار مہینے کام کیا اور اگست کے آواخر میں یورپ کا مارکیٹنگ منیجر بن کے فرانس، جرمنی اور اٹلی کے دورے پہ نکلا۔ مجھے تین چار کمپنیوں سے بزنس بھی مل گیا۔ میں نے اپنی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کو خوشخبری سنائی۔ میں جن لوگوں کے ساتھ کام شروع کیا تھا وہ لوگ زیادہ تر جاپان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی چھوٹی کمپنی کو یورپین ڈور مل رہے تھے حالانکہ میں جس کمپنی میں پہلے جاب کرتا تھا اس کا بزنس بہت کم رہ گیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے پندرہ ستمبر کی واپسی سیٹ ریزرو کروائی۔ اب میرے پاس ایک ہفتہ بچا تھا۔ یہ ہفتہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ فلورنس میں اپنے دوست نعمان خان کے چچازاد نیاٹش خان کے پاس گزاروں گا۔ وہ مجھے ایک بار پھر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء منگل کا دن تھا۔ ستمبر میں اٹلی میں نہ سردی ہوتی ہے نہ گرمی۔ دن کو موسم اچھا ہوتا اگر دھوپ نکلے تو، اور رات کو تھوڑی بہت خنکی ہو جاتی ہے۔ لیکن آج دھوپ میں کافی تیزی تھی۔ میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹی وی آن کیا۔ نیاٹش صبح صبح کام پہ چلا گیا تھا اس لیے میں گھر پہ اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ جو لڑکے رہائش میں حصے دار تھے وہ بھی کام پہ گئے ہوئے تھے۔ مجھے وقت کا اندازہ نہ ہوا لیکن اچانک ٹی وی پہ بلیٹن چلا کہ امریکہ کے ٹوئن ٹاورز دہشت گردوں نے اُڑا دیے۔ اُن کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ پہلے ایک ٹاور سے جہاز ٹکراتے ہوئے دکھایا گیا اس کے بعد دوسرے ٹاور سے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سات عمارتیں ہیں۔ یہ جو دو عمارتیں ہیں ان کو جڑواں مینار بھی کہا جاتا ہے۔ ٹی وی پہ خبر دی گئی کہ یہ کام القاعدہ کا ہے۔ اس کارروائی کے پیچھے اُسامہ بن لادن ہے۔ جب ٹی وی پر یہ خبر چلی اور جہاں جہاں بھی یہ خبر چلی، سب کو معلوم ہوتا چلا گیا کہ اس دہشت گردی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے حالانکہ اس وقت پوری دنیا میں یہ کوئی نہیں جانتا تھا یہ کام درحقیقت کس کا ہے۔ انٹرنیشنل میڈیا نے یہ الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا اور مسلمانوں نے بدحواسی میں ایسی عجیب و غریب حرکتیں کیں کہ شک یقین میں بدل گیا۔ مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو وہ تھے

جنھوں نے یہ کہا ٹھیک ہوا ہے دوسرے وہ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔

نیائش جب گھر آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ تم پریشان تو نہیں ہو۔ میں نے کہا جب تک اس خبر کے بارے میں تفصیل سے پتا نہ چل جائے میں اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ کام کس کا ہے۔ اس لیے اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دن پورے اٹلی کی ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ یہ دن پوری دنیا کے مسلمانوں نے بڑی مشکل میں گزارا۔ اگلے دن میرے ساتھ میری زندگی کا سنگین ترین سانحہ پیش آیا۔ مجھے پاکستان سے گھر والوں نے فون کیا کہ تمہارے دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔ دوسرا فون مجھے میری کمپنی نے کیا کہ ہم نے کمپنی بند کر دی ہے اور کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر جاپان چلا گیا ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام غیر ملکیوں نے جن میں یورپ اور امریکہ کی ٹورز آپریٹر کمپنیاں تھیں۔ سب نے اپنے اپنے ٹور کینسل کر دیے ہیں۔ دو دن بعد، جن کمپنیوں کے ساتھ میں بات چیت کر کے آیا تھا، ان کے فون آنے لگے کہ ہم نے پاکستان کے لیے اپنے تمام گروپس کینسل کر دیے ہیں۔ میں اس بات پہ بڑا حیران ہوا کہ امریکہ میں دھماکہ ہوا تو اس کا پوری دنیا نے اثر لیا اور پاکستان میں دھماکے ہوتے ہیں۔ فلسطینی، کشمیری، عراقی اور افغانی کئی سالوں سے انسانی خون سے اپنی زمین کو سینچ رہے ہیں لیکن دنیا کے کان پہ جوں تک نہیں رینگتی۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ جڑواں عمارتوں کے اندر اور آس پاس رہنے والے بے شمار بے گناہ لوگ مارے گئے۔ اس ناگہانی آفت کا کسی کو علم نہیں تھا۔ میڈیا اور ویڈیو کریسی نے پوری دنیا کو اس بات کا یقین دلایا کہ اس کام کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے اور انہوں نے اس بات کو تسلیم بھی کر لیا۔

دادا کی دنیا سے چلے جانے کی خبر نے یورپ کے قیام سے میرا دل اُچاٹ کر دیا۔ میں نے نیائش سے بات کی کہ میں پاکستان واپس چلا جاتا ہوں کیونکہ میرے ویزے کی میعاد بھی ختم ہونے والی ہے۔ تو اس نے کہا، اس وقت پاکستان جانا مناسب نہیں۔ ایئرپورٹس پر سختی ہوگی۔ حالت یہ ہے کہ ہر مسلمان خصوصاً پاکستانی کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ میں نے ویزے کی میعاد بڑھانے کے لیے فون کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ آپ نے فرانس کا ویزہ لیا تھا اس لیے وہاں جا کے اپلائی کریں۔ اب میں فرانس جانا چاہتا تھا۔ میں نے پاکستان فون کیا کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو جواب ملا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کوئی پیسے نہیں میرے حصے کی زمین جائیداد پہ بھائیوں نے قبضہ

کرلیا۔ میرے دادا مرنے سے پہلے اپنی وصیت میں ایک بات لکھ گئے تھے کہ اپنی ساری کتابیں فرشتہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور اب میرے پاس کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

نیائش نے مجھے مشورہ دیا کہ یہیں رہ جاؤ۔ چھوڑو پاکستان کو۔ میں نے اسے کہا کہ میرے تمام سرٹیفکیٹ پاکستان میں ہیں۔ میں اگر یہاں نوکری تلاش کروں تو کس بنا پر ۔۔۔ مجھے ''کوریکولم وٹے'' یعنی'' سی وی'' بنانا ہوگا۔ اس نے کہا کہ اٹلی میں اس طرح نہیں ہوتا۔ تمہیں کسی نہ کسی فیکٹری میں کام مل جائے گا۔ جیسے تیسے کر کے میں نے کام کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ میرے ویزے کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور میں اب اٹلی میں غیر قانونی طور پہ مقیم تھا۔ میں نے کئی ٹریول کمپنیوں سے بات کی کہ میں پروفیشنل ٹور گائیڈ ہوں لیکن مجھے کہیں بھی ملازمت نہ ملی۔ اسی طرح ایک دو ماہ گزر گئے۔ میری انگریزی، فرنچ اور تھوڑی بہت اطالین کسی کام نہ آئی۔ میں نے ساری زندگی آرام و آسائش میں گزاری تھی۔ مالی طور پر اس طرح کے مشکل حالات سے نہیں گزرا تھا۔ اس کے باوجود خودداری اجازت نہیں دیتی تھی کہ دست طلب دراز کروں لہٰذا میں نے نیائش خان کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھا کہ کسی بھی قسم کا کام کر لینا مجھے منظور ہوگا لیکن کسی پر بوجھ نہیں بنوں گا۔

○○○

مجھے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹر کی نوکری مل گئی۔ اس طرح مجھے اس ذہنی اذیت سے نجات مل گئی کہ میں نیائش پہ بوجھ ہوں۔ میرا گھر والوں سے رابطہ بالکل منقطع ہو گیا اور میں نے اپنا دل اٹلی میں ہی لگا لیا۔ اس بات کو میں بالکل بھول گیا کہ میں بھی ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد ویسے تو پوری دنیا نے مسلمانوں سے نفرت شروع کر دی تھی لیکن اطالین نے اس بات کا کچھ زیادہ ہی اثر لیا۔ انہوں نے پاکستانیوں کی دوکانوں پہ چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ ان کی ڈاک پر سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ ان کے موبائل فون چیک ہونے لگے۔ نہ صرف اٹلی بلکہ پوری دنیا کے مسلمان ایسا محسوس کرنے لگے جیسے یہودیوں ایسی بدنام زمانہ ہولوکوسٹ دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ جہاں کئی مسلمان ملکوں نے امریکہ کو دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اپنے تعاون کا یقین دلایا وہیں پاکستانی آمر پرویز مشرف نے بھی امریکہ کو یقین دلایا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور انہیں باقاعدہ طور پہ دعوت دی کہ تم پاکستان آ کے دہشت گردوں کا خاتمہ کر سکتے ہو۔

ویسے تو ریسٹورنٹ کا مالک اچھا انسان تھا لیکن کئی دفعہ گاہکوں کو جب پتا چلتا کہ میں

پاکستانی ہوں تو وہ مجھے اچھی نظر سے نہ دیکھتے۔ انہیں میری شکل میں اُسامہ بن لادن نظر آتا۔ انہیں ایسا لگتا کہ ٹون ٹاور میں نے گرائے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کا زیادہ اثر معیشت پر پڑا۔ پوری دنیا کی معیشت کو اس واقعے نے ہلا کر رکھ دیا۔ ایئر لائنز کو کروڑوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ جن ملکوں کا امریکہ کے ساتھ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام تھا وہ بری طرح متاثر ہوئے۔ جہاں پوری دنیا نے مسلمانوں کے ساتھ نفرت کا اظہار کیا وہاں کاروباری حضرت کو اپنے کاروبار کی فکر پڑ گئی۔ اطالوی اریزو شہر کو سونے کا شہر کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہاں چھوٹی بڑی سونے اور چاندی کی فیکٹریاں ہیں۔ جو لوگ اپنا مال امریکی کمپنیوں کو بیچتے تھے ان کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا۔ کئی لوگوں نے اپنی فیکٹریاں بند کر کے کافی بارز کھول لیے۔ کچھ نے ٹریول ایجنسیز بنالیں۔ بے شمار لوگ بے روزگار ہو گئے۔ پوری دنیا شدید معاشی بحران کا شکار ہو گئی۔

روز نئی نئی خبریں سننے کو ملتیں۔ کبھی خبر آتی کہ اُسامہ بن لادن پکڑا گیا، کبھی ہیڈ لائن چلتی کہ دہشت گرد جیسا ٹاور گرانے کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ ان خبروں میں کتنی صداقت تھی یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ایک خبر جو صداقت پر مبنی تھی یہ تھی کہ امریکی افواج طالبان کا قلع قمع کرنے کے بہانے افغانستان میں فعال ہو چکی تھیں۔ اب امریکہ عراق میں داخل ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ افغانستان میں ایک عارضی سی حکومت قائم کر دی گئی تھی۔ جب امریکن فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو ساری دُنیا کے ترقی یافتہ ملکوں نے امریکہ کا ساتھ دیا اُن میں برطانیہ پیش پیش تھا۔ اٹلی تو ایک ایسا ملک ہے۔ جو "جیہڑا جتے اوہدے نال۔" اس نے بھی اپنی فوجیں افغانستان بھیج دیں۔ آئے دن طالبان کے نام پر بے گناہ اور نہتے شہریوں پر بمباری ہوتی۔ اُس افغانستان میں کہ جہاں آسمان سے بم برسانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ پورا ملک بارودی سرنگوں سے بھرا پڑا ہے۔ آگے کھڈا پیچھے کھائی والا حساب ہے۔ یورپین میڈیا نے نہتے اور بے گناہ افغان شہریوں کی ہلاکت کا ذکر تو خیر کیا کرنا تھا۔ اس کے برعکس کی یورپین یا اٹالین فوجی کے مرنے کی خبر آتی تو اُسے خوب اُچھالا جاتا اور اس طرح چند دنوں کے لیے لوگ پھر طالبان اور مسلمانوں کی مخالفت میں اپنی بھڑاس نکالتے۔ ان دنوں میڈیا کی کوریج کا یہ عالم تھا کہ ایک دن کوئی چینل یہ ویڈیو دکھاتا کہ افغانستان میں طالبان اور امریکی فوجیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ دوسرے دن جو ویڈیو دکھائی جاتی اس میں اس مقام پر صحافی یہ کہانی سنا رہا ہوتا کہ اس مقام سے کس طرح طالبان کا صفایا کر دیا گیا ہے۔۔۔

۲۰۰۲ء، فروری کے مہینے میں میرے آجر نے مجھے جواب دے دیا کہ وہ اب مجھے کام پہ

نہیں رکھ سکتا اس کی وجہ مسلمانوں سے نفرت نہیں بلکہ کام کی کمی تھی۔ میں اس کی نظر میں اچھا انسان تھا لیکن خود مجھے بھی نہیں پسند تھا کہ بنا کام کے تنخواہ لوں۔ دو تین مہینے گھر پہ گزارے اس کے بعد اپریل میں ایک کوریئر کمپنی میں لوڈنگ کا کام مل گیا۔

میرا مشاہدہ بہت اچھا تھا۔ آس پاس ہونے والے واقعات پہ ضرور نظر رکھتا۔ کام کے دوران اگر کوئی تنقید کا نشانہ بناتا بھی تو خاموشی اختیار کیا کرتا کیوں کہ میں جان چکا تھا کہ اٹالین لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسی بچ پہ یقین کرتی ہے جو میڈیا دکھاتا ہے۔ اس لیے ان سے بحث کرنا حماقت ہے۔ اریزو شہر کے لوگوں کی زندگی بالکل کسی ایسے گاؤں کی طرح ہے جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ لوگ صبح نو بجے دوکانیں کھولتے ہیں اور ایک بجے بند کر دیتے ہیں۔ پھر تین گھنٹے کے وقفے کے بعد چار بجے دوبارہ کھولتے ہیں اور آٹھ بجے پھر بند کر دیتے ہیں۔ ساڑھے سات بجے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں چونکہ کوریئر کمپنی میں کام کرتا تھا اس لیے صبح چھ بجے چلا جاتا ایک بجے واپس آتا اور شام کو بھی تین یا چار گھنٹے کام کرتا۔ ہفتہ اتوار ریسٹ ہوتی۔

۲۰۰۲ مئی کے اواخر میں، میں جس کوریئر کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں کسی حساس ادارے کا چھاپا پڑا اور مجھے بغیر وجہ بتائے کام سے فارغ کر دیا گیا کیونکہ جس کمپنی کے لیے میں کام کرتا تھا اس کو جرمانہ بھگتنا پڑا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرا دل بہت کھٹا ہوا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب اٹلی میں نہیں رہوں گا۔ میں گھر آیا تو اس واقعے کا نیاتش سے ذکر کیا۔ اس نے کہا دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اٹلی اس لیے چھوڑنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس کام نہیں یا تمہیں اس بات کی تشویش ہے کہ تمہیں مجھ پہ بوجھ بننا پڑے گا تو اس بات کی تم بالکل فکر نہ کرو۔

میری اور نیاتش کی کافی بحث وتمحیص ہوئی اور ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ میں سوئٹزرلینڈ جاؤں۔ نیاتش نے بتایا کہ اس کا ایک جان پہچان والا میلانو کے مضافاتی قصبے واریزے میں رہتا ہے۔ اس کا پیشہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اٹلی کی سرحد پار کرا کے سوئٹزرلینڈ پہنچاتا ہے۔ اس نے کہا میرا خیال ہے وہ دو سو یورو لے گا، وہاں جا کے تم سیاسی پناہ لے لینا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

O

ہفتے کے دن پری بیکر، فرشتہ سے کاغذوں کا پلندہ لے کر گیا اور اتوار کی صبح پھر وارد ہوا۔

نیاکش نے دروازہ کھولا۔ اس نے آتے ہی پوچھا "ارے بھئی فرشتہ صاحب کدھر ہیں۔"

میں نے کہا: "خیریت ہے آج فرشتہ کا نام بڑے احترام سے لیا جارہا ہے۔"

"نیاکش یہ شخص جیسا نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں۔ تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔"

"میں تو اس راز سے پہلے ہی واقف ہوں لیکن میں چاہتا تھا کہ تم خود اس حقیقت کو اپنے طور پہ جانو اور اپنی رائے قائم کرو۔"

"فرشتہ صاحب اس وقت کہاں ہیں۔"

"باہر کھڑا ہوگا محفل سجا کے۔ کسی کے کان کھا رہا ہوگا۔ دنیا جہان کے گندے لطیفے اس کو آتے ہیں۔ جگت بازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بات نکالنے میں اتنا ماہر ہے کہ بڑے سے بڑے بولنے والے اس کے سامنے گونگے ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ اس نے اپنے اوپر ایسا خول کیوں چڑھایا ہوا ہے۔ اپنی اس صلاحیت کو کسی مثبت کام کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے۔"

"مجھے خود سمجھ نہیں آتی۔ ویسے میرے ساتھ وہ بہت اچھے طریقے سے رہتا ہے۔"

"اچھا جب وہ آئے تو اس کو یہ پیکٹ دے دینا۔"

"اس میں اس کی رام کہانی کا ابتدائیہ ہے۔ بہت اچھا لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال تھا باقی ابواب بھی لے جاتا اگر اس نے لکھ لیے ہوں تو۔"

"تم کہتے ہو تو بلا لیتا ہوں۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے، یا مجھے اس کا سیل نمبر دو میں خود اس سے بات کر لیتا ہوں۔"

"فرشتہ سیل فون استعمال نہیں کرتا"

"وہ کیوں؟"

"یہ تم اسی سے پوچھ لینا۔"

"تو پھر تم اسے کیسے مطلع کرو گے۔"

"مجھے اندازہ ہے وہ اس وقت کس شخصیت کے ساتھ ہوگا میں اس شخصیت کو فون کرتا ہوں۔ اگر میرا اندازہ درست ہوا تو فرشتہ سے ابھی بات ہو جائے گی۔"

نیاکش نے اس شخص کا موبائل نمبر ملایا۔ دو دفعہ گھنٹی بجی اور کال اٹینڈ کر لی گئی۔

"ہاں جی نیاکش بھائی کیسے یاد کیا۔"

"ارے بھئی یہ پری پیکر میرا مطلب ہے ثقلین صاحب فرشتہ سے ملنے کے لیے بڑے بے چین ہیں۔"

اس شخص نے مختصراً بریف کرتے ہوئے موبائل فرشتہ کو دے دیا اور کہا نیاکش بھائی سے بات کیجیے۔

"ارے بھئی مجھ سے کون سی خطا ہو گئی۔ ثقلین صاحب نے کہیں میری گوشمالی تو نہیں فرمائی؟"

"ارے نہیں وہ تمہارا کاغذوں کا پلندہ لایا ہے اور کہہ رہا ہے اگر اگلا باب لکھا ہو تو مجھے دے دیں۔"

"آپ لوگ پانچ منٹ میرا انتظار کریں، میں آ رہا ہوں۔"

اس طرح نیاکش اور فرشتہ کی ٹیلی فونک گفتگو ختم ہو گئی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد فرشتہ گھر پہ موجود تھا۔ وہ آتے ہی ثقلین سے مخاطب ہوا" جناب کیا خطا ہو گئی، جو آپ نے طلب فرمالیا؟"

''فرشتہ صاحب کاغذوں کو جو پلندہ آپ نے مجھے تھمایا تھا میں نے پڑھ لیا ہے۔ بہت دلچسپ لگا۔۔۔مزید پڑھنے کے لیے بے چین ہوں۔''

''شقلین صاحب اس میں اغلاط تو بہت ہوں گی کیونکہ میں نے بہت جلدی میں لکھا ہے۔''

''تھوڑی بہت غلطیاں ہیں۔کا،کے،کی وغیرہ کی۔آپ کی اردو مجھ سے زیادہ اچھی ہے۔''

''ویسے کا کے کی غلطیاں تو معاف کی جا سکتی ہیں۔''

''میرا مطلب وہ والے ''کاکے'' کی غلطیاں نہیں بلکہ دوسری والی کا۔۔۔کے۔۔۔کی ہے۔''

''میں اب سمجھا۔''

''سمجھ تو آپ تبھی گئے تھے لیکن بات میں مزاح کا عنصر ڈھونڈنا آپ کا فن ہے۔''

اجی کہاں کا مزاح، کہاں کا فن، بات صرف اتنی ہے کہ بقول شاعر:

؎ صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

''بہت شکریہ۔''

اتنا کہہ کر فرشتہ اٹھا۔شقلین سے پرانا پلندہ لیا اور کمرے میں چلا گیا۔جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کاغذات کا نیا پلندہ تھا۔اس نے وہ پلندہ شقلین کو پیش کرتے ہوئے کہا''اس پر بھی مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں آپ کی تحریر کو اس کے شان شایان توجہ ملے گی۔''

شقلین نے پلندہ ہاتھ میں لیا اور اجازت چاہی۔فرشتہ اور نیائش نے بہت کہا کہ چائے پی لے کچھ کھا لے لیکن وہ نہ مانا اور خدا حافظ کہہ کے چلا گیا۔

شقلین نے ڈنر کے بعد چائے پی۔پھر ٹیبل لیمپ آن کیا اور اپنی دراز سے کاغذوں کا پلندہ نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

سن ۲۰۰۲ مئی کے مہینے میں فٹ بال کا ورلڈ کپ شروع ہوا۔جس طرح انگلینڈ کو کرکٹ کا گھر کہا جاتا ہے۔بالکل اسی طرح اٹلی کو فٹ بال کا گھر کہتے ہیں۔اٹالین اکثریت مذہبا عیسائی ہے زیادہ تر لوگ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ایک اطالوی کے لیے فٹ بال مذہب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔یہ لوگ گھنٹوں فٹ بال پہ گفتگو کرتے ہیں لیکن ان کی اچھی بات یہ ہے کہ کتنی بھی

بحث ہو، ایک دوسرے کو بھلے کتنا ہی برا بھلا کہیں، فٹ بال کے کھلاڑیوں کی کارکردگی کو کتنا ہی تنقید کا نشانہ بنائیں لیکن ہاتھا پائی پر نہیں اُترتے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں لوگ کھیل اور سیاست کی بحث کے دوران مرنے مارنے پہ اتر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یورپین یا یوں کہنا چاہیے کہ اٹالین بہت مہذب لوگ ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں کا قانون بڑا سخت ہے۔ یہاں جو شخص بھی پہلے ہاتھ اُٹھاتا ہے اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔

اس دفعہ بھی فٹ بال کے ورلڈ کپ کے لیے ہمیشہ کی طرح ہالینڈ، اٹلی اور برازیل کی ٹیمیں ہاٹ فیورٹ تھیں۔ میں نے نیائش سے کہا میں کچھ میچز ادھر اٹلی میں دیکھوں گا باقی وہاں سوئٹزرلینڈ میں ہی۔ گو مجھے فٹ بال کا اتنا شوق نہیں لیکن ورلڈ کپ کے میچز دیکھنے میں لطف آتا ہے۔ شروع کے میچز بڑے دلچسپ تھے۔ بہت سی ٹیمیں جو غیر متوقع طور پر کوارٹر فائنل کے لیے کوالیفائی کر چکی تھیں ان میں ترکی کی ٹیم بھی شامل تھی۔

نیائش مجھے اب بھی روکنے کے حیلے بہانے ڈھونڈ رہا تھا لیکن میرے پرزور اصرار پہ وہ مجھے میلانو لے جانے پہ راضی ہو گیا۔ اس نے اپنے ملنے والے کو فون کر دیا کہ ہم لوگ چند دنوں میں آ رہے ہیں۔ اس نے کہا جب بھی تمہارا دل چاہے آ جانا کوئی مسئلہ نہیں۔

۲۰۰۲ء جون کی ۱۵ تاریخ کو ہم صبح چھ بجے نکلے۔ فلورنس نارتھ کے آٹوگرل (یورپین ملکوں میں موٹروے پہ ہر تیس یا چالیس کلومیٹر کے بعد اس طرح کے ریفریشنگ شاپ بنے ہوتے ہیں) پہ رکے۔ نیائش نے کاؤنٹر پہ دو کیپوچینو اور کوآساں کا آرڈر دیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے کوآساں کو بمشکل نگلتے ہوئے کہا: ''فرشتہ میں تو کہتا ہوں اب بھی واپس چلے چلو۔''

میں نے کہا ''اب نکلا ہوں تو اپنا مشن پورا کر کے ہی رہوں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

ہم لوگ واش روم سے ہوتے ہوئے دوبارہ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نیائش کی گاڑی پیٹرول یا ڈیزل کے بجائے گیس سے چلتی ہے اس لیے وہ میتانو گیس (ایک طرح کی گیس جو گاڑیوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اٹلی میں جی پی ایل گیس بھی استعمال ہوتی ہے) سٹیشن پہ رکا۔ اس نے جیسے ہی گیس فل کروائی، گاڑی سٹارٹ کی۔ اس کی کار موٹروے پہ فراٹے بھرنے لگی۔ ہم لوگ قریباً گیارہ بجے واریزے کے نزدیک پہنچ گئے۔ نیائش نے متعلقہ شخص کو موبائل نمبر پہ کال کی اور اُسے

اپنی آمد سے مطلع کیا۔ اس نے ہدایت کی کہ آپ لوگ واریزے ریلوے سٹیشن پہ آ جائیں میں یہاں قریب ہی ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ نیائش مجھے بتانے لگا کہ یہ شخص پہلے اریزو ہی میں رہتا تھا۔ اس نے جیسے ہی اٹالین لائسنس حاصل کیا، یہ کام شروع کر دیا۔ پہلے یہ فرانس سے سپین کا بارڈر پار کروایا کرتا تھا اب یہ سوئٹزرلینڈ بندے لے کر جاتا ہے۔

ہم لوگ موٹروے سے، اس کا ٹکٹ ادا کر کے باہر آ گئے اور اب عام شارع پہ عازم سفر تھے۔ نیائش نے کافی پینے کے لیے ایک چھوٹی سی بار پہ گاڑی روکی۔ میں عام طور پہ کافی پیتا نہیں ہوں لیکن چونکہ مجھے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے بھی کیپوچینو پی اور اس کے ساتھ ایک کوآساں کھایا۔ پھر میں نے بارٹینڈر سے کہا کہ اگر ہو سکے تو مجھے ایک تاکی پریناڈا یا اسپرین دے دے۔ اس نے جھٹ سے گلاس میں پانی ڈالا اور اس میں اسپرین ٹیبلٹ ڈال دی۔ اٹالین لوگ اس طرح کی ٹیبلٹ کو افیروےشینتے یعنی مکمل جانے والی گولی کہتے ہیں۔ میں نے ایک ہی سانس میں یہ حل شدہ ٹیبلٹ حلق میں اُتاری۔ نیائش نے کوفی اور کیپوچینو کے پیسے ادا کرنے کے لیے اپنا پرس نکالا۔ ابھی وہ یہ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ گولی اور پانی کا گلاس کے پیسے بھی شامل کرنے ہیں۔ وہ شخص نیائش سے پہلے بول پڑا۔ گولی اور پانی میری طرف سے۔ نیائش اور میں حیران ہوئے۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں۔ نیائش نے اصرار کیا لیکن اس نے گولی اور پانی کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

نیائش اس شخص کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ واریزے ریلوے سٹیشن کا راستہ سٹیشن کے بالکل قریب ہے۔ اس نے کہا یہاں سے اُلٹے ہاتھ جو راستہ جاتا ہے اس پہ سیدھے چلتے چلے جاؤ۔ یہ سڑک سٹیشن پہ جا کے ہی رکتی ہے۔ ہم لوگوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ نیائش کہنے لگا، "ابتدا تو بہت اچھی ہوئی ہے اب آگے دیکھو کیا ہوتا۔"

پانچ منٹ کے سفر کے بعد ہم واریزے ریلوے سٹیشن کے سامنے کھڑے تھے۔ گاڑی سے باہر آ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ نیائش نے بے چینی میں متعلقہ شخص کو موبائل پہ فون کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ سٹیشن سے ملحق بار میں کافی پی رہا ہے۔ اس نے کہا جب تم لوگوں کا فون آیا، میں اس وقت ناشتہ کر رہا تھا۔ ناشتہ چھوڑ کے تم لوگوں کو لینے آیا ہوں۔ ہم لوگ جلدی سے بار میں پہنچے۔ اس نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم سے کافی کا پوچھا تو ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم راستے میں پی کر آئے ہیں۔ اس نے جیسے ہی کافی ختم کی، کہنے لگا "تم لوگ گاڑی میں میرے پیچھے

پیچھے آؤ۔ یہاں پاس ہی گاؤں ہے وہاں ہم لوگوں کا ڈیرا ہے۔"

تابش نے کہا "جیسے آپ کا حکم۔"

وہ ہماری گاڑی کو "اسکارٹ" کرتے ہوئے مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک ایسی سڑک پہ مڑ گیا جہاں دونوں اطراف میں کھیت ہی کھیت تھے۔ جون کا مہینہ شروع ہوا تھا۔ موسم بہار جوبن پر تھا اور کھیت سرسبز تھے۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ کس چیز کی فصل تھی کیونکہ اس وقت میں کسی اور ہی خیال میں گم تھا۔ کھیتوں سے گزرتے گزرتے ہماری گاڑی ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اکا دُکا مکان تھے۔ پھر طرز جدید کے نو تعمیر شدہ مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دو گلیاں گھوم کے بڑے سے صحن میں گاڑیاں روک دی گئیں۔ اطالین اسی طرح کی جگہ کو کورتلیو کہتے ہیں۔ مجھے یہ جگہ چال کی طرح لگی۔ جن لوگوں نے انڈین فلمیں دیکھی ہیں، انہوں نے بارہا ان کی فلموں میں چال دیکھی ہوگی۔ بمبئی جس کا نام بدل کر ممبئی رکھ دیا گیا ہے وہاں اس طرح کئی چالیں ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا یہ جگہ بہت صاف ستھری تھی۔ ایک راستہ تو وہ تھا جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ باقی اطراف میں ایک جیسی دو منزلہ عمارات تھیں۔ گراؤنڈ فلور پہ بھی گھر تھے جب کہ دوسری منزل کے گھروں کے سامنے کاریڈور بنا ہوا تھا، اگر آپ ایک کونے سے سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر جائیں تو سارے گھروں کے سامنے سے گزر کے دوسرے کونے والی سیڑھیوں سے اُتر سکتے ہیں۔ اس کے بڑے سے صحن میں بہت ساری پلاسٹک کی تاریں بندھی ہوئی تھیں، ان تاروں پہ لوگوں کے کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے ہلکی ہلکی ہوا کی وجہ سے لہرا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ فرشتہ کو اس کی آمد پہ خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔

ہم لوگ گاڑی سے نکلے۔ وہ شخص ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے ہمیں اس چال نما عمارت کی حدود میں لے گیا۔ ایک کونے میں سیڑھیاں تھیں۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پہ پہنچ گئے۔ اس عمارت میں سارے گھروں کے دروازے ایک جیسے تھے لیکن پاکستانیوں کے گھر کا ایک لمحے میں پتا چل گیا کیونکہ اس کے باہر بیشمار جوتوں کے جوڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں برامدے میں جو کپڑے سکھانے کے لیے تار لگی ہوئی تھی اس پہ شلواریں اور قمیصیں لہرا رہی تھیں۔ ایک شخص شلوار کے اوپر رنگین بنیان پہنے گھر کے باہر پڑے استری سٹینڈ پہ کپڑا استری کر رہا تھا۔ جو شخص ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا "بھئی میں مہمانوں کو لے آیا ہوں۔ اور اب

ان کو آپ کے پاس چھوڑ کے جا رہا ہوں مغل صاحب سے کہنا ان کا خیال رکھیں۔"

اس شخص نے جواب دیا "آپ فکر ہی نہ کریں۔ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بازار گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کو اندر لے کر جاتا ہوں۔ یہاں دو اور لوگ بھی ہیں جنہیں سوئٹزر لینڈ ہے۔"

ان دونوں میں مختصری گفتگو ہوئی اور وہ شخص جو ہمیں یہاں تک لایا تھا چلا گیا، شاید اس نے واریزے ریلوے سٹیشن سے کسی اور کو لانا ہو۔ یہ شخص جو شلوار اور رنگین بنیان میں ملبوس تھا ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ ہم جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئے ہمیں ایک عجیب طرح کی باس آنے لگی۔ پہلے میں نے سوچا شاید میرا وہم ہے لیکن نیائش نے میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے شکل بنائی اور کہنے لگا "مجھے یہاں کچھ ناگواری بو محسوس ہو رہی ہے کیا صرف مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے یا تم نے بھی محسوس کی ہے۔"

میں نے کہا: "ہاں مجھے بھی کچھ ایسا ہی احساس ہو رہا ہے۔"

رنگین بنیان پہنے ہوئے شخص نے کہا "آپ لوگ تشریف رکھیں، میں آپ لوگوں کے لیے چائے بناتا ہوں۔"

جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے بالکل اس کے سامنے ایک ڈائننگ ٹیبل اور اس کے اردگرد چھ کرسیاں پڑی تھیں۔ کھڑکی برامدے کے ساتھ تھی دیوار کے ساتھ ایک بڑا صوفہ پڑا ہوا تھا، سیاہ رنگ کا یہ چرمی صوفہ کافی قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ بھی ایک صوفہ پڑا ہوا تھا جس پر تین نفوس کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ان دونوں صوفوں کے سامنے ایک میز پڑی تھی۔ جس پہ ایک دو اردو اخبار اہتمام سے رکھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس ساتھ ساتھ دو راکھ دانیاں تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایش ٹریز تھیں۔ جو پیلے پیلے فلٹرز اور ادھ جلے سگرٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دونوں صوفوں کے درمیانی کونے میں ایک چھوٹی سی میز تھی جس پہ ریموٹ کنٹرول پڑے ہوئے تھے۔ میں اور نیائش کھڑکی کے ساتھ والے صوفے پہ بیٹھ گئے ایک طرف ایک ٹرالی پہ ٹی وی اور اس کے نیچے رسیور پڑا ہوا تھا۔ ٹی وی سکرین پہ کوئی گانوں کا چینل چل رہا تھا۔ میری آنکھیں تو ٹی وی دیکھ رہی تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ چند منٹ میں رنگین بنیان میں ملبوس شخص ہمارے لیے کانچ کے گلاسوں میں چائے لے آیا۔ چائے کا رنگ بتا رہا تھا کہ رنگین بنیان والے شخص نے کم پتی اور دودھ زیادہ کے فارمولے کو استعمال کیا ہے۔ ہم نے چائے جیسے تیسے حلق سے نیچے اُتاری کہ کسی نے دروازہ

کھولا۔ایک بھاری بھرکم شخص کمرے میں داخل ہوا۔اس کے ساتھ درمیانے قد کا آدمی بھی تھا۔دونوں کمرے میں داخلے کی وقت قہقہے لگا رہے تھے۔رنگین بنیان والا شخص اس بھاری بھرکم ڈیل ڈول والے سے مخاطب ہوا''مغل صاحب یہ دو بندے اریزو سے آپ کو ملنے آئے ہیں۔میں نے انہیں چائے وغیرہ پلا دی ہے۔''

وہ شخص جس کو اس نے مغل صاحب کہہ کر مخاطب کیا تھا نہ صرف بھاری بھرکم تھا بلکہ اس کی آواز بھی بہت بھاری تھی۔اس نے کہا''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔''پھر نیائش سے مخاطب ہوا''نیائش صاحب گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو پیش نہیں آئی۔''

نیائش نے نہایت مہذب انداز میں کہا''جی بالکل نہیں۔آپ کا بندہ ہمیں واریزے ریلوے سٹیشن سے راستہ دکھاتا ہوا یہاں تک لایا ہے۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہوا''جناب کی تعریف۔''

نیائش نے جواب دیا''یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں،یوں جانئے کہ بھائی ہیں۔میں نے انہیں بہت روکا ہے کہ سوئٹزرلینڈ نہ جاؤ لیکن یہ وہاں جانے پہ مصر ہیں۔''

مغل صاحب نے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے:''کیا نام ہے آپ کا۔''

میں نے کہا''جی فرشتہ۔''

وہ مسکرایا اور بڑے خوشگوار موڈ میں بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتوں کو بھی بارڈر پار جانے کے لیے ہم جیسے پاپیوں کی مدد درکار ہے۔''

''تو فرشتہ صاحب!آپ سوئٹزرلینڈ جانا چاہتے ہیں۔میری تو رائے ہے یہیں رُک جائیں۔آپ کو کام پہ لگوا دیں گے۔آپ کو اطالین زبان آتی ہے؟''

میں نے کہا''جی بس گزارا کر لیتا ہوں۔''

نیائش کو میرا کسرِ نفسی سے کام لینا شاید پسند نہ آیا اور وہ فوراً بولا''جی گزارا نہیں کرتا بلکہ اچھی خاصی بول لیتا ہے۔اس کے علاوہ فرنچ اور انگریزی بھی جانتا ہے۔نہ جانے اس کے دماغ میں کیا بات سما گئی ہے۔کہتا ہے بس سوئٹزرلینڈ جانا ہے۔''

''نیائش صاحب ان کی مرضی۔''

میں نے پوچھا "مغل صاحب کیا میں آج ہی چلا جاؤں گا یا کچھ وقت لگے۔"

تو اس نے جواب دیا "فرشتہ صاحب ہمیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔ ایک دو دن رکیں۔ آپ کو میلانو کی سیر کروائیں گے۔ اس کے بعد آپ کو سوئس چھوڑ آئیں گے، ایسی بھی کیا جلدی۔"

ہم لوگ ابھی اس لگی لپٹی اور مصنوعیت بھری آپ جناب کی گفتگو میں محو تھے کہ ساتھ والے کمرے سے ایک شخص آنکھیں مسلتا ہوا نمودار ہوا۔ نہ کسی کو سلام، نہ آداب۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آ کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ جیسے ہی بیٹھا، اس نے کونے پہ رکھی میز پر سے دو میں سے ایک ریموٹ کنٹرول اُٹھایا اور سیور کے چینل گھمانے لگا۔ مغل صاحب نے گرجدار آواز میں کہا "اوئے کوچوان کہیں روک بھی دے۔"

اس نے بات سنی ان سنی کر دی اور اپنے کام میں مگن رہا۔ مغل صاحب ایک دفعہ پھر اس سے مخاطب ہوئے "اوئے کوچوان آج تو کام پہ نہیں گیا۔"

اس کا منہ ٹی وی کی طرف تھا، اس نے مغل صاحب کی طرف بنا دیکھے ہی جواب دیا "مغل صاحب آج مالک کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے اس نے فون پر کہہ دیا تھا کہ آج مت آنا۔"

مغل صاحب کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مغل صاحب کہیں باہر جا رہے ہیں۔ ہم دونوں سے اجازت لے کر مغل صاحب باہر چلے گئے اور ساتھ اس بات کی بھی تسلی دے گئے کہ جلد واپس آ جائیں گے۔

جو شخص ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا مجھ سے مخاطب ہوا "جناب کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟"

میں نے کہا "جی راولپنڈی سے۔"

راولپنڈی کے نام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہنے لگا "جی میں بھی پنڈی وال ہوں۔"

میں نے پوچھا "پاکستان میں آپ کیا کرتے تھے۔"

اس نے جواب دیا "جی میں تانگہ چلاتا تھا۔"

اب مجھے سمجھ آئی کہ مغل صاحب اسے کوچوان کیوں کہہ رہے تھے۔

میں نے دوسرا سوال کیا "یہاں کب سے رہ رہے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔"

اس نے بڑے جوش سے جواب دیا "جی میں سپین سے آیا ہوں۔ سنا ہے اٹلی کی امیگریشن کھلنے والی ہے۔ یہاں پہ ایک فیکٹری میں موٹر وائینڈنگ کا کام مل گیا ہے۔ بڑی اچھی دیہاڑی مل جاتی

ہے۔ پاکستان میں تانگہ چلاتا تھا وہاں بھی اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ پھر تانگہ بیچ دیا۔ سوچا سوزوکی لے لوں لیکن کمپنی والوں نے روٹ پرمٹ ہی نہیں دیا۔ اُدھر ایک ٹھیکے دار تھا جو رشوت لے کے روٹ پرمٹ دلواتا تھا۔ مگر میں ادھر اُدھر سے پیسے اکٹھے کیے۔ ڈنکیاں لگاتا لگاتا یورپ آ گیا۔"

پھر مجھ سے پوچھنے لگا" آپ کیا کام کرتے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا" میں کوئی کام نہیں کرتا اور اریزو سے آیا ہوں۔"

اس دوران میں دو اور اشخاص وارد ہوئے۔ آپ انہیں نوجوان کہہ سکتے ہیں کیونکہ دونوں کی عمر لگ بھگ بیس سے چوبیس کے درمیان تھی۔ وہ آ کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ وہ شخص جسے مغل صاحب نے کوچوان کے لقب سے نوازا تھا۔ ان سے مخاطب ہوا" ہاں بھئی جوانوں نیند پوری ہو گئی۔"

انہوں نے کورس کے سے انداز میں یا یوں کہیے کہ یک زبان ہو کر جواب دیا" جی بہت اچھی نیند آئی ہے۔"

میں نے پوچھا" یہ لوگ کدھر سے آئے ہیں۔"

کوچوان کہنے لگا (میں اس کا نام نہیں جانتا اس لیے میں اُسے کوچوان ہی لکھوں گا)" یہ مغل صاحب کے مہمان ہیں۔ انہوں نے چلین جانا ہے۔"

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کیا مغل صاحب کا یہی کاروبار ہے۔ یا کچھ اور بھی کرتے ہوں گے؟ کمرے کی فضا عجیب سی ہو گئی۔ میں اور نیائش کوچوان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے کہ اب یہ دو نئے مہمان وارد ہو گئے تھے۔

ان دو لڑکوں میں سے ایک نے ریموٹ کنٹرول اُٹھایا اور چینل بدلنے لگا۔ آخر کار B4U پہ جا کے روک دیا۔ یہ انڈین سیٹلائٹ چینل ہے جو کہ یہاں ڈش انٹینا کی مدد سے نظر آتا ہے۔ اس پہ زیادہ تر انڈین فلموں کے نئے اور پرانے گانے دکھائے جاتے ہیں۔ جس کے کئی سیگمنٹ ہوتے ہیں۔ جیسے ہی یہ چینل لگا سب کی نظریں ٹی وی کی طرف ہو گئیں۔

کوچوان بولا" یہ چینل کیسے آتا ہے۔ مجھے تو مغل صاحب نے بتایا تھا کہ اس چینل کو دیکھنے کے لیے پیسے دینے پڑتے ہیں۔"

دونوں لڑکوں میں سے ایک بولا" یہ کبھی کبھی ایسے ہی آ جاتا ہے۔"

میں نے ان کی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ یہ چینل بالکل مفت ہے۔ اس کو دیکھنے کے کوئی پیسے نہیں دینے پڑتے۔"

نیائش نے مجھے آہستگی سے کہا "تمہیں کیا ضرورت ہے انہیں بتانے کی۔ انہیں مغل صاحب نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایسا کہہ رکھا ہوگا تاکہ یہ ہر وقت یہی چینل دیکھنے پر اصرار نہ کریں، بعض لوگ اس قسم کے چینلز دیکھنے کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ دوسروں کی پسند ناپسند کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔"

میں نے نیائش کی بات کی تائید کی اور کوچوان سے مخاطب ہوا "جناب۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا ہوگا کہ نیائش نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستگی سے کہا "یار ان کو نہ بتانا جو میں کہہ رہا تھا۔" میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا "نیائش بھائی آپ فکر نہ کریں میں واش روم کا پوچھنے لگا ہوں۔" تو اس نے کہا "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔"

کوچوان نے کہا "آپ کچھ پوچھنے لگے تھے۔"

"میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ واش روم کدھر ہے۔"

وہ میری شکل یوں دیکھنے لگا، جیسے اُسے "واش روم" کا مطلب نہ آتا ہو۔ میں نے وضاحت کے لیے کہا "مجھے پیشاب آیا ہے۔"

تو کہنے لگا "بالکل کونے میں ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

میں اُٹھا اور اس کے اشارے کی رہنمائی میں چلتا چلا گیا۔ یہ ایک تنگ گلی نما کاریڈور تھا۔ پہلے ایک کمرا آیا، جس میں دونوں اطراف میں ایک ایک چار پائی بچھی ہوئی تھی جسے آج کل بیڈ کہتے ہیں۔ جن کے اوپر کمبل اور تکیے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا اس کی بھی حالت ایسی ہی تھی۔ آخری کمرہ اور واش روم ساتھ ساتھ تھے۔ آخری کمرے کا دروازہ بند تھا جس کے اطراف میں پلاسٹک شیٹ کا پردہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف واش بیسن مع آئینے کے موجود تھا اور اس کے آگے لگے ہوئے سٹینڈ پہ بے شمار کریمیں، ٹوتھ برشز اور ٹوتھ پیسٹ کی کچھ خالی اور بھری ہوئی ٹیوبز پڑی تھی۔ میں نے اس معائنے کو ملتوی کیا اور واش روم سے باہر آ گیا واپسی پر بھی راستے میں آنے والے کمروں پہ اچٹتی نظر ڈالتا آیا۔ اور واپس آ کر اسی چمڑے کے صوفے پہ بیٹھ گیا جو بظاہر بڑا قیمتی دکھائی دیتا تھا۔

نیائش کہنے لگا "یار یہ مغل صاحب جانے کہاں رہ گئے ہیں۔"

اس نے کوچوان سے پوچھا "یار پتا تو کرو مغل صاحب کہاں ہیں۔"

اس نے جواب دیا "بس جی آتے ہی ہوں گے۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا۔ مغل صاحب ایک اور شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

آتے ہی کہنے لگے "معاف کیجئے گا مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔ میں آپ لوگوں کے لیے ہی گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلایا اور کہا "آئیں باہر چلتے ہیں وہاں جا کے بات کرتے ہیں۔"

ہم فوراً ان کے ساتھ ہو لیے ویسے بھی یہاں بیٹھے بیٹھے ہم اُکتا گئے تھے۔ ہم لوگ سیڑھیاں اُتر کے نیچے کھلی فضا میں آ گئے۔ جہاں اطراف میں مکینوں کے دُھلے ہوئے کپڑے چمکتی دھوپ میں لہرا رہے تھے۔ ادھر ایک عدد ٹرک اور اس کے پاس ایک کار کھڑی تھی۔ کار کے پاس جا کے مغل صاحب بولے "یہ میرے دوست ہیں جعفر صاحب۔ ہم دونوں آپ کو سوئٹزرلینڈ چھوڑ کے آئیں گے۔ میرا دل تو چاہتا تھا آپ لوگ ایک دو دن رکتے لیکن جعفر صاحب کہتے ہیں کہ آج ہی چلتے ہیں کیونکہ اگلے اتوار کو یہ فارغ نہیں ہوں گے۔"

میں نے پوچھا "تو کیا ابھی جانا ہوگا۔"

مغل صاحب نے جواب دیا "ارے جناب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد چائے پئیں گے۔ ابھی تو ایک بجا ہے۔ ہم لوگ قریباً چار بجے نکلیں گے۔"

نیائش نے کہا "مجھے تو واپس جانا ہوگا کیونکہ سوموار میرا ورکنگ ڈے ہے۔"

"نیائش بھائی آپ کو کس بات کی پریشانی ہے۔ ہمارے پاس رکیں۔ اپنے آجر کو فون پر اطلاع کر دیں کہ طبیعت ناساز ہے۔"

"مغل صاحب میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"چلیں جیسے آپ کی مرضی، میں نے تو مشورہ دیا تھا۔"

پھر وہ نیائش اور مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا "آپ مجھے دو سو یورو دے دیں۔ میں نے اپنے دوست کو دینے ہیں۔ وہ یہ کام رضاکارانہ طور پر نہیں کرے گا۔۔۔ کیونکہ وہ پروفیشنل ہے۔"

میں نے کہا "پیسے فی الوقت تو نہیں البتہ منزل پہ پہنچتے ہی دست بستہ پیش کر دوں گا۔"

تو کہنے لگا "جیسے آپ کی مرضی، پھر نجانے اُسے کیا خیال آیا کہ نیائش سے مخاطب ہوتے

ہوئے بولا" ایسا کیجئے گا نیائش صاحب۔ میرا ایک بھانجا اریزو میں ہوتا ہے آپ اسے پیسے دے دیجئے گا، اس کو میں اپنی جیب سے دے دیتا ہوں۔"

نیائش نے کہا" اگر آپ اس طرح مطمئن ہیں تو تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں حاضر ہوں۔۔۔"

اس کے بعد ہم میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم لوگ واپس اسی گھر میں آ گئے جہاں ہم پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوچوان اور دوسرے دولڑکے ابھی تک بیٹھے B4U چینل دیکھ رہے تھے۔ اس دوران دولڑکوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

مغل صاحب نے با آواز بلند کہا" چلو اوئے کوئی اور چینل لگاؤ۔ ہاں کھانا کون پکائے گا۔ ایسا کرو، فرج سے گوشت نکالو اور اچھا سا دال گوشت بناؤ اور ہاں برکت ضرور ڈالنا کیونکہ بندے زیادہ ہیں۔"

دولڑکے جو نئے آئے تھے وہ دونوں اٹھے۔ ان میں سے ایک آٹا گوندھنے لگا اور دوسرا کھانا بنانے کے لیے پیاز اور ٹماٹر کاٹنے لگا۔ مغل صاحب آ کے چمڑے کے صوفے پہ بیٹھ گئے اور نیائش سے مخاطب ہوئے" نیائش صاحب، وہاں اریزو میں کام کے کیسے حالات ہیں۔"

" کیا بتائیں جب سے 9/11 کا واقعہ ہوا ہے یوں لگتا ہے جیسے اس کا سب سے زیادہ اثر اریزو پر پڑا ہو۔ کام بہت کم ہو گیا ہے ایسا لگتا ہے اریزو شہر ایک دم غریب ہو گیا ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا اریزو میں بیشمار سونے چاندی کی فیکٹریاں تھیں۔ اب بہت کم رہ گئی ہیں۔ ان سب فیکٹریوں کا مال امریکہ جاتا تھا۔ جب کہ امریکن منڈی میں مندی کا رجحان ہے۔"

" یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

باتوں باتوں میں ہمیں پتا نہ چلا کہ تین بج چکے ہیں لڑکے جب کھانا پکا چکے تو انہوں نے روٹیاں پکانی شروع کر دی۔ اس لیے کھانا پیش کرنے میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی۔ انہوں نے قریباً تمیں روٹیاں پکائی ہوں گی۔ جیسے ہی وہ کھانے کی میز پہ تمام چیزیں سجا چکے، انہوں نے با آواز بلند کہا " آئیں جناب کھانا لگ گیا۔ ہم سارے اُٹھے اور ایک ایک کرسی پہ براجمان ہو گئے۔ جن کو کھانے کی میز پہ جگہ نہ ملی وہ ایک پلیٹ میں سالن ڈال کر اور دوسری پلیٹ میں روٹیاں رکھ کے ایک طرف ہو گئے۔ کھانے کی میز کے بالکل درمیان سالن سے بھرا دیگچہ پڑا ہوا تھا۔ سب نے یکے بعد دیگرے

سالن اپنی اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ میں نے جیسے ہی پہلا نوالہ لیا، جھٹ سے پانی کا بھرا گلاس غٹا غٹ پینا پڑا کیونکہ سالن میں نہ صرف مرچ زیادہ تھی بلکہ مصالحہ جات بھی قدرے زیادہ تھے لیکن سالن چٹخارے دار تھا۔ جیسے ہی کھانے سے فارغ ہوئے مغل صاحب نے چائے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ چند لمحوں میں چائے بھی میز پر حاضر تھی۔

مغل صاحب ایک دفعہ گرجدار آواز میں بولے" جوانو! برتن دھو دینا اور اس کے بعد گھر کی صفائی بھی کر دینا کیونکہ گھر بہت گندا لگ رہا ہے۔" اس کے بعد ہم سے مخاطب ہوئے" آئیں جی نیائش صاحب باہر کھلی فضا میں جا کر کھڑے ہوتے ہیں۔" اس طرح میں، نیائش، جعفر اور مغل صاحب نیچے کھلی فضا میں آ گئے۔

نیائش نے کہا" مغل صاحب اب اگر مجھے روانگی کی اجازت دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں اپنے دوست کو آپ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔"

مغل صاحب نے کہا" جناب آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری میں ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کو بہت جلد" اریز" ان کی فون کال موصول ہوگی۔ یہ خود اپنی" سوئس پہنچ" سے آپ کو انفارم کریں گے۔ اگر خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو گیا تو یہ جہاں بھی ہوں گے میں انہیں واپس واریزے اپنے گھر لے آؤں گا۔ میرا ان سے مسلسل رابطہ رہے گا۔

نیائش نے کہا" یقیناً ایسا ہی ہوگا، مجھے آپ پہ پورا بھروسہ ہے۔"

اتنا کہہ کر نیائش مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا" فرشتہ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا لیکن اٹلی میں اپنے طویل قیام کے تجربے کے بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں جن دنوں کام والی جگہوں پہ چھاپے وغیرہ زیادہ پڑتے ہیں ان دنوں امیگریشن کھلنے کے کافی امکانات ہوتے ہیں۔"

" نیائش بھائی میرا وعدہ رہا، جیسے ہی امیگریشن کھلے گی میں واپس آ جاؤں گا۔"

میں نے نیائش کو اپنے ضروری کاغذات، ایک چھوٹی سی ڈائری۔۔۔ جس پہ ٹیلی فون نمبر وغیرہ تحریر تھے دیئے۔ وہ کہنے لگا موبائل فون بھی چھوڑ جانا مناسب ہوگا، لیکن میں نے جملہ کاغذات کے ساتھ اسے موبائل فون نہ دیا کہ دوران سفر مجھے اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ الوداعی گفتگو کے بعد نیائش نے مجھے گلے لگایا اور اللہ حافظ کہہ کر مغل صاحب کے پاس چلا گیا۔ ان دونوں میں جو بات چیت ہوئی وہ میں نہ سن سکا۔ پھر وہ جا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور ہاتھ ہلاتا ہوا اس

برامدہ نما جگہ، جہاں تاروں پہ لوگوں کے کپڑے سوکھنے کے لیے چمکیلی دھوپ میں لہرا رہے تھے، سے نکلا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ واپس جاتا ہوا نیائش مجھے کچھ اندیشوں میں گھرا محسوس ہوا تھا۔ میرے حوالے سے اس کی تشویش اس وقت تک رفع نہ ہوتی جب تک کہ میں منزلِ مقصود پہ پہنچ کر اسے اطلاع نہ کر دیتا۔ اس کی یہ تشویش بجا بھی تھی۔ کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ:

؎ طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

نیائش کی روانگی کے بعد مجھے، جعفر اور مغل صاحب کو بھی بذریعہ کار سوئس کے سفر پر رواں دواں ہونا تھا، سو وہ لمحہ بھی آ پہنچا۔ جعفر کہنے لگا "فرشتہ صاحب آپ اگلی سیٹ پہ آ جائیں۔" میں نے دروازہ کھولا اور حسبِ ہدایت اگلی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ مغل صاحب نے سنبھال لی۔

جیسے ہی گاڑی سٹارٹ ہوئی، میں نے تاروں پہ سوکھنے کے لیے ٹنگے ہوئے رنگ برنگے کپڑوں پہ آخری نظر ڈالی۔ ہماری کار دوبارہ انہیں کھیتوں کے پاس سے گزری اور ایک دو ذیلی راستوں سے ہوتی ہوئی مین روڈ پہ آ گئی۔

جعفر مجھ سے مخاطب ہوا "فرشتہ صاحب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سوئس جا کر چپکے سے سیاسی پناہ لے لینا۔ میرا مشورہ ہے کہ سوئس کے آخری کونے پہ قیام آپ کے لیے سودمند ہو گا۔ میں سوئس رہ کر آیا ہوں۔ وہاں حکومتی سطح پر تارکینِ وطن کو کافی مراعات دی جاتی ہیں۔

میں نے کہا "تو پھر آپ وہاں سے اٹلی کیوں آ گئے۔"

"بس کیا بتاؤں۔ جس لڑکی سے شادی کی تھی، اس سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے شکایت کر دی۔ ایک تو اس جھنجھٹ سے جان چھڑانا مقصود تھا، دوسرا اس دوران میں اٹلی کی امیگریشن کھلی تو سوچا کہ اپلائی کیا جائے۔

"اس کے بعد کبھی جانا ہوا۔"

"کیوں نہیں اکثر جاتا رہتا ہوں۔"

مجھے کہاں تک چھوڑ کر آئیں گے۔"

"آپ ٹینشن نہ لیں آپ کو سوئس حدود کے اندر پہنچا کے آئیں گے۔ تاہم آپ ایسا کیجئے گا کہ جب ہم لوگ کومو (Como) سے کیاسو (Chaisso) پہنچیں۔ آپ وہاں سے لوگانو

(Logano) کا ٹکٹ لینا۔ اس کے بعد آپ کو کرائس لنگن (Kreuzlingen) پہنچنا ہوگا۔ ویسے تو سوئس میں سیاسی پناہ پانے کے چار بڑے سینٹرز ہیں لیکن کرائس لنگن (Kreuzlingen) اس لیے قابلِ ترجیح ہے کہ یہ جرمن بارڈر سے زیادہ قریب ہے۔ اگر آپ نے لوگانو (Logano) سینٹر میں درخواست دی تو ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کو اٹلی واپس بھیج دیں اور اگر نہ بھی بھیجیں تب بھی آپ کے لیے ایک مسئلہ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر کبھی امیگریشن کھلی اور آپ کا اٹلی واپس آنے کو دل چاہا تو اس صورت میں آپ یہ موقع کھو دیں گے۔"

"یقین رکھیے جعفر صاحب جیسا آپ فرما رہے ہیں میں ویسا ہی کروں گا۔ بس مجھے اس شہر کا نام کسی چٹ پر لکھ دیں تاکہ جب میں ٹکٹ لوں تو مجھے یاد رہے۔"

پیچھے سے مغل صاحب کی آواز آئی "جعفر باقی باتیں سٹیشن پہ سمجھا دینا۔" غالباً مغل صاحب کو دورانِ سفر گفتگو زیادہ پسند نہیں تھی۔ جعفر نے آواز لگائی "ٹھیک ہے مغل صاحب۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ گاڑی اچانک ایک بہت ہی خوبصورت شاہراہ پہ چلنے لگی۔ شاہراہ گری کی وجہ سے زیادہ ہی سیاہی مائل دکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں اطراف چیڑ کے گھنے درخت تھے۔ جو سڑک پہ بالکل ایسے جھکے ہوئے تھے جیسے یہ خود پر آنے والے راہروؤں کو سلامی پیش کر رہے ہوں۔ اس منظر نے مجھے اس زمانے کی یاد دلا دی جب میں ٹورسٹ گائیڈ تھا مجھے یاد آیا کہ سوات کے راستے میں شنگر دار سٹوپا کے پاس اس طرح کی ایک سڑک آتی تھی اور جب بھی میرا پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اس طرف آنا ہوتا مجھے اس کا شدت سے انتظار رہتا۔ یہ راستہ میرا من پسند تھا۔ سڑک کے دونوں طرف درخت ایسے جھکے ہوتے جیسے سڑک کو آئینہ سمجھ کر اس میں اپنی شباہت تلاش کر رہے ہوں۔ یہ منظر زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہ دے سکا اور ہم اس شاہراہ سے نکل کے ایک چہار رویہ رہگزار پر نکل آئے۔ دو اطراف سے گاڑیاں جا اور دو اطراف سے آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں کومو (Como) ریلوے سٹیشن کا ماتھا نظر آیا، جس پہ جلی حروف میں کومو (Como) لکھا ہوا تھا۔ جعفر نے پارکنگ میں جا کے گاڑی کھڑی کی، گاڑی سے نکلا اور پارکنگ مشین سے پارکنگ ٹکٹ نکال کے اُسے گاڑی کی فرنٹ سکرین پہ لگا دیا۔ اس کے بعد میں اور مغل صاحب بھی گاڑی سے نکلے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے سٹیشن میں داخل ہوئے۔

جعفر کہنے لگا "میں جا کر ٹکٹ لے آتا ہوں۔"

مغل صاحب نے پیچھے سے آواز دی "ایک ہی ٹکٹ لانا۔ ہم لوگ تو واپس آ جائیں گے۔ ویسے بھی لوکل ٹرین پہ کون چیک کرتا ہے۔"

چند لمحوں میں جعفر ٹکٹ لے کر آ گیا۔ کہنے لگا: "ہم لوگ آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ سیٹ پہ بیٹھ جانا اور ہم دونوں بظاہر اجنبی بن کر ٹرین میں چکر لگاتے رہیں گے۔ اگر پولیس وغیرہ کسی مداخلت کا اندیشہ ہوا تو ہم آپ کو اشارہ کر دیں گے، جہاں ہم اُتریں آپ بھی ساتھ ہی اُتر جانا۔ بصورت دیگر ہم کیاسو (Chiasso) ہی اُتریں گے۔"

میں نے کہا "او۔کے، میں سمجھ گیا۔ آپ کی ہدایت پر عمل ہوگا۔"

ہم لوگ ریلوے سٹیشن پہ آتے جاتے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں جعفر نے اشارہ کیا کہ ہماری ٹرین فلاں پلیٹ فارم پہ آ گئی ہے۔ ہم لوگ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے مطلوبہ پلیٹ فارم پہ پہنچے۔ ٹرین میں سوار ہوتے ہی جعفر نے ایک دفعہ پھر تاکید کی کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لوکل ٹرین تھوڑی دیر میں کیاسو (Chiasso) ریلوے سٹیشن پہ ہوگی۔ ٹرین ایک جھٹکے سے چلی۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔ جعفر اور مغل صاحب پہلے تو کچھ دیر کھڑے رہے پھر ٹرین کے مختلف ڈبوں میں ٹہلتے ہوئے چکر لگانے لگے۔ آتے جاتے مجھے اشارہ کر جاتے کہ سب ٹھیک ہے۔ جیسے جیسے ٹرین کومو سے دور ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے باہر کے مناظر بدل رہے تھے۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ جون کے مہینے میں دن ویسے بھی لمبے ہوتے ہیں اس لیے باہر کافی روشنی تھی۔ سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بمشکل پندرہ یا بیس منٹ گزرے ہوں گے۔ میں نے کیاسو (Chaisso) کا بورڈ پڑھا۔ اس دوران میرے سامنے سے ایک ٹرین گزری جس پہ کئی زبانوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ مجھے جعفر کی آواز سنائی دی "فرشتہ صاحب تیار ہو جائیں سوئس کا پہلا شہر کیا آ گیا ہے۔ جیسے ہی ٹرین رکے گی آپ نے ہمارے پیچھے پیچھے آنا ہے۔ جس راستے سے میں نکل کے جاؤں گا وہیں سے آپ نے بھی نکلنا ہے۔"

جیسے ہی ٹرین رکی میں جعفر اور مغل صاحب کے پیچھے ہو لیا۔ ہم تینوں ایک سرنگ نما جگہ سے گزر کے باہر آ گئے۔ جس سُرنگ سے نکل کے ہم آئے تھے اس کے بالکل مخالف سمت میں ایک اور سُرنگ تھی جو کہ دوسری طرف جا رہی تھی۔ ایک راستہ ایسے مسافروں کے لیے مختص تھا جو سوئس سے واپس اٹلی آ رہے تھے اور دوسرا راستہ جس سے ہم گزر کر آئے تھے وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو

اٹلی سے سوئس جا رہے تھے۔ ہم تینوں کیا سو ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑے تھے۔ سٹیشن کے ایک کونے میں ٹیلی فون کیبن بنے ہوئے تھے۔ مجھے مغل صاحب کہنے لگے "فرشتہ جی نیائش صاحب کو بتا دیں کہ آپ سوئس پہنچ چکے ہیں۔" میں جلدی سے کیبن کی طرف گیا لیکن اس ٹیلی فون بوتھ میں یورپین یونین کے سکے نہیں چلتے تھے مجھے جعفر نے ایک سوئس سکہ دیا اور کہا "یہاں یہ چلے گا۔" میں نے اس سے سکے موبائل نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی" کی اے۔" اس نے اٹالین میں غالباً اس لیے پوچھا تھا کہ کون ہے کیونکہ میرا نمبر اس کے موبائل پر نہیں آیا ہوگا۔ میں نے جواب دیا" نیائش بھائی فرشتہ بول رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں سوئس پہنچ گیا ہوں۔ اس شہر کا نام کیا سو ہے۔ یہاں سے میں آگے جاؤں گا۔ منزل پہ پہنچ کے آپ کو دوبارہ فون کروں گا۔ اللہ حافظ۔"

نیائش نے بھی اللہ حافظ کہا تو میں فون بند کر دیا۔

فون بوتھ سے باہر نکلا تو مغل صاحب کہنے لگے" وہاں خیر خیریت سے پہنچ کے اطلاع دے دینا اور ہاں نیائش صاحب کو پیسوں کی ادائیگی کی تاکید بھی کر دینا۔"

میں نے کہا" مغل صاحب آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے واجبات آپ کو مل جائیں گے۔"

اس کے بعد جعفر اور مغل صاحب نے مجھ سے اجازت لی لیکن اچانک مغل صاحب کو کچھ یاد آیا اور مڑے" یہ پچاس یورو رکھ لیں مجھے نیائش صاحب جاتے ہوئے دے گئے تھے۔" میں نے خاموشی سے پیسے جیب میں رکھے اور مسکرا دیا۔ اب مجھے پتہ چلا نیائش کیوں مغل صاحب کو ایک طرف لے گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے خدا حافظ کہا اور واپس اٹلی چل دیئے۔ میں نے سوچا، کتنا آسان کام ہے۔ ٹرین میں دو تین چکر لگاؤ اور دو سو یورو کماؤ۔ جب تک میں میلانو نہیں آیا تھا یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے گاڑی میں لے کر جائیں گے لیکن یہ حقیقت مجھ پر بعد میں کھلی کہ مجھے ٹرین کے ذریعے جانا ہے۔ خیر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا اور اگلے سٹیشن کے لیے ٹکٹ خریدنے چلا گیا۔ جب میں کھڑکی پہ پہنچا جسے فرنچ" گیشے"، اطالوی" سپورتیلو" اور انگریز" ونڈو" کہتے ہیں تو میں کھڑکی کے اس طرف اور اندر کیبن میں بیٹھی ہوئی ایک سوئس خاتون دوسری طرف تھی۔ ہمارے درمیان شیشہ تھا اور اس شیشے میں ایک طرف ہتھیلی کے پھیلاؤ جتنا سوراخ تھا جہاں سے آپ مطلوبہ رقم دے کر اپنی منزل مقصود کا ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس خاتون کی عمر لگ بھگ چالیس یا پینتالیس سال ہوگی۔ چہرے مہرے سے جاذب نگاہ لگتی تھی۔ سنہرے بال، دونوں شانوں پہ لہرا رہے تھے۔ اس نے ہلکے

سے رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور گلے میں نیلی اور پیلی دھاریوں والا سکارف باندھ رکھا تھا۔ سکارف کی گرہ بڑے اہتمام سے لگائی گئی لگتی تھی۔ جون کے مہینے میں گرمی ہوتی ہے۔ ویسی تو نہیں جیسی پاکستان میں یا دیگر ایشیائی ممالک میں عموماً ان دنوں میں ہوتی ہے لیکن ایسا بھی موسم نہیں تھا کہ کوٹ نہ پہنا جا سکے۔ گہرے نیلے رنگ کا کوٹ غالباً اس کی یونیفارم کا حصہ تھا۔ اٹلی میں ریلوے ملازمین کا لباس اسکائی بلیو شرٹ، سبز ٹائی، سبز کوٹ اور کالی پتلون ہے۔ ریلوے ملازمین کی یونیفارم کی تبدیلی بتا رہی تھی کہ میں ایک نئے ملک میں ہوں۔ میں نے سوچا اس خاتون سے اٹالین میں بات کروں پھر خیال آیا کہ اس سے انگریزی میں بات کرتا ہوں۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ مجھے لوگانو (Logano) جانا ہے۔ اس لیے مجھے لوگانو (Logano) تک کا ٹکٹ دے دو۔ اس نے میری بتائی ہوئی منزل کا مجھے ٹکٹ بنا دیا۔ اور شیشے کا وہ حصہ جہاں ایک دائرہ سا بنا ہوا تھا وہاں سے ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پچاس یورو کا نوٹ تھما دیا۔ نوٹ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہنے لگی کہ میں تمہیں یورو نہیں دوں گی بلکہ تمہیں سوئس فرانک دوں گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ پچاس یورو کے نوٹ سے ٹکٹ کے پیسے لے کر اس نے مجھے باقی ماندہ رقم سوئس فرانک کی صورت میں واپس کر دی جو کہ نوٹوں اور سکوں کی صورت میں تھی۔ میں نے ٹرین کا ٹکٹ اور باقی رقم جیب میں ڈالی اور اُس پلیٹ فارم پہ جو 'لوگانو' جانے والی ٹرین کے لیے مخصوص تھا، جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اٹلی کی ٹرینوں میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کی لوکل اور ریجنل ٹرینوں کا برا حال ہے۔ البتہ انٹرسٹی اور ہائی سپیڈ ٹرینیں تھوڑی بہتر ہیں اس کے برعکس سوئس کی لوکل اور ریجنل ٹرینوں کا معیار کافی اچھا تھا۔ ایک دو ٹرینیں کھڑی تھیں۔ ان پہ چار مختلف زبانوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جرمن، فرنچ اور اٹالین تو مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھیں لیکن چوتھی زبان میرے پلے نہ پڑی۔ میں سوئس کے حوالے سے سوچنے لگا کہ یہاں کے بارے کیا مشہور ہے۔ سب سے پہلے تو میرے ذہن میں انڈین فلمیں آئیں جن کا پچھلے کچھ عرصہ سے یہ ٹرینڈ چلا آ رہا ہے کہ بنتی تو ہندوستان میں ہیں ان کے لیکن گانے زیادہ تر سوئٹزرلینڈ میں فلمائے جاتے ہیں۔ شاید ہندوستانیوں کے لیے خیالی اور تصوراتی جنت سوئس جیسی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سوئس گھڑیاں بھی پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ میں سوچنے لگا سوئس لوگ صرف گھڑیاں کیوں بناتے ہیں اور کچھ کیوں نہیں بناتے۔ پھر سوچنے لگا سیاحت سوئس کے لیے صنعت کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ لوگ اس کو پروموٹ بھی بہت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پوری دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں کی ناجائز

کمائی کے اکاؤنٹ بھی تو یہاں ہوتے ہیں۔ سوئس بینکنگ پوری دنیا میں قابلِ اعتماد بھی جاتی ہے۔ اسی لیے تو عربی شیخ اپنے تیل کی کمائی سوئس بینکوں میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ سود بھی نہیں لیتے۔ پھر مجھے فرنچ فلاسفر و لٹیغ (وولٹیر۔Voltaire) کا خیال آنے لگا۔ اس کا باپ گھڑیاں بناتا تھا۔ وولٹیر کے بارے میں اُن دنوں ہمیں فرنچ کلچرل سنٹر میں کافی کچھ بتایا گیا تھا۔ جن دنوں میں فرنچ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ فرنچ کلچرل سنٹر سے یاد آیا۔ میں نے وہاں چند یوم ماڈرن جیز ڈانس کی کلاسز بھی لی تھیں۔ ہمارے نوجوان ڈانس ٹیچر نے جب تعلیم مکمل کی تو اس کو فرانس کی حکومت نے دوسال آرمی میں گزارنے کو کہا۔ اگر وہ فوج میں دوسال نہیں گزارتا تو دوسری صورت میں اسے کسی دوسرے ملک میں دوسال گزارنے ہوتے۔ اس نے آرمی میں دوسال گزارنے کی بجائے دوسرے ملک جا کے فرنچ زبان سکھانے کو ترجیح دی۔ لہٰذا وہ پاکستان آ گیا۔ قانون کی رو سے اسے یہاں دوسال تک فرنچ کلچرل سنٹر میں غیر ملکیوں کو فرنچ پڑھانی تھی۔ وہ ہفتے میں پانچ دن فرنچ پڑھایا کرتا اس کے علاوہ وہ ماڈرن جیز ڈانس کا بھی استاد تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنی پریکٹس کیا کرتا اس کے ساتھ اس نے لوگوں کو ماڈرن جیز ڈانس بھی سکھانا شروع کر دیا۔ فرنچ کلاس کے بعد ہفتے میں دو دن وہ ڈانس بھی سکھایا کرتا۔ فیس اس نے بہت کم رکھی تا کہ زیادہ سے زیادہ سٹوڈنٹس آئیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ فرنچ کلچرل سنٹر میں ایک دو پاکستانی لڑکیوں نے اس کلاس میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ایک افغان لڑکی بھی آ گئی۔ پھر میں نے بھی یہ کلاس جوائن کر لی۔ مجھے وہ جو بھی سکھاتا میں گھر آ کر اس کی پریکٹس کیا کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کے باقی شاگردوں سے کافی بہتر تھا۔ ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ہماری ڈانس کلاس میں ایک سوئس لڑکی بھی شامل ہوگئی۔ ڈانس کے لیے مخصوص لباس پہن کر آنے کی ہدایت تھی لیکن ''کلچرل گیپ'' کی وجہ سے پاکستان میں اسے قابلِ عمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سوئس لڑکی باقاعدہ طور پہ ڈانس کا لباس پہن کر آیا کرتی۔ جب وہ پہلے دن ہماری کلاس میں آئی ہم سب حیران رہ گئے۔ ہم بھی کافی آزاد خیال تھے لیکن کم از کم پہناوے کے حوالے سے اس حد تک نہیں تھے۔ مجھے اس کا پہلا دن بالکل اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔

وہ سوئس ایمبیسی میں کام کرتی تھی۔ کیا کام کرتی تھی اس بات کا مجھے کوئی علم نہیں نہ تھا نہ ہی میں نے کبھی اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی غالباً اس کا مسئلہ بھی ہمارے فرنچ ٹیچر جیسا تھا۔ اس کا نام سوزی تھا۔ مکمل نام بہت مشکل تھا اس لیے سب اسے سوزی ہی کہہ کر پکارتے۔ سوزی جس کلھ

اور گپ شپ لگانے والی لڑکی تھی۔ اسے پاکستان کے شمالی علاقہ جات بہت پسند تھے۔ وہ پاکستانیوں کی مہمان نوازی سے بڑی متاثر تھی۔ سوزی قد میں ہم سب سے لمبی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا جسم بہت بھرا ابھرا اور متناسب تھا۔ جب وہ پہلے دن ماڈرن جیز ڈانس کی کلاس میں آئی تو اتفاق سے وہ میرے ساتھ آ کے کھڑی ہوگئی۔ میں جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا جوتے اور موزے میں اُتار دیا کرتا کیونکہ ڈانس فلور لکڑی کے تختوں کا بنا ہوا تھا اس لیے پاؤں کو کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ میرے ساتھ کھڑی تھی۔ ابھی ڈانس ٹیچر نے کلاس شروع نہیں کی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں اور سڈول رانیں دیکھ کے میں مبہوت رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کسی نے سفید سنگ مرمر سے تراشی ہیں۔ باقی جسم بھی متناسب تھا لیکن اس نے ڈانس کے لیے جو لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی چھاتیاں ایسی پچکی ہوئی تھیں جیسے کسی نے ربڑ کے گیند سینے پر چپکا رکھے ہوں۔ اس کو دیکھ کے مجھے انگریزی فلم فلیش ڈانس (Flash Dance) کی ہیروئن جنیفر بیلز (Jennifer Beals) یاد آ گئی۔ وہ بھی فائنل ڈانس کے لیے اس طرح کا لباس پہن کر آتی ہے۔ اتفاق سے ہمارا ٹیچر بھی ہمیں فلیش ڈانس کے گانے پہ ہی پریکٹس کروا رہا تھا۔ سوزی شکل صورت کی ٹھیک تھی گول شیشوں کی عینک لگاتی تھی۔ جب اس نے ڈانس کے لیے عینک اُتاری تو اس کی ناک کی ہڈی پہ مسلسل عینک پہننے کا نشان بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لگ رہی تھیں جیسے اندر کو دھنسی ہوں۔ جیسے ہی ڈانس ٹیچر نے ٹیپ ریکارڈر پہ میوزک آن کیا۔ ہم سب نے ہلنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح ہمارا جسم گرم ہو جاتا تھا۔ پھر گانا شروع ہوا، وہی فلیش ڈانس کا ''what a feeling'' (واٹ آ فیلنگ) سب نے دائیں ٹانگ ہوا میں لہرا دی۔ سوزی نے بھی اپنی خوبصورت ٹانگ ہوا میں لہرا دی۔ میری نظر اس پہ تھی۔ جتنی دیر تک ڈانس کی کلاس چلتی رہی میں سوزی کے حسین جسم کے نظارے میں محو رہا۔ کبھی ٹانگوں سے، کبھی گول گول بازوؤں سے، کبھی اس کی پچکی ہوئی چھاتیوں سے نظر چپک چپک جاتی۔ ڈانس کی کلاس ختم ہوئی تو اکثر کلاس فیلوز نے مجھ سے پوچھا کہ اس میں ایسی کیا بات تھی جو تم ڈانس کے دوران اس کو اتنی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ''میں نے جواب دیا'' تم بھی تو اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔'' ایک لڑکی جو خود کو بڑی تیز طرار سمجھتی تھی اس نے کہا'' ہم اسے نہیں تمہیں دیکھ رہے تھے۔'' ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ سوزی نے مجھے فرنچ زبان میں آواز دی۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ مجھے کہنے لگی تم ڈانس اچھا کرتے ہو۔ کہاں سے سیکھا ہے۔ میں نے کہا یہیں سے سیکھا ہے۔ تو کہنے لگی میرا

نہیں خیال کہ ایک مہینے میں کوئی اتنا اچھا ڈانس کر سکتا ہے۔ میں نے کہا، مجھے شوق بھی ہے اور اس کے علاوہ میں گھر جا کر پریکٹس بھی کرتا ہوں۔ انہی دنوں سوزی سے میری دوستی ہو گئی۔ اب ہفتے میں دو دفعہ جب بھی ڈانس کی کلاس ہوتی کلاس کے بعد ہم لوگ اکٹھے بیٹھتے۔ کبھی وہ کچھ پلا دیا کرتی اور کبھی میں۔ اس دوران ہمارے فرنچ ٹیچر کے دو سال پورے ہو گئے۔ اس کی جگہ ہمیں ایک پاکستانی فرنچ پڑھانے لگا جو فرانس کی کسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ صبح وہ انٹرنیشنل سکول میں پڑھایا کرتا اور شام کو ہماری کلاس لیا کرتا۔ لیکن ہماری ڈانس کی کلاس ختم ہو گئی۔ اس طرح سوزی نے فرنچ کلچرل سنٹر آنا بند کر دیا۔ ساری کلاس مجھے چھیڑا کرتی۔ فرشتہ تمہارا پہلا پیار ادھورا رہ گیا۔ ہمارا ڈپلومہ مکمل ہوا تو ہماری فرنچ کی کلاس بھی بکھر گئی۔ سوزی کی کہانی وہیں ختم ہو گئی۔ اور میں بعد میں انگریزی اور فرنچ سپیکنگ گائیڈ کے طور پر جاب میں چلا گیا۔

اس بات کو پورا سال گزر چکا تھا۔ ایک دن میں گروپ کے ساتھ چلاس کے ہوٹل شنگریلا میں کمرے کے سامنے چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھا برٹرینڈ رسل (Bertrand Russsell) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے پیچھے سوزی کھڑی تھی۔

میں نے فرنچ میں کہا "تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

اس نے جواب دیا "میں نے بیرون ملک لازمی نوکری کے دو سال پورے کر لیے ہیں۔ اب میں واپس جا رہی ہوں۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے پاکستان کے شمالی علاقہ جات دیکھتی جاؤں۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

میں نے جواب دیا "میں نے ڈپلومہ مکمل کرنے کے بعد ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری اختیار کر لی ہے۔ اب غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان کے خوبصورت علاقوں کی سیر کرواتا ہوں۔" میرا جواب سننے کے بعد کہنے لگی "تمہارا گروپ کس ملک کا ہے۔"

میں نے جواب دیا فرنچ گروپ ہے۔ "نوول فرنٹیر (Nouvelle Frontiere) بہت کنجوس ہیں۔ نہ کچھ خریدتے ہیں نہ ہی اچھی ٹپ دیتے ہیں مگر کام تو کرنا ہے نا۔"

"کہاں کہاں لے کر جاؤ گے۔"

میں نے کہا "یہاں سے گلگت جانا ہے، گلگت سے ہنزہ، وادی نگر، گلمت، سست اس کے بعد واپسی پہ بیشام آنا ہے۔ بیشام سے سوات، سوات سے چترال، چترال سے ان لوگوں کی پشاور کی فلائٹ ہے۔ اور پشاور سے بائی ایئر فرانس واپس چلے جائیں گے۔"

وہ کہنے لگی "کافی لمبا ٹور ہے۔"

میں نے کہا "ہے تو۔"

پھر اس نے مجھ سے کہا "تمہارا کمرہ کون سا ہے۔"

میں نے اسے اپنی چابی دکھائی، جس کی رنگ میں لٹکے ہوئے ٹوکن پر کمرے کا نمبر تحریر تھا، تو وہ بڑی خوش ہوئی اور کہنے لگی "دیکھا ہمیں قسمت نے پھر ملایا اور ملایا بھی کہاں، یہاں چلاس میں اور ہمارا کمرہ بھی ساتھ ساتھ ہے۔"

میں نے کہا "یہ محض اتفاق تو نہیں۔ میرا خیال ہے تم میرا پیچھا کر رہی تھیں۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

میں نے اسے کہا "جب دھوپ کی تمازت کم ہوگی تو میں اپنے گروپ کو راک کارونگ (rock carving) دکھلانے لے جاؤں گا۔ اگر تمہیں مصروفیت نہ ہوئی تو ساتھ چلی چلنا۔ دیکھنا میں کیسے ان فرنچ لوگوں کو بیوقوف بناتا ہوں۔"

کہنے لگی "مجھے پتا ہے گائیڈ کیا شیطانیاں کرتے ہیں۔ خیر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن تمہارے گروپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

میں نے کہا "یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو لیکن ٹھیک پانچ بجے تیار رہنا۔ میں نے اپنے گروپ کو پانچ بجے کا وقت دیا ہے۔"

تو انگریزی میں بولی "ڈونٹ وری۔"

OOO

میں ساڑھے چار بجے اپنے گروپ کے انتظار میں کوسٹر (ایک طرح کی بس) کے پاس آ کے کھڑا ہوگیا۔ میں نے ڈرائیور کو بھی سمجھا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ کہنے لگا باؤ جی فکر ہی نہ کریں۔ پانچ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ دور سے سوزی آتی دکھائی دی۔ آتے ہی کہنے لگی "مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔" میں نے کہا "نہیں تم وقت سے پہلے آگئی ہو۔" ٹھیک پانچ بجے ہیں، سوزی اور باقی گروپ

راک کاروِنگ (rock carving) دیکھنے کے لیے نکلے۔ وہاں پہنچ کے راک کاروِنگ کے بارے میں، میں نے اپنی معلومات ان کے ساتھ شیئر کیں۔ چند ایک نے سوال کیے، کتابوں سے تصویریں نکال نکال کے مجھے دکھانے لگے کہ یہ چیز کہاں ہے، وہ چیز کہاں ہے۔ گروپ کے زیادہ تر لوگ بوڑھے تھے اس لیے کئی ایک کو چلنے میں میری مدد کی ضرورت پیش آئی۔ جب میں اپنی پروفیشنل ذمہ داریوں سے کچھ فارغ ہوگیا تو سوزی کے پاس آ کے کھڑا ہوگیا۔ وہ کہنے لگی "قرشتہ تمہیں تو تاریخ کی بابت کافی کچھ پتا ہے۔ میرا خیال تھا تم ادھر اُدھر کی باتیں کر کے ان سے جان چھڑوا لو گے۔" میں نے کہا "درحقیقت مجھے خود بھی تاریخ اور آثار قدیمہ سے گہرا لگاؤ ہے۔ اسی لیے میں اس پیشے میں آیا ہوں۔"

جب تمام ٹورسٹ جی بھر کے تصاویر بنا چکے تو ہم لوگ شنگریلا ہوٹل چلاس واپس آ گئے۔ رات یہاں گزار کے ہمیں صبح سویرے گلگت کے لیے نکلنا تھا۔ سب لوگوں نے ہوٹل کے بڑے ہال میں ڈنر کیا، سب کو صبح سات بجے ناشتے کا وقت دیا گیا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے روانگی ہوگی۔ بریفنگ سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازے پہ دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو سامنے سوزی کھڑی تھی۔ کہنے لگی "تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟" میں نے کہا "نہیں۔"

"چلو گپ شپ لگاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آؤ باغیچے میں بیٹھتے ہیں۔" تو کہنے لگی "دل تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن وہاں بڑے ہیوی ویٹ مچھر ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بات تو درست ہے لیکن کوئی بات نہیں مچھروں کو بھی تھوڑا سوئس خون پینے کو ملنا چاہیے۔"

جواب میں کہنے لگی "ہمارا خون پینا اتنا آسان نہیں۔"

میں نے تجویز دی "اگر تمہیں برا نہ لگے تو میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

سوزی نے کہا "آئیڈیا برا نہیں ہے۔"

اس طرح سوزی میرے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں یہی سوچ رہا تھا تھوڑی گپ شپ لگائیں گے اور پھر وہ چلی جائے گی۔

سوزی نے ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور نیچے کسی ہلکے سے کپڑے کا پاجامہ پہنا

ہوا تھا۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔

کمرے میں آتے ہی کہنے لگی "فرشتہ تمہارے کمرے میں ٹیپ ریکارڈر ہے۔"

میں نے کہا "ٹیپ ریکارڈر تو نہیں ہے۔ کیا کرنا ہے اس کا؟"

کہنے لگی "اگر مل جائے تو بہت مزہ آئے گا۔"

میں نے کہا "تم میرا یہیں انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں کمرے سے باہر نکلا اور ہوٹل انتظامیہ سے ٹیپ ریکارڈر مانگ کر لے آیا۔

میرے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر دیکھ سوزی نے فرنچ زبان میں کہا "اولالا۔"

اس نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگائی۔ جیسے ہی میوزک آن ایئر ہوا، میں حیران رہ گیا۔ فلیش ڈانس کا وہی گانا، what a feeling بجنے لگا جس پہ فرنچ کلچرل سنٹر میں ہمارا ڈانس ٹیچر ہمیں ڈانس کی پریکٹس کروایا کرتا تھا۔ سوزی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں اس گانے پہ رقص کرنے لگے۔ میں تھوڑی دیر ہی میں تھک گیا لیکن سوزی نے پورے گانے پہ ڈانس کیا۔ مجھے کہنے لگی، اب تم اس طرح ڈانس نہیں کرتے۔ میں نے کہا، ہمارا ڈانس ٹیچر واپس فرانس چلا گیا تھا اس کے بعد ڈپلومہ بھی ختم ہوگیا۔ پھر کام شروع کردیا۔ اب نہ پریکٹس ہے نہ ہی سٹیمنا۔ سوزی کہنے لگی، تمہارے کمرے کا ایئر کنڈیشنر تو ٹھیک چل رہا ہے؟ میں نے کہا، بالکل ٹھیک چل رہا ہے چونکہ تم نے مسلسل ڈانس کیا ہے اس لیے تمہارے خون کی گردش تیز ہوگئی ہے اور غالباً اسی لیے تمہیں زیادہ گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے ٹی شرٹ اُتار دی اور ٹراؤزر بھی۔ میں ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ اتنا ضرور کہوں گا میری نتھ سوزی نے اُتار دی۔ اس رات مجھے سوزی کی صرف پنڈلیوں اور رانوں کے نظارے پر اکتفا نہیں کرنا پڑا، بلکہ میں نے یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا۔ میں لڑکیوں سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا لیکن جنسی عمل پر خود کو کبھی مائل نہ کرسکا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں اس معاملے میں کافی "جھینپو" ثابت ہوا تھا آج سوزی نے میری ساری جھینپ اُتار دی تھی۔ خیر چلو اس کی یہ رات بہت شاندار تھی۔ جو فلیش ڈانس سے شروع ہوکر جسمانی ملاپ پہ ختم ہوئی۔ اس کے بعد میں اپنے گروپ کے ساتھ جہاں جہاں بھی گیا سوزی میری ساتھ گئی۔ ہمارے کمرے تو علیحدہ علیحدہ ہوتے لیکن کبھی وہ میرے کمرے میں رات گزارتی اور کبھی میں اس کے کمرے میں شب بسری کرتا۔ جب

میں نے گروپ کو پشاور سے رخصت کیا تو مجھے واپس آنا تھا۔

سوزی کہنے لگی، اگر تمہیں برا نہ لگے تو ہم واپسی پہ ٹیکسلا دیکھتے چلیں۔ کیونکہ تمہیں بدھ مت کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔"

میں نے کہا" کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن جو مجھے پتا ہے تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"

ہم لوگ پشاور سے واپسی پر ٹیکسلا شہر رکے۔ وہاں ہم نے ٹیکسلا میوزیم دیکھا، پھر سرکپ اور جولیاں یونیورسٹی دیکھی۔ جولیاں کے کھنڈرات کے پاس برٹش آرکیالوجسٹ سرجان مارشل کا کمرہ نما گھر بھی ہے۔ میں نے ہر ٹورسٹ کی طرح سوزی کو بھی بتایا کہ ۱۹۲۵ء سے پہلے یہ جگہ جہاں تم جولیاں یونیورسٹی دیکھ رہی ہو، یہ ایک پہاڑی ٹیلے کی صورت میں موجود تھی۔ دو ہزار سال تک کسی کو نہیں پتا تھا کہ اس ٹیلے کے نیچے کسی یونیورسٹی کے کھنڈرات ہیں۔ سرجان مارشل نے بدھ مت کے مونک فاہیان اور ہیوان سانگ کے سفر نامے سے یہ بات دریافت کی کہ ٹیکسلا میں کوئی یونیورسٹی ہے جس کا نام جولیاں ہے۔ پھر سرجان مارشل نے کافی عرصہ تبت میں گزارا اور وہاں سے اسے کچھ نقشے ملے۔ سوزی یہ ساری تفصیل جان کر بڑی حیران ہوئی۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ بدھ مت کے پیروکار اپنی خانقاہیں پتھر سے بناتے لیکن ان کی چھتوں میں لکڑی استعمال کیا کرتے۔ جب سفید ہنوں نے ٹیکسلا پر حملہ کیا تو انہوں نے ان کی تمام خانقاہیں جلا دیں۔ قتل و غارت گری کی انتہا کر دی اور مختصر عرصہ میں ہی پوری تہذیب کا نام ونشان مٹا ڈالا۔۔۔ اب سفید ہنوں کا بھی کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے مگر کھنڈرات اپنی کہانی سناتے چلے جاتے ہیں۔

پھر میں سوزی کو سرکپ کی سیر کروانے لے گیا۔ وہاں ہم سیر کرتے کرتے ایک پہاڑی پہ چلے گئے۔ اس پہاڑی پہ کنال سٹوپا ہے۔ یہ سٹوپا مہاراجا اشوک نے اپنے بیٹے کنال کی یاد میں بنایا تھا۔ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ اشوک کی ایک بیوی بہت جوان اور خوبصورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اشوک کی بیوی اپنے سوتیلے بیٹے کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ جب اشوک کو پتا چلا تو اس نے مورد الزام اپنے بیٹے کو ٹھہرایا۔ اس طرح اس نے اپنے بیٹے کو اس جرم کی سزا کچھ اس طرح دی کہ اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے قتل کروا دیا۔ اس کی بیوی نے اسے بعد میں بتایا کہ سارا قصور میرا ہے۔ اشوک اپنے کیے پہ بہت شرمندہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں یہ سٹوپا بنوایا۔ کہانی سن کر سوزی کہنے لگی" بالکل اسی طرح کی کہانی یونانی ڈرامہ نگار ارسٹوفین (Aristophene) نے بھی لکھی ہے۔

وہ اس کہانی سے دو سو سال پرانی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے اس کہانی سے متاثر ہو کر یہ کہانی خود سے گھڑی ہو۔" میں نے کہا" ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ میں نے ایک قصہ سن رکھا ہے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے کہ ان کے دور میں کسی عورت سے اس طرح کا جرم سرزد ہوا تھا۔"

تو وہ کہنے لگی" جب سے دنیا بنی ہے۔ وہی پرانے قصے دہرائے جا رہے ہیں۔ داستان گو بدل گئے ہیں۔ سامعین بدل گئے ہیں۔ زمانہ بدل گیا لیکن قصے وہی ہیں۔"

سر کپ کی سیر کے بعد ہم لوگ اسلام آباد واپس آ گئے۔ وہ اپنے گھر چلی گئی اور میں دوسرے دن اپنی ٹورسٹ کمپنی رپورٹ کرنے چلا گیا۔ وقت اسی طرح گزر رہا، ایک دو ماہ بعد مجھے سوزی کا خط ملا جس میں ہمارے ٹور کی تصویریں تھیں اور ایک عدد پوسٹ کارڈ تھا۔ جس پہ اس کا سوئٹزر لینڈ کا پتا تحریر تھا۔ چند سطروں میں اتنا لکھا ہوا تھا کہ تم جب بھی سوئٹزر لینڈ آؤ تو میرے ہاں ٹھہرنا۔۔۔ ہم جی بھر کے سوئٹزر لینڈ کی سیر کریں گے۔ ایک دو تصویریں تو ایسی تھیں کہ مشرقیت ان کا نظارہ زیبا نہیں گردانتی تھی۔

میرے دادا کو سوزی سے میری جذباتی وابستگی کا پتا چل چکا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی بقول اس قدیم مقولے کے۔۔۔ کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ میرا ایک کولیگ یہ مقولہ سن کر اکثر لقمہ دیا کرتا۔۔۔ کہا کرتا تھا" کھنگ تے خشکی بھی نہیں چھپتے۔ اس بات سے میں اور سوزی واقف تھے کہ ہمارے ٹور کے دوران چلاس سے پشاور تک ساری راتیں ایک ساتھ گزری تھیں۔ سوزی کہتی تھی کہ سوئس لڑکی سے سب کچھ کہنا لیکن اس سے گھر بسانے کی بات نہیں کرنا ورنہ وہ فوراً بھاگ جائے گی۔ میں نے اس کی اس بات پہ عمل کرتے ہوئے اُسے کبھی پرپوز نہ کیا۔۔۔ اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

میں کیا سو ریلوے سٹیشن پہ بیٹھا لوگا نو کی ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے سوزی کو یاد کر رہا تھا سوزی کی یاد میں سے ہمیشہ مجھے اس کے ساتھ بتائی راتوں کی مہک آتی تھی اور آج بھی آتی ہے۔

O

سوموار کو شام سات بجے گھر کی گھنٹی بجی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اس وقت کون آ گیا؟"

نیائش نے گمان ظاہر کیا۔۔۔"مالک مکان ہو سکتا ہے، اسے کئی دفعہ نیچے سٹور سے چیزیں نکالنی ہوتی ہیں۔"

خیر نیائش نے انٹرکام پہ پوچھا "کی اے، یعنی کون ہے۔" جواب سن کے اس نے دروازہ کھول دیا۔

کوئی جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آ رہا تھا۔ جب وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو میں اُسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میرے سامنے ثقلین کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "ثقلین آپ کیسے، اس وقت۔"

اس نے جواب دیا "سارا قصور آپ کا ہے۔"

میں کہا "میرا"

"جی آپ کا۔ میں آپ کی داستان الف لیلہ کا دوسرا باب لے آیا ہوں۔ اگر ہو سکے تو اگلا باب دے دیں۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ نے میرا ناولیسہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔"

"آپ دلچسپی کی بات کرتے ہیں۔ میں رات کو سو نہیں سکتا۔ ہر وقت یہی اندازہ لگاتا رہتا ہوں کہ آگے کہانی میں کون سا موڑ آئے گا؟"

اگر یہ بات ہے تو آپ کو اگلا باب بھی دے دیتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو سارے ابواب مسلسل پڑھنے پڑیں گے۔"

"مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔"

نیاٗش ہم دونوں کی گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کہنے لگا: "ارے پری پیکر، میرے دوست نے تم پہ کیا جادو کر دیا ہے۔ کل تک تو تم اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور آج تم اُس کے بہت بڑے مداح بن کر آ گئے ہو۔"

ثقلین بولا "نیاٗش بھائی انسان کتابوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک ان کو کھول کے نہ پڑھو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔

ع انھیں دوری نے میری آنکھ پر بے خال و خد لکھا

میں غلطی پر تھا۔ حالانکہ میں جس شعبے سے تعلق رکھتا ہوں اس میں ہم کئی قسم کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنتے ہیں اور گمان کر لیتے ہیں کہ ہمیں شکل و صورت سے شخصیت کا اندازہ کرنے کا ملکہ ہو گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ ظاہر اپنے طور پر باطن کا صحیح غماز ہو ہی نہیں سکتا۔

فرشتہ پاس کھڑا سن رہا تھا کہنے لگا "ثقلین صاحب اب بھی وقت ہے۔ میرے بارے میں کوئی آخری رائے قائم کرنے سے پہلے سوچ لیں۔ میرے لکھے ہوئے پہ مت جائیں۔ سب جھوٹ کا پلندہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"فرشتہ صاحب جھوٹ سچائی کی لذت سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

اتنا کہہ کر فرشتہ کمرے سے اپنی خود نوشت کا تیسرا باب لینے چلا گیا۔

دوسرا باب اس سے وصول کرتے ہوئے اُسے تیسرا تھما دیا۔ ثقلین نے تیسرے باب پر مشتمل مخروطی کاغذات لیتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

نیاٗش نے اور میں نے یک زبان ہو کر کہا "ثقلین صاحب کھانے کا وقت ہے، کھانا کھا کے چلے جایئے گا۔"

ثقلین کہنے لگا" میں سوچ رہا تھا کہ ابھی نہ جاؤں لیکن میرا تجسس میرے آڑے آ گیا، ورنہ میں کھانے کے وقت حارج ہونے کو اچھا خیال نہیں کرتا۔"

میں نے کہا" ثقلین صاحب دوست ہوتے ہوئے اجنبیوں کی سی باتیں نہ کریں یوں بھی آپ کا نصیب آپ کو یہاں لے کے آیا ہے۔ ہم نے کوئی خاص چیز تو بنائی نہیں۔ آپ کو دال چاول کھلانے ہیں۔ دال تیار ہے بس چاول بنانے ہیں۔ ساتھ تھوڑا سا رائتہ بناؤں گا۔ تھوڑا سلاد اور میں آج ہی احمد کا مکس اچار لایا ہوں۔ ایک ساتھ طعام کا مزہ ہی اور ہوگا۔"

"فرشتہ صاحب آپ نے مینو کی تفصیل بتا کر میری بھوک چمکا دی ہے۔۔۔ اس لیے اب مزید اصرار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا بھی چکھ لیتے ہیں۔"

جب کھانا تیار ہو گیا تو میں نے اور نیائش نے کھانے کے میز پہ تمام چیزیں چُن دیں۔ اُبلے ہوئے چاول، مسور کی دال جس کو پیاز اور لہسن کا بگھار دیا گیا تھا۔ پیاز، کھیرے، ٹماٹر اور موزریلا (mozzerella) میں تھوڑی سی کریم ڈال کر میں سلاد بنایا تھا۔ کھانا دیکھ کے سب کی بھوک میں اضافہ ہو گیا۔ ہم تینوں نے سیر ہو کر کھایا۔ جب کھانا کھا چکے تو میں نے کہا" چائے کا دور ہو جائے۔"

ثقلین کہنے لگا" تمہیں تو پتا ہے میں چائے نہیں پیتا۔"

نیائش کہنے لگا" چلو میں تمہیں پشاوری قہوہ پلا دیتا ہوں۔"

میں نے کہا" یار یہ پیلا شربت مجھے نہ پلانا۔"

نیائش کہنے لگا" یہ کھانا ہضم کرنے میں مدد دے گا۔"

میں نے کہا" تم لوگ قہوہ پیو، میں اپنے لیے چائے بناؤں گا۔"

خیر نیائش اور ثقلین پری پیکر نے قہوہ پیا اور میں نے چائے۔ اس کے بعد میں نے سارے برتن اٹھا کے سنک میں رکھ دیے۔ نیائش کہنے لگا" برتن میں دھوؤں گا۔"

میں نے کہا" آج یہ کارِ خیر مجھے سرانجام دے لینے دو۔۔۔ ویسے بھی مجھے دیر سے نیند آتی ہے، مصروفیت بنی رہے گی۔"

نیائش نے ہم سے اجازت طلب کی اور سونے چلا گیا کیونکہ اُسے صبح کام پہ جانا تھا۔ جیسے ہی نیائش اُٹھا ثقلین نے بھی خدا حافظ کہا اور واپسی کی راہ لی۔

○○○

ثقلین جیسے ہی گھر پہنچا اس سے ایک روم میٹ نے پوچھا کہ کھانے وانے کا کیا پروگرام ہے؟ تو اس نے جواب دیا آپ کھا لیں میں کھا کر آیا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ٹیبل لیمپ آن کرتے ہوئے اس نے تیسرا باب پڑھنا شروع کیا۔

میں اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں جس پلیٹ فارم پہ میں بیٹھا تھا ۔۔۔ایک ٹرین آ کر رکی۔ میں نے احتیاطاً ایک شخص سے پوچھا کہ ''کیا یہ ٹرین لوگانو جا رہی ہے؟'' تو اس کا جواب اثبات میں تھا۔ میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح میں نے کھڑکی کی طرف بیٹھنا پسند کیا۔ اتفاق سے ٹرین میں اتنا رش نہیں تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ چلی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا دور ایک کونے میں کسی گھر کے باہر لکڑی کی ایک ریڑھی پڑی ہوئی تھی جس میں جا بجا پھولوں والے گملے جڑے ہوئے تھے۔ مجھے اتنی دور سے پتا تو نہ چلا کہ یہ کون سے پھول ہیں لیکن ان کا رنگ ضرور نظر آ رہا تھا۔ آتشی گلابی پھول، یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ پھول مجھے اپنے ملک میں خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ جیسے ہی ٹرین کی رفتار میں اضافہ ہوا یہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ ٹرین جیسے جیسے آگے چلتی جا رہی تھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ترقی یافتہ ملک میں داخل ہو رہا ہوں سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کا موازنہ کرتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ تبدیلی بہت واضح تھی۔ اٹلی کے قدرتی مناظر مختلف ہیں اور سوئس کے قدرتی مناظر مختلف۔ اٹلی میں گھروں کی چھتیں تھوڑی نیچی ہیں اور سوئس میں اُونچی۔ اس کے علاوہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بھی مختلف تھیں۔ گھروں کی آرائش و زیبائش میں اطالوی سوئس لوگوں سے بہت مختلف مذاق کے حامل ہیں۔ میں ابھی اسی تقابلی جائزے میں مصروف تھا کہ ٹکٹ چیکر آیا اور اُس نے ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیے۔ میں نے ابھی اپنا ٹکٹ دکھایا اس نے ٹکٹ دیکھ کے واپس کر دیا۔ میں دوبارہ خیالوں کی دنیا میں چلا گیا۔ میں اس بات سے ناواقف تھا کہ میرا قیام کہاں ہو گا۔ فی الحال میں بس اتنا جانتا تھا کہ کرائس لنگن (Kreuzlingen) سیاسی پناہ کے دفتر جا کے وہاں سیاسی پناہ گزینی کی درخواست دینی ہے۔ ٹرین اسی طرح چلتی رہی اور پتا ہی نہ چلا کہ کب لوگانو ریلوے سٹیشن آ گیا۔ میں لوگانو ریلوے اسٹیشن پر اترا اور سیدھا ٹکٹ گھر کی طرف ہو لیا۔ سٹیشن کے ایک طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ آس پاس مختلف جگہوں پہ چار زبانوں میں معلومات درج تھیں۔ جرمن، فرنچ اور اطالین کا تو پتا چلتا تھا لیکن ایک زبان کی تحریر میرے لیے انجان تھی۔ میں سوچنے لگا کیسا

عجیب ملک ہے کہ کسی ایک زبان پر بھروسہ نہیں رکھتا بلکہ اسے اپنا مدعا عام کرنے کے لیے چار زبانوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ سوئٹزرلینڈ رقبے کے لحاظ سے زیادہ بڑا ملک نہیں۔ میں سٹیشن کے ٹکٹ گھر پہ ٹکٹ لینے چلا گیا۔

یہاں بھی کیبن میں ایک خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں بھی اسی طرح کا سکارف تھا جس طرح کیاسو ریلوے سٹیشن پہ مامور خاتون نے گلے میں باندھا ہوا تھا۔ اس کے سکارف کی دھاریاں بھی نیلی اور پیلی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ یہ خاتون کافی کم عمر لگتی تھی۔ میں نے انگریزی میں اسے بتایا کہ مجھے کرائس لنگن (Kreuzlingen) جانا ہے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر بڑے اچھے انداز میں انگریزی میں جواب دیا۔ اچھے انداز سے میری مراد یہ ہے کہ اس کا تلفظ بہت اچھا تھا۔ وسطی یورپ کے ریلوے سٹیشن پہ کام کرنے والے عموماً اچھی سی انگریزی جانتے ہیں لیکن جب سے میں سوئس میں داخل ہوا تھا میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ یہ لوگ انگریزی اٹالین لوگوں کی نسبت کافی اچھی جانتے ہیں۔ اس وقت شام کے سات بج چکے تھے اور شام کو عموماً بہت کم لوگ سوئس کے آخری کونے میں جانے کی زحمت محسوس کرتے ہیں۔ ویسے بھی کرائس لنگن (Kreuzlingen) کوئی اتنی مشہور تفریح گاہ نہیں تھی۔

جہاں میں اس وقت کھڑا تھا۔ اس کنٹون کو۔۔۔ تی شینو (Ticino) کہا جاتا ہے اور یہاں کی زبان اٹالین ہے لیکن دیگر زبانیں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں جس کا اندازہ مجھے اب تک ہو چکا تھا۔ جس کا نام ہے بودن سے (boden see) یا کوستانزے سے (costanze see) ہے جب کہ اٹالین اس کولاگو دی کوستانسو (Lago di costanso) کہتے ہیں۔ یہ شہر تھرگاؤ (thurgau) کنٹون میں ہے یعنی میں سوئس کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جا رہا تھا۔ خیر اس نے مجھے ٹکٹ دیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ اس وقت ٹرین موجود تھیں۔ اگر مجھے ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو مجھے رات زیورخ ریلوے سٹیشن پہ گزارنی پڑتی۔ اس نے مجھے تین ٹکٹ دیے۔ پھر ان کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا "پہلا ٹکٹ تم لوگانو سے زیورخ تک استعمال کرو گے۔ دوسرا ٹکٹ زیورخ سے ونٹرتھور (winterthur) کا ہے اور تیسرا ٹکٹ ونٹرتھور سے کرائس لنگن کا ہے۔ یہاں سے تمہاری ٹرین ساڑھے سات بجے چلے گی اور تین گھنٹے میں زیورخ پہنچے گی۔ زیورخ سے تم لوکل ٹرین پہ بیٹھو کے تقریباً چالیس منٹ میں ونٹرتھور پہنچ جاؤ گے۔ وہاں ونٹرتھور سے تمہیں کرائس لنگن کے لیے ٹرین ملے گی۔ میرے خیال میں تم

ساڑھے گیارہ بجے کرائس لنگن پہنچو گے۔" اس نے ساری تفصیل مجھے زبانی بتا دی تھی۔ میں نے کہا، اگر تمہیں برا نہ لگے تو مجھے مہربانی کر کے اس سارے سفر کا اور ٹرینوں کا پرنٹ آؤٹ نکال دو تا کہ مجھے سمجھنے میں آسانی رہے اور راستے میں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو۔ وہ کہنے لگی، میں نے کمپیوٹر پہ کمانڈ دے دی ہے، تمہیں اس کا پرنٹ آؤٹ بھی دوں گی۔ تھوڑی دیر میں اس نے میرے ہاتھ تمام سفر کی تفصیل ٹرینوں کے نام، نمبر اور اوقات کار تھما دیے۔ ٹرینوں کے ٹائم اور شہروں کے نام ہائی لائٹ کر دیے گئے تھے۔ جس دوران وہ اس عمل میں مصروف تھی میں اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی خوبصورت اور جوان تھی۔ بالوں کا رنگ کالا تھا۔ خدوخال سے اٹالین لگتی تھی۔ کیونکہ یہ کنٹون اٹالین ہے اس لیے یہاں اٹالین امیگرنٹس کی تعداد زیادہ ہونا فطری بات ہے۔ اس کا ناک نقشہ جاذب نظر تو تھا ہی اس کے ہاتھ بھی بہت خوبصورت تھے۔ اس نے گورے گورے ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں میں ہائیلائیٹر پکڑا ہوا تھا اور جن ریلوے سٹیشنوں پہ مجھے اُترنا تھا کہ ان کو پیلے رنگ کے ہائیلائٹر سے ہائی لائٹ کر رہی تھی تا کہ مجھے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ہائی لائیز بہت بھلا لگ رہا تھا۔ جب کہ اس کے ناخنوں پہ لال رنگ کی نیل پالش الگ طور پہ اپنی بہار دکھا رہی تھی۔

میں نے "فاہر پلان" یعنی سفر کی تفصیلات ہاتھ میں لیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اب مجھے لوگانو سے زیورخ اور زیورخ سے ونٹرتھور اور وہاں سے کرائس لنگن جانا تھا۔ میری ٹرین کے آنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک دو فون کر لوں۔ آس پاس نظر دوڑائی تو قریب ہی ایک کیبن دکھائی دیا جو ٹیلی فون بوتھ اور انٹرنیٹ یوز کے لیے مخصوص تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ فون بوتھ کی سلوٹ میں پانچ سوئس فرانک کا سکہ ڈالا اور نیائش کا نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے جواب آیا۔" کی اے، یعنی کون ہے؟"

میں نے جواب میں کہا" میں ہوں نیائش بھائی۔ میں لوگانو سے بول رہا ہوں۔ یہاں سے تھوڑی دیر میں میں زیورخ چلا جاؤں گا۔ وہاں سے پھر آگے جانا ہے۔"

نیائش نے کہا" فرشتہ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہیں رہ جاؤ لیکن تم نہ مانے۔ خیر وہاں پہنچ کر اطلاع دینا۔"

میں نے کہا" اچھا نیائش بھائی۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے موبائل فون سے سوزی کا نمبر نکالا۔ موبائل فون کو سامنے رکھ

کے سوزی کا نمبر ڈائیل کیا۔ دوسری طرف سے جرمن میں کسی نے کچھ کہا۔ میں نے انگریزی میں اپنا مدعا بیان کیا کہ میں ہوں۔ فون سوزی نے ہی اُٹھایا تھا۔ جب اس کو پتا چلا کہ میں فرشتہ بول رہا ہوں تو وہ بڑی خوش ہوئی۔

کہنے لگی "کہاں سے بول رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں لوگانو ریلوے سٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں قریباً ساڑھے دس بجے زیورخ پہنچوں گا۔" سوزی زیورخ میں کسی دفتر میں کام کرتی تھی اور وہ اورلیکون (orlekon) کے پاس کہیں رہتی تھی۔ میرے سوئس کو اپنے قیام کے لیے منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سوزی میرے یہاں قیام کے انتظام میں مددگار ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جاب کے انتظام سمیت وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ فون پہ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، پھر اس نے کہا "ٹھیک ہے تم سے زیورخ ریلوے سٹیشن پہ ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

مجھے خوشی تھی کہ میں جس مقصد کے لیے سوئس آیا تھا وہ پورا ہونے جا رہا تھا۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ سوزی اتنی اچھی طرح پیش آئے گی۔ میں نے سوزی کے بارے میں نیاتش کو بھی نہیں بتایا تھا۔ میرا خیال تھا سارا کام ہو جانے کے بعد بتاؤں گا۔ ہم پاکستانی لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا دکھ دل میں بٹھا لیتے ہیں۔ یہ بات میں نے کیوں کی ہے اس کے بارے میں آپ کو آگے چل کے پتا چلے گا۔

ٹرین آ کے پلیٹ فارم پہ رکی۔ اٹالین لوگ پلیٹ فارم کو بناریو (binario) کہتے ہیں سوئس اور جرمن میں اس کو گلائس (gleis) کہا جاتا ہے۔ میں ٹرین میں سوار ہوا۔ ویسے تو میری ٹکٹ پہ سیٹ نمبر لکھا ہوا تھا لیکن ٹرین میں زیادہ لوگ نہیں تھے اس لیے میں کھڑکی والی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کے اٹلی اور سوئس کی ریلوے سروس کا موازنہ کرتے ہوئے مجھے لگا کہ سوئس ٹرینوں کی سیٹیں نسبتاً زیادہ اچھی اور صاف ستھری تھیں۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ سوئس ٹرینیں وقت کی بہت پابند تھیں۔ جس ٹرین پہ میں سوار ہوا تھا اور مجھے زیورخ جانا تھا، یہ ٹرین بالکل اسی وقت پہ آئی جو وقت اس کاغذ پہ لکھا ہوا تھا جو بکنگ کلرک لڑکی نے مجھے میری سہولت کے لیے دیا تھا۔ اس کے برعکس اٹلی کی ٹرینیں کم آرام دہ تھیں جب کہ ان میں صفائی ستھرائی کا انتظام بھی واجبی ہوتا تھا، وقت کی پابندی کی تو بات ہی نہ کریں۔ کبھی اپنے وقت پہ نہیں آتیں۔ جتنا وقت میں نے اٹلی میں گزارا، اس

دوران اگر کبھی ٹرین پہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو بار ہا ایسا ہوا کہ اطالین ریلوے عملے نے پابندیٔ وقت کے حوالے سے تنقید کا جواب دیتے ہوئے یہ سوال کر ڈالا کہ کیا تمہارے ملک پاکستان میں ٹرینیں وقت کی پابندی کرتی ہیں؟ ایسے الزامی سوالات کے جواب میں مَیں ان سے ہمیشہ یہی کہا کرتا کہ تم ہماری ٹرینوں کا اپنے ملک کی ٹرینوں سے موازنہ نہ کرو۔ کیونکہ پاکستان ایک غریب اور ترقی پذیر ملک ہے۔ جب کہ اٹلی ایک ایسا ملک ہے جو یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی یونین میں بھی شامل ہے۔ لہٰذا اٹلی کی ٹرینوں کا موازنہ دیگر یورپین ملکوں کی ٹرینوں سے ہی کیا جانا چاہیے۔

میں انہی تقابلی جائزوں میں مصروف تھا کہ ٹرین کسی سٹاپ پہ رُکی۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو باہر بیلن زونا (Belenzona) کا بورڈ نظر آیا۔ لوگانو سے بیلن زونا تک قدرتی مناظر بالکل اٹلی کی طرح تھے۔ راستے میں آنے والی عمارتیں بھی اطالوی انداز کی تھیں۔ بیلن زونا ٹرین رُکی تو میں نے احتیاطاً وہ کاغذ دیکھا جس پہ تمام سٹیشنوں پہ جہاں جہاں ٹرین نے رکنا تھا کا نام اور وقت لکھا ہوا تھا۔ جو وقت بیلن زونا پہنچنے کے لیے لکھا ہوا تھا ٹرین ٹھیک اسی وقت پہ یہاں پہنچی تھی۔ یہاں سے ایک نوجوان لڑکا ٹرین کے اس ڈبے میں جس میں مَیں براجمان تھا، سوار ہوا۔ اس کی عمر قریباً پچیس سال ہوگی یا اس سے بھی کم۔ موٹا تازہ۔ اس نے جو ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اس پہ عربی رسم الخط میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ سفید رنگ کی ٹی شرٹ پہ سیاہ رنگ میں لکھے گئے عربی الفاظ بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی جینز جوگر ٹائپ شوز پہن رکھے تھے۔ قد کاٹھ میں وہ مجھ سے کچھ لمبا محسوس ہوا۔ چہرہ گول، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ناک نہ تیکھی نہ موٹی، درمیانی سی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے بالوں کا رنگ سنہرا لیکن گہرا تھا۔ وہ آ کے میرے سامنے والی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی جرمن میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے انگریزی میں کہا مجھے جرمن زبان نہیں آتی تو اس نے انگریزی میں جواب دیا کوئی بات نہیں۔ اس نے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے اسے جواب دیا ''زیورخ'' میری طرف سے اس سوال کے جواب میں اس نے کہا ''ونٹر تھور'' اس طرح بات چیت کا سلسلہ چل نکلا۔

میں اس سے کہا کہ تم نے جو ٹی شرٹ پہن رکھی ہے اس پہ عربی زبان کی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ تو اس نے پوچھا ''کیا تم عربی پڑھ سکتے ہو؟'' میں جواب دیا ''پڑھ سکتا ہوں لیکن مطلب جانے بغیر۔'' وہ بڑا حیران ہوا کہ میں عربی پڑھ سکتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی۔ خیر اس نے مجھے مطلب

بتایا۔ پھر اس نے مجھ سے وہی رواتی سوال کیا کہ "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ عربی کیسے جانتے ہو؟" میں نے اسے اپنی بابت تعارفی تفصیل سمجھائی کہ میں ایک پاکستانی مسلمان ہوں۔ میری قومی زبان اُردو ہے۔ پاکستان میں اُردو کے علاوہ علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں جن میں پنجابی، پشتو، بلوچی اور سندھی زبانیں شامل ہیں۔ انگریزی ہماری دفتری زبان ہے۔ عربی ہماری مذہبی زبان سمجھ لو۔ پرانے لوگ عربی لکھنی پڑھنی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے اس کے علاوہ فارسی بھی لوگوں میں عام تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی توجہ فارسی اور عربی کی طرف کم ہوگئی۔ اب لوگ عام بول چال کے لیے اُردو اور انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرا جواب سن کر وہ زور ہنسا اور کہنے لگا کہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری کم ازکم قومی زبان تو ہے۔ ہماری قومی زبان ہی کوئی نہیں۔ ہر کنٹون اور علاقے کی اپنی زبان ہے۔ علاقوں کے حساب سے زبان تقسیم کی ہوئی ہے۔ پورے سوئس میں ساٹھ فیصد آبادی جرمن زبان بولنے والوں کی ہے۔ پچیس فیصد لوگ فرنچ بولتے ہیں اس کے علاوہ باقی آبادی اٹالین اور ریٹرو رومانو (retro romano) بولتی ہے۔ میں نے کہا پبلک انفرمیشن کے لیے یہاں جو چار زبانیں استعمال ہوتی ہیں ان میں سے تین زبانوں کی تو مجھے سمجھ آرہی تھی لیکن چوتھی زبان کا مجھے پتا نہیں چل رہا تھا۔ اب آپ کی بات سے میں سمجھ سکا ہوں کہ وہ چوتھی زبان کونسی تھی۔ وہ کہنے لگا کیا تمہیں اٹالین، فرنچ اور جرمن آتی ہیں۔ میں نے کہا، اٹالین اور فرنچ تو مجھے آتی ہیں۔ جرمن زبان کی تحریر پہچان لیتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ کچھ لفظ سمجھ بھی لیتا ہوں کیوں کہ اس کے کئی لفظ انگریزی سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ میں اٹالین اور فرنچ جانتا ہوں۔ اس نے مجھ سے سوال کیا، تم نے فرنچ اور اٹالین زبان کہاں سے سیکھی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ دونوں زبانیں میں نے پاکستان میں سیکھی تھیں۔

اس نے پھر سوال کیا، آپ کو یہ زبانیں سیکھنے کی ایسی کیا ضرورت تھی؟ تو میں نے جواب دیا۔ مجھے زبانیں سیکھنے شوق تھا۔ پھر اسے میں نے اپنے دادا کا فلسفہ بتایا۔ پھر اسے میں نے یہ بھی بتایا کہ میں پاکستان میں ایک پروفیشنل ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ یہ سن کے وہ کہنے لگا کہ مجھے بھی پاکستان دیکھنے کا اشتیاق ہے کیونکہ میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ وہاں کے پہاڑ اپنی بلند ترین چوٹیوں کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا وہاں سیر کرنے گئے تھے؟ تو کہنے لگا نہیں، ایک سوئس این جی او نے نیپال میں بچوں کے لیے سکول کھول رکھا ہے۔ وہاں چھ مہینے بچوں کو پڑھا کر آرہا ہوں۔ سوئس دو ماہ رہ کر واپس نیپال چلا جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تمہاری اپنی چوائس تھی یا سوئس گورنمنٹ نے تمہیں بھیجا

ہے۔تو کہنے لگا، یہ لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں مختصراً سناتا ہوں۔ ہوا کچھ اس طرح کہ میں نشے کا عادی ہوگیا تھا۔ اتنا زیادہ کہ مجھے ہسپتال داخل کردیا گیا۔ جب میں تھوڑا بہتر ہونے لگا تو انہیں نے مجھے ری ہیبلی ٹیشن سنٹر (rehabilitation centre) بھیج دیا۔ وہاں انہوں نے مجھے ڈیٹوکسیکیٹ (detoxicate) کیا۔اس کے بعد جب میں کافی بہتر ہوا تو انہوں نے مجھے کام پہ بھیج دیا تاکہ میرا دماغ مصروف رہے۔اس دوران مجھے اس سوئس این جی او نے نیپال میں کام کی آفر کی۔ میں نے ان کی آفر تسلیم کرلی اور وہاں چلا گیا۔

میں نے کہا'' تمہاری کہانی کافی دلچسپ ہے۔''

وہ کہنے لگا'' یہ تو میری کہانی ہے تمہاری بھی تو کوئی کہانی ہوگی ،تم یہاں کیا کررہے ہو۔''

تو میں نے کہا'' میں یہاں ٹورازم کے حوالے سے آیا ہوں۔ یہ سن کے وہ کہنے لگا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اگر ہوسکے تو مجھے پاکستان کے بارے میں بتاؤ کہ وہاں کون سا مہینہ سیر کے لیے بہتر ہے۔کون سے علاقے زیادہ خوبصورت ہیں۔ میں نے کہا، پاکستان ویسے تو سارا ہی خوبصورت ہے لیکن پاکستان کے شمالی علاقہ جات بہت خوبصورت ہیں۔ جیسا کہ تم پہلے سے جانتے ہوں کہ وہاں کے پہاڑ بہت سرسبز اور خوبصورت ہیں۔

یہ جان کر وہ کہنے لگا پہاڑ تو ہمارے بھی خوبصورت ہیں۔

میں نے کہا'' مثلاً؟''

مثلاً'' جنگ فراؤ(junge frau) یہ پہاڑ سوئس کا سب سے خوبصورت پہاڑ ہے۔''

میں کہا'' اس کی اُونچائی کتنی ہے۔''

تو کہنے لگا'' چار ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہے۔''

میں نے پوچھا'' جنگ فراؤ کا کیا مطلب ہے۔''

تو کہنے لگا'' اس کا مطلب ہے جوان لڑکی۔ ویسے اس کے علاوہ یورپ کی سب سے اُونچی چوٹی مونٹے بیانکو (monte bianco) ہے۔ یہ چار ہزار آٹھ سو سات میٹر بلند ہے۔ یہ اٹلی اور فرانس کے درمیان واقع ہے۔سوئس کی سب اُونچی پہاڑی پنٹا دوفور (punta dufore) ہے۔ یہ چار ہزار چھ سو چونتیس میٹر اُونچی ہے۔ پھر زرمیت (zarmet) کا نمبر آتا ہے یہ چار ہزار چار سو اٹھتر میٹر اُونچی ہے۔''

تو میں نے کہا" پاکستان میں ایک درہ ہے جسے درہ خنجراب کہتے ہیں۔ وہ چار ہزار میٹر کی بلندی پہ ہے۔ یہاں سے سال کے چھ مہینے پاکستان اور چین کے مابین گاڑیوں کی آمدورفت ہوتی ہے۔ یہاں آکسیجن کی بھی کمی ہوتی ہے۔ اب تقابل کے طور پہ یہ بتاؤ کہ کیا جنگ فراؤ پہ تم بذریعہ سڑک جاسکتے ہو؟"

وہ یہ سن کر بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا" یہ واقعی حیران کن بات ہے۔"

میں نے اسے مزید بتایا کہ پوری دنیا میں دس پہاڑ ایسے ہیں جن کی بلندی آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ ہے۔ ان میں سے آٹھ پہاڑ پاکستان میں ہیں۔ دو نیپال میں ہیں۔ کے ٹو بلندی ۸۶۱۱ (آٹھ ہزار چھ سو گیارہ) میٹر ہے۔ اس کے علاوہ نانگا پربت، کے تھری، کے فور، راکاپوشی، اور التر۔ یہ پہاڑ آٹھ اور سات ہزار میٹر کی بلندی پہ ہیں۔ تمھیں یہ جان کر شاید حیرت ہوگی کہ دنیا کا سب سے اونچا پولو گراؤنڈ" شندور پاس پہ واقع ہے۔ میں ایک دفعہ ایک گروپ کے ساتھ تھا۔ اس میں بوٹنسٹ اور جیالوجسٹ تھے۔ ان میں سے ایک بوٹنسٹ اور ایک جیالوجسٹ جب شندور پاس پہنچے تو بوٹنسٹ نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگا کہ وہ نظریہ جو میری زندگی بھر کے علم اور تجربات کا نچوڑ تھا۔ آج بالکل لغو اور بے بنیاد ثابت ہوا۔ میرے تھیسس مطابق ایک خاص بلندی پہ پودے نشوونما نہیں پاتے۔ لیکن میرا یہ تھیسس غلط ثابت ہوا کیوں یہاں پہ اس موسم میں، اتنی بلندی پہ ان پودوں کا اگنا اور ان جڑی بوٹیوں کا پھلنا پھولنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کئی دفعہ ہم لوگ جو درسی کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ درست نہیں ہوتا۔ اس نے کئی ایک جڑی بوٹیوں کے نمونے بھی لیے۔ جیالوجسٹ پتھروں کی تہوں کو گنتا جاتا اور سالوں کا اندازہ لگاتا جاتا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تو کہنے لگا، میں اس زمین کی عمر گن رہا ہوں۔ ان پتھروں میں تم یہ جو لکیریں دیکھ رہے ہو۔ ایک ایک لکیر ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ میں اس کی اس بات پہ بہت ہنسا تھا لیکن وہ کہنے لگا یہ جو تم ان پتھروں پہ نیلے، پیلے، اور لال چھوٹے چھوٹے پھول دیکھ رہے ہو یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ زمین کا یہ حصہ کئی ہزار سال تک پانی میں رہا ہے۔ ایسی باتیں سن کر میرے جیسا جاہل یہ سوچنے لگا شاید زیادہ پڑھنے سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ حالانکہ سائنسی طور پر یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ یہ تو تھی شندور پاس کی کہانی۔ اس کے علاوہ دنیا کے بڑے گلیشیرز بھی پاکستان میں ہیں۔

وہ کہنے لگا" تمھیں اگر برا نہ لگے تو مجھے یہ تمام نام لکھ دو۔ میں پاکستان گیا تو ان مقامات پہ

ضرور جاؤں گا۔"

میں نے اس سے کاغذ اور پین لیا اور اسے ان تمام مقامات کے نام لکھ دیے۔

میرا تجسس ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی ٹی شرٹ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے یہ ٹی شرٹ کہاں سے لی ہے۔ آخر کار میں نے اس پوچھ ہی لیا کہ تم نے یہ ٹی شرٹ کہاں سے لی ہے۔

تو کہنے لگا "میں نیپال گیا تھا۔ راستے میں رکا تھا۔ میرا ٹکٹ ایمیریٹس ایئر لائن کا تھا۔ ہم لوگ راستے میں دوبئی رکے۔ دوبئی ایئر پورٹ پہ جو شاپنگ آرکیڈ ہے۔ میں وہاں گھوم رہا تھا۔ مجھے یہ ٹی شرٹ پسند آئی اور میں نے خرید لی۔ اب جب بھی میں یہ ٹی شرٹ پہنتا ہوں۔ بہت سے لوگ مجھے عجیب وغریب نظروں سے دیکھتے ہیں، لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ کسی ٹی شرٹ پہ عربی لکھے ہونے سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بندہ دہشت گرد ہے۔"

میں نے کہا "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دنیا میں کچھ اس طرح کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ مغرب میں لوگ عموماً عربی زبان، داڑھی اور محمد، احمد، علی، حسین، حسن عثمان، عمر اور ابن فلاں جیسے نام والوں کو مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں۔"

وہ کہنے لگا "تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن یہ دور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ایسے کئی بلوگ (blog) بن گئے ہیں۔ بیشمار سائینس بن چکی ہیں جو لوگوں کو حقائق سے بہرہ مند کر دیتی ہیں۔"

ہمیں گفتگو کے دوران پتا ہی نہ چلا کہ ٹرین کئی سٹیشنوں پہ رُکی، جب ٹرین زگ (zug) ریلوے سٹیشن پہ رکی تو اس نے مجھے کہا کہ اب ایک سٹاپ رہ گیا اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو جائیں گے۔ میں زیورخ اتر کے اگلی ٹرین پہ ونٹرتھور چلا جاؤں گا اور تم شاید زیورخ ہی رُکو گے۔

میں نے کہا "ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔ نہ جانے کیوں میں اس سے چھپا رہا تھا کہ اگر سوزی نہ ملی تو میں کرائس لنگن ہی جاؤں گا۔ میں نے ٹکٹ بھی کرائس لنگن تک ہی خریدی تھی۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا، موبائل نمبر دیا اور تاکید کی کہ اگر ونٹرتھور آنا ہوا تو اسے فون ضرور کروں، لیکن میں اپنی منزل کے بارے میں جانتا ہی نہیں تھا اسے یقین سے کیسے کہتا کہ میں آؤں گا۔ اسے میں نے پاکستان کی سیر کے لیے کئی آئیڈیز بنا کے دیں۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا کہ پہلے میرا پاکستان کی سیر کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا لیکن اب تم نے میرے تجسس میں اضافہ کر دیا ہے۔ اب جب میں واپس نیپال جاؤں گا تو وہاں سے پاکستان بھی جاؤں گا۔

میں نے پوچھا "تم کب تک جاؤ گے۔ تو کہنے لگا، ابھی تو جون کا مہینہ ہے۔ ستمبر کے مہینے شاید دوبارہ نیپال جاؤں۔ اگست کا مہینہ کیسا رہے گا۔"

میں نے کہا "یہ مہینہ بہت زیادہ مصروف ہوتا ہے۔ ہوٹلوں میں جگہ ہی نہیں ملتی۔ میرا مشورہ ہے نومبر میں جاؤ۔ اگر نومبر میں نہیں تو اکتوبر میں جانا۔"

وہ کہنے لگا "میں دیکھتا ہوں کیا پروگرام بنتا ہے۔ ٹرین زیورخ ریلوے سٹیشن کے آخری پلیٹ فارم کی طرف جاری تھی۔ جیسے ہی ٹرین رکی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔ اس نے میرا نام تک نہ پوچھا۔ میرے پاس اس کا کارڈ تھا۔ میں نے بھی اس کا نام دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ میں ٹرین سے باہر نکلا۔ زیورخ ریلوے سٹیشن پہ کافی چہل پہل تھی۔ جرمنی، آسٹریا اور سوئس میں سٹیشنوں کو ہاپٹ باہن ہوف (hapt bahn hauf) کہتے ہیں۔ میں پلیٹ فارم پہ چلتا چلتا سٹیشن کی اس جگہ آ گیا جہاں بہت سارے الیکٹرانک ڈسپلے آویزاں تھے۔ ایک طرف آنے والی ٹرینوں کا لکھا ہوا تھا اور دوسری طرف جانے والی ٹرینوں کا لکھا ہوا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ابھی کہیں دور سے آواز آئے گی۔ فرشتہ میں آ گئی لیکن مجھے اس طرح کی کوئی آواز نہ آئی۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ ہم پاکستانی بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ کسی لڑکی کے ساتھ ایک دو راتیں گزار لیں۔ جسمانی تعلق قائم کر لیں تو اس کو اپنا سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں سوزی کے معاملے میں تھوڑا پوزیسو (possessive) سا ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا میں جیسے ہی اسے فون کروں گا وہ تڑپ جائے گی اور اسی وقت گاڑی سٹارٹ کرے گی اور میرے پاس آ جائے گی۔ کچھ کچھ اندازہ مجھے لوگانو ریلوے سٹیشن پہ ہی ہو گیا تھا جب میں نے اس نے فون پہ بات کی تھی لیکن میں نے سوچا ٹیلی فون پہ احساس آلہ ہے اس پہ گفتگو کرتے ہوئے انسان کبھی کبھی کسی کے بارے میں غلط رائے بھی قائم کر لیتا ہے۔ میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ وہ نہ آئی نہ ہی میں نے دوبارہ اسے ٹیلی فون کرنا مناسب سمجھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ شاید وہ قیامت نہیں آنے والی۔۔۔ تو میں ان بڑے بڑے ڈسپلیز پہ دیکھنے لگا کہ ونٹرتھور جانے والی ٹرین کس پلیٹ فارم پہ آئے گی۔ پلیٹ فارم نمبر دیکھ کے میں نے اس کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں نے احتیاطاً ایک دو بندوں سے پوچھ بھی لیا تھا۔ ٹرین کے جانے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ میرے پاس کچھ پیسے تھے میں نے سوچا آگے چل کے نہ جانے کچھ کھانے کو ملے نہ ملے، کیوں نہ کوئی سینڈوچ وغیرہ کھا لوں پلیٹ فارمز کے پاس کئی جگہوں پہ چھوٹے چھوٹے دکان نما کیبن بنے

ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پہ گیا۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا تھا جو شکل وصورت سے فلپینی (fillipino) لگتا تھا لیکن مجھے اس کی نیشنیلٹی کا صحیح پتا نہ چلا۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ مجھے ایک سینڈوچ اور ایک کوک کا کین چاہیے۔ اس نے مجھے شیلف میں لگے ہوئے سارے سینڈوچز کی ورائٹی کے نام بتائے اور بتایا کہ ان کے نام کیا ہیں اور ان کے اندر کیا ہے۔ میں نے کہا، میں سبزی یا پنیر والا کوئی سینڈوچ لونگا کیوں کہ مجھے گوشت سے الرجی ہے۔ خاص طور پہ میں سور کو گوشت بالکل نہیں کھاتا۔ اس نے میری بات پہ کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میرے ہاتھ میں کوک کا ایک کین اور ایک عدد سینڈوچ تھما دیا، جس میں ٹماٹر، سلاد کے پتے، ایک ٹکڑا پنیر کا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مطلوبہ رقم ادا کی اور پلیٹ فارم کی طرف آ گیا جہاں ٹرین کھڑی تھی۔ میں نے ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ٹرین میں ملنے والے لڑکے کا کارڈ میں نے پاس پڑے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہ موبائل فون پھینک دوں پھر خیال آیا کہ کرائس لنگن جا کر پھینک دوں گا۔ میں نے اپنی جیب سے تمام اٹالین ٹکٹ، ایک دو چابیاں اور چند ایک ایسے کاغذ جن پہ لوگوں کے پتے، ٹیلی فون نمبر اور ای میل تحریر تھے نکالے اور اُسی ڈسٹ بن میں پھینک دیے۔ جب میں ٹرین میں سوار ہوا تو اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ یہ ٹرین اس ٹرین کی طرح نہیں تھی جس پہ میں لوگانو سے زیورخ آیا تھا لیکن اٹلی کی ریجنل ٹرینوں سے بدرجہا بہتر تھی۔ ٹرین میں سوار ہوتے ہی مجھے یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ اگر وہ لڑکا جس نے مجھے کارڈ دیا تھا دوبارہ مل گیا تو کیا ہوگا کیونکہ اس کو بھی ونٹر تصور جاتا تھا۔ آخرکار میں نے خود کو ذہنی طور پہ تیار کر لیا کہ اگر مل گیا تو اُسے صاف صاف بتا دوں گا کہ اصل میں مَیں یہاں سوزی سے ملنے آیا تھا اور اس کے حوالے سے میں نے خوابوں اور خیالوں کے جو محل کھڑے کر لیے تھے۔ وہ سارے چکنا چور ہو گئے ہیں سو اب کرائس لنگن جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر سیاسی پناہ کی درخواست دوں گا۔ میں نے خود کو خیالوں کے اس بھنور سے نکالا اور کاغذ کے بیگ سے نکال کر سینڈوچ کھانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں کوک بھی پی رہا تھا۔ جب میرا سفری کھانا ختم ہو گیا تو میں نے خالی کین اور کاغذ بن کی نذر کر دیے۔ ٹشو پیپر سے ہاتھ اور منہ صاف کیا۔ سینڈوچ کھانے کے بعد میں نے سوچا چلو اس سے تھوڑی دیر معدہ بہل جائے گا۔ میرا یہ سفر زیادہ طویل نہ تھا۔ قریباً چالیس سے پینتالیس منٹ کا ہوگا۔ زیورخ ریلوے سٹیشن سے جب ٹرین چلی تھی تو اس کے آس پاس پہلے بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ اِکا دُکا عمارتیں آئیں۔ پھر یہ سلسلہ

بند ہو گیا۔ ٹرین ایک دو چھوٹے چھوٹے ریلوے سٹیشنوں پہ رکی۔ ٹھیک وقت پہ ٹرین ونٹرتھور ریلوے سٹیشن پہ پہنچ گئی۔ یہاں سے میری اگلی ٹرین کا وقت بہت مختصر تھا، جس پہ مجھے کرائس لنگن جانا تھا وہ ٹھیک پانچ منٹ بعد کی تھی۔ خوش قسمتی سے سوئس ٹرینیں وقت کی پابندی کرتی ہیں وگرنہ اگر میں اگلی میں ہوتا تو عین ممکن تھا کہ مجھے رات ونٹرتھور ریلوے سٹیشن پہ ہی گزارنی پڑتی۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پہ رکی میں نے آگے پیچھے مڑ کے نہ دیکھا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ پلیٹ فارم پہ لگے ہوئے مونیٹر پہ اپنی ٹرین کا ٹائم اور پلیٹ فارم نمبر دیکھا۔ بالکل ساتھ والا پلیٹ فارم تھا۔ یہ لوکل ٹرین تھی۔ اس کا آخری سٹاپ کرائس لنگن تھا۔ میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین تقریباً خالی تھی۔ یہ ٹرین جب ونٹرتھور سے چلی تو اس نے پہلا سٹاپ فرائن فیلڈ (Freinfeild) کیا۔ یہاں سے ٹرین میں مسافروں کا یک ایسا جتھہ سوار ہوا جس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے تھوڑا ڈر گیا کہ کہیں 9/11 کے چکر میں مشکوک قرار نہ دے دیا جاؤں۔۔۔ کیونکہ سوئس میں اپنی موجودگی کا جواز دینا فی الوقت میرے لیے بہت مشکل تھا، پھر میں نے سوچا اگر انہوں نے پوچھا بھی تو میں کہوں گا کہ میں تمہارے ملک میں سیاسی پناہ لینے آیا ہوں۔ ٹرین چلتی رہی اور آخر کار کرائس لنگن ریلوے سٹیشن آ گیا۔ میں جلدی سے ٹرین سے اُترا اور بنا سوچے سمجھے نیچے سیڑھیوں پہ اُترتا چلا گیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میری کوشش یہی تھی کہ ان فوجیوں کی آنکھوں سے سامنے سے جتنی جلد ہو سکے اوجھل ہو جاؤں۔ سیڑھیاں اُترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک راستہ دوسرے پلیٹ فارم کی طرف جا رہا ہے اور ایک طرف سرنگ ہے، جسے عموماً "سب وے" کا نام دیا جاتا ہے۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اس سب وے پہ چلنے لگا۔ چلتے چلتے باہر سڑک پر نکل آیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں لیکن مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ باہر ہر طرف اندھیرا تھا۔ دور سے ریلوے سٹیشن کے کلاک پہ نظر ڈالی۔ اس پر اس وقت رات کے ۱۱:۴۵ کے اعداد دکھائی دیے۔ اس وقت میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کس طرف جاؤں، کبھی سوچتا سیدھے ہاتھ چلتے چلے جانے کو ترجیح دی۔ اس روڈ کا نام "باہن ہوف سٹراز ے" (Bahnhauf Strasse) تھا جیسے پاکستان میں ریلوے روڈ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا یعنی ریلوے سٹیشن روڈ۔ میں نے سوچا اگر پاس ہی کوئی پولیس سٹیشن نظر آیا تو خود کو ان کے حوالے کر دوں گا اور وہ خود ہی مجھے مہاجرین کے کیمپ میں چھوڑ آئیں گے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے ازیل ہائم یعنی سیاسی پناہ گاہ کا پتہ بتا دیں۔ مجھے مغل صاحب کے دوست جعفر نے بتایا تھا

کہ ازیل ہائم ڈھونڈنا بہت آسان ہے یہ سٹیشن کے بالکل پاس ہے۔ میں نے چند ایک ٹیکسی ڈرائیورز سے پوچھا تو ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم'' سی صورت حال پیدا ہوگی یعنی وہ انگریزی زبان سے ناواقف نکلے اور میں جرمن زبان سے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے ایسا لگا جیسے میں دنیا کے اس کونے میں گم ہوگیا ہوں۔ میں تھکا ہوا تھا، مجھے نیند بھی آنے لگی تھی، بھوک بھی لگ رہی تھی اور اس پہ مستزاد سارا جسم ایسے درد کررہا تھا جیسے کسی نے بیدردی سے پیٹا ہو۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میرا پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز سے بے چینی محسوس ہورہی تھی وہ یہ تھی کہ میں نے ابھی تک اپنے دانت صاف نہیں کیے تھے۔ حالانکہ راستے میں کئی ایک جگہ رُکنے کا موقع بھی ملا۔ وہاں میں چیونگ گم استعمال کرسکتا تھا جس سے اس طرح کے احساسات کم ہوجاتے لیکن میرا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں۔ اب میرے سر میں ہلکا ہلکا درد بھی شروع ہوگیا تھا۔ کیونکہ میرے جسم میں نکوٹین اور کیفین دونوں کی کمی مجھے تنگ کررہی تھی۔ اس وقت میں نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا۔ کبھی کبھی انسان کی ترجیحات اور ہوتی ہیں جب کہ ضروریات کچھ اور۔ میری ترجیحات میری ضروریات پہ غالب آگئیں اور میں نے نئی پناہ گاہ ڈھونڈنے کے نکتے پر اپنی توجہ مرکوز کردی کہ جہاں مجھے رات گزارنی تھی۔ میں بابن ہوف ستراز ے پہ چلتا چلا جارہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک آئی نیٹ کیفے پہ پڑی۔ یہ اس کیفے کا نام تھا۔ اتفاق سے رات کے بارہ بجے یہ کھلا ہوا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ خیر میں انٹرنیٹ کیفے کے اندر داخل ہوا اور اس شخص سے انگریزی میں پوچھا ''کیا یہ نیٹ کیفے اوپن ہے؟''

اس نے جواب دیا ''ہاں''

میں پوچھا ''ایک گھنٹہ انٹرنیٹ استعمال کرنے کے کتنے پیسے۔''

جواب ملا ''ایک گھنٹے کے آٹھ سوئس فرانک اور آدھے گھنٹے کے چار سوئس فرانک۔''

کیفے میں ایک دو لوگ موجود تھے۔ چار کمپیوٹر پڑے ہوئے تھے۔ اس نیٹ کیفے کا مالک انگریزی جانتا تھا اس لیے اس نے بات چیت کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یہ شخص درمیانے قد کا مالک تھا۔ اس کی عمر قریباً پینتالیس سال یا شاید اس سے کچھ زیادہ ہوگی۔ اس کا چہرہ گول آنکھیں چھوٹی چھوٹی، اور ہونٹ پتلے تھے۔ اس نے بہت ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس کا اوپر والا ہونٹ کم دکھائی پڑرہا تھا۔ میں جب اس کے چہرے کا معائنہ کررہا تھا وہ اس وقت وہ کمپیوٹر پر پاس ورڈ لکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی پاس ورڈ لکھا۔ کمپیوٹر کا انٹرنیٹ قابل استعمال ہوگیا۔

میں نے ایڈریس والی بار میں www.hotmail.com لکھا اور کلک کر دیا۔ تھوڑی سی سرچ کے بعد ہاٹ میل کی سائٹ کھل گئی۔ میں اپنا ای میل ایڈریس لکھا۔ پھر پاس ورڈ لکھا۔ چند لمحوں میں میرا میل بوکس کھل گیا۔ میں نے ان بوکس میں اپنی میلز دیکھیں۔ کوئی خاص میلز نہیں تھیں، زیادہ تر جنک میلز تھیں، وہ میں نے کینسل کر دیں۔ اس کے بعد میں نے یاہو سرچ انجن (Yahoo search engine) کھولا۔ اب تک گوگل سرچ انجن (Google search engine) اتنا مشہور نہیں تھا۔ میں نے کرائس لنکن از ڈیل ہائم لکھا اور سکرین پہ ڈیل ہائم کے کئی آپشنز آ گئے۔ مجھے جو ایڈریس چاہیے تھا وہ مجھے مل گیا۔ اس دوران آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں نے اسے آدھ گھنٹہ انٹرنیٹ استعمال کے پیسے دیے اور کوک کے بھی۔ اس کام کے بعد میں انٹرنیٹ کیفے سے باہر آ گیا لیکن اچانک نہ جانے مجھے کیا خیال آیا میں دوبارہ انٹرنیٹ کیفے چلا گیا۔ وہ آدمی مجھے دوبارہ دیکھ کے بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا اب میں کلوز کرنے لگا ہوں۔

میں نے کہا "میں انٹرنیٹ استعمال کرنے نہیں آیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر تمہیں برا نہ لگے تو میرا موبائل فون رکھ لو۔ میں صبح آ کے لے لوں گا۔"

اس نے نہایت مہذب انداز میں کہا "ہاں کیوں نہیں۔ یہ یہاں پڑا رہے گا۔ تمہاری امانت ہے۔ تم صبح آ کے لے جانا۔"

میں نے کہا "بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر میں انٹرنیٹ کیفے سے باہر آ گیا اور دوبارہ ہاہن ہوف ستراز ے پہ چلنا شروع کر دیا۔ میں نے باہر روڈ پہ آ کے لکھا ہوا ایڈریس ایک دو لوگوں کو دکھایا۔

ایڈریس دیکھ کے مجھے انھوں نے یہی بتایا کہ میری مطلوبہ جگہ ریلوے سٹیشن کے دوسری طرف جو کوستانزستراز ے (Costanze Strasse) ہے وہاں ہے۔ میں ہاہن ہوف ستراز ے پہ چلتا چلتا دوبارہ سب وے کی طرف آیا۔ قریباً آدھے منٹ میں کوستانزستراز ے پہ تھا۔ جیسے ہی سڑک پہ آیا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کی ایک ڈونر کباب کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ اس پہ لکھا ہوا ہے۔ ڈونر کباب امبس (imbiss)۔ اس کے ساتھ ایک بلیئرڈ کلب تھا اور پب بھی۔ میں ابھی تک جان نہیں پایا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اس وقت کوستانزرستراز ے پہ چلتے ہوئے میں اس بات سے ناواقف تھا کہ یہاں سے دو سو قدم کے فاصلے پہ جرمن بارڈر ہے یا شاید اس سے بھی کم۔ میں نے سامنے سے دو آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ لگتی تھی لیکن ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ اونچے لمبے

گورے چٹے گپیں لگاتے چلے جا رہے تھے۔ دونوں نے ٹی شرٹس اور شارٹس پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں ٹریزز پہنے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو کاغذ پہ لکھا ہوا پتا دکھایا۔ انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ کہ اس روڈ پہ واپس جاؤں۔ پھر ان میں سے ایک نے مجھے انگریزی میں بتایا کہ پیچھے جو ہیلتھ کلب اور ڈونر کباب امبس (imbiss) ہے بالکل اس کے ساتھ ایک روڈ جاتی ہے اس کا نام ہے ڈوبل لس سترازے (doubless strasse)۔ اس روڈ پہ تھوڑا ہی چلنا پڑے گا۔ تمہیں ازیل ہائم کی عمارت دکھائی دے گی۔ یہ تیرہ نمبر پہ واقع ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اپنے قدم آگے بڑھانے شروع کر دیے اور اسی روڈ پہ واپس چلنا شروع کر دیا جہاں سے میں چل کے آیا تھا۔ ڈونر کباب امبس کے بالکل ساتھ مجھے ایک چھوٹ سا روڈ نظر آیا۔ میں اس روڈ پہ ہولیا۔ اس روڈ کا نام ڈوبل لس سترازے تھا۔ اس روڈ کے بالکل ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یا یوں کہہ لیجیے گندا نالا تھا کیونکہ اس سے کافی ناخوشگوار بو اٹھ رہی تھی۔ میں جس روڈ پہ چل رہا تھا اس کے ایک طرف تو یہ بدبودار گندا نالا تھا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ میں گھروں کے نمبر دیکھتا گیا۔ جب گھر ختم ہوئے تو ایک عجیب سی عمارت آ گئی۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے فوجیوں کی بیرکس ہوں یا پھر اس کا کوئی ہسپتال۔ میں نے اس عمارت کے آس پاس دیکھا شاید کوئی نمبر لکھا ہوا مل جائے لیکن مجھے کہیں بھی تیرہ نمبر لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ میں اسی روڈ پہ آگے چلتا چلا گیا۔ آگے ایک نئی تعمیر شدہ عمارت نظر آئی۔ میں نے اس عمارت کا قریباً اسی طرح چکر کاٹا جیسے کوئی طواف کرتا ہے۔ لیکن مجھے اس کا داخلی دروازہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر کار مجھے ایک کونے میں ایک جنگلہ لگا ہوا نظر آیا۔ اس کے جنگلے پہ لگی ہوئی تختی پر مختصر حروف میں "۱۳" لکھا ہوا تھا۔

میں نے اس جنگلے پہ لگی ہوئی گھنٹی پہ ہاتھ رکھا۔ دو تین دفعہ گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

منگل کے دن ہمیں توقع نہیں تھی کہ آج ثقلین آئے گا۔ آج نیاش کا ککنگ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا پکائیں۔ نیاش کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نیاش کہنے لگا ''یار اگر کہیں سے کھانا آجائے تو مزہ ہی آجائے۔''

میں نے کہا ''نیاش بھائی اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ڈونر کباب لے آتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے پیاتسا سانت اگوستیو (piatzza sant agostino) میں کسی پاکستانی نے ڈونر کباب شروع کیا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن پیاتسا سانت اگوستیو یہاں سے کافی دور ہے۔ تمہارے پاس ابھی لائسنس بھی نہیں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں ورنہ میں چلا جاتا۔''

میں نے کہا ''فون تو سنیں کس کا ہے۔''

نیاش نے فون اٹھایا اور فون پہ ہاتھ رکھ کے کہا ''تمہارے دوست ثقلین کا۔''

پھر نیاش، ثقلین المعروف پری پیکر سے مخاطب ہوا ''ہاں بھئی پری پیکر کیا بات ہے۔''

فرشتہ کا بیانہ چلا کہ ثقلین نے کیا کہا۔

نیاش کی آواز آئی ''ما زاور یہ کس بات کی ہے۔ نگی اور پوچھ پوچھ۔''

یہ کہہ کر نیاش نے فون بند کر دیا۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوا'' آج میں خدا سے کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔ ثقلین آ رہا ہے۔ وہ یہ پوچھ رہا تھا کہ کچھ پکایا تو نہیں کیونکہ وہ ڈونر کباب لے کر آ رہا ہے۔ اس وقت وہ پیاتسا سانت اگوستینو پر کھڑا ہے۔''

''بھلا ہو ثقلین کا، وہ اگر نہ آتا تو کسی اور کو یہ زحمت اُٹھانی پڑتی۔''

''ماڑا وہ میز پہ میونیز، کیچ اپ اور بڑی بوتل سیون اپ کی رکھو۔''

ہم لوگوں نے کھانے کے لیے میز پر مطلوبہ اشیاء رکھ دیں۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ثقلین ہمارے گھر پہ موجود تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا۔ اس میں سے سلور فوئیل میں لپٹے ہوئے ڈونر کباب نکالے، جب میں نے ڈونر گنے تو چار تھے۔ میں نے پوچھا''ثقلین صاحب یہ چار کیوں ہیں۔ ہم لوگ تو تین ہیں۔''

تو ثقلین کہنے لگا'' مجھے ٹیبل پر کھانا کم پڑتا اچھا نہیں لگتا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کوئی بھی پیٹ بھر کے نہ کھائے اور ہر کوئی دوسرے کے نوالے کی طرف دیکھتا رہے۔''

''آپ کا مشاہدہ بڑا تیز ہے۔''

''میرا مشاہدہ کیا خاک تیز ہے۔ مشاہدہ تو آپ کا ہے۔ میں نے پاکستان میں کئی سال صحافت میں برباد کیے ہیں۔ خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا لیکن آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔''

دور سے نیائش بولا'' ماڑا ایک دوسرے کی تعریف بعد میں کرنا مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔''

یہ سننا تھا کہ ہم سب نے کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے دوران مختلف موضوعات پہ باتیں ہوئی رہیں۔ کھانے سے فارغ ہو چکے تو میں نے نیائش اور ثقلین سے پوچھا تم لوگ چائے پیو گے؟ ثقلین نے ہیش کی طرف کہا'' آپ کو تو پتا ہے فرشتہ صاحب میں چائے نہیں پیتا۔''

نیائش نے کہا'' لیکن میں پیوں گا۔''

میں چائے بنانے لگا۔ تو ثقلین نے کہا'' فرشتہ صاحب آپ کے پاس چوتھا باب تو ہوگا؟''

میں کہا'' ہاں ہے۔ پہلے والا پڑھ لیا کیا؟''

''آپ کا کیا خیال ہے میں ایسے ہی یہاں آیا ہوں۔ درحقیقت میں نہیں بلکہ میرا تجسس مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔''

نیائش کہنے لگا'' ماڑا، یہ تم نے کیا لکھا ہے کہ پری پیکر کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔''

"نیائش بھائی آپ راتوں کی نیند کی بات کرتے ہیں۔ میں کام کے دوران سوچتا رہتا ہوں کہ کب چھٹی ہو۔ گھر پہنچوں اور آپ کے ہاں آؤں اور اگلا باب لے جاؤں۔"

نیائش مجھ سے مخاطب ہوا "ماڑا سارا کا سارا ایک ہی دفعہ دے دو۔ جو بھی تم نے لکھا ہے۔"

"نیائش بھائی۔۔۔ ڈوز کی زیادتی نقصان کا باعث بھی ہو سکتی ہے اس لیے دوا وقفے وقفے سے استعمال کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔"

نیائش قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "یہ بات تو درست ہے، ڈاکٹر صاحب!"

مجھے ثقلین نظم وضبط کا بہت پابند محسوس ہوا۔ وہ جس طرح صفحات لے کر جاتا اسی ترتیب میں واپس لاتا۔ میں لکھتے ہوئے ہر صفحے کے اوپر نمبر بھی لکھتا اور باب کا عنوان بھی تاکہ صفحے آپس میں گڈمڈ ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ ثقلین اس ترتیب کا بہت خیال رکھتا۔ میں نے چائے پیالیوں میں ڈال کے میز پہ رکھی اور ثقلین نے ہمارا ساتھ دینے کے لیے تھوڑی سی کوک گلاس میں ڈال لی۔ میں ان دونوں کو چھوڑ کے کمرے میں گیا اور چوتھا باب اٹھا لایا۔ ثقلین نے مجھے تیسرا باب دیا اور چوتھا باب ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہنے لگا "فرشتہ صاحب میرا خیال ہے اس تحریر کو کتابی شکل ملنی چاہیے۔"

میں نے کہا "آئیڈیا اچھا ہے مگر اس کو چھاپے گا کون، پڑھے گا کون؟؟"

ثقلین نے کہا "یہ آپ مجھ پہ چھوڑ دیں۔ ویسے کتنے باب ہیں اس کے؟"

میں نے کہا "اس باب میں تھوڑا سا تجسس ابھی رہنا چاہیے۔ ویسے بھی ایڈیٹنگ فائنل ہونے تک ابواب کی تعداد کا تعین ذرا مشکل ہے۔"

ثقلین نے کہا "۔۔۔آپ ٹھیک کہتے ہیں فرشتہ صاحب۔"

چائے پی چکے تو نیائش سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نیائش اُٹھا تو ثقلین نے بھی اجازت چاہی لیکن میں نے اسے کہا "اگر آپ جلد نہیں سوتے تو تھوڑی دیر رک جائیں۔"

وہ کہنے لگا "آپ کہیں اور میں نہ رکوں۔ مجھے ویسے بھی نیند دیر سے آتی ہے۔ جب سے میں نے یہ پڑھنا شروع کیا ہے کہ میرا دھیان اسی میں لگا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "ثقلین صاحب، سچ بتائیے گا آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں یا یہ ناول نما تحریر آپ کو واقعتاً پسند آئی ہے۔"

تو کہنے لگا "اگر آپ کی تحریر مجھے پسند نہ آئی ہوتی تو میں اس کے مزید ابواب لینے اس

طرح روزانہ دوڑانہ آتا؟ آپ کو پتا ہے اریزو میں کسی کے گھر دو دفعہ جاؤ تو لوگ پی سی او پہ جا کے باتیں کرتے ہیں کہ یہ بندہ روز شام کو کھانے کے وقت وارد ہو جاتا ہے۔ میں آپ کا نہیں کہہ رہا کیوں کہ آپ کا جملہ پورے اریزو میں مشہور ہے "ساڈا کی۔۔۔ کھا جانڑاں اے، اونہاں نصیب کھانڑاں اے" اس لیے مجھے آپ کے ہاں آتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی۔ ویسے بھی نیازش بھائی کی عادت اوروں سے تھوڑی مختلف ہے۔"

میں ثقلین کی اس بات پہ بہت ہنسا۔ اس کا مطلب ہے لوگوں پہ میرے کہے کا اثر ہوتا ہے۔ میں نے کہا "ثقلین ویسے ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔"

"ہاں ہاں ضرور۔"

"آپ چائے کیوں نہیں پیتے۔"

فرشتہ صاحب یہ چائے جو ہے یہ صحافیوں کا پٹرول ہوتی ہے۔ میں نے ہر طرح کی چائے پی ہے۔ دفتروں کی چائے، سڑک کنارے ہوٹلوں کی چائے، گھروں کی چائے۔ پاکستان میں لوگ کھانے کا وقت بھی ہو تو چائے کا پوچھتے ہیں۔ کلرکوں کی چائے، بیوروکریٹس کی چائے، ٹریول ایجنسیوں کی چائے، ادبی تقریبات کی چائے۔ میں نے پاکستان میں اتنی چائے پی ہے کہ مجھے چائے سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں اپنے حصے کی ساری چائے پی چکا ہوں۔"

"لیکن کبھی کبھی پینے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

"یہ سگریٹ کی طرح تھوڑی ہی شروع ہوتی ہے اور نشے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فرشتہ صاحب جب اب اگر اجازت دیں تو میں چلوں گا۔ میں رات سونے سے پہلے چوتھا باب پڑھنا چاہوں گا۔"

"ثقلین صاحب مجھے حیرت ہے کہ آپ کو میرا لکھا ہوا پسند آیا ہے۔"

"پسند اس لیے آیا ہے کہ آپ جب باب کا اختتام کرتے ہیں تو ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ تجسس کا ایک نا ختم سلسلہ ہے کہ جو باب در باب آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کے اندر ایک عجیب کھلبلی مچ جاتی ہے کہ آگے کیا ہوا ہوگا۔ اس طرح آپ کا قاری آپ کی تحریر میں مسلسل انوالو رہتا ہے۔ میری نظر میں کسی تحریر کی اس سے بڑی خوبی کوئی اور نہیں ہوتی۔

"بہت شکریہ۔"

ثقلین نے مجھ سے اجازت لی اور چلا گیا۔

OOO

ثقلین جب گھر پہنچا تو سارے لڑکے جہاں وہ رہتا تھا، حسب معمول ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ثقلین نے آہستگی سے ہیلو ہائے کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور خاکی لفافے سے اگلا باب نکال کے پڑھنا شروع کیا۔

جب میں مایوس ہو چکا کہ اندر سے کوئی نہیں آئے گا اور رات مجھے یہیں ویرانے میں گزارنا پڑے گی تو میں نے سوچا واپس ریلوے سٹیشن پہ چلا جایا جائے لیکن اس میں ایک قباحت یہ تھی کہ عین ممکن تھا پولیس گشت کرنے آئے اور مجھے پکڑ کے لے جائے۔ میں اس بات سے ناواقف تھا کہ چھپا ہوا کیمرہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ ابھی میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اس نے جرمن زبان میں مجھے کچھ کہا لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سمجھایا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے چلوں۔ چلتے چلتے وہ مجھے وہیں لے آیا جہاں سے میں گزر کر آیا تھا۔ وہی بیرک نما جگہ جو مجھے ریڈ کراس کا کوئی دفتر لگی تھی، جس کے سامنے وہ گندا بدبودار نالہ بہہ رہا تھا۔ جس کی بو کے بھبھوکے میرے ناک کے نتھنوں کے اندر سے گزر کے میرے دماغ کو مجروح کرتے رہے تھے۔

میں اس اجنبی کے پیچھے پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا یونیفارم پہنا ہوا تھا۔ جس کی شرٹ کے پیچھے سفید رنگ سے سیکیوریتاس (securitas) لکھا ہوا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور رنگ گورا۔ اس کی شرٹ کے پیچھے جس کیمیکل کلر سے سیکوریتاس لکھا تھا وہ اندھیرے میں چمک دے رہا تھا۔ اس آدمی کے پاس اس کے پروفیشن کے حوالے سے غالباً تمام ضروری لوازمات تھے، مثلاً اس کے بیلٹ کے ساتھ ہتھکڑی کی جوڑی بندھی ہوئی تھی، ایک طرف لکڑی کا یا شاید لوہے کا چھوٹا سا ڈنڈا چمڑے کے کور میں پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف پستول لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف چابیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ بیلٹ ہی پہ ایک طرف وائرلیس ڈیوائس لگی تھی، جس پہ مختلف قسم کے پیغامات نشر ہو رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کے وہ آدمی رُکا تو میں بھی رُک گیا۔ اس نے لوہے کا وہ گیٹ کھولا۔ میں جس گیٹ کے پاس سے گزر کے گیا تھا لیکن مجھے پتا ہی نہ چلا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ جیسے ہی ہم اس گیٹ سے اندر داخل ہوئے اس نے گیٹ کو تالا لگا دیا۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے مجھے کسی نے جیل میں بند کر دیا ہو، مجھے

ایک چیز دیکھ کے بڑی حیرت ہوئی اس نے گیٹ کھولنے کے لیے جو چابی استعمال کی وہ لوہے کی ایک زنجیر کے ساتھ منسلک تھی۔ اس نے چابی زنجیر سے علیحدہ کیے بغیر تالا کھولا تھا اور واپس چابی وہیں رکھ لی تھی جہاں سے نکالی تھی۔ چابی استعمال کرنے کے لیے اس نے چابی کو زنجیر سے علیحدہ کرنے کا تکلف نہیں برتا اور از حد تردد کے ساتھ خود کو مشکل میں ڈالتے ہوئے گیٹ کھولنے کو ترجیح دی مجھے اس کی یہ حرکت بڑی بیگانہ محسوس ہوئی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا ''تم کون سی زبان بولتے ہو۔''

میں نے کہا ''انگریزی اور فرنچ۔''

''میرا مطلب ہے تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟''

''میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔''

''تم لوگ کون سی زبان بولتے ہو، عربی۔''

''نہیں ہم اردو بولتے ہیں۔''

اس سکیورٹی گارڈ نے مالٹایا شاید لال رنگ کا کاغذ اُٹھایا اور ایک سفید۔ یہ دونوں کاغذ مجھے دیئے اور کہنے لگا ان کو پُر کر کے مجھے دے دو۔ پھر اس کے دماغ میں نہ جانے کیا آیا اس نے مجھ سے کہا: ''چھوڑو، تم یہ فارم صبح پُر کر لینا۔ میں تمھیں تمہارے سونے کی جگہ بتاتا ہوں۔''

اس سکیورٹی گارڈ نے ایک اور دروازہ کھولا اور کہا اس کمرے میں چلے جاؤ۔ میں نے بالکل ویسے ہی کیا جیسے اس نے کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سکیورٹی گارڈ میرے لیے دو کمبل، ایک سفید چادر اور ایک تکیہ لے آیا۔ یہ چیزیں میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگا ''اس کمرے سے ملحق غسل خانہ ہے۔ اس میں پلاسٹک کے گلاس پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تمھیں رات کو پیاس لگے تو وہاں سے پانی پی سکتے ہو۔ وہ پانی پینے لائق ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا، بلکہ لاک کر دیا اور وہ اپنے کیبن میں چلا گیا۔ اب میں اس کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ یہ وہ کمرہ تو نہیں تھا۔ جہاں سے میں داخل ہوا تھا۔ وہاں لکڑی اور شیشے کے استعمال سے ایک دیوار سی بنائی گئی تھی اور اس کے ساتھ دروازہ بنا ہوا تھا جس کو وہ لاک کر گیا تھا۔ پچھلی دیوار پہ چار بڑی بڑی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ تین کھڑکیاں بند تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ لاک تھیں۔ ایک کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے ہلکی ہلکی ہوا آ رہی تھی۔ ایک طرف سیمنٹ کی پکی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ یہ واش روم تھا۔ اس میں ایک رفع حاجت کے لیے ڈبلیو سی لگی ہوئی تھی اور ایک طرف دیوار کے ساتھ واش بیسن تھا۔

اس کے پاس ہی چند پلاسٹک کے گلاس پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک میں نے اٹھایا اور واش بیسن کی ٹونٹی کھول کے اس میں پانی ڈالا۔ یہ پانی پینے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا کیوں کہ جب سے میں اریزو آیا تھا یہاں سب لوگ منرل واٹر پیتے دیکھے تھے کہ میرے علم میں یہ بات بھی آئی تھی کہ کمونے دی اریزو (Commune di Arezzo) سے باقاعدہ گھر گھر پیغام بھیجا گیا تھا کہ اریزو میں گھروں کے استعمال کا پانی پینے لائق نہیں اس لیے صحت کی درستی مقدم جانتے ہوئے سب لوگ منرل واٹر استعمال کریں، یا پانی اُبال کر قابلِ استعمال بنائیں۔ میں نے باتھ کی ٹونٹی کا پانی پیا اور گلاس میں دو تین دفعہ ڈال کر پیا۔ اس کے بعد باتھ سے باہر آ گیا۔ جس کمرے میں وہ گارڈ مجھے چھوڑ کے گیا تھا اس میں دو مستطیل میز پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کمبل اس مستطیل میزوں کے پیچھے زمین پہ بچھایا اور اس کے اُوپر سفید چادر بچھا دی۔ سر کے نیچے تکیہ رکھا اور لیٹ گیا۔ دوسرا کمبل میں نے سوچا اُوپر اوڑھ لوں گا لیکن اس چھوٹے سے کمرے میں کافی گرمی تھی۔ گو کہ ان علاقوں میں جون کے مہینے میں بھی اتنی حدت نہیں ہوتی لیکن ۲۰۰۳ء میں عالمی موسمیاتی تبدیلیوں کے زیر اثر کچھ زیادہ ہی گرمی پڑی تھی اور اس کا اثر جہاں پوری دنیا پر پڑا وہاں کراس لنگن پر بھی پڑا۔ گرمی کی وجہ سے فضا میں عجیب سی چپچپی تھی۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حالانکہ میں جتنا تھکا ہوا تھا مجھے ایک دم نیند آ جانی چاہیے تھی۔ میری نظر وال کلاک پہ پڑی جو باہر برآمدے میں ٹیلی فون بوکس کے اُوپر فکس تھا۔ اس پہ صبح کے دو بج رہے تھے۔ میں اس بستر پہ جو میں نے چند لمحے پہلے اپنے ہاتھوں سے بچھایا تھا، کروٹیں بدلتا چلا جا رہا تھا۔ میں اپنے حافظے کے نہاں خانوں میں ماضی میں گزری ہوئی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے حافظے کے اندر بھی کمپیوٹر کی فائیلوں کی طرح، باٹ میل کے ان بوکس کی طرح مختلف فائلیں تھیں۔ جنہیں میں کھول کھول کے دیکھنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی نے میرے ساتھ کیا کیا، میں کیا کر رہا ہوں اور آنے والے کل میں میرے ساتھ کیا ہوگا۔

اچانک میں نے کچھ شور سنا۔ ایسا سنائی دے رہا تھا جیسے کوئی وینیشین بلائنڈ (Venettian Blind) یعنی یورپین چقیں اٹھا رہا ہے۔ جیسے ہی بلائنڈز اوپر اٹھی میں نے کیا دیکھا باہر روشنی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ صبح ہوگئی گویا جب میں اپنے دماغ کے ان بوکس میں اپنی زندگی کی فائلیں دیکھ رہا تھا اس دوران میں ہی کسی مہربان لمحے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ یعنی نیند کی دیوی کچھ دیر مجھ پر مہربان رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کسی اور نے میرے کمرے کا تالا کھولا اور اس کے بعد دروازہ۔ اس شخص

نے بھی وہی یونیفارم پہن رکھی تھی جیسی رات والے گارڈ نے۔ اس نے مجھے ناشتہ دیا اور وہ کاغذ جو مجھے رات کو پُر کرنے کے لیے دیا گیا تھا، دوبارہ دیا۔ ناشتہ میں چھوٹی سی ٹکیہ جیم کی تھی، چھوٹی سی ٹکیہ مکھن کی تھی، دو سوئس بریڈ کے سلائس تھے۔ جسے سوئس لوگ بروڈ کہتے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی وہ مجھے دے کر گیا تھا نہ ہونے سے بہتر تھا۔ میں اس وقت عجیب سا محسوس کر رہا تھا کیونکہ میرے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو رہا تھا۔ میں نے کافی دیر سے دانت صاف نہیں کیے تھے۔ میں نے بنا دانت صاف کیے ہی ناشتے کے نام پر جو کچھ میسر ہوا تھا، بصد شکر کھایا۔ اس کے بعد میں نے وہ فارم جو کہ اردو میں تھا، پُر کر کے اس آدمی کو دیا۔ جب میں ان کاموں سے فارغ ہو گیا تو میں دوبارہ جا کر کے اسی بستر پہ لیٹ گیا جو میں نے گزشتہ شب خود بچھایا تھا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کب میری آنکھ لگ گئی۔ کیونکہ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کوئی زور زور سے چلا رہا تھا "کھانا کھالو، کھانا کھالو۔" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں آنکھیں ملتا اُٹھا۔ اس عورت کا انگریزی بولنے کا انداز انوکھا تھا۔ جب میں اُٹھ بیٹھا تو وہ پھر چلائی "یہ تمہارا لنچ ہے، مجھے اور بھی کام ہے، جلدی کرو۔"

آج اتوار کا دن تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ۱۶ جون ۲۰۰۲ء کی صبح اس دن سویڈن اور سینیگال کا میچ تھا اور سپین اور آئرلینڈ کے درمیان میچ تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے سامنے گھڑی دیکھی جو ٹیلی فون بوتھ کے اوپر لگی ہوئی تھی۔ اس پہ دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ آج چونکہ اتوار تھا اس لیے نہ میرے فنگر پرنٹ لیے جا سکتے تھے۔ نہ ہی میرا انٹرویو اور میڈیکل ہو سکتا تھا۔ جب میں اس کھانے سے جو کہ پاستے کی ایک پلیٹ، سوئس روٹی یعنی بروڈ پر مشتمل تھا، فارغ ہو گیا تو سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ اس دوران کسی نے دروازہ کھولا، یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے فارم پُر کرنے کے لیے دیا تھا۔ کہنے لگا "تم باہر جا سکتے ہو لیکن فی الحال تم لوہے کے جنگلے سے باہر نہیں جا سکتے البتہ داخلی دروازے کے ساتھ جو کھلی جگہ ہے وہاں تمہارے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔" میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ میں وہ سیڑھیاں اُتر کے اس جگہ آ گیا جہاں سے میں داخل ہوا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی صحن نما جگہ تھی۔ جس کا فرش لال اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ یہ اینٹیں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک نل تھی اور اس کے پاس ایک بہت بڑا درخت تھا۔ درخت کے بالکل ساتھ ایک دیوار تھی۔ یہ دیوار لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں جا کے بیٹھ گیا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا نیلا آسمان اور اس پہ کہیں کہیں سفید بادل روئی کے گالوں کی طرح ہوا کے دوش پہ رواں دواں تھے۔ کبھی

کبھی یہ بادل مختلف اشکال میں تبدیل ہو جاتے۔ اچانک کسی نے لوہے کے دروازے کو زور زور سے پیٹا۔ سکیورٹی گارڈ اپنے کیبن سے نکلا اور اس نے گیٹ کھولا۔ دو لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ سکیورٹی گارڈ اندر چلا گیا غالباً دونوں لڑکے انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اس لیے وہ شاید کسی ایسے بندے کی تلاش میں گیا تھا جو ان کی زبان سمجھ سکتا ہو۔ پھر وہ واپس آیا اور مجھ سے انگریزی میں کہنے لگا تم ان کی زبان سمجھتے ہو۔ میں نے کہا نہیں۔ وہ پھر چلا گیا۔ میں سمجھ نہ پایا کہ ماجرا کیا ہے۔

میں نے ان سے انگریزی میں پوچھا "تم کہاں کے ہو۔"

ان میں سے ایک کہنے لگا "میں فلسطینی ہوں۔" میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے فلسطینیوں کی کہانیاں سنی تھیں انھیں ٹی وی پہ دیکھا تھا۔ خاص طور پر فلسطینی لیڈر یاسر عرفات نے اپنی ساری زندگی فلسطینیوں کی آزادی کے لیے صرف کر دی تھی۔ خصوصاً تحریک آزادی فلسطین بابت میں نے بہت کچھ پڑھا اور سن رکھا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا "تم کہاں سے ہو؟"

میں نے کہا "پاکستان سے۔"

اس نے میرا تعارف پوچھا۔ جب میں اسے اپنا نام بتا چکا تو یہی سوال میں نے اس سے کیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

کہنے لگا "ہانیل بن آدم"

پھر میں نے اُس سے پوچھا "تمہارا دوست بات چیت نہیں کرتا۔"

تو اس نے جواب دیا "یہ انگریزی نہیں جانتا۔ اس کا نام عبداللہ بن خطیب ہے۔ لیکن تم یہ بات ان لوگوں کو نہ بتانا کہ مجھے انگریزی آتی ہے۔"

میں نے کہا "تم بالکل فکر نہ کرو۔"

میں جس جگہ بیٹھا تھا یہ ساری عمارت لکڑی اور سیمنٹ کے بلاکس سے بنی ہوئی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو سکیورٹی گارڈ نے مجھے اشارہ کیا کہ تمھیں اندر بلایا گیا ہے۔ میں اٹھ کے اندر آ گیا۔ ایک طرف تو وہ دیوار تھی جہاں ٹیلی فون بوتھ کے اُوپر کلاک نصب تھا۔ ایک طرف کمرہ تھا جہاں میں رات کو سویا تھا اور ایک طرف سکیورٹی گارڈ کا کمرہ تھا۔ میں سکیورٹی گارڈ کے کمرے کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ اس سیکورٹی گارڈ نے مجھے اشارہ

کیا کہ کمرے میں چلے جاؤ۔ میں اندر چلا گیا۔ چند لمحوں میں اس کمرے میں ایک موٹا تازہ آدمی داخل ہوا۔ اس نے بھی سکیورٹی گارڈ جیسی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی یونیفارم پہ بھی سکیوریتاس لکھا تھا۔ یہ شخص موٹا تھا اور اس کا چہرہ لال گوں رنگت لیے ہوئے تھا۔ اس نے چہرے پہ فرنچ کٹ داڑھی سجا رکھی تھی۔ اس کے لال اور گول چہرے پہ فرنچ کٹ داڑھی کچھ عجیب سے لگ رہی تھی۔ جس کمرے میں ہم دونوں کھڑے تھے وہاں بمشکل دو بندوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ اس نے بہت برے انداز میں میری تلاشی لینی شروع کی۔ مگر اس کی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے فوراً حکم جاری کیا۔۔۔ سارے کپڑے اُتار دو۔ میں نے پہلے جوتے اُتارے۔ یہ اچھا ہوا کہ میں موزے نہیں پہنے ہوئے تھے ورنہ جتنی دیر سے میں نے جوتے پہنے ہوئے تھے اتنی دیر تک میں موزے پہنے رکھتا تو ان کی بدبو سے یہ سکیورٹی گارڈ ضرور بے ہوش ہو جاتا۔ جوتے اُتارنے کے بعد جینز اُتاری، پھر ٹی شرٹ کی باری آئی۔ میرا وزن گزشتہ کئی سالوں سے پینسٹھ اور ستر کلو کے درمیان مستحکم چلا آ رہا تھا۔ میرا نظام ہضم بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ میرے جسم پہ چربی نکتی ہی نہ تھی۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ میرا میٹابولزم ہی اس طرح کا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب یہ مجھے کہے گا کہ انڈرویئر بھی اتار دو۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس نے ہاتھوں پہ پلاسٹک کے دستانے چڑھا رکھے تھے، جو بالکل ایسے تھے جیسے غبارے ہوتے ہیں۔ دستانے پہننے کے بعد اس نے میرے پورے جسم پہ ہاتھ پھیرا۔ جب اس کی تسلی ہو گئی۔ تو اس نے میری جینز کی تمام جیبیں اچھی طرح ٹٹول کر دیکھیں۔ پھر اس نے جوتوں کو توڑ موڑ کر دیکھا۔ آخر میں جینز سے بیلٹ نکالی اور اس کو بھی ٹھیک طرح دیکھا۔ میری جینز سے دو سوس فرانک کا جو سکہ نکلا اس کو اس نے پلاسٹک کے لفافے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا اب تم کپڑے پہن سکتے ہو۔ میں نے اس سہولت کی اجازت پاتے ہی دوبارہ کپڑے پہن لیے۔ پھر جوتے بھی۔ اس نے میری تلاشی اس طرح لی تھی جیسے میں کوئی بہت بڑا ڈرگ ڈیلر ہوں۔ یا میں اپنے جسم کے مخفی حصوں میں کوئی خفیہ نقشہ لیے گھوم رہا ہوں۔ آخر کار اس نے مجھ سے کہا تم اس کمرے سے باہر جا سکتے ہو۔

جامہ تلاشی کے بعد مجھے ایک اور جگہ لایا گیا۔ میں اس جیل نما جگہ سے باہر نکلا۔ میں نے اس جیل نما عمارت کے صحن سے کھلا آسمان دیکھا تھا لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں قید خانے سے نیلا آسمان دیکھ رہا ہوں لیکن اب جس جگہ مجھے لایا گیا تھا یہاں کھلی فضا تھی۔ موسم اچھا تھا۔ صبح جو موسم میں چبھن تھی اب وہ نہیں تھی۔ یونہی چلتے چلتے ایک سکیورٹی گارڈ مجھے دوسرے سکیورٹی گارڈ کے حوالے کر

کے چلا گیا۔ میں اس دوسرے سکیورٹی گارڈ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں میری دوبارہ تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد مجھے ایک بہت بڑے ہال میں لے جایا گیا، وہاں بے شمار لوگ تھے۔ عورتیں مرد، کالے، گورے، پیلے انسان۔ اس ہال کی چھت کوئی بیس فٹ اونچی ہوگی۔ ہال میں اندر جا بجا لکڑی کے لمبے لمبے بینچ پڑے تھے۔ ایک دیوار پہ کافی اونچائی پر ٹیلی وژن نصب تھا۔ سینیگال، سویڈن کو دو ایک سے ہرا چکا تھا، جب میں اس ہال میں داخل ہوا تو اس وقت سب لوگوں کی نظریں ٹی وی پر تھیں کیوں کہ آئرلینڈ اور سپین کا میچ ہو رہا تھا۔

میں نے ہال کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ جہاں سے میں داخل ہوا تھا اس کے ساتھ ایک راستہ اندر کو جاتا تھا میں نے اندر جھانک کے دیکھا تو یہ باتھ رومز تھے۔ اس کے ساتھ بہت بڑا کچن تھا۔ ہال کے دونوں اطراف پہ سکون سے چلنے والی "وینڈنگ مشینیں" لگی ہوئی تھی۔ جن میں ڈرنکس اور سنیکس تھے۔ میرے پاس دو سوئس فرانک تھے جو سکیورٹی گارڈ نے پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ ہال کے چاروں اطراف کھڑکیاں تھیں۔ کچھ کھلی تھیں اور کچھ بند۔ کھڑکیاں بہت بڑی اور اونچی تھیں۔ یورپین لوگ انہیں فرنچ ونڈوز کہتے ہیں۔ یعنی فرانسیسی انداز کی کھڑکیاں۔ چھت پہ چار پنکھے لگے ہوئے تھے۔ جن کی آواز سے ہال کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا۔ کافی دیر سے وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ تم کہاں کے ہو۔ تو میں نے جواب دیا پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنے ملک کا نام "انگولا" بتایا۔ یہ ابتدا تھی۔ میں نے تھوڑی دیر کے لیے دیوار پہ لگے ہوئے ٹی وی پہ فٹ بال میچ دیکھا۔ یہ ناک آؤٹ راؤنڈ کا کوئی میچ تھا، مجھے اس میچ میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ چند لمحے بعد میں ایک دروازے کی طرف چل دیا جو سامنے چھوٹے سے باغ میں جا کے کھلتا تھا۔ میں اس دروازے سے گزر کے باغ میں داخل ہوا۔ باغ کیا تھا چھوٹا سا بنجر وتھا۔ یعنی زمین پہ سبزہ تھا لیکن جڑی بوٹیاں خود منتظر تھیں۔ اس جہاز پھونس والی جگہ جسے انہوں نے باغ کا نام دیا تھا کے اردگرد مضبوط جنگلہ لگا ہوا تھا لیکن اس جالی دار جنگلے سے باہر نظر آتا تھا۔ یہاں کھلا آسمان بھی نظر آ رہا تھا۔ اس جنگلے کے باہر وہی بدرو بہہ رہی تھی جس کے تعفن اور بدبو سے میرے دماغ کے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔ اس گندے نالے میں پانی بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس میں بیشمار پلاسٹک کے لفافے، خالی بوتلیں اور خالی ڈبے تیر رہے تھے۔ یہاں پر بھی کافی لوگ تھے۔ میں نے اپنے لیے ایک

جگ پسند کی اور بیٹھ گیا۔ یہاں پہ ہر براعظم کے لوگ تھے۔ ایشیا، افریقہ، یورپ کے غریب ممالک کے لوگ، روسی وغیرہ۔ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے مائیکل جیکسن کا گانا یاد آ گیا۔

We are the world

We are the children

جس باغیچے کے پنجرے میں میں بیٹھا تھا وہاں سے دور سڑک پہ لگے ہوئے سائن بورڈ نظر آ رہے تھے۔ ایک سڑک اوپر کو جا رہی تھی اور اس سے بالکل ملحق ایک دائرہ نما سڑک تھی جسے انگریز رنگ روڈ کہتے ہیں۔ اس کے اوپر جو سائن بورڈ لگے ہوئے تھے ان میں سے ایک پہ لکھا ہوا تھا "فرائن فیلڈ، زیورخ وغیرہ۔ ہمارے پنجرہ نما باغ کے بالکل سامنے ریلوے لائن تھی۔ کرائس لنگن ریلوے سٹیشن کے سائن بورڈ بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ روڈ پہ ٹریفک کم تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ آج اتوار تھا۔ اس پنجرہ نما باغ کے باہر ایک سکیورٹی گارڈ کھڑا تھا جس کا کام ہماری نقل و حرکت پہ نظر رکھنا تھا۔

مجھے وقت کا اندازہ اس وقت ہوا، جب کسی عورت نے اونچی آواز میں صدا لگائی "ڈنر ٹائم"۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا اتنی جلدی۔ کیونکہ گرمیوں میں سورج دیر سے غروب ہوتا ہے۔ آج ۱۶ جون تھی۔ بائیس جون تک دن مزید بڑے ہونے تھے اور راتیں چھوٹی۔ ویسے بھی یورپ کے ان علاقوں میں سورج گرمیوں میں ساڑھے آٹھ بجے غروب ہو جاتا ہے اور رات نو دس بجے تک روشنی رہتی ہے۔ خیر ہمیں تو حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ سب لوگ کھانا کھانے کے لیے میزوں کی طرف بھاگے۔ وہ عورت جس نے ہمیں بلایا تھا زور سے چلائی سارے لائن میں کھڑے ہو جاؤ اور پہلے اپنی اپنی پلیٹ اٹھاؤ، پھر چھری، کانٹا اور چمچ۔ اس کے بعد لائن میں لگ کے اپنی اپنی پلیٹ آگے کرو۔ میں سب کو برابر کھانا ڈال کے دوں گی۔ جب ختم کر چکو گے اور مزید چاہیے ہوگا تو دوبارہ ڈال دوں گی۔ ہم سب نے اس کی ہدایت پہ عمل کیا۔ ہم سب ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ وہ پھر چلائی کہ بچے اور عورتیں ایک طرف اور مرد ایک طرف۔ ہم نے پھر ویسا ہی کیا۔ میں مردوں کی قطار میں سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ یہاں لوگوں کو کھانا تقسیم کرنے والے تین افراد تھے۔ دو عورتیں اور ایک نوجوان۔ وہ عورت جو مجھے صبح ناشتے کے لیے جگانے آئی تھی اور اس کے بعد میرے لیے دوپہر کا کھانا لائی تھی وہ ان تینوں میں موجود نہیں تھی۔ ایک عورت کی عمر لگ بھگ پچاس سال ہوگی۔ اس کی آواز کرخت، بال

سنہرے تھے۔ اس نے کپڑوں کے اوپر ایک ایپرن باندھا ہوا تھا۔ دوسری لڑکی نوجوان تھی۔ عمر کوئی بائیس سے پچیس سال ہوگی۔ اس کی آواز بہت باریک تھی۔ وہ ہم سب کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔ میں قطار کے آخر میں کھڑا، سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ اپنی اپنی پلیٹ میں کھانا لے کے انہی لمبے بنچوں پہ جا کے بیٹھ گئے جہاں کچھ دیر پہلے انہی میں سے کچھ لوگ لیٹے اور کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سب سے آخر میں کھڑا تھا۔ اس لیے میری باری بھی آخر میں آئی۔ اس کرخت آواز والی عورت نے میری پلیٹ میں کوئی چیز ڈال دی۔ پھر تھوڑا سا آگے چلا۔ اس پتلی سی آواز والی لڑکی نے مجھے ایک سیب دیا اور وہی سوئس روٹی دی جسے یہاں بروڈ کہتے ہیں۔ ایک کونے میں ایک دبلا لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے قریب بہت سے جگ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ان میں کیا ہے تو جواب ملا ''سبز چائے۔''

میں نے پلیٹ اُٹھائی، اس کے ایک کونے میں سیب رکھا، بروڈ رکھی اور آ کر انہی لمبے لمبے بنچوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا۔ کھانا جو میری پلیٹ میں تھا۔ بہت ساری چیزوں کا مرکب تھا۔ جب میں نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو مجھے انڈے کا ذائقہ محسوس ہوا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں کیا کھا رہا ہوں اور اس وقت یہ جاننے سے مجھے کوئی سروکار بھی نہ تھا۔ بھوک، ایسا کوئی تکلف روا نہیں رکھتی۔۔۔ جو مل جائے یہ جانے بغیر کہ وہ کیا ہے۔ صبر شکر کرتے ہوئے اسی پر قانع ہونے کی خُو رکھتی ہے۔ ایک طرف ایک لڑکی اپنی بچی کو کھانا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اسلامی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زبردستی اپنے بچی کے منہ میں کھانا ٹھونس رہی تھی لیکن شاید اس چھوٹی سی بچی کو کھانے کا ذائقہ پسند نہیں آیا تھا اس لیے وہ نہیں کھا رہی تھی۔ اچانک وہی کرخت آواز والی عورت نمودار ہوئی جو سب کو کھانا تقسیم کر رہی تھی۔ اس نے یہ ماجرا دیکھا تو گرجدار آواز میں بولی ''ہم سوئٹزرلینڈ میں تمام کھانا کھاتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں پلیٹ میں کھانا چھوڑنے کا کوئی رواج نہیں۔''

اس لڑکی نے جواب دیا ''لیکن یہ بچی ہے اس کو نہیں پسند۔ یہ نہیں کھا رہی۔''

اس عورت نے کہا ''تو تم کھا لو۔ تم پلیٹ کو صاف کر دو۔''

آخرکار وہ کھانا اس بچی کی ماں کو کھانا پڑا جو پلیٹ میں بچا ہوا تھا۔

وہ عورت جو کھانا تقسیم کر رہی تھی۔ اس عورت نے جرمن میں کچھ کہا لیکن کسی کو سمجھ نہ آئی۔ ہم سب کو یہی لگا کہ وہ ہمارے بارے میں کچھ برا کہہ رہی ہے۔ عین ممکن تھا اس نے ایسا نہ کہا ہو۔

میں نے کھانا کھایا یا یوں کہہ لیجیے کہ زہر مار کیا۔ پلیٹ کپڑے سے صاف کر کے ٹرالی میں رکھ دی جہاں دوسری پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ گلاس دوسرے گلاسوں کے ساتھ رکھ دیا اور ٹرے بھی رکھ دی۔ میں نے میز پہ پڑی ہوئی سبز چائے پانی کی طرح پی۔ اس میں میں نے کافی چینی حل کی تھی تاکہ زبان کا ذائقہ ٹھیک ہو جائے۔ یہاں سے فارغ ہوا تو میں مشین کی طرف چلا گیا جہاں پیسے ڈال کے کافی یا دوسری اس طرح کی چیزیں نکلتی تھیں۔ میں مشین کو ندیدوں کی طرح دیکھنے لگا حالانکہ میری جیب میں ایک پائی بھی نہ تھی۔ اس اثنا میں کسی نے میری کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہی انگولا کا لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''کافی پیؤ گے؟''

میں نے کہا ''میرے پاس پیسے نہیں۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔'' اس نے اتنا کہا اور مشین میں اسی سینٹم ڈالے۔ مشین پہ کئی چیزوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے کیپو چینو والے بٹن کو دبایا۔ چشم زدن میں مشین سے ایک سفید پلاسٹک کا گلاس گرا۔ اس میں اندر سے کوئی محلول گرا۔ اس کے بعد کوئی سفید چیز گری۔ تھوڑی دیر میں مشین کے اوپر لکھا ہوا آ گیا کہ کیپو چینو تیار ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے کیپو چینو اٹھالی۔ اس کیپو چینو کا رنگ بہت کالا تھا اور اس کے اندر پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ڈنڈی تھی جو چینی کو ہلانے کے لیے تھی۔ میں نے چینی مکس کی اور کیپو چینو سے شغل کرنے لگا۔ کیپو چینو پیتے ہوئے اس انگولا کے لڑکے کا شکریہ ادا کیا تو وہ کہنے لگا کوئی بات نہیں۔ میں نے کیپو چینو اس لیے پی تھی کہ میرا دل چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ جب میں کیپو چینو پی چکا تو میں تازہ ہوا لینے کے لیے اس باغ نما جگہ دوبارہ چلا گیا جو حوالات کی طرح تھی۔ میں نے کسی سے کوئی بات نہ کی بہت سے لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکا جو ڈیل ڈول میں کافی بھاری بھرکم، قد میں اُونچا لمبا تھا، افریقہ کے کسی ملک سے متعلق لگتا تھا۔ شاید نائیجیرین تھا لیکن مجھے اس بات کا مکمل یقین نہیں تھا کہ وہ نائیجیرین ہے۔ وہ کسی عورت سے باتوں میں محو تھا۔ وہ عورت پچاس سال کی ہوگی یا شاید اس سے کم۔ دیکھنے میں وہ عورت سری لنکن لگتی تھی یا انڈین۔ دونوں بائبل کے پیدائش کے باب کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک موٹا سا آدمی اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔ میرے خیال میں یہ دونوں کسی مشرقی یورپین ملک کے تھے۔ ایک لڑکا اور لڑکی گھاس پہ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کا گھاس پر بیٹھنے کا انداز دیکھ کر مجھے بے اختیار کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ گیا:

سے جھک رہے تھے باغ کے سب پھول اس کے سامنے
گھاس پر بیٹھی تھی وہ فرماں رواؤں کی طرح

غرض اس چھوٹے سے باغیچے میں بہت ساری زبانیں تھیں اور بہت سارے رنگ۔

ان میں سے کچھ کو کچن میں کام کرنے کے لیے بلا لیا گیا۔ کچھ کو ہال صاف کرنے کے لیے کہا گیا، کچھ کو باتھ روم صاف کرنے کے لیے کہا گیا، کچھ کو جس جیل نما باغ میں، میں اس وقت بیٹھا تھا، صاف کرنے کے لیے کہا گیا۔ جب ان کاموں سے سارے فارغ ہو گئے تو اس عمارت کے باہر ایک نیلے رنگ کی وین آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس دوران سکیورٹی گارڈ نے سب کے نام اُونچی آواز میں پکارنے شروع کر دیئے۔ اس نیلے رنگ کی ٹویوٹا وین میں ایک وقت میں دس سے بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے۔ ہماری تعداد تقریباً اسی ہو گی یا نوے۔ اس نے جن دس افراد کے نام لیے وہ تیزی سے جا کر وین میں بیٹھ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق جب بھی ان لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہو گا۔ اس وین والے کو دس یا شاید اس سے بھی زیادہ چکر روز لگانے پڑتے ہوں گے۔ روز دس سے چدرہ کے قریب لوگ آتے۔ ان لوگوں میں تمام ملکوں کے لوگ ہوتے لیکن ان میں مجھے کبھی کوئی جاپانی، امریکی، آسٹریلین یا یورپین یونین کے کسی ملک کا کوئی باشندہ نظر نہ آیا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا اور اس جیل نما باغ میں چکر لگا رہا تھا۔ وقت گزارنے کا اس سے اچھا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ نیلے رنگ کی ٹویوٹا وین کافی چکر لگا چکی تھی۔ ہال میں اور باغ میں چند لوگ رہ گئے تھے۔ اچانک ایک گونج دار آواز مجھے سوچوں کے سمندر سے باہر لے آئی۔ کوئی اونچی آواز میں چلا رہا تھا "سب آ جاؤ، وین انتظار کر رہی ہے۔ یہ آخری چکر ہو گا۔" میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وین کی طرف گیا۔ جس جگہ وین کھڑی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے رات کو میرا آنا ہوا تھا۔ اس تین یا چار منزلہ نامکمل عمارت کا ڈھانچہ تو کھڑا تھا لیکن اس پر پلستر ہونا باقی تھا۔ اس کے سامنے وہی لوہے کا گیٹ تھا جس کے پاس رات کو آ کے میری مسافت تمام ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لوہے کا دروازہ تھا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس کے اُوپر ایک کیمرہ نصب تھا۔ شاید اسی کیمرے نے میری موجودگی سے اس سکیورٹی گارڈ کو آگاہ کیا ہو گا۔ سکیورٹی گارڈ نے سکوت توڑا اور کہا، کومے آلیس، کومن سی بتے Kome alles, kommen sie bitte۔ سکیورٹی گارڈ نے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے کہا کہ تمہارا نام بھی اس لسٹ میں شامل ہے۔ پھر

اس نے مجھے کہا کہ ایک منٹ رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔ یہ تمہارا کاغذ ہے۔ اس پہ تمہاری تاریخ پیدائش اور نام پتا لکھا ہے۔ جب تک تمہارے فنگر پرنٹ نہیں لے لیے جاتے یہی تمہاری شناخت ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں متجسس تھا کہ وین میں ہم لوگوں کو کہاں لے جایا جائے گا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق پہلے دوسروں کے وین میں داخل ہونے کا انتظار کیا۔

لوگ جلدی جلدی وین میں داخل ہو گئے۔ کوئی اگلی سیٹوں پہ بیٹھ گیا کوئی پیچھے۔ ساری وین بھر گئی۔ سارے لوگ وین میں اس طرح ٹھونسے گئے لگتے تھے جیسے دوسری جنگ عظیم میں نازی یہودیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا کرتے تھے۔ اب وین میں کوئی جگہ نہ بچی تھی۔ اگلی سیٹ پہ بیٹھے افراد کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ڈرائیور کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ وین ڈرائیور کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہوگی۔ وہ قدرے موٹا اور بھدا دکھائی دیتا تھا۔ اس پہ طرہ یہ کہ اس کا قد بھی چھوٹا تھا۔ اس ڈرائیور کو سوئس جرمن (جرمن زبان کے کئی لہجے اور رسم الخط ہیں آسٹریا کی جرمن مختلف ہے، سوئس جرمن الگ ہے اور مغربی و مشرقی جرمنی کی جرمن اور طرح کی ہے) کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی۔ یا شاید وہ کرائس لنگن کی کوئی مقامی زبان بول رہا تھا۔ میں ابھی وین سے باہر کھڑا تھا۔ وہ موٹا اور چھوٹا ڈرائیور وین سے اُترا اور وین کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے کہنے لگا ”بتے“ Bitte۔ میں اس کا بتے سننے کے بعد اس جگہ بیٹھ گیا جو اس نے چند لمحے پہلے کھولی تھی۔ درحقیقت وین کی پچھلی طرف یہ جگہ یورپ میں عموماً دورانِ سفر اپنے پالتو کتے کو بٹھانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جیسے ہی میں یہاں بیٹھا یہاں سے کتے کے جسم کی بو آنے لگی۔ جب یہ وین آئی تھی اس میں سے جو پالتو کتا نمودار ہوا تھا۔ وہ اس وقت دورانِ سفر اگلی سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وین والا ہمیں کہاں لے کر جائے گا۔ ڈرائیور نے وین سٹارٹ کی۔ ایک چھوٹا سا چکر لگانے کے بعد وہ اسی بدرو کے پاس سے گزرا جس سے بو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ ایک بات البتہ میں نے ضرور محسوس کی کہ اب بو کی شدت میں کافی حد تک کمی واقع ہوگئی تھی یا شاید میں ایک رات میں اس بو کا کچھ عادی ہوگیا تھا۔ ہماری وین اس بیرک نما عمارت کے پاس سے گزری۔ ایک طرف وہ بدبودار نالا تھا اور دوسری طرف وہ عمارت، جہاں میں نے رات گزاری تھی، جو کہ مجھے بالکل ریڈ کراس کی عمارت کی طرح لگی تھی۔ ڈرائیور تھوڑی دیر میں اُلٹے ہاتھ مڑا اب ہم ستانس سترازے پہ تھے۔ چند لمحوں میں ہماری وین ایک رِنگ روڈ سے گزر کے کرائس لنگن ریلوے سٹیشن کے پاس تھی۔ اس کے بعد ڈرائیور نے گاڑی سیدھے ہاتھ موڑ دی۔ اب ہم جس

روڈ پہ تھے میں اس کا نام نہ پڑھ سکا۔ میں نے چند ایک خوبصورت عمارتیں دیکھیں۔ یہ کم و بیش تین سو سال پہلے بنائی گئی ہوں گی۔ اس بات کا اندازہ مجھے ان کے گوتھک طرز تعمیر سے ہوا۔ اس دوران ڈرائیور وین ایک ترچھی روڈ کی طرف موڑ چکا تھا جو اوپر جاتی تھی۔ اس روڈ کا نام گران نیگے سٹراز ے (Granegge Strasse) تھا۔ اب تک میں اس بات سے ناواقف تھا کہ ہم لوگ کہاں تھے۔ ڈرائیور نے وین موڑی اور چند لمحوں بعد ایک عمارت کے سامنے کھڑی کر دی۔ جیسے ہی وین رکی، ڈرائیور نے جرمن زبان میں کہا، سب لوگ نیچے اتر جاؤ۔ سب نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سارے لوگ اس تین منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ سکیورٹی گارڈ نے نفری پوری کرنے کے لیے سب لوگوں کو گنا۔ اس کے حساب سے ایک نفر کم تھا۔ اس نے جرمن زبان میں اونچی آواز میں کہا "وو است فرشتہ" (wo ist farishta)۔ جب ڈرائیور نے سکیورٹی گارڈ کو چلاتے ہوئے دیکھا تو اسے خیال آیا کہ ایک شخص پیچھے بھی ہے۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ ایک شخص کو اس نے اس جگہ بٹھایا تھا جہاں وہ اپنے کتے کو بٹھاتا ہے۔ وہ وین کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ اس نے وین کا پچھلا دروازہ اٹھایا اور کہا "کومن زی بٹے" kommen sie bitte ڈرائیور کے اس جملے میں بہت زیادہ طنز تھا۔ اب تک سارے لوگ اس عمارت کے اندر داخل ہو چکے تھے سوائے میرے۔ سکیورٹی گارڈ نے مجھے دیکھتے ہی کہا "کومن زی بٹے" اب تک مجھے اس جملے کا مطلب پتا چل چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میں جیسے ہی قدم اندر رکھا۔ اس سکیورٹی گارڈ نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک چھوٹا سا کاریڈور تھا۔ سب سے پہلے سکیورٹی گارڈ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بورڈ دکھایا جس پر ہاؤس یا قیام گاہ میں رہنے کے اصول لکھے تھے۔ اس نے مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا کہ اگر میں نے اس گھر کے اصولوں کی پابندی کی تو میں یہاں رہ سکتا ہوں دوسری صورت میں مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔ میں نے ہاؤس کے قانون اور قاعدے پڑھے۔ اس کے بعد سکیورٹی گارڈ نے میرا کاغذ دیکھتے ہوئے، میرے ملک کا نام پڑھتے ہوئے مجھے ہاؤس کے قاعدے اور قانون اردو زبان میں دیے۔ میں انگریزی میں سب کچھ پڑھ چکا تھا اب اردو میں بھی ان پہ ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ اس کے بعد سیکورٹی گارڈ نے سب کو باری باری بلانا شروع کیا، پھر اس نے مجھے میرے نام سے بلایا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس نے مجھے بستر کی دو چادریں، ایک کمبل، تکیے کا ایک غلاف، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، چھوٹی سی صابن کی ٹکیہ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سب کو یہ بھی کہتا جا رہا تھا کہ جب تم اس ہاؤس کو چھوڑو گے تو یہ ساری چیزیں جمع کروا

کے جانا ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں انتظار کرنے کا کہا گیا۔ ہم سب کاریڈور میں اس کا انتظار کرنے لگے۔ میں کاریڈور میں لگے ہوئے نوٹس بورڈ پہ لکھی چیزیں دیکھنے لگا۔ اس پہ جرمن میں کچھ لکھا ہوا تھا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔

جو شخص ہمیں انتظار کرنے کا کہہ کر گیا تھا وہ آیا اور اس نے اشارے سے بتایا کہ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ میرے علاوہ دو اور لڑکوں کو وہ دوسری اور آخری منزل پہ لے گیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بستر دکھاتے ہوئے کہنے لگا "یہ تمہارا بستر ہے۔ تم نے یہاں سونا ہے۔ یہ تمہاری شناخت کا کاغذ ہے اسے اپنے بستر کے ساتھ رکھنا۔ میں رات کو دس بجے دوبارہ آؤں گا۔ یہ دیکھنے کہ یہ کاغذ تمہارے بستر کے ساتھ لگا ہوا ہے یا نہیں۔"

وہ مجھے جس کمرے میں چھوڑ کے گیا تھا، بہت چھوٹا تھا۔ دیواروں کے آمنے سامنے چار چار اور کمرے کے وسط میں آٹھ بستر لگے تھے۔ یہ بستر دو منزلہ تھے۔ یعنی اس چھوٹے سے کمرے میں آٹھ بستر نیچے اور آٹھ اوپر۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو باہر چھوٹی سی ایک راہداری کی طرف کھلتی تھی۔

میں جب سے یہاں آیا تھا اسی ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھا جو میں اریزو سے پہن کر آیا تھا۔ میں ہفتے کی صبح کو چلا تھا اور آج اتوار تھا، مگر ایسا لگتا تھا یہ گزرے ہوئے لمحات کئی مہینوں پر محیط ہوں۔ پچھلی رات جب میں کرائس لنگن ریلوے سٹیشن پہ پہنچا تھا تو میں اس بات سے ناواقف تھا کہ مجھے اگلی رات کہاں گزارنی ہے اور اب میں اپنے بستر کے پاس کھڑا تھا یعنی اس بات کی فکر نہیں تھی مجھے سونا کہاں ہوگا؟

میں نے سب سے پہلے اپنا وہ کاغذ اپنے بستر کے ساتھ لگا دیا جو کہ اب میری شناخت تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک افریقن لڑکے سے انگریزی میں پوچھا کہ مجھے اگر کپڑوں کی ضرورت ہو تو کیا کروں۔ تو اس نے جواب دیا جس کوریڈور سے تم داخل ہوئے ہو۔ وہاں ایک چھوٹا سا کیبن ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی ہوگا۔ اس سے کہنا، وہ تمہیں کپڑے دے دے گا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے گیا راستے میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دنیا کے کئی ممالک کے لوگ۔۔۔ میں جب کیبن کے پاس پہنچا تو وہ عورت جو اس جیل نما باغ ایک افریقن لڑکے سے بائبل کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جہاں سے کپڑے ملتے ہیں وہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ میں اس کا جواب سن کر واپس آ گیا۔ اب میں چاہتا تھا کہ نہالوں میں روز نہانے کا عادی ہونے کے باوجود دو دن سے نہا نہیں پایا تھا۔ جون

کے مہینے میں یورپین ملکوں میں بھی گرمی ہوتی ہے۔ یہاں کرائس لنگن میں کچھ زیادہ ہی گرمی تھی کیونکہ کرائس لنگن میں ایک بڑی جھیل ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا خاصی مرطوب ہے۔ میں جب باتھ روم کی طرف گیا تو اس کے باہر ایک لمبی قطار تھی۔ میں نے نہانے کا ارادہ ترک کیا اور آگے اس چھوٹی سی راہداری میں کھڑا ہو گیا جو ہمارے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بنی ہوئی تھی۔ میرے سامنے کھلا آسمان تھا۔ جون میں چونکہ سورج دیر سے غروب ہوتا ہے۔ اس لیے مطلع روشن دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے ایک ہی طرح کے تین چار مکان بنے ہوئے تھے۔ ان مکانوں سے ملحق عقبی باغیچوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک ایسی نوعمر لڑکی کھیل رہی تھی جس کی عمر سولہ سترہ کے قریب لگتی تھی، شاید وہ تھوڑی موٹی تھی اس لیے اس کی عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ راہداری میں کھڑے کھڑے میں نے اپنے آس پاس دیکھا تو سارے لڑکے اس لڑکی کو بغور دیکھتے پائے۔ نیچے باغ میں ایک سکیورٹی گارڈ ایک عدد کتے کے ساتھ ہم لوگوں کی نگرانی پر مامور تھا۔ اس کے پاس جرمن شیفرڈ نسل کا کتا تھا۔ جو ہمیں دور سے دیکھ کر اس طرح غرا رہا تھا جیسے اس نے ہمیں دراندازخیال کرلیا ہو۔ اس سکیورٹی گارڈ کا چہرہ گول مٹول اور رنگ سرخ نما تر ایسا تھا۔ اس پہ اس نے چہرے پہ بڑی بڑی مونچھیں سجائی ہوئی تھی۔

جب میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے انگریزی کی نظم ایکوئنگ گرین (echoing green) گونجنے لگی۔ مجھے کالج کے دن یاد آنے لگے، شور وغوغا، کھیل کود، ہلڑ بازی کے مناظر تصور میں آنکھوں کے سامنے سے ہو ہو کر گزرنے لگے، پھر میں اس منظر سے اُکتا گیا اور اس عمارت کا جائزہ لینے لگا جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس میں اس کا تہہ خانہ بھی شامل تھا۔ اس بلڈنگ کا پرانا نام" گارنیگے ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ" (garnegge hotel and restaurant) تھا۔ اس کا پرانا سائن بورڈ ہٹا دیا گیا تھا اور اس پہ رنگ کر دیا گیا تھا لیکن کافی عرصہ نیون سائن بورڈ لگے رہنے کی وجہ سے اس سائن بورڈ کے عکسی اثرات ابھی دیوار سے غائب نہیں ہوئے تھے۔ اسی بنا پر میں یہ راز جان گیا تھا کہ یہ عمارت پہلے ہوٹل ہوا کرتی تھی۔ اس عمارت کے دو پورشن تھے۔ دونوں طرف چار چار کمرے اور دو دو باتھ تھے۔ سب کمروں کے لیے ایک مشترکہ کچن تھا لیکن اب یہ کچن پٹس روم (Putz rom)یعنی صفائی کا سامان رکھنے کا کمرہ بن گیا تھا۔ لیکن اس میں کھانا پکانے کی جملہ سہولیات بھی موجود تھیں۔ ہر کمرے میں نفوس کی تقسیم اس کی لمبائی اور چوڑائی کے مطابق تھی۔ کسی کمرے میں سولہ (۱۶) اور کسی کمرے میں اٹھارہ نفر

تھے۔ پہلے فلور پہ کل تعداد اسی سے سو کے قریب تھی جب کہ دوسرے فلور پہ بھی اتنے ہی افراد رہائش پذیر تھے۔ پہلی منزل پہ سنگل پیرنٹس (single parents) اور فیملیز ٹھہری ہوئی تھی اور دوسرا فلور سنگل یعنی ''چھڑے'' یا غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے تھا۔ گراؤنڈ فلور پہ ایک طرف تو دفتر اور ابتدائی طبی امداد کے لیے چھوٹا سا ہسپتال قائم تھا جبکہ دوسری طرف کچن، ٹی وی لاؤنج، ڈائننگ ہال اور بہت بڑے میس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تہہ خانے میں ایک بہت بڑا باتھ روم لیڈیز کے لیے مخصوص تھا، جس میں بچوں کی نیپی وغیرہ بدلنے کی سہولت موجود تھی اس کے علاوہ لانڈری روم بھی یہیں تھا۔ اس عمارت کا بجلی، پانی اور گیس اور دیگر یوٹیلٹی سسٹم کے انتظام کا کمرہ بھی یہیں تھا۔ میں نے اس عمارت کا بھرپور جائزہ لیا اور واپس اس میس میں آ گیا۔ وہ لڑکی اب بھی باغ میں کھیل رہی تھی۔ رات کے نو بجے ہوں گے لیکن اب بھی سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر پھر سے اُکتا کر میں نے دوبارہ باتھ روم کا رخ کیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو اندر کوئی نہیں تھا لیکن باتھ روم کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہاں سیلاب گزر کے گیا ہو۔ باتھ کے اندر غدر مچا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلے دانت صاف کیے، پھر نہایا اور اس کے بعد جسم کو تولیے کے ساتھ خشک کر کے باہر آ گیا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور آ کر اپنے بستر کے ایک کونے میں اپنا تولیہ لٹکا دیا۔ میرے نیچے ایک ترک کا بستر تھا۔ یہ سارے بستر آرمی باسٹلز کی طرح دومنزلہ تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس ہوٹل کے تہہ خانے میں چلا گیا۔ ٹی وی لاؤنج تک جانے کے لیے تہہ خانے کے کوریڈور سے لاؤنج میں زیادہ تر لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ لاؤنج سے گزر کے میں میس میں آ گیا۔ یہاں پر بھی بیشمار لوگ بیٹھے تھے۔ عورتیں، بچے، مرد گورے، کالے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ ایک طرف نائجیرین، انگولین، اور سینیگالیز بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف عربی بولنے والے ملکوں کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں زیادہ تر لبنان اور فلسطین کے لوگ تھے۔ ایک طرف ترکی اور ایران کے لوگ تھے۔ ایک گروپ الجیریہ، مراکش اور تیونس کے لوگوں کا تھا۔ پاکستانی، انڈین حکومتی سطح پر ایک دوسرے کے لیے غیر دوستانہ جذبات رکھنے کے باوجود اکٹھے پائے جا رہے تھے۔ آج میرا یہاں کسی سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں ایک کونے میں جا کے اکیلا بیٹھ گیا۔ میں یہاں میس میں بیٹھا کرائس لنگن جھیل جس کو بودن سے بھی کہتے ہیں، کا نظارہ کر رہا تھا۔ اٹالین اس کو لاگو دی کوستانساں بھی کہتے ہیں کیونکہ اٹالین زبان میں لاگو، جھیل کو کہتے ہیں۔ اب

تھوڑا تھوڑا اندھیرا پھیل رہا تھا لیکن جھیل میں کھڑی کئی کشتیوں کے رنگ برنگے بادبان نظر آ رہے تھے۔ بظاہر تو میں کرائس لنگن جھیل کے ان رنگ برنگے بادبانوں کو دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے سوچ کے اس سمندر سے پاس بیٹھے پاکستانیوں کی آپسی بات چیت باہر لے آئی۔ وہ میرے بارے میں بات کر رہے تھے لیکن مجھے اس بات کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ میں سوچنے لگا۔ ابھی کل شام کو نو بجے میں زیورخ آنے والی ٹرین میں بیٹھا ہوا تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میری رات کہاں گزرے گی۔ میں تو سوئس یہی سوچ کر آیا تھا کہ سوزی سے ملوں گا۔ شاید وہ میرے لیے کوئی بہتر انتظام کر دے۔ ہم پاکستانی بھی عجیب مخلوق ہیں۔ میں نے کافی عرصہ ٹورسٹ کمپنی میں کام کیا تھا۔ کئی طرح کے لوگوں سے ملا تھا۔ مختلف ملکوں کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ کسی حد تک ان کی عادات سے بھی واقف ہو گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے اندر سے اپنی پاکستانی طرز توقعات کو کبھی ختم نہ کر سکا۔ اگر میں سوزی کی جگہ ہوتا۔ وہ اپنا ملک چھوڑ کے میرے پاس آتی اور اپنا دُکھڑا روتی تو میں ہر صورت میں اس کی مدد کرتا۔ میں تو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اس کے پاس آیا تھا۔ اسے زیورخ پہنچنے سے پہلے فون بھی کیا تھا۔ اس نے اسٹیشن آنے کا یقین بھی دلایا لیکن وہ نہ آئی، حالانکہ یورپین لوگ وعدے کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ اگر اس نے نہ ملنا ہوتا تو فون پہ ہی انکار کر دیتی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود مجھے رات کو سونے کی جگہ بھی مل گئی تھی اور آج میری سوئس میں دوسری رات تھی۔

اچانک مجھے انگریزی میں کوئی جملہ سنائی دیا۔ میں مُڑ کے دیکھا تو ایک افریقن لڑکا مجھ سے لائیٹر مانگ رہا تھا۔ میں کہا ''میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' اس نے مجھ سے پوچھا ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میں جواب دیا ''میں پاکستان کا رہنے والا ہوں اور تم؟''

جواب ملا ''نائیجیریا'' ساتھ ہی اس نے دوسرا سوال کر ڈالا کہ اُسامہ بن لادن کہاں ہے؟

میں نے جواب دیا، مجھے کیا پتا ویسے عین ممکن ہے وہ اس وقت امریکہ میں ہو۔ اس نے کہا، یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔''

میں نے کہا ''وہ پہلے بھی ان کے لیے کام کرتا تھا ہو سکتا ہے اب بھی ان کے لیے کام کر رہا ہو۔''

کسی نے پیچھے سے آواز دی، مائیکل لائٹر لے کر آؤ۔ اس نے کہا ''میں چلتا ہوں۔ وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ میں دوبارہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ میں اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جس کے پاس میں پچھلی رات کو اپنا موبائل فون چھوڑ آیا تھا۔ موبائل فون زیادہ قیمتی تو نہ تھا لیکن غیر ممکن نہ تھا کہ

اگر جامہ تلاشی کے دوران مجھ سے برآمد ہوتا تو کسی مصیبت کا باعث بن جاتا۔ وہ نیٹ کیفے والا بھی کیا سوچتا ہوگا کہ آخر کوئی کیوں چھوڑ گیا اپنا موبائل سیٹ۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے نیا کش کا خیال آیا لیکن یہاں سے کال کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پھر ایک لمحے کے لیے مغل صاحب اور جعفر کے بارے میں سوچنے لگا جنھوں نے مجھے بارڈر پار کروانے کے نام پر ٹرین میں دو تین چکر لگانے کے دو سو یورو لیے تھے۔ سوئس سرکاری مہربانی تھی جو مجھے یہاں کی انتظامیہ نے سونے کی جگہ دی تھی، کھانا دیا تھا اور نہ جانے کتنے دن مجھے یہیں قیام کرنا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے میس سے اٹھ کے جانا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو نوٹس بورڈ پہ لگی ہوئی لسٹیں دیکھ رہے تھے اور کچھ اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اتنے میں ایک سکیورٹی گارڈ آیا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہ نوجوان بہت خوبصورت تھا۔ اُونچا لمبا قد، گورا چٹا رنگ، سبز آنکھیں۔ اس نے چند لوگوں کو ٹی وی لاؤنج صاف کرنے کا کہا، کچھ کی میس صاف کرنے پر ڈیوٹی لگائی، کچھ کو ڈائننگ ہال صاف کرنے کا فریضہ سونپا۔ باقیوں کو اپنے اپنے کمرے میں چلے جانے کا حکم دیا، مجھ سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ میں نے سوچا میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا اس لیے میں نے بھی اپنے کمرے کی راہ لی۔ میں دوبارہ اپنے کمرے کے فرنٹ کوریڈور میں جا کے کھڑا ہو گیا۔ جو سکیورٹی گارڈ اپنے جرمن شیفرڈ کتے کے ساتھ باغ میں نگہبانی کے امور سرانجام دے رہا تھا، اس نے مجھے نیچے سے دیکھا تو کہنے لگا۔ جا کے سو جاؤ یا اپنے کمرے میں چلے جاؤ کیونکہ دس بجے کے بعد یہاں بیٹھنا منع ہے۔ میں نے خیریت اسی میں جانی کہ اس کی بات مان لوں۔ میں اپنے کمرے میں آیا جہاں اُوپر نیچے سول بستر لگے ہوئے تھے۔ میں بستر کے ساتھ لگی ہوئی چھوٹی سی سیڑھی سے اوپر چڑھا اور اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گیا۔ میں نے اب تک جتنی بھی زندگی گزاری تھی میں آج تک اتنی جلد نہیں سویا تھا۔ میں اپنے سکول کے دنوں سے ہی مختصر نیند لینے کا عادی تھا بطور گائیڈ نوکری کے دوران مجھے صبح سویرے اُٹھنا پڑتا تھا لیکن اس کام کے دوران بھی میں رات کو بارہ بجے سے پہلے کبھی نہ سویا تھا۔ پچھلی رات حالانکہ میں بہت تھکا ہوا تھا اس کے باوجود دیر سے سویا تھا۔ لیکن آج دس بجے بستر پہ جانے سے مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے معمولات زندگی میں ہلچل مچا دی ہو۔ میں نے لیٹتے ہی سوچنا شروع کر دیا کہ سوئٹزرلینڈ کی اصل صورت حال اسی فلمی صورت حال سے کس قدر مختلف ہے جیسی خصوصا بولی وڈ کی موویز میں دکھائی جاتی ہے۔ کسی انڈین فلم میں کاجل (انڈین اداکارہ) منفی درجہ حرارت میں یہاں

کے کسی مضافاتی قصبے میں لانگ بوٹ پہن کے شاہ رخ خان کے سامنے ڈانس کرتی ہے۔ یکا یک اسے دو چھینکیں آتی ہیں اور وہ اسے ہوٹل کے ایسے کمرے میں لے جاتا ہے۔ جو دنیا کی تمام آسائشوں سے مزین ہوتا ہے۔ ایک میں تھا سوئس کے ایک ایسے چھوٹے سے کمرے میں، جہاں ایک ساتھ سولہ بستر لگے ہوئے تھے۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے انڈین فلم انڈسٹری میں رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ گیتوں کی پکچرائزیشن کے لیے زیادہ تر سوئٹزرلینڈ کی لوکیشنز کا انتخاب کرنے کو ترجیح دیتے ہیں مگر ان کی پکچرائزیشن اور یہاں کے حقیقی ماحول میں جو فرق ہے وہ خصوصاً ایسے شخص کو جس نے سوئٹزرلینڈ کی خود سیاحت کی ہو، واضح طور پر نظر آجاتا ہے، جس سوئس میں میں گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران رہ رہا تھا یہ سوئس کسی انڈین فلم میں مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ انہی خیالوں میں میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں میں نے کسی کو اونچی آواز میں بولتے سنا۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ دو سکیورٹی گارڈ زور زور سے چلا رہے تھے۔ رول کال ٹائم۔ انہوں نے ہم سب کے نام پکارے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا جنگی قیدی ہوں۔ اٹلی کے ایک اداکار اور فلم میکر نے اس موضوع پہ طنز و مزاح سے بھرپور فلم بنائی تھی۔ جس کا اطالین نام "لا ویتا اے بیلا" (la vita e bella) تھا اور بعد ازاں اس کو انگریزی میں "دی لائف از بیوٹی فل" کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔ اس کو کئی اکیڈمی ایوارڈ ملے۔ اس پر نہ صرف روبیر تو بینینی (Roberto Begnini) کو بہترین اداکار کا ایوارڈ ملا تھا بلکہ اس فلم کو بھی بہترین فلم کا ایوارڈ ملا تھا۔ اس کے کچھ سین بالکل اس کمرے جیسے تھے جہاں میں سو رہا تھا۔ سکیورٹی گارڈ اپنے معمول کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد جانے لگے تو ایک نے کمرے کی واحد کھڑکی بھی بند کر دی جہاں سے ملگجی سی روشنی آ رہی تھی۔۔۔ شاید اُسے علم نہیں تھا کہ دُنیا بھر میں روشنی اُمید کی علامت تصور کی جاتی ہے۔

○

بدھ کی صبح جب میری آنکھ کھلی تو مجھے کچن میں برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی دی۔ اُٹھ کے دیکھا تو نیاکش کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا: ''نیاکش بھائی آج کام پہ نہیں گئے؟''

''ماژا کیا بتاؤں کل رات طبیعت خراب تھی۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اسی لیے کھانا بھی نہ بنایا۔ اللہ بھلا کرے پری پیکر کا کہ وہ ڈونر کباب لے آیا۔ میں نے آج مالک کو فون کر دیا ہے کہ کام پہ نہیں آؤں گا۔ لگتا ہے مجھے فلو ہو گیا ہے۔ یہ بہت واہیات بیماری ہے۔ بظاہر انسان بیمار نہیں لگتا لیکن جسم اندر سے ٹوٹ کے رہ جاتا ہے۔''

''نیاکش بھائی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ فلو میں ایسا لگتا ہے جیسے درد ہڈیوں تک میں رچ بس گیا ہے نتیجتاً عجیب طرح کی بے چینی اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔''

''ماژا تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''آپ چھوڑیں ناشتہ میں بناتا ہوں۔''

''یار چائے میں میٹھا زیادہ ڈالنا۔ منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کڑوا بادام کھا لیا ہو۔''

''نیاکش بھائی آج اگر کوئی چٹخارے دار چیز بنالی جائے تو کیسا رہے۔۔۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ آج پری پیکر، میرا مطلب ہے ثقلین بھی ادھر ضرور آئے گا۔''

''مازاتم نے اسے پتانہیں کس شے پہ لگا دیا ہے۔ یہ تو ہیروئن کے نشے سے بھی برا ہے۔''
''نیاکش بھائی میں باقاعدہ رائٹر وائٹر تو ہوں نہیں، دن بھر کی فراغت سے نجات پانے کے لیے بس یونہی کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ جب مکمل ہو جاتا ہے اس کو دے دیتا ہوں۔ نیاکش نے میرے عذر خواہانہ کلمات پر کچھ تبصرہ نہ کیا۔ لحاتی وقفے کے بعد میں اس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ایسا کرتا ہوں ناشتہ کر کے میں عربی قصاب کی دوکان پہ جاتا ہوں۔ اور گوشت لاتا ہوں۔ گو وہ ممنن دوسروں کے مقابلے میں مہنگا دیتا ہے لیکن اس کے پاس گوشت اچھا ہوتا ہے۔''
''مازا پہلے ناشتہ تو کرلو۔ یہ تو شام کا پروگرام ہے۔ ویسے بھی پری پیکر شام سات بجے کے بعد ہی آئے گا۔''

میں نے ناشتہ تیار کیا۔ نیاکش ناشتہ کر کے کمرے میں چلا گیا اور میں ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اریزو کی لائبریری چلا گیا۔ اریزو کی لائبریری اپنے سسٹم کے حوالے سے جدید ترین لائبریری ہے۔ یہاں آپ کتابوں کو سامنے دیکھ نہیں سکتے۔ آپ کمپیوٹر پر کتاب کا نام دیکھتے ہیں۔ اس کو طلب کرنے پر عملہ آپ کو کتاب لاکر پیش کر دیتا ہے۔ یہ لائبریری ایک تاریخی عمارت میں بنائی گئی ہے۔ اریزو شہر میں پیدا ہونے والے شاعر فرانچسکو پترارکا (Francesco Petrarca) کا گھر اس لائبریری سے متصل ہے۔ یہاں پترارکا کی لائبریری بھی ہے۔ اس میں محفوظ کی گئی کتابوں کو ایک خاص قسم کا کیمیکل لگا کر رکھا گیا ہے تاکہ خراب نہ ہوں۔

پڑھنے کے حوالے سے مجھے اطالین زبان اتنی نہیں آتی اس لیے میں ہمیشہ انگریزی کتب کا متلاشی رہتا ہوں اس لائبریری میں میری دلچسپی کی خاص چیز انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ہے جو یہاں انگریزی زبان میں دستیاب ہے۔ ضروری چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے حوالے سے مجھے اس سے کافی مدد مل جاتی ہے۔ لائبریری سے فراغت پا کر گھر کی راہ لی۔ واپسی کے راستے پر۔۔۔ ویالے مائیکل اینجلو (viale michelangelo) میں ایک بہت اچھی پیزا شاپ ہے، اس سے ایک بڑا پیزا لیا۔

گھر پہنچ کے پیزے کے دو حصے کیے۔ نیاکش ابھی تک سو رہا تھا۔ شاید اس نے ناشتے کے بعد کوئی اینٹی بائیوٹک لی تھی جس کی وجہ سے اسے نیند آ گئی تھی۔ جب میں میز پہ تمام چیزیں سجا چکا تو نیاکش کو آواز دی۔ اس نے اندر سے آواز دی: ''مازا وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ اور یہ تم نے کیا مذاق بنا رکھا

ہے۔ کبھی پیزا لے آتے ہو، کبھی گوشت لے آتے ہو۔۔۔تم ابھی کام نہیں کرتے۔ جب کام کرو گے تو میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔''

''نیائش بھائی کام نہیں ہے تو کیا کھانا چھوڑ دیں۔''

''نیائش نے میرے جواب پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے آئندہ پروگرام سے آگاہ کیا۔۔۔ میں کھانا کھانے کے بعد اپنے ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا، ملاقی لکھوانے (میڈیکل سرٹیفکیٹ)۔ وہ آتا تو چار بجے ہے لیکن وہاں کافی رش ہوتا ہے۔ اس لیے پہلے جا کے ٹوکن لوں گا۔ اس کے بعد اس کا انتظار کروں گا۔''

''نیائش بھائی اٹالین سسٹم بھی عجیب ہے۔ بندہ بیمار ہو تو بھی تکلیف اُٹھائے۔''

''یار سہولت پانے کے لیے تکلیف تو اُٹھانی ہی پڑتی ہے ویسے بھی کیا یہ ڈاکٹر کی مہربانی نہیں ہوگی جو تین دن کا سرٹیفکیٹ لکھ دے، اگر سوموار کو ٹھیک ہوا تو کام پہ چلا جاؤں ورنہ دوبارہ لکھوا لوں گا۔''

میں نے اپنے حصے کا پیزا کھا لیا لیکن نیائش نے تھوڑا سا کھا کر چھوڑ دیا۔ اور کہنے لگا'' یار کچھ کھانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔''

پیزا کھانے کے بعد میں چائے بنائی اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد نیائش نے گاڑی سٹارٹ کی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ جب کہ میں دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

OOO

شام کو چھ بجے نیائش گھر آیا اس کے ساتھ پری پیکر بھی تھی۔ میں نے کہا:'' نیائش بھائی اتنی دیر کر دی، خیریت تھی۔''

''یار پہلے ڈاکٹر کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چار بجے آیا۔ اس نے ملاقی لکھوائی (میڈیکل سرٹیفکیٹ لکھوایا۔) اس کے بعد ڈاک خانے چلا گیا وہاں سے مالک کو ایک کاپی رجسٹر ڈپوسٹ کی ہے۔ اس سارے عمل میں کچھ دیر ہو گئی۔ تمہیں تو پتا ہے یہاں کے ڈاک خانوں میں عملہ عموماً ضرورت سے کم ہی رکھا جاتا ہے۔''

پھر میں پری پیکر سے مخاطب ہوا'' آپ سنائیں کیا احوال ہیں۔۔۔''

''بالکل ٹھیک ہوں۔ آج جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ گھر جا رہا تھا راستے میں نیائش بھائی مل

گئے انہوں نے بہت اصرار کیا تو ان کے ساتھ چلا آیا۔ میں نے ویسے بھی آنا تھا، آپ کو چوتھا باب واپس کرنے۔ تاکہ پانچواں باب مل سکے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' نیائش نے میرے ہاتھ میں لفافہ پکڑایا اور کہنے لگا'' اس میں دو مرغیاں ہیں۔ دو کلو چھوٹا گوشت ہے اور ایک کلو قیمہ۔ آج پری پلیر کھانا بنائے گا۔''

یہ کہہ کر نیائش کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ثقلین نے کھانا بنایا۔ وہ کھانا بھی بنا تا جا رہا تھا اور ساتھ گپ شپ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ہم تینوں نے رات کا کھانا کھایا۔ ثقلین مجھ سے پانچواں باب لے کر چلا گیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرا لکھا ہو ثقلین کو اتنا پسند آیا کہ اگلا باب حاصل کرنے میں اسے تاخیر گوارہ نہ تھی۔ کہاں تو وہ مجھ سے کلام کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور کہاں وہ چھٹی ہوتے ہی ہمارے ہاں آجاتا۔ نیائش بھی بڑا حیران تھا۔

OOO

ثقلین نے جلدی جلدی پانچواں باب پڑھنا شروع کیا۔

اگلے دن جب میری آنکھ کھلی تو کسی کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اٹھو، اٹھو، ٹرانسفر، ٹرانسپورٹ، کنٹونن۔ ان تینوں لفظوں کا مطلب تھا کہ کچھ لوگوں کو یہاں سے منتقل کیا جاتا تھا، کچھ لوگوں کا کنٹونن جانے کا وقت آ گیا تھا اور کچھ لوگوں کو گاڑی میں بٹھا کے اسی جگہ لے جایا جاتا تھا جہاں میں نے کل سارا دن گزارا تھا۔ چشم زدن میں سارے ہاتھ روم بھر گئے۔ سب کے ہاتھ گھٹیا قسم کا سبز ٹوتھ برش تھا اور ایک چھوٹی سی منٹ ٹوتھ پیسٹ تھی۔ کچھ لوگ ہاتھ روم کے باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ لوگ ہاتھ روم کے باہر ہی ٹوتھ برش کے اوپر ٹوتھ پیسٹ لگا کے وہیں کھڑے کھڑے ایسے اپنی دانتوں کو اس طرح برش سے رگڑ رہے تھے جیسے انہوں نے ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش پہلی دفعہ استعمال کیا ہو۔

جن لوگوں کا آج کوئی انٹرویو، میڈیکل، کنٹونن ٹرانسفر کا سلسلہ نہیں تھا۔ ان سب کو یہیں رہنا تھا۔ یعنی ان تمام لوگوں کو گارنیکے ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ میں ہی ناشتہ ملنا تھا جو کہ اب مہاجر کیمپ بن گیا تھا۔ باقی سب کو اسی جگہ لے جایا جاتا تھا جہاں وہ بدبودار بدرو بہتی تھی۔ اسی بیرک نما عمارت میں۔ اسی جیل نما باغ میں۔ اسی نیلی ٹویوٹا وین میں۔ جن لوگوں کو منتقل کیا جاتا تھا، ان لوگوں کی لسٹ میں میرا بھی نام شامل تھا۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اپنی باری کا انتظار کیا۔ وین والے نے اس دفعہ

بھی دس چکر لگائے۔ آخری چکر میں ہم تھوڑے سے لوگ بچے تھے۔ اب کے وین کا ڈرائیور کوئی اور تھا۔ اس نے مجھے انگریزی میں کہا "تم فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ جاؤ۔" میں اس کی ہدایت کے مطابق فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ یہ ڈرائیور جوان اور خوش شکل اور قدرے خوش اخلاق بھی تھا اور انگریزی کا جانکار بھی!۔ اس کے ساتھ مختلف موضوعات پہ باتیں ہونے لگیں۔ میں اس سے پوچھا "جو ڈرائیور ہمیں رات کو لے آیا تھا وہ اتنا غصیلا کیوں تھا؟"

تو کہنے لگا "اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو اسے غیر ملکی پسند نہیں۔ دوسرا جب اس کی شام کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جلدی جلدی گھر جائے۔ کل ویسے بھی اتوار تھا۔"

میں نے کہا "لیکن کل اس نے مجھے اس جگہ بٹھایا، جہاں کتے کو بٹھاتے ہیں۔"

ڈرائیور کہنے لگا "یہ بہت غلط بات ہے۔ اس نے ایسا اس لیے کیا ہوگا کیونکہ وہ صرف ایک فرد کے لیے مزید ایک چکر نہ لگانا چاہتا ہوگا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے ویسے ہی بات کی تھی۔"

تو کہنے لگا "تم نے ویسے ہی بات نہیں کی۔ تم نے محسوس کیا، تمھیں برا لگا اس لیے تم نے بات کی۔" اس تھوڑی سی گفتگو کے دوران ہم اسی بدبودار نالے کے پاس سے گزرے۔ مجھے پتا چل گیا کہ ہمارا مہاجر کیمپ آ گیا ہے۔ اس وین والے نے ہم سب کو وہیں اتار دیا جہاں میں نے کل رات کا کھانا شام چھ بجے کھایا تھا۔ میں نے جیسے ہی ہال میں قدم رکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں ناشتے کی تیاری ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ کام کرنے والے عملے کی مدد کر رہے تھے۔ اور ہر میز پہ سٹین لیس سٹیل کے جگوں میں بھر کے کسی سیال مادے پر مشتمل کوئی ایسی کوئی چیز رکھ رہے تھے جس کا رنگ پیلا تھا۔ اس کے بعد ساری میزوں پر جیم، مارملیڈ اور مکھن کی ٹکیاں رکھ دی گئیں۔ جو عورت ناشتہ تقسیم کر رہی تھی اس نے گرج دار آواز میں کہا "بچے اور عورتیں ایک طرف قطار بنا لیں اور مرد ایک طرف۔ سارے بچے اور عورتیں ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ جنگی قیدیوں کی طرح وہ سب کو ایک ایک بروڈ اور خالی پیالی دیتی جاتی۔ جب ساری عورتوں اور بچوں کو وہ بروڈ اور پیالیاں دے چکی تو اس نے انتہائی کرخت آواز میں کہا "اب تم لوگ آؤ۔" میں ہمیشہ کی طرح قطار کے آخر میں کھڑا تھا۔ جب میں نے بروڈ اور پیالی لی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی اور بھی کھڑا ہے۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو افریقہ کے کسی ملک کا باشندہ تھا۔ اس نے انتہائی آہستگی سے کہا "مجھے پتا تھا تم سب سے آخر میں کھانا لینا چاہتے ہو۔ میں

ایک طرف چھپ گیا تھا۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ جب تم کھانا لے لو گے تو میں تمہارے پیچھے آکے کھڑا ہو جاؤں گا۔ میں نے بالکل ایسا ہی کیا، سو آج سے آخر میں کھانا لینے کا اعزاز میں نے جیت لیا ہے۔'' اس کے بعد اس نے مزید تبصرہ کیا۔۔۔

''صبر دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اگر آپ کے پاس ہو تو۔''

''تم کہاں کے ہو؟''

''میں پاکستان کا رہنے والا ہوں اور تم؟''

میں سیرالیون کا ساکن ہوں۔''

''تمہارا نام؟''

''میرا نام جادو نے چکو چان ہے، اور تمہارا؟''

''میرا نام فرشتہ ہے۔''

جو لوگ کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا'' جلدی سے ناشتہ کر کے اس جگہ کو صاف کرو۔''

جب میں ناشتہ کر چکا تو انتظار کرنے لگا کہ اب میرے لیے کیا حکم جاری ہوگا۔ اسی اثنا میں میرا اور چکو چان کا نام پکارا گیا۔ ایک سکیورٹی گارڈ نے ہم دونوں کو انتظار گاہ میں بیٹھنے کو کہا۔ یہ سکیورٹی گارڈ خاصا طویل قامت تھا۔ اس کا رنگ ایسا گلابی تھا، جیسا سالمن مچھلی کا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے گلابی سالمن رنگ کے چہرے پہ کالے شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ یہ اس کے چہرے پہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے باری باری سب لوگوں کو بلایا اور انھیں انتظار گاہ میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اب ہم اس بڑے ہال کے باہر کھڑے تھے جہاں ہم نے بھکاریوں کی طرح لائن میں کھڑے ہو کر ناشتہ وصول کیا تھا۔ میں جہاں کھڑا تھا یہ وہی جگہ تھی جہاں میں ہفتے کی رات آکے کھڑا ہوا تھا۔ سکیورٹی گارڈ بتا رہا تھا کہ پندرہ دن کے اندر سارے لوگ اس عمارت میں منتقل ہو جائیں گے۔ ابھی اس سلسلے میں ضروری انتظامات ہو رہے ہیں۔

پھر سکیورٹی گارڈ نے کہا'' میرے پیچھے پیچھے آؤ۔''

ہم سب اس کے پیچھے ہو لیے۔ وہ ہمیں اس جگہ لے گیا جہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس نے لوہے کا گیٹ کھولا اور ہمیں اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا میں نے پہچان

لیا کہ یہ وہی جگہ اور وہی کمرہ تھا جہاں میں نے بیتے کی رات گزاری تھی۔ ہم سب کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس کمرے سے ملحق ایک چھوٹا سا باغ تھا جس سے باہر کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سے وہ گندا نالہ بھی نظر آرہا تھا جس کی بُو نے میرے دماغ کو ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ اتنے میں ہمارے کمرے میں ایک خاتون داخل ہوئی اس نے سفید رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی۔ اس نے بلند آہنگ میں کہا'' آج تم لوگوں کے فنگر پرنٹس لیے جائیں گے، تصویریں اُتاری جائیں گی اور اگر وقت بچا تو کچھ لوگوں کے انٹرویوز اور میڈیکل چیک اپ بھی ہوگا۔ ہم لوگ ان دنوں تھوڑے سے غیر منظم ہیں۔ کیونکہ ان دنوں مہاجرین کے لیے نو تعمیر شدہ بلڈنگ میں اپنا سامان منتقل کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

جس کمرے میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ وہاں کچھ تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر کوسوا کے بچوں کے حوالہ سے دُنیا کے مختلف ملک کے بچوں نے بنا کر بھیجی تھیں۔ یہاں کچھ رسائل اور بچوں کے کھیلنے کے لیے کچھ کھلونے پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک ٹی وی دیوار کے ساتھ قدرے اُونچائی پر نصب تھا لیکن ٹی وی کی نسبت سے خاص بات یہ تھی کہ وہ لکڑی کے ڈبے میں بند تھا اور اس ڈبے کو تالا لگا ہوا تھا۔ جس دیوار پہ ٹی وی لگا ہوا تھا اس کے مخالف سمت پہ جو دیوار تھی اس پہ ایک پوسٹر جس پر پلاسٹک کوٹنگ کی گئی تھی چسپاں تھا۔ اس پوسٹر پہ چار سلسلہ وار تصاویر چھاپی گئی تھیں یا یوں کہہ لیجئے کہ چار مدارج میں کسی چیز کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ پوسٹر اس بات کی تشہیر کر رہا تھا کہ آپ بحفاظت جنسی تسکین کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی کہ آپ مباشرت ومجامعت کے دوران کسی جنسی بیماری سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

پہلی تصویر میں کنڈوم بنا ہوا تھا اور اس کو کھولنے کا طریقہ دکھایا گیا تھا۔۔۔

دوسری تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کنڈوم کے اوپر کے حصے کو اوپر سے کیسے دبانا ہے۔۔۔

تیسری تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کنڈوم کو مرد کے جنسی عضو پہ کیسے چڑھانا ہے اور اس کے اُوپر کا حصہ کیسے خالی چھوڑنا ہے جب کہ چوتھی تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا، جب کہ آپ اپنے کام سے فراغت حاصل کرلیں تو اس کو کیسے اُتار کے پھینکنا ہے۔

اس پوسٹر کو دیکھ کر آپ با آسانی سمجھ سکتے تھے کہ یہ پوسٹر مخدوش مباشرت سے بچاؤ کے لیے ایک طرح کا ہدایت نامہ تھا۔ ایک بات مجھے نہ سمجھ آئی کہ اسے یہاں مہاجرین کے کیمپ میں

چسپاں کرنے کا کیا مقصد تھا۔ ممکن ہے یہ مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے لگایا گیا ہو کہ عام آدمی کو جنسی تعلقات کے تناظر میں ایڈز وغیرہ کے خطرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس پوسٹر کے نیچے جرمن زبان کی وضاحتی تحریر میری سمجھ سے بالا تھی لیکن تصاویر اپنی کہانی خود بیان کر رہی تھیں۔

میں کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عورت دوبارہ آئی جس نے سفید رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے میرا نام پکارا اور ساتھ آنے کا کہا، میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کوریڈور میں ہی ایک شخص نے مجھے بنچ پہ بیٹھنے کو کہا۔ میں اس کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے ایک بنچ پہ بیٹھ گیا۔ اس نے انگریزی میں کہا "یہاں بیٹھ کے اپنی باری کا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر میں تمھیں فنگر پرنٹس کے لیے بلایا جائے گا اور تمہاری تصاویر اُتاری جائیں گی۔"

میں اس شخص کو ok سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

ok کہہ کر میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں کسی نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر بلایا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک موٹی سی گوری عورت تھی۔ اس نے سفید رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ ڈاکٹر تھی یا فنگر پرنٹس کی کوئی ماہر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا "جب مشین آن ہو جائے گی تو میں تمہارے فنگر پرنٹس بھی لوں گی اور تمہاری تصویر بھی۔"

میں نے کہا "اوکے۔"

تھوڑی دیر میں اس کی آواز سنائی دی "اوکے مسٹر فرشتہ، مشین آن ہے۔"

یہ بہت ہی جدید قسم کی مشین تھی۔ اس میں کیمرہ بھی نصب تھا، فنگر پرنٹس لینے کی سہولت بھی موجود تھی۔ اور اس کمپیوٹرائزڈ مشین کے ساتھ ایک مونیٹر بھی ملحق تھا۔ یعنی یہ کمپیوٹرائزڈ فنگر پرنٹس تھے۔ اس عورت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کا گورا ہاتھ برف کی طرح یخ تھا۔ مجھے کسی افسانے کا برسوں پہلے پڑھا ہوا وہ جملہ جو افسانہ نگار نے اپنے افسانے کو وائنڈ اپ کرنے کے لیے لکھا تھا۔۔۔ یاد آ گیا۔

"گرم ہاتھ وفا کی نشانی ہوتے ہیں۔ آج پتا چلا اس کے ہاتھ کتنے ٹھنڈے تھے۔"

"مسٹر فرشتہ تم کہاں کھو گئے ہو۔ فنگر پرنٹس لینے میں کیوں میری مدد نہیں کر رہے ہو؟ مجھے تمہاری ساری انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشان لینے ہیں۔"

اس نے میرا سیدھا ہاتھ پکڑا۔ فنگر بائی فنگر ایک ایک کر کے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں بشمول انگوٹھوں کے نشان لیے۔ جب وہ دونوں ہاتھوں کے نشان لے چکی تو اس نے کہا "مسٹر فرشتہ

تمہارا بہت شکریہ۔ اب میں تمہاری تصویریں لوں گی۔ تم کیمرے کی طرف دیکھو۔ تمہیں کیمرے کے اندر کراس کے نشان کو دیکھنا ہوگا۔"

وہ دوبارہ گویا ہوئی "بہت شکریہ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں اس کمرے سے نکل کے دوبارہ اسی کمرے میں آ گیا جہاں میں پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ اب تک قریباً آدھا دن گزر چکا تھا۔ ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے بلا لیا گیا۔ کھانے کا بلاوا دینے والے سکیورٹی گارڈ کی رہنمائی میں اس کے پیچھے چلتے، جب ہم ہال میں پہنچے تو کھانا چنا جا چکا تھا۔ آج کھانے میں چاول اور چکن کا سالن کسی ساس کے ساتھ تیار شدہ تھا۔ میں نے یہ کھانا اپنی مرغوب غذا سمجھ کے کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے میری نظر ایک لڑکی پہ پڑی جو بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی تھا، جس کی عمر دو سال ہوگی۔ درمیانے قد کی لڑکی تھی۔ گھنگریالے کالے بال، خوبصورت چہرے پہ کنول کی پتیوں جیسی دو خوبصورت آنکھیں۔ رنگ گورا، نہ زیادہ پتلی نہ موٹی۔ اس کے جسم میں ایک بھلا لگنے والا سڈول پن تھا۔ عمر اندازاً بائیس سال ہوگی۔ وہ کھانا کھا کے اپنے بچے کے پاس چلی گئی۔ وہ اس کے ساتھ عربی زبان میں کوئی بات کر رہی تھی۔ وہ یقیناً مراکش، تیونس یا الجیریا کی مہاجر ہوگی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے وہ عراق، فلسطین یا کسی اور عربی بولنے والے ملک کی ہو۔ مجھے اس امر کا بڑا تجسس تھا کہ یہ لڑکی کہاں کی ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور "ہیلو" کہا۔ اس طرح ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے فرنچ زبان میں اپنی داستان سنانی شروع کی۔ جو بہت دُکھ بھری تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں پہ آئے ہوئے سب لوگوں کی داستان اور کہانی دکھ بھری ہے۔ ہال میں اس وقت قریباً ایک سو اسی لوگ ہوں گے۔ زیادہ تر لوگ ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے میں سمجھ نہیں پایا کہ ہم دونوں کی ہمکلامی میں ایسی کیا بات ہے کہ جو دوسروں کی دلچسپی کا سامان رکھتی ہو؟

اس کا نام لیلیٰ بنت احمد تھا۔ عرب ممالک میں لڑکیاں شادی کے بعد بھی عموماً اپنے باپ کا نام ساتھ رکھتی ہیں۔ عربوں میں باپ کا نام نہ صرف بیٹے کے نام ساتھ آتا ہے بلکہ بیٹیاں بھی اسے لاحقہ بنانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔

افریقہ تریپن ممالک پر مشتمل بہت بڑا براعظم ہے۔ اس میں ہزاروں علاقائی اور مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ افریقہ کے بعض ممالک میں تین تین سو سے زائد مختلف مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں جہاں تک رائج زبانوں کا معاملہ ہے اس براعظم کے بیشتر ممالک میں ایسے غیر ممالک کی زبانیں

بھی رائج ہیں جنھوں نے انھیں اپنی کالونی بنائے رکھا۔ افریقہ کے کئی ایک ممالک میں اس وقت سے عربی بولی جاتی ہے، جب سے مسلمانوں نے افریقہ میں قدم رکھا۔ افریقہ کے بعض ملکوں میں فرنچ، انگلش اور پرتگالی زبان رائج ہے۔ اس کے علاوہ ساؤتھ افریقہ میں انگریزی اور ڈچ زبان کی آمیزش سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جس کو افریکان کا نام دیا جاتا ہے۔ افریقہ کی پرانی زبانوں میں آمیرک اور سواہلی ہیں۔ یہ زبانیں دنیا کی چند ایک قدیم ترین زبانوں میں سے ہیں۔

لیلی فرنچ زبان بولتی تھی کیونکہ وہ مراکش کی رہنے والی تھی۔ مراکش، تیونس اور الجیریا یہ تینوں ممالک ایسے ہیں جو ایک عرصہ تک فرانس کے قبضہ میں رہے ہیں۔ اس لیے یہاں عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی رائج ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے جن جن ممالک پہ انگریزوں نے قبضہ کیا وہاں فطری طور پر انگریزی زبان کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور وہ اشرافیہ کی زبان بن گئی۔

لیلی کا حسن دلنواز مجھ پر براہ راست اثر انداز ہوا۔ مجھے اس کے ملیح چہرے کی ہلکی سی مسکان بہت بھائی۔ میں لڑکیوں کے معاملے بہت بیوقوف ہوں۔ میں ابھی سوزی کے فریب سے ہی نہ نکل سکا تھا۔ اب یہ پہلی نظر کی پسندیدگی۔۔۔ گو کہ اس لڑکی کے ساتھ ایک بچی بھی تھی۔ یورپ میں ملبوسات کا گلابی رنگ عموماً صنف نازک کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔۔۔ بچی کے لباس کی ساخت لڑکوں کے ملبوسات کی تھی۔ غالباً اس کے پاس گلابی رنگ کے کپڑے نہیں تھے۔ اُسے مہاجر کیمپ والوں نے جو بھی کپڑے دیئے وہ اس نے بچی کو پہنا دیئے۔ اس لیے لباس سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس "بے بی" کی تذکیر و تانیث کیا ہو سکتی ہے۔!

میں نے دل ہی دل میں بے شمار خاکے بنا لیے تھے۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ اگر کوئی ایسی صورت وقوع پذیر ہوئی کہ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری جا سکے تو میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔ بھلے وہ ایک بچی کی ماں تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا جیسے ہی مجھے کوئی مناسب موقع ملا میں اسے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میرے خوابوں کا محل اس وقت چکنا چور ہو گیا جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کا شوہر اٹلی کے شہر میلانو میں رہتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جیسے ہی اس کے یہاں رہنے کا انتظام ہو جائے گا وہ اُسے ملنے آئے گا۔ میں دکھی دل کے ساتھ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے یہاں پہ کام کرنے والے عملے میں سے ایک عورت نے آواز دی۔ میں اس کے پاس گیا تو کہنے لگی "تم میرے ساتھ آؤ" تھوڑے توقف کے ساتھ وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب

ہوئی: ''تم نے ٹائیلٹ صاف کرنے ہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں سامان کہاں پڑا ہے۔'' میں نے لیلی کو فرنچ زبان میں ''ایکسکیوزے موا'' (excuse moi) کہا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ جب میں عورت کے ساتھ جا رہا تھا راستے میں دو افراد کھڑے میرے بارے میں بات کر رہے تھے۔

''پاکستانی لگتا ہے۔''

''انڈین بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''مگر اپنے انداز سے تو پاکستانی لگتا ہے۔''

''لیکن یہ انگریزی کے ساتھ ساتھ کوئی اور زبان بھی بولتا ہے۔ دیکھا نہیں اس لڑکی کے ساتھ کس طرح گفتگو کر رہا تھا۔''

میں ان کے پاس گیا اور کہا ''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے میں پاکستانی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اس عورت کے ساتھ چلا گیا کیونکہ مجھے سوئٹزر لینڈ کے مہاجر کیمپ کے ٹائیلٹ صاف کرنے تھے۔

OOO

میں اس مہاجر کیمپ کے اس باغ میں بیٹھا تھا، جو جیل نما تھا۔ میں وہاں بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا کہ میں کس جگہ رہ رہا ہوں۔ یہ ملک جس کا نام سوئٹزر لینڈ ہے، جس کو لوگ زمینی جنت کہتے ہیں، جس ملک میں بے شمار جھیلیں ہیں۔ جس میں جنت نظیر وادیاں ہیں۔ جس میں ریلوے کا بہترین نظام ہے، جس ملک میں جنگ فراؤ، مونتے روسا اور مونٹے جیسے پہاڑ ہیں۔ ظہیر الدین بابر نے وادیٔ کشمیر دیکھ کر کہا تھا کہ ''اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہیں ہے۔'' اس نے یقیناً سوئٹزر لینڈ نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اس کے بارے میں بھی یہی کہتا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ کیا سوئٹزر لینڈ۔ میرے لیے جنت ہے، دوزخ ہے یا کوئی برزخ؟ میں خود کو دانتے الیگیری (Dante Allighieri) کی کتاب ڈیوائن کامیڈی (Divina Commedia) کے کسی حصے میں نہیں پا رہا تھا۔ نہ میں جنت میں تھا، نہ دوزخ میں، اور نہ کہیں برزخ میں، میں انہی خیالات میں گم تھا کہ کسی نے آواز دی ''اے او پاکستانی، رات کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا ''ابھی تو دن کے ساڑھے پانچ بجے ہیں۔''

اس نے کہا ''کیمپ کے عملے کا کہنا ہے کہ جتنے لوگ بھی باغیچے میں ہیں انہیں اندر بلا لو۔''

جون کا مہینہ تھا۔ بہت گرمی تھی۔ چونکہ اس شہر کے پاس جھیل ہے اس لیے جسم میں ایک

عجیب قسم کی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی ہے۔فضا میں ایک عجیب قسم کی گھٹن تھی۔ کچھ تو میں اس جیل نما باغ سے گھبرا گیا تھا کچھ گرمی تھی اور کچھ رات کے کھانے کا ٹائم ٹیبل بدل جانے کی وجہ سے میں طبیعت میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ رات کا کھانا مجھے سہ پہر ساڑھے پانچ بجے تناول فرمانا ہوگا۔ جون کے مہینے میں سورج ویسے بھی دیر سے غروب ہوتا ہے۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا۔ میں ہال کے اندر داخل ہوا۔ دوبارہ قطار میں کھڑا ہوا گیا۔ جنگی قیدیوں کی طرح، جب بھی میں کھانا لینے قطار میں آ کر کھڑا ہوتا، احساس ذلت سے خود کو بڑا انجل محسوس کرتا۔ مجھے ایک بات سمجھ نہ آئی کہ سوئس حکومت نے مہاجرین کو کھانا دینے کا اس طرح کا نظام کیوں رائج کیا ہوا ہے؟ پھر میں نے سوچا کہ یہ ان کا ملک تھا وہ جیسے چاہتے کرتے اور جیسے چاہیں کریں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے درخواست دے کر تو نہیں بلایا، میں خود اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔ ان کا جو بھی طریقہ کار ہے مجھے اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا، پھر مجھے اس عورت کی آواز سنائی دی جو کھانا تقسیم کر رہی تھی۔ ''مزید چھ افراد اپنی اپنی پلیٹیں پیش کریں۔'' اس دفعہ کوئی اٹالین انداز کا کھانا تھا۔ نوڈلز، بروؤ، ساس، سلاد اور ایک ایک سیب۔ یہ چیزیں اس نے یکے بعد دیگرے ہم سب کی پلیٹوں میں ڈال دیں۔

اس ہال میں اس وقت ہم کوئی سو کے قریب لوگ ہوں گے۔ سارے کے سارے لکڑی کی لمبی میزوں پہ اپنی اپنی پلیٹیں رکھ کے کھانا کھا رہے تھے۔ ان میزوں کی خوبی یہ تھی کہ یہ بند بھی ہو جاتی تھیں۔ ذائقے کے حوالے سے کھانا بہت عمدہ تھا۔ حالانکہ مجھے اس وقت بالکل بھوک نہیں تھی۔ اس کے باوجود کھائے چلا جا رہا تھا۔ ابھی میں کھانے میں مصروف تھا کہ جن لوگوں نے کھانا تقسیم کیا تھا ان میں سے ایک مرد بولا'' تم لوگوں نے آدھے گھنٹے میں کھانا ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد اس جگہ کو صاف کرنا ہے۔ کچھ لوگ کچن میں صفائی کا کام کریں گے۔ کچھ برتن دھوئیں گے۔ کچھ ہال کی صفائی کریں گے۔ کچھ باغ کی صفائی کریں گے اور کچھ لوگ ٹائیلٹ صاف کریں گے۔ جب آپ سب لوگ اس کام سے فارغ ہو جائیں گے تو آپ سب کو گاریگے سترا سے والے ہوٹل گاریگے منتقل کر دیا جائے گا۔''

سب نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق کچھ لوگ کچن میں چلے گئے۔ کچھ باغ میں، کچھ ہال میں، کچھ ٹائیلٹ صاف کرنے، میں کچن میں چلا گیا۔ وہاں تین چار عورتیں کام کر رہی تھیں۔ میں نے ایک سے کہا'' میں کچن کی صفائی میں تمہاری مدد کروں گا۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر میں نے اس عورت سے اجازت لے کر برتن دھونے والی مشین میں برتن

رکھے اور مشین چلا دی۔ وہ بڑی حیران ہوئیں۔ ان میں سے ایک مجھے کہنے لگی: ''تمہیں برتن دھونے والی مشین استعمال کرنی آتی ہے؟''

میں نے کہا'' یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پلیٹوں کا گند، گند کے ڈبے میں پھینکو۔ اس کے بعد پلیٹیں مشین کے اندر بنی ٹریز میں ترتیب سے رکھ دو۔ اور اس کے بعد مشین چلا دو! میں نے اس مشین میں قریباً تین سو پلیٹیں دھوئیں۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ جب میں اٹلی آیا میں نے پہلا کام یہی کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ویٹر کے کام پہ لگا دیا گیا تھا۔

جب میں برتن دھو چکا تو ان میں سے ایک مہربان عورت نے مجھے ایک سیب دیا۔ کہنے لگی ''تم نے بہت کام کیا ہے۔ ایک سیب لے لو۔ تمہیں جب بھی بھوک لگے تو ہم سے آکے مانگ لیا کرو۔''

میں بڑا حیران ہوا کہ میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں۔ میں کچن سے باہر آیا اور وہ سیب انگولا کے اس لڑکے کو دے دیا جس نے کل مجھے کافی پلائی تھی جب سب لوگ سارے کاموں سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے ہمیں حسب سابق دس دس کی ٹولی میں گارنیکے ہوٹل منتقل کرنا شروع کر دیا۔

درحقیقت اس بلڈنگ کا نام گارنیکے ہوٹل نہیں تھا بلکہ یہ شلافن ہائم یعنی ''سلیپنگ ہاؤس'' تھی لیکن چونکہ پہلے کبھی یہ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اسے سب اسی نام سے پکارتے تھے۔ اب بھی نئے لوگ آ رہے تھے۔ روز کوئی نہ کوئی آتا۔ جیسے میں ہفتے کی رات یہاں وارد ہوا تھا۔ اب مجھے یہاں آئے دو دن بیت چکے تھے۔

ہمیں واپس ہوٹل لایا گیا تو شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ اتفاقاً ان دنوں موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ چونکہ فضا میں آلودگی بالکل نہیں تھی اس لیے آسمان کچھ زیادہ ہی نیلا دکھائی دیتا تھا۔ میں گارنیکے ہوٹل کے ٹیرس میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ حجرو کے، ٹیرس، کوریڈور۔ جہاں جس کو جگہ ملی تھی بیٹھا ہوا تھا۔ بچے، جوان، عورتیں مرد، گورے، کالے ہر طرح کے لوگ تھے۔ حتیٰ کہ ایک حاملہ عورت بھی تھی جس کی زچگی میں ابھی قریباً تین ماہ باقی تھی۔ مجھے تو اس بات پہ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ اس حالت میں سفر کیسے کر کے آئی ہوگی۔ گارنیکے ہوٹل کی ہر جگہ پہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ تولیے، انڈرویئرز، عورتوں کے بریزیئر، ٹی شرٹس، جس کو جہاں جگہ ملی اس نے اپنے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے لٹکائے ہوئے تھے۔ گو کہ اس کی اجازت نہیں تھی لیکن نئے لوگوں کو مختصر وقت میں قاعدے کا پابند کرنا مشکل تھا۔ مختلف زبانیں، مختلف

تہذیبیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا، بلکہ کئی نئے لوگ آتے۔

میں ٹیرس میں بیٹھے بیٹھے اردگرد کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم چپک رہا ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فضا میں نمی بہت زیادہ تھی۔ گرمی بھی بہت تھی۔ میں نے سوچا چلو باتھ روم میں جا کر نہا تا ہوں۔ جب وہاں پہنچا تو باتھ روم اندر سے بند تھا۔ میں اس ہوٹل کے ایک دوسرے باتھ روم میں چلا گیا۔ اس کا کموڈ بند تھا۔ یا یوں کہیئے کہ اس کی ڈبلیوسی کے پانی کی نکاسی کا نظام خراب ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت زیادہ بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں بدبو کی پرواہ کیے بغیر موقعے کا فائدہ اٹھایا اور جلدی جلدی صابن لگا کے جسم پہ پانی گرایا۔ نہا کر جسم کو تولیے سے سکھایا اور آ کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ٹی وی دیکھا اور اس کے بعد دوبارہ ٹیرس میری جائے نشست قرار پائی۔ اس وقت میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں تنہا بیٹھا اپنی تنہائی کا مزہ لے رہا تھا۔ ایک لڑکا میرے پاس آیا۔ اسے نہ جانے کہاں سے پتا چل گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ مجھے آتے ہیں پنجابی میں کہنے لگا: ''تہاڈا ناں ٹرانسپورٹ لسٹ اچ اے'' (آپ کا نام ٹرانسپورٹ لسٹ، میں ہے)۔

میں نے کہا: ''اس اطلاع کے لیے بہت بہت شکریہ۔''

پھر کہنے لگا: ''تمہیں پتا ہے میں پاکستانی ہوں۔''

میں نے کہا: ''ہاں مجھے پتا ہے تم پاکستانی ہو۔''

''تو پھر تم ہر وقت افریقی لڑکوں کے ساتھ ہی کیوں نتھی رہتے ہو۔''

''کیوں کہ اس میں کوئی ایسی قباحت بھی نہیں ہے۔''

''تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ تم نے کن بنیادوں پر سیاسی پناہ کی درخواست دی ہے۔ تم سوئٹزرلینڈ کیوں آئے ہو؟''

اس نے ایک جملے میں مجھ سے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ میں ایشین لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی بہت سے ذاتی سوال کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ شائستگی کے خلاف ہے اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے میرے نزدیک اس لیے معیوب ہے کہ ایسا کرنا کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے۔

میں نے اسے دانستہ طور پر غیر سنجیدگی سے جواب دیا ''میں گے (ہم جنس پرست) ہوں۔

تمھیں پتا ہے پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ وہاں پہ یہ جنسی رویے افعال قبیح میں شمار ہوتے ہیں میرا یہ چلن میرے باپ کو بھی ناپسند تھا۔ اس لیے میں یہاں آ گیا ہوں۔''

وہ میرے اس غصیلے مگر بناوٹی طور پر شائستہ طرز گفتار کی تہ تک نہ پہنچ سکا اور اس نے پھر سوال کر ڈالا'' تمہارے اور بھی بہن بھائی ہیں؟''

میں نے کہا ہاں تھے لیکن وہ سارے روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے۔ صرف میں بچا ہوں۔''

اس لڑکے کو میرے دونوں جواب پسند نہ آئے یا شاید اسے احساس ہو گیا کہ مجھے اس کے ساتھ مکالمہ قطعاً پسند نہیں ہے۔ اس لیے وہ فوراً چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا اچھا ہوا جلد جان چھوٹ گئی۔

سکیورٹی گارڈ کی گرج دار آواز سنائی دی'' سب لوگ یہاں سے اٹھو اور مل کے میس، کچن، ہال، ٹائلٹ اور ڈائننگ ہال صاف کرو۔ میں اور ایک لڑکا مل کے میس صاف کرنے لگے۔ میں نے میس میں رکھی ساری پلاسٹک کی کرسیاں اکٹھی کیں اور ایک کونے میں رکھ دیں۔

اس کے بعد یہاں پڑے ہوئے سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے، ان کے فلٹرز، پلاسٹک کی خالی بوتلیں، پلاسٹک ریپرز اکٹھے کیے۔ دونوں نے مل کے میس کو بہت اچھی طرح صاف کر دیا۔ سکیورٹی گارڈ مجھے کام کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا'' تم کام بڑے اچھے طریقے سے کرتے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے۔''

میں نے کہا'' اس لیے کہ میں کام مشقت کے طور پر نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے کر رہا ہوں۔ جہاں کچھ بھی کرنے کو نہ ہو، وہاں انسان کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وقت گزارنے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی کام میں خود کو مصروف رکھیں۔''

وہ کہنے لگا'' تمہارا فلسفہ مجھے پسند آیا۔ یہاں پہ کئی مہاجر آتے ہیں وہ کام کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ کام کرنا اپنی ہتک خیال کرتے ہیں۔''

میں نے کہا'' ہر شخص زندگی کو اپنے انداز سے دیکھتا ہے۔''

وہ بڑا حیران ہوا، کہنے لگا'' تم کہاں کے رہنے والے ہو۔''

میں نے کہا'' پاکستان۔''

اس نے مسکرا کے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا'' مشرف کا کیا حال ہے۔''

میں نے کہا" ٹھیک ہی ہوگا۔"

"تم پاکستان میں کس جگہ کے ہو۔"

"میں راولپنڈی کا ہوں۔"

"یہ تو اسلام آباد کے پاس ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے۔"

"الیکٹرونک میڈیا نے دنیا کو انفارمیشن کے طور پر بہت کچھ دیا ہے۔ ویسے بھی میرا جغرافیہ اتنا کمزور نہیں۔"

میں آج فٹ بال میچز نہ دیکھ سکا تھا۔ میں نے متجسس انداز میں پوچھا" آج فٹ بال کا کیا ہوا۔"

تو کہنے لگا" امریکہ نے میکسیکو کو دو گول سے ہرا دیا ہے اور دوسرے میچ میں برازیل نے دو گول سے ہی بلجیم کو۔"

"تمہیں فٹ بال سے کیسے لگاؤ ہے تمہارے ملک کا مقبول کھیل تو کرکٹ ہے۔"

میں نے کہا" ویسے تو مجھے نہ کرکٹ سے اتنا لگاؤ ہے اور نہ ہی فٹ بال سے لیکن جب فٹ بال کا ورلڈ کپ ہوتا ہے تو جیسے ساری دنیا اس کو شوق سے دیکھتی ہے اس طرح میں بھی دیکھنے کی حد تک انوالو ہو جاتا ہوں لیکن سارے میچز کبھی نہیں دیکھ پایا۔ اس دفعہ خلاف توقع سینیگال کی ٹیم کوارٹر فائنل میں آئی ہے تو ذرا زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا ہوں۔"

اس نے پُرجوش انداز میں کہا" اصل میچز تو کل ہیں۔ ساؤتھ کوریا اور اٹلی کا میچ ہے پھر ترکی اور جاپان کا۔"

میں نے پوچھا" تم کیا چاہتے ہو کل کون سی ٹیمیں جیتیں۔"

تو کہنے لگا" پہلا میچ تو اٹلی کو جیتنا چاہیے اور دوسرا کوئی بھی جیت جائے۔"

میں نے کہا" اٹلی کیوں؟ ساؤتھ کوریا کیوں نہیں؟"

تو کہنے لگا" کیونکہ میرے ماں باپ اٹالین ہیں۔ میں سوئس شہری ہوں لیکن میری روح اٹالین ہے۔"

میں نے کہا" تم کہاں کے ہو، میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ اٹلی کے کون سے

علاقے سے آئے ہیں۔"

اس نے متجسس ہو کر پوچھا "تم اٹلی کے بارے میں جانتے ہو؟"

میں نے جواب میں اسے وہی کہا جو اس نے مجھے کہا تھا "تم تو جانتے ہو انگلش اِٹک میڈیا کو!"

تو کہنے لگا "ہاں ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے میرے ماں باپ سسلی کے ہیں۔"

میں نے کہا "سسلی تو جزیرہ ہے۔ وہاں کس شہر کے ہیں۔"

تو کہنے لگا "کتانیا (catania) کے ہیں۔"

میں نے کہا "ویسے کل اگر اٹلی جیت جائے تو تمہیں خوشی ہو گی لیکن جاپان سے ترکی جیت جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"وہ کس لیے۔"

"اس لیے کہ ان کی ٹیم بہت اچھی ہے۔"

"میں نے کہا "کہہ سکتے ہیں۔ سینیگال کے بعد ترکی دوسرا مسلمان ملک ہو گا جو کوارٹر فائنل میں آئے گا۔"

ہم دونوں میں ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک اور سکیورٹی گارڈ آیا اور اس نے کہا "ہال کو خالی کر دو کیونکہ یہاں بیٹھنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس گارڈ کی بات پہ عمل کرتے ہوئے میں نے اور دوسرے لوگوں نے ہال، ٹی لاؤنج، میس خالی کر دیا اور اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔ میں نے جاتے جاتے اسے کہا "میں اُمید کرتا ہوں کہ اٹلی اور ترکی جیت جائیں۔"

اس نے جواب دیا "ترکی کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اٹلی ضرور جیت جائے گا۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے جیسا تم سوچتے ہو ویسا ہی ہو لیکن کھیلوں میں "اَپ سیٹ" تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے اٹالین میں کہا "ویدآمو vediamo یعنی دیکھتے ہیں۔"

میں نے جواب میں کہا "چاؤ، چس۔" ان دنوں میں نے یہ دو نئے لفظ سیکھے تھے۔

اس کو یہ کہہ کر میں اسی راستے سے گھوم کر جو تہہ خانے سے اُوپر آتا تھا، سیڑھیاں طے کرتا ہوا تیسری منزل پہ پہنچا۔ راستے میں اب بھی لوگ بیٹھے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور اپنے بستر پہ لیٹتے ہی سوچنے لگا، میں نے کتنی پر آسائش زندگی گزاری ہے۔ مجھے سوئس آئے ہوئے ابھی دو دن

ہوئے ہیں اور میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ میں یہاں آ کے مہاجر کیمپ کے ٹائلٹ تک صاف کر چکا ہوں۔ ہوٹل کے میس کی صفائی تو بات ہی معمولی ہے۔ کل برتن بھی دھوئے۔ مجھے اپنے دادا کی یاد بڑی شدت سے ستانے لگی۔ وہ کہتے تھے۔ تین چیزیں انسان کی زندگی میں تبدیلی لاتی ہیں۔ کتاب، سفر اور عورت۔ یہ تینوں چیزیں میری زندگی میں آ چکی تھیں۔

○

ستمبر کے مہینے میں اریزو میں کبھی گرمیوں کا گمان ہونے لگتا ہے اور کبھی ایسا لگتا کہ سردی شروع ہو گئی ہے۔ یورپین لوگ تو جون میں بھی اپنے ساتھ ایک ہلکی سی جیکٹ رکھتے ہیں۔ کبھی ٹھنڈی ہوا چلے تو پہن لیتے ہیں۔اس کے برعکس ہم ایشائی اعصابی طور پہ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ہم میں قوت برداشت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔اریزو میں اب ویسے بھی ستمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا اور اکتوبر کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔

میں چونکہ کام پہ نہیں جاتا تھا اس لیے عموماً رات گئے سوتا اور دن کو دیر سے اُٹھتا۔ رات کو زیادہ تر تخلیقی کام میں مصروف رہتا، اگر کہانیاں بُننے میں وقت پیش آتی تو ٹی وی دیکھنے لگتا۔ میرا لکھا ہوا ثقلین کو اچھا لگا تھا۔ میں بہت شوق اور جذبے سے لکھتا تھا۔ اب تک میں بے شمار صفحات کالے کر چکا تھا۔ ثقلین کی شکل میں مجھے اپنا کم ازکم ایک عدد قدردان قاری میسر آ ہی چکا تھا۔۔۔ اس کی تحسین و تعریف لکھنے لکھانے میں مزید محنت پر اُکساتی۔اب مجھے ثقلین کا انتظار رہنے لگا تھا۔ جس کہانی پر میں ان دنوں کام کر رہا تھا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت طوالانی ہو گئی لیکن ابھی تک میں اس کی تبویب کے حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ اسے کتنے ابواب میں تقسیم کروں۔

بروز جمعرات میں ناشتہ کر کے اریزولائبریری چلا گیا۔ نیائش کو صبح دس سے بارہ بجے تک دن کو اور شام پانچ بجے سے سات بجے تک گھر میں نظر بند رہنا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا کسی وقت بھی چیک ان

ہو سکتا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے گھر پہ ہی رکا۔ میں ایک بجے لائبریری سے واپس آیا۔ ہمارے گھر کے پاس فوڈ آئٹمز کا سٹور تھا۔ اریزو شہر میں دو مشہور سٹورز ہیں۔ ایک اپر کوپ (ipercoop) اور اس کی ذیلی شاخ کوپ (coop) ہے اور دوسرا اسٹور ہے "ایسے لنگا" (esselunga)۔ ہمارے گھر کے پاس کوپ ہے اس لیے ہم لوگ عموماً کوپ سے ہی خریداری کرتے ہیں۔ لائبریری سے واپسی پر میں کوپ سے فریز کیے گئے نان لے آیا تھا۔ اٹلی میں ان کو پانے عارابو (pane arabo) کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ترکش نان ہوتے ہیں۔ دو نان دو افراد کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بچ بھی جاتا ہے۔

گھر پہنچ کر میں نے رات کا بچا کھچا سالن فرج سے نکال کر گرم کیا۔ سالن گرم ہو چکا تو مائیکرو ویو اوون میں پہلے ان نانوں کو ڈی فراسٹ کیا۔ اس کے بعد ان کو پانی اور تھوڑا سا زیتون کا تیل لگا کر فرائی پین میں گرم کیا۔ یہ بالکل ایسے ہو گئے جیسے ابھی ابھی تنور سے نکالے گئے ہوں۔ جب میں ساری چیزیں میز پہ سجا چکا تو نیائش کو بھی بلایا۔ اس کی طبیعت ابھی سنبھلی نہیں تھی۔ وہ بڑی مشکل سے بستر سے نکلا اور ہم نے کھانا شروع کیا۔ میں نے پیٹ بھر کے کھایا لیکن نیائش نے بے دلی سے تھوڑا بہت کھایا اور پلیٹ ایک طرف کر دی۔ اس نے پشتو میں ایک بڑی سی گالی دی اور کہنے لگا "ماڑا یہ بیماری تو بندے کو۔۔۔ کر دیتی ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں نیائش بھائی ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"کبھی لگتا ہے بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں کبھی لگتا ہے جسم میں بالکل جان نہیں ہے۔"

"آج شام کو کیا بناؤں۔"

"جو تمہاری مرضی۔ تم بھی کیا سوچتے ہو گے جب سے آیا ہوں مجھے کسی نہ کسی کام پہ لگائے رکھتا ہے۔ مجھے تو نعمان خان کا خیال آتا ہے وہ کیا سوچے گا جب اس کو پتا چلے گا۔"

"نیائش بھائی چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں نہ سوچا کریں۔"

"نہیں ماڑا یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ مجھے نعمان نے بتایا تھا تمہارے بارے میں جب تم چلے گئے تھے۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ تم بڑے رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔"

"کیسی امارت، کیسی رئیسی نیائش بھائی سب ختم ہو گیا۔ دوسرا جنم لیا ہے۔"

''خیر جو بھی ہے لیکن تم بڑے قابل آدمی ہو۔''

''کیسی قابلیت، میری کوئی بھی ڈگری میرے کسی کام نہیں آئی۔ الیکٹریشن یا پلمبر ہوتا تو اب تک کام مل گیا ہوتا۔''

''ماڑا دل چھوٹا نہیں کرو۔ جیسے ہی پیپر مل جائیں گے تمھیں کام بھی مل جائے گا۔ میں نے اپنے ایمپلائر سے بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے جیسے ہی پیپر ملے ادھر فیکٹری میں لے آنا۔ کام تمھیں میں سکھا دوں گا۔''

کھانا کھا کے میں نے برتن سمیٹے اور ڈرائنگ روم میں جا کر ٹی وی کے سامنے جا بیٹھا اور نیائش کمرے میں لیٹ گیا اس کو فلو کی وجہ سے بہت زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے ساری دالیں بھگو دی تھیں۔ گوشت کو بھی ابال کے اس کے ریشے سے بنا دیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مصالحہ بھی تیار ہو گیا۔ تو میں نے حلیم بنانی شروع کر دی۔ جب حلیم تیار ہو گئی تو اس پہ ادرک اور سبز مرچیں چھوٹی چھوٹی کاٹ کے اس کے اوپر بکھیر دیں۔ ایک پلیٹ میں لیموں کاٹ کے رکھے، ادرک اور سبز مرچیں علیحدہ سے کاٹ کے رکھیں۔ پھر نیائش کا موبائل فون لیا اور ثقلین کو فون کیا کہ آج کھانا ہمارے ساتھ کھائے اور گھر کی طرف آتے ہوئے کوپ سے چار نان بھی لیتا آئے۔ اس نے جواب میں کہا، میں روز ہی آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔

ویسے تو میں سارے ہی کھانے بہتر بنا لیتا ہوں لیکن حلیم کچھ زیادہ ہی مزیدار بن گئی تھی۔ سب نے تعریف کی۔ آج ہم سب نے کھانے کے بعد سبز قہوہ پیا حالانکہ میں سبز قہوہ زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن آج میں بھی سبز قہوے سے لطف اندوز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح ثقلین نے کھانے کی تعریف کی اور اس کے ساتھ ساتھ پانچویں باب کی بھی۔ میں نے کہا چھٹا باب تیار ہے اگر لے کر جانا ہے تو! کہنے لگا۔ ضرور لے کر جاؤں گا۔ ویسے کتنے باب ہیں۔ اس نے باب کا لفظ کچھ ایسے ادا کیا کہ سامعت کو ''باپ'' کا گمان ہوا سو اسی رعایت سے مذاق کے طور پر میں نے کہا'' باپ تو ایک ہی ہوتا ہے، بھلے عورت کتنے ہی مردوں کے ساتھ رہے لیکن جہاں تک تبویب کا معاملہ ہے۔۔۔ اس کہانی کے کتنے باب ہوں گے اس بات کا فیصلہ کہانی کا تسلسل ہی کرے گا۔

میں نے چھٹا باب اس کے حوالے کیا اور کہا۔

''ثقلین صاحب ایک بات پوچھوں؟''

اس نے کہا "ہاں پوچھو۔"

"جہاں آپ رہتے ہیں وہ لوگ اعتراض نہیں کرتے کہ آپ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔"

"نہیں۔۔۔میرا خیال ہے کہ وہ میری کمی محسوس نہیں کرتے ہوں گے اور اگر کرتے ہیں تو انھوں نے کھل کر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔۔۔"

"یوں کہیے نا کہ لاتعلقانہ رویہ اختیار کیے رکھتے ہیں۔"

"اگر کسی کی ذاتیات میں دخل انداز نہ ہونے کو لاتعلقانہ رویہ قرار دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں آج کل کے دور میں اس کے بغیر گزارہ نہیں۔"

"شکلین صاحب، آج کل کے دور میں اپنے ساتھیوں سے اتنا سروکار تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ کسی کی غیر حاضری کا نوٹس لے سکیں۔"

"میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن یہ بھی سوچیے کہ بقدر حصہ میں انہیں مہینے کا خرچہ دیتا ہوں۔ کھانے کا بھی اور گھر کے کرایہ کا بھی اس لیے انہیں میری غیر حاضری پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہاں کہہ سکتے ہیں۔"

"اچھا تو مجھے اجازت ہے؟"

"پہلے مجھے نان لانے کا شکریہ تو ادا کر لینے دو۔"

"پھر مجھے بھی اتنا مزیدار حلیم کھلانے کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا اس لیے اس سلسلہ میں آپ اب مزید کچھ نہ کہیے گا۔۔۔میں اب چلنے لگا ہوں۔"

بتاتے چلنے ایسی معنویت لفظی کی رعایت سے میری زبان سے "جگت" یا پھبتی کے طور پر جو الفاظ ادا ہوئے وہ کچھ یوں تھے کہ

"ٹھیک ہے لیکن ذرا پرے ہٹ کر۔"

ثقلین جیسے ہی گھر پہنچا۔ چھٹا باب پڑھنا شروع کیا۔

میں رات کو اپنے دادا جی کی یہ بات یاد کرتے سو گیا تھا کہ تین چیزیں انسان کی زندگی میں تبدیلی لاتی ہیں عورت، کتاب اور سفر۔ میں تو ہر طرح سے سفر کر رہا تھا۔ انگریزی والا، اردو والا اور عربی کا۔۔۔ جہاں تک عربی کے صفر کا تعلق ہے تو صفر کے مہینے کی بابت میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ صفر کا مہینہ بہت سخت ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو تنگی دیکھنی پڑتی ہے۔ میری دادی بہت سادہ عورت تھیں۔ ان کی میرے دادا سے کبھی نہ بنی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ان دونوں کو آپس میں نوک جھونک کرتے ہی دیکھا تھا۔ میرے دادا کبھی کبھی دادی کے لیے گرم گرم جلیبیاں بھی لایا کرتے، جس کے ردِ عمل میں بجائے خوش ہونے کے وہ مجھ سے کہا کرتیں کہ دیکھو تو ٹانگیں قبر میں ہیں مگر اس باپ کے چونچلے نہیں جاتے۔ میرے دادا میری دادی کے ساتھ جب بھی تُنی کرتے، تھوڑی دیر بعد بھول جاتے۔ میرے دادا کا زیادہ وقت کتابوں میں گزرتا۔ وہ کہتے تھے انسان کی سب سے اچھی دوست کتاب ہوتی ہے۔

آج اٹھارہ تاریخ تھی۔ فٹ بال ورلڈ کپ کے سلسلہ میں آج دو میچ کھیلے جانے تھے، مجھے اس انالیین شہزادے نس کی بات یاد تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اٹلی جیتے گا اور میرا دل چاہتا تھا اٹلی بھلے نہ جیتے لیکن ترکی ضرور جیت جائے۔ میں ان ملے جلے خیالات کے ساتھ باتھ میں گیا اور وہاں دانت صاف

کھیئے۔ چہرہ دیکھا تو ایسا لگا جیسے منہ پر بہت زیادہ کیڑے چل پھر رہے ہوں۔ میں نے نیچے جا کر گارنیکے ہوٹل جو کہ اب مہاجرین کا کیمپ تھا، کے عملے سے ایک ڈسپوزایبل یعنی استعمال کر کے پھینک دینے والا ریزر لیا، شیو شروع کرتے ہوئے میں نے سوچا کیوں نہ فرنچ انداز کی داڑھی رکھ لوں۔ میں اپنی شخصیت میں اس طرح کی تبدیلیاں لاتا رہتا تھا کیونکہ شیشے میں ایک ہی طور کی شکل دیکھ دیکھ کے میں جلد اُکتا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے سر کے بال بھی صاف کر دیئے یوں بھی اب میرے سر پہ کم بال رہ گئے تھے۔ میرے سر کے بال گرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو مجھے شمالی علاقہ جات میں گائیڈنگ کرتے ہوئے وہاں کا پانی راس نہیں آیا تھا۔ دوسری وجہ گرم پانی سے سر کو بہت زیادہ دھوتا تھا، لیکن میرا ایک دوست جس کو جینیٹکس کا خبط ہے اس کا خیال ہے کہ گنجا پن خاندانی مسئلہ ہے۔ حالانکہ میرے پورے خاندان میں دور دور تک کوئی بھی گنجا نہیں ہے۔ میرے خاندان میں مردوں کے بڑھاپے تک بال رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سفید ہو جاتے ہیں۔ لیکن بال گرنا یا گنجا ہونا میرے ہی حصے میں آیا۔

باتھ روم سے فارغ ہو کر جب میں باہر آیا تو اکثر کو اپنی طرف دیکھتا پایا۔ خاص کر دو پاکستانیوں کو میں بہت عجیب لگا۔ آج مجھے پھر اسی جگہ لے جایا جانا تھا جہاں میں پہلے دن آیا تھا۔ میرا انٹرویو اور میڈیکل چیک اپ باقی تھا۔ میں جلدی فارغ ہو جاتا لیکن چونکہ مہاجر کیمپ والے اپنا سامان نئی بلڈنگ میں منتقل کر رہے تھے اس لیے سارا انتظام درہم برہم حالت میں تھا۔ خیر ہمیں اسی مخصوص نیلی وین سے گارنیکے ہوٹل سے اسی بیرک نما عمارت میں لے جایا گیا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں ناشتہ دیا گیا۔ ناشتے سے فراغت پا کر میں مہاجر کیمپ کے عملے کی جانب سے صفائی ستھرائی کے کسی کام پر مامور کیے جانے کا منتظر تھا، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد ایک سکیورٹی گارڈ بلانے آیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اسی جگہ لے گیا جہاں میں نے پہلی رات گزاری تھی۔ اس نے مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا جہاں میں کل فنگر پرنٹس اور تصاویر کے انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ اس سے ملحق ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ میں اس باغیچے میں چلا گیا۔ وہاں وہ پاکستانی بھی بیٹھا ہوا تھا جس نے مجھے گارنیکے ہوٹل سے ٹیرس میں پوچھا تھا کہ تم سوئس کیوں آئے ہو؟ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا "تمھیں پتا ہے آج ہمیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "پتا نہیں۔"

تو کہنے لگا" آج ہمارے انٹرویو ہوں گے۔"

ان چند دنوں میں جب سے میں سوئس آیا تھا یہاں دھوپ بڑے مزے کی محسوس ہوتی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں جون کے مہینے میں بھی ٹھنڈ ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ بس ایک مسئلہ تھا کہ میں نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے مجھے ان سے گھن آ رہی تھی کیونکہ مجھے یہی ٹی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے آج چوتھا دن تھا۔ انڈر ویئر کی حالت تو اتنی خراب تھی کہ اسے مزید پہنا ہی نہیں جا سکتا تھا لہٰذا میں نے وہ پھینک دیا تھا۔ اب گزشتہ دو دنوں سے میں بغیر انڈر ویئر کے ہی گزارا کر رہا تھا۔

وہ شخص جس نے مجھے بتایا تھا کہ آج انٹرویو ہوں گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا" کیا تمہارا کیس وہی ہوگا جو تم نے مجھے بتایا تھا؟"

میں نے کہا" کیس تو وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔"

"یار ایسا کیس نہ کرنا اس سے پاکستان کی بدنامی ہوگی۔"

"اگر میں سوئس لوگوں کو بتاؤں گا کہ میں ہم جنس پرست ہوں تو کیا اس سے پاکستان کی بدنامی ہوگی؟"

"ہاں"

"تو پھر کیا بتاؤں؟"

"تم کہنا میرا سیاسی مسئلہ ہے، مذہبی مسئلہ ہے، قادیانی بن جانا، خود کو کسی اور فرقے کا ظاہر کر دینا۔"

میں نے کہا" اس سے اسلام کی بدنامی نہیں ہوگی، مذہب کی بدنامی نہیں ہوگی۔"

تو اس نے جواب دیا" تم کون سا سچ مچ ایسا کر رہے ہو۔"

"تو میں کون سا سچ مچ ہم جنس پرست ہوں۔"

یہ لڑکا جو مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نواز رہا تھا۔ دبلا پتلا تھا، اس کے گال پچکے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کی تیکھی ناک کچھ زیادہ ہی تیکھی لگ رہی تھی۔ پچھلے دو دنوں سے گھوم رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میرا حلیہ بھی پسند نہیں ہے، پھر بھی نہ جانے کیوں اُسے مجھے مفت مشورے سے نوازنے کی حاجت ہو رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا" تم نے کیا کیس تیار کیا ہے؟"

کہنے لگا" ہمارا خاندانی جھگڑا چل رہا ہے۔ مجھے قتل کے جھوٹے کیس میں پھنسا دیا گیا ہے۔"

میں نے کیس کی بابت تصدیق چاہتے ہوئے پوچھا "اصلی والا؟"

تو بڑے وثوق سے بولا، جیسے مجھے یقین دلانا چاہتا ہو" ہاں ہاں بالکل اصلی کیس ہے۔ تم نے سنا نہیں گجرات کے بارے میں۔"

میں نے کہا" میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور سنا ہے کہ وہاں کوئی چکوں والا گروپ ہے۔"

تو کہنے لگا" ہماری انہی کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے۔"

میں اس کا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ ابھی ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ ہمارے پاس ایک اور شخص آ گیا۔ یہ شخص شکل وصورت سے عجیب سا لگ رہا تھا۔ مجھ سے اس دبلے پتلے لڑکے نے اس آدمی کا تعارف کروایا" اس سے ملو، یہ ہمارا افغانی بھائی ہے لیکن اردو جانتا ہے۔"

میں نے خوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پوچھا" آپ افغانستان کے کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔"

تو کہنے لگا" میں نے سارا زندگی پاکستان میں گزارا ہے۔ میں مانسہرہ کے پاس ایک چھوٹا سا شہر ہے فتح پور وہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں وہاں گاڑیاں ٹھیک کرنے کا کام کرتا تھا۔"

میں نے کہا" آپ کو پاکستان کیسا لگتا ہے۔"

تو کہنے لگا" بہت اچھا لگتا ہے۔"

میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا تو اس کی ایک آنکھ میں پھپھولہ نما ایک جھلی سی تیر رہی تھی۔

میں نے پوچھا" یہ آپ کی آنکھ میں کیا ہے۔"

تو کہنے لگا" ایک دفعہ میں گاڑی ٹھیک کر رہا تھا۔ اس گاڑی کے ریڈی ایٹر کے پاس پنکھا ہوتا ہے وہ نکل کے میرے منہ پہ لگا۔ اس کی وجہ سے میری یہ آنکھ زخمی ہو گئی۔۔۔ میری آنکھ ضائع تو نہیں ہوئی لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں یہ آپریشن سے ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کو صاف کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا" تو تم نے یہ آپریشن پاکستان میں کیوں نہیں کروایا۔"

تو کہنے لگا" یہاں اسی لیے آیا ہوں۔ جتنی دیر کیس چلے گا اتنی دیر میں میرا علاج ہو جائے گا۔ اگر کیس منظور نہ بھی ہوا تو آنکھ کا آپریشن ہو جائے گا۔ یہی میری بچت ہوگی۔"

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ یہ تو بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ اس دوران اس افغانی کو انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔ میں اپنے دماغ میں اپنا کیس تیار کرنے لگا۔ میں افسر کو کیا بتاؤں گا کہ مجھے کیا مسئلہ ہے۔ مجھے اس دبلے پتلے لڑکے نے بتایا تھا کہ تاریخ اور دن ایسے رکھنا جو تمہیں آسانی سے یاد رہیں۔ کوئی قومی دن نہ ہو کیونکہ یہاں کے افسروں کو یہ بات پتا چل چکی ہے۔ اس سے تمہارا کیس کمزور ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دماغ میں اپنے کیس کے بارے میں مکمل تانا بانا بن لیا۔ تاریخیں بھی ایسی رکھیں جو کسی نہ کسی کی تاریخ پیدائش تھی۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میرا نمبر آیا۔ ایک لڑکی آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔

یہاں ایک کمرہ تو وہ تھا جہاں میں سویا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ تھا جس میں میرے فنگر پرنٹس اور تصویریں لی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ جو کمرہ تھا وہاں مجھے داخل ہونا تھا۔ میں اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کی ایک دیوار پہ ایک بڑی سی مچھلی فریم میں لگی ہوئی تھی۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ یہ مچھلی اصلی تھی یا نقلی۔ ایک دیوار پہ ایک گھڑی لگی ہوئی تھی۔ یہ گھڑی بالکل اس طرح بنی ہوئی تھی جیسے ہسپانوی مصور سلوادور دالی (Salvadore Dali) تصاویر بنایا کرتا تھا۔ کمرے میں ایک مستطیل میز پڑی تھی۔ اس پہ بہت سارے کاغذ پڑے تھے۔ ایک کونے میں کمپیوٹر اور پرنٹر پڑا تھا۔ کمرے میں چار کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پہ جو آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی قمیض پہنی اور تھوڑے گہرے نیلے رنگ کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اس کا کوٹ کرسی کی پشت کے ساتھ ٹنگا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ اس کی شکل سے لگتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کے خوش نہیں ہوا، یا شاید اس کی شکل ہی ایسی تھی۔ اس کا منہ پچکا سا تھا۔ چہرے پہ تیکھی ناک، پتلے ہونٹ جیسے لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ شیو کرنے کی وجہ سے اس کے چہرے کی جلد سبزی مائل ہو چکی تھی۔ جلد کی اس رنگت کی ایک وجہ اس کا الیکٹرک شیور سے شیو کرنا بھی ہو سکتی تھی۔ الیکٹرک شیور بڑی گہرائی سے بالوں کو کھال سے نکالتا ہے۔ مجھے اس کو دیکھ غلام عباس کا ایک افسانہ یاد آ گیا جس میں وہ ایک شخص کے چہرے کے خدوخال اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ شخص آپ کے سامنے کھڑا ہو۔ اس کمرے میں ایک خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر وہ پاکستانی نہیں لگتی تھی۔

اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس نے میز پہ ایک سٹاپ واچ رکھی اور انگریزی میں کہا: ''انٹرویو شروع کرتے ہیں۔''

سب سے پہلے اس نے اپنا تعارف کروایا۔ جس کا مترجم نے اُردو یا جسے ہندی بھی کہا جا سکتا تھا، میں ترجمہ کر کے بتایا۔ اس کے ساتھ اس عورت نے اپنا تعارف کروایا۔ پھر اس نے افسر کو بتایا کہ میں نے اسے اپنا نام اور یہاں آنے کی وجہ بتائی ہے۔

اس نے پہلا سوال کیا جو کہ جرمن میں تھا۔ مترجم نے مجھے بتایا کہ کیا کہہ رہا ہے۔

''تمہارا نام''

''خاندانی نام، یا فیملی نیم''

''سبزواری''

''تاریخ پیدائش''

میں نے تاریخ پیدائش بتائی۔

اس کے بعد مزید سوالات شروع ہوئے۔ میں جو بھی بتاتا جا رہا تھا وہ افسر کمپیوٹر پہ لکھتا جا رہا تھا۔

''مکمل پتا''

میں نے مکمل پتا بتایا۔ شہر کا نام راولپنڈی بتایا۔

''تمہارا خاندان، ماں باپ، بہن بھائی۔''

''وہ ایک بس کے حادثے میں اس دنیا سے چلے گئے۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔''

یہ جواب سن کر افسر کے چہرے پہ ایک عجیب سی شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم شادی شدہ ہو۔''

''نہیں۔''

''تمہارے بچے ہیں؟''

میں کہا'' اگر شادی ہی نہیں ہوئی تو بچے کیسے؟''

اس کا مترجم نے تفصیل بتائی کہ ان کے ہاں بنا شادی بچے پیدا کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ لاکھوں میں کوئی ایک آدھا ایسا وقوعہ ہوتا ہوگا۔

اس افسر نے کہا'' یہ انٹرویو کا حصہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے ملک میں کونسی روایات زیرِ عمل ہیں۔

پھر اس نے مجھ سے سفر کی روئیداد پوچھی۔

جو میں نے کچھ اس طرح سنائی ''میں پاکستان کے شہر راولپنڈی کا رہنے والا ہوں۔ وہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں مختلف جگہ نوکری کی۔ اس کے بعد میں نے ایک سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ سیاسی جماعت نواز شریف کی سربراہی میں سرگرم عمل تھی۔ جب پرویز مشرف نے ۱۲ را کتوبر ۱۹۹۹ء میں نواز شریف کا تختہ اُلٹا اور ملک میں مارشل لگا دیا تو میرے لیے وہاں رہنا مشکل ہو گیا''

اس نے میرے جواب کے دوران سوال کیا۔

''لیکن نواز شریف کی پارٹی کے آدھے رکن تو پرویز مشرف کے ساتھ مل گئے ہیں۔''

میں کہا'' لیکن میری وابستگی جس گروپ کے ساتھ ہے وہ تا حال زیرِ عتاب ہے۔''

اس نے سوال کیا'' تمہیں کیا مسئلہ تھا۔''

میں نے کہا'' مجھے جان کا خطرہ تھا۔''

اس نے کہا'' پرویز مشرف نے ۱۲ را کتوبر ۱۹۹۹ء کو تختہ اُلٹا اور آج اٹھارہ جون ۲۰۰۲ء ہے۔ اتنا عرصہ تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔''

میں نے کہا'' میں نے بڑا سخت وقت گزارا ہے۔''

''مثلاً''

''میں کہیں بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ سیکرٹ ایجنسیاں میری پیچھے لگی رہتی تھیں۔''

''تم ایسا کیا کام کرتے تھے جس سے پرویز مشرف کی حکومت کو تم سے خطرہ تھا۔''

''میں مضمون لکھتا تھا۔ میں پارٹی قائدین اور دیگر سیاسی لوگوں کے لیے تقاریر لکھا کرتا تھا۔''

''اس میں جان کا خطرہ تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''اگر آپ کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر لوگوں کے دل پہ اثر کر جائے تو وہ ملک میں انقلاب برپا کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا، پھر سوال کیا،

''تم نے پاکستان کب چھوڑا؟''

''یکم مئی سن ۲۰۰۲ء کو۔''

''یہاں تک کیسے آئے۔''

''میں نے پاکستان سے نکلنے کی کئی دفعہ کوشش کی، ہر دفعہ مجھے ایئرپورٹ پہ پکڑ لیا جاتا۔ آخرکار ایک ایجنٹ مجھے جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سلاواکیہ (Slavakia) کے شہر براتسلاوا (Bratislava) لے آیا۔ وہاں سے وہ ہمیں کار کے ذریعے کرائس لنگن چھوڑ کے چلا گیا۔''

''تم نے راستے میں دیکھا تم کن راستوں سے گزر کے آئے۔''

''نہیں۔ اس نے ہمیں گاڑی سے باہر دیکھنے کو منع کیا تھا۔ ہم جب بھی سر باہر نکالتے وہ اوپر سے ہمارے سر پہ مکّے مارتا۔''

''تم نے بتایا کہ تم نے یکم مئی کو پاکستان چھوڑا لیکن آج اٹھارہ جون ہے یعنی تم ایک مہینہ اور اٹھارہ دن تک سلاواکیہ میں قیام پذیر رہے۔''

''جب ہم سلاواکیہ پہنچے تو ہمیں اس نے ایک گھر میں رکھا۔ جو بارڈر کے پاس تھا۔ وہاں اور بھی لوگ تھے۔ وہ آہستہ آہستہ لوگوں کو لے کر جاتا۔ ہماری باری ۱۵ جون کو آئی۔ اس نے جب مجھے کرائس لنگن ریلوے سٹیشن کے پاس چھوڑا تو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ بلکہ رات کے ۱۱:۳۵ تھے۔''

''تم یہاں تک کیسے پہنچے۔''

''لوگوں سے پوچھتا پوچھتا۔''

''اگر ہم تمہیں واپس بھیج دیں تو۔''

''میری جان کو خطرہ ہے۔''

''گوکہ یہ بات تمہارے انٹرویو کا حصہ نہیں لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پرویز مشرف نے ان تمام پاکستانی سفارت خانوں کو جو دوسرے ممالک میں قائم ہیں، خط لکھا ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی مسئلہ نہیں۔ جو بھی سیاسی پناہ کی درخواست دے اس کا پاسپورٹ بنا کر اسے فوراً پاکستان بھیجا جائے۔''

''انہوں نے ٹھیک لکھا ہے کیونکہ ان کو کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو دوسروں کی تکلیف نظر نہیں آتی۔''

''ہم لوگ تمہارے فنگر پرنٹس کی جانچ کریں گے، اگر ہمیں جرمنی، اٹلی یا کسی بھی دوسرے

ملک سے تمہارا کوئی حوال ملا تو ہم تمہیں وہاں بھیج دیں گے۔"

اس کے بعد اس نے کمپیوٹر کو کمانڈ دی۔ کیونکہ جب وہ انٹرویو کر رہا تھا اس دوران وہ لکھ بھی رہا تھا۔ جب وہ سوال کرتا اس سوال کا ترجمہ کر کے مجھے مترجم بتاتی۔ میں اس کا جواب دیتا اور وہ اس کا جرمن میں ترجمہ کر کے اس کو بتاتی۔ وہ لکھتا جاتا۔ اس نے جب کمپیوٹر کو کمانڈ دی تو پاس پڑے ہوئے پرنٹر سے آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس پرنٹر نے چھپے ہوئے کاغذ اگلنے شروع کر دیے۔ پانچ صفحات پرنٹ ہو کر نکلے تو پرنٹر کی چرچراہٹ بند ہوگئی۔ اس نے یہ کاغذات اس عورت کو دیئے اس عورت نے سارے سوال پہلے جرمن میں پڑھے پھر مجھے ان کا ترجمہ کر کے سنایا۔ پھر اس شخص نے وہ کاغذ اٹھا کے ایک فائل میں رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے پرنٹر میں ایک خاکی سا کاغذ رکھا۔ یہ لمبائی چوڑائی میں چھوٹا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کو پھر کمانڈ دی۔ پھر اسی طرح چرچراہٹ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کاغذ پرنٹر سے باہر نکل آیا۔ اس پہ میری فوٹو اور میرا پتا وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ کارڈ میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا" یہ تمہاری شناخت ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے اُوپر لکھا تھا" ہاؤس وائس این۔"

اس نے کارڈ دیتے ہی مجھ سے کہا" اب تمہارا انٹرویو ہو چکا ہے۔ اب تمہیں اپنے میڈیکل چیک اپ کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس میں ہم تمہارا ہیپاٹائٹس بی اور سی کا ٹیسٹ کریں گے، اور دیگر بیماریوں میں ایڈز ٹیسٹ کریں گے۔ میڈیکل چیک اپ کے بعد جب بھی تمہاری او کے کی رپورٹ آئی ہم تمہیں دوسری جگہ منتقل کر دیں گے۔ اور ہاں اب تم صبح دو گھنٹے اور شام کو دو گھنٹے باہر جا سکو گے۔"

میں نے جب یہ سنا کہ میں باہر جا سکتا ہوں تو مجھے ایسے لگا جیسے کسی قیدی کو رہائی مل گئی ہو۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا" اب تم جا سکتے ہوں۔"

میں نے اس افسر سے ہاتھ ملایا اور اس کی مترجم خاتون کو نمستے کہہ کے باہر آ گیا۔

OOO

میں جب کمرے سے باہر آیا تو وہی پاکستانی۔ آج صبح جس نے مجھے زور دے کر کہا تھا کہ ہم جنس پرست ہونے کا کیس نہ کروانا کیونکہ اس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہوگی۔ وہ باہر کھڑا تھا۔ پہلا سوال ہی اس نے یہ کیا" کس چیز کا کیس کروایا ہے؟"

میں نے کہا" وہی جو تمہیں بتایا تھا۔ وہ افسر بھی ہم جنس پرست تھا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ دیا

ہے۔ کہتا ہے میرے گھر آنا۔"

وہ کہنے لگا "اس کا مطلب ہے تمہیں یہاں پہ پناہ مل جائے گی۔۔۔ تمہیں سوئس پاسپورٹ مل جائے گا"

میں نے کہا "ہاں"

کہنے لگا "یہ تم نے ٹھیک کیا۔ اگر یہ رپورٹ پاکستان چلی گئی تو کیا ہوگا۔ یہ لوگ ایک فائل کاپی پاکستانی سفارت خانے کو بھی بھیجتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو ٹھیک ہے نا، لوگوں کو پتا تو چلے کہ پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔"

وہ لڑکا جو خود کو افغانی کہتا تھا۔ وہ کہنے لگا "ماڑا کوئی بات نہیں۔"

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ لڑکا جو خود کو افغانی بتاتا ہے درحقیقت افغانی نہیں ہے لیکن مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ کون ہے۔ اس سے اجازت لے کر میں سکیورٹی گارڈ کے پاس آ گیا۔ اسے میں نے ہاؤس واؤس دکھائی تو کہنے لگا "دس بجے تمہارا ٹائم شروع ہوگا۔ دس سے بارہ بجے تک تم باہر جا سکتے ہو۔ بارہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے تمہیں یہاں ہونا ہوگا۔ کیونکہ بارہ بجے یہاں لنچ ٹائم ہوتا ہے۔ اس وقت ہم رول کال بھی کرتے ہیں۔ اگر تم کھانے کے وقت موجود نہ ہوئے تو ہمیں پولیس کو مطلع کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "میں ابھی باہر نہیں جا رہا۔ ابھی دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جاپان اور ترکی کا کیا بنا۔"

کہنے لگا "ترکی جیت گیا ہے۔" "ابھی ساؤتھ کوریا اور اٹلی کا میچ باقی ہے۔"

میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ترکی جیت جائے۔ ترکی تو جیت گیا تھا لیکن ابھی اٹلی کی باری تھی۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس دفعہ دو مسلمان ٹیمیں ورلڈ کپ کے کوارٹر فائنل میں تھیں۔ میں اُمید لگائے ہوئے تھا کہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ٹیم فائنل میں آ جائے یا کم از کم دوسری تیسری پوزیشن حاصل کر لے۔

دس بجے میں نے اس بیرک نما عمارت کو چھوڑا۔ اس کے سامنے جو چھوٹی سی سڑک تھی اس پہ میں اکیلا چلا جا رہا تھا۔ میں نے خود اپنی آزادی سلب کی تھی۔ اس کے بعد تین دن میں نے قیدیوں کی سی زندگی گزاری تھی۔ اس سڑک کے ساتھ وہی گندا نالا تھا جس کی بُو سے میرے دماغ میں ہلچل مچ

گئی تھی لیکن اب مجھے بو کا ایسا کوئی احساس نہ ہوا۔ اس میں کہیں کہیں گھاس پھونس اُگی ہوئی تھی۔ اور کہیں پلاسٹک کے ڈبے، لفافے اور کئی طرح کا مواد تیر رہا تھا۔ پانی صاف تھا لیکن کہیں کہیں گدلا بھی ہو جاتا۔ میں اپنی سوچوں میں گم اس سڑک پہ چلا جا رہا تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جس نے مجھ سے پہلی ملاقات میں کئی سوال کیے تھے۔ اور اس وجہ سے مجھے بہت برا لگا تھا۔ دوسری دفعہ ملنے پر یہ شخص عجیب سا اور تیسری دفعہ بس ٹھیک لگا لیکن اب مجھے کچھ بھی نہ محسوس ہوا۔ میں رک گیا۔ اس کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو خود کو افغانی ظاہر کر رہا تھا۔ جس کی ایک آنکھ میں زخم نے اپنا نقش بنا رکھا تھا۔ جس کی بابت اس نے بتایا تھا کہ گاڑی ٹھیک کرتے ہوئے ریڈی ایٹر کا پنکھا لگنے سے اُسے یہ زخم آیا تھا۔ اب ہم تین تھے۔ ہم تینوں اسی سڑک پہ آ گئے جہاں وہ ڈونر کباب امبس تھی اور اس کے ساتھ بلیئرڈ کلب تھا۔ ہم تینوں نے اس روڈ پہ چلنا شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑی دور ہی چلے ہوں گے کہ آگے عمارتیں آ گئیں۔ یہ دونوں ہوٹل تھے۔ ایک طرف جرمنی کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور دوسری طرف سوئٹزرلینڈ کا۔ ہم یہاں سے گزرنے لگے تو ہمیں ایک پولیس اہلکار نے روک لیا۔ اس نے ہماری ہاؤس وائس دیکھی اور واپس جانے کو کہا۔ مجھے انگریزی آتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ہم آگے کیوں نہیں جا سکتے تو کہنے لگا۔ جہاں پہ جھنڈا لگا ہوا ہے وہاں سے جرمنی کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ تم لوگوں کے پاس جو کاغذ ہے اس کے ساتھ تم جرمنی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔ میرے ہمراہیوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس پولیس اہلکار نے کیا کہا ہے تو میں نے ان کو تفصیل بتائی۔ وہ لڑکا جس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ اس نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا" چلو جھیل دیکھنے چلتے ہیں۔"

اس کی تجویز کو قابلِ عمل خیال کرتے ہوئے ہم نے دوسری سڑک پہ چلنا شروع کر دیا جو کرائس لنگن ریلوے سٹیشن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ ایک دو جگہ میں نے ترکی کے جھنڈے لگے ہوئے دیکھے۔ میں بہت خوش ہوا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہاں ترکش لوگ بھی رہتے ہیں۔ آج ترکش لوگوں کے لیے بڑی خوشی کا دن تھا۔

ہم جیسے جیسے جھیل کے پاس پہنچ رہے تھے راستے میں جا بجا بڑی بڑی سوانز یعنی راج ہنس بھی ہوئی تھی۔ میں ایک سوان کے پاس کھڑا ہو کے اس کو تکنے لگا۔ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اصلی ہو۔ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جو کہ جھیل اور اس کے آس پاس پارک کے اندر جانے

کے لیے استعمال ہوتی تھی اس پر مجھے دور سے بے شمار ٹورسٹ نظر آئے۔ میں نے بڑی حسرت سے انھیں دیکھا۔ میں بھی کبھی ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ ایک سال پہلے۔ میں بھی کبھی سیاحوں کو پاکستان کی سیر کروایا کرتا تھا۔ میں نے کئی ایک سوئس کمپنیوں کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ کونی (Kuoni) ان میں پیش پیش تھی۔ ان کے گروپ زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک دفعہ تو میری دو سوئس خواتین سے تکرار بھی ہو گئی تھی۔ یہاں جھیل کے کنارے ایک بہت بڑا چبوترا بنا ہوا تھا۔ متعدد سیاح ایک سٹیمر کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے ایک دو کو ہیلو بھی کہا۔ انھوں نے جواب میں مجھے ہیلو کہا۔ ان کے انگریزی بولنے کے تلفظ سے لگتا تھا کہ امریکن ہیں۔ مجھے وہ دونوں لڑکے حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ وہ جس کی آنکھ میں چھوٹا سا زخم تیر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کے کبھی کبھی ڈر بھی لگتا تھا۔ وہ کہنے لگا "ماز اتم تو بڑی اچھی انگریزی بولتے ہوں۔"

میں نے کہا "اتنی تو سب کو ہی آتی ہے۔"

کہنے لگا "میں فتح پور کا رہنے والا ہوں۔ وہاں سے انگریزوں کی گاڑیاں گزرتی ہیں۔ وہ اگست کے دنوں میں اس علاقے میں بہت آتے ہیں۔ میں نے اس طرح فر فر انگریزی بولتے ہوئے ان کو دیکھا ہے۔"

میں کہا "میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ میں کیسے انگریزی بولتا ہوں۔"

ہم ان سیاحوں سے تھوڑا آگے آئے تو آگے بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے۔ جھنڈ کے قریب بہت سے بنچز نصب تھے۔ ایک کونے میں چند بچے تھے جن کو ایک دبلی پتلی اور نوجوان سی لڑکی کچھ پڑھا رہی تھی۔ ان دنوں یورپین ملکوں میں بچوں کو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ بچے سمر کیمپ کے حوالے سے یہاں آئے تھے۔ ان بچوں نے ہماری طرف غور سے دیکھا لیکن ہم آگے چل دیے۔ وہ لڑکا جس کے گال پچکے ہوئے تھے وہ کہنے لگا: "جلدی چلو، تمہیں وہ مینار دکھاتا ہے جہاں پیار کرنے والے اپنے نام لکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا خیال ہے جو بھی لڑکا کسی لڑکی سے پیار کرتا ہے یا کوئی لڑکی کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ اگر وہ اس پہ اپنے محبوب کا نام لکھ دے تو اس کا پیار اسے ضرور ملتا ہے۔"

میں اس طرح کی خرافات پہ یقین نہیں رکھتا لیکن میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے۔ چند لمحوں میں مجھے لکڑی کا ایک مینار نظر آیا۔ میں نے چند سال ٹورسٹ گائیڈ کی

نوکری کی تھی۔ آثار قدیمہ بھی دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ یہ مینار بہت زیادہ بھی پرانا ہوا تو پچاس سال سے زائد قدیم نہیں ہوگا۔ اس کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس پہ بے شمار نام لکھے اور کُھدے ہوئے ہیں۔ مارکرز سے، چاقو سے جسے جو چیز ملی اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس لکڑی کے مینار پہ کر دیا۔ جس طرح پاکستان میں دیواروں پہ لکھا ہوتا ہے۔ اجابت خانوں میں لکھا ہوتا ہے۔ اس مینار کی چار منازل تھیں لیکن کافی اُونچا لگ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ان دونوں کی اُوپر جانے کی خواہش تھی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ دونوں تو اُوپر چلے گئے اور میں نے جھیل کے کنارے مٹرگشت شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بودن سے (boden see) تھی۔ اس کو لاگودی کوستانسا (loge di costanza) بھی کہتے ہیں جرمن زبان میں جھیل کو سے (see) کہتے ہیں اس لیے اس جھیل کو بودن سے کہا جاتا ہے۔ میں جھیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہاں پہ آلودگی بالکل نہیں تھی۔ اس جھیل کا پانی بہت صاف شفاف تھا۔ بالکل نیلا۔ اس میں جب ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوتیں تو ایسے لگتا جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔ اس جھیل میں چند ایک کشتیاں بھی ادھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔ ان کے رنگ برنگے بادبان بہت بھلے لگ رہے تھے۔ مجھے یہ مناظر شاید اس لیے بہت زیادہ اچھے لگ رہے تھے کہ میں پناہ گزینی کے نام پر قید سے تین دن بعد بغیر کسی سکیورٹی گارڈ کے نکلا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں کئی مہینے قید میں رہا ہوں اور اب جا کے مجھے آزادی ملی ہے۔ جن دنوں میں گائیڈ تھا، ڈیڑھ سال پرانی بات ہے۔ ہنزہ سے خنجراب کی طرف جاتے ہوئے، سست پاکستان کا آخری شہر ہے۔ اس کے بعد خنجراب پاس آتا ہے جو چائنہ اور پاکستان کا بارڈر ہے۔ یہ درہ چار ہزار میٹر بلند ہے۔ جب آپ ہنزہ سے سست جائیں تو راستے میں ایک چھوٹا سا شہر آتا ہے۔ اس کا نام ہے گلمت۔ گلمت میں ایک چھوٹی سی جھیل ہے اس کا نام ہے بورتھ جھیل۔ اس جھیل کا پانی سبز رنگ کا ہے۔ اس کے ایک کونے میں کسی نے ٹی سٹال بنا رکھا ہے۔ اس جھیل کے کنارے اس ٹی سٹال کی چائے پینے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ یہ جھیل تین ہزار سات سو میٹر کی بلندی پہ ہے۔ یہاں بودن سے یعنی بودن جھیل کے کنارے بیٹھے بیٹھے مجھے بورتھ جھیل کی یاد آئی۔ چائے کی یاد آئی۔ یہاں بارڈر پہ سوئس کے آخری شہر میں، اس جھیل کے کنارے چائے کہاں سے ملتی۔ میں کافی دیر تک اس جھیل کو دیکھ کے بورتھ جھیل کو یاد کرتا رہا، مجھے اس سوچ سمندر سے وہ دونوں لڑکے واپس لے آئے۔ انہوں نے دور سے آواز لگائی ''یار ہم تمہیں کافی

دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ واپس جانے کا وقت ہو گیا۔ اگر ٹھیک وقت پہ نہ پہنچے تو لنچ ٹائم نکل جائے گا۔"

میں جلدی سے اُٹھا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔

واپس اس بیرک نما عمارت میں پہنچے تو سب لوگ ڈائننگ ہال کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ہم لوگ بھی جلدی سے جا کے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ روز کی طرح آج بھی میں نے کھانا آخر میں لیا۔ جب میں اپنا کھانا کھا چکا تو دوبارہ قطار میں کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ میں کچھ مزید کھانا چاہتا تھا۔ میں نے دوبارہ اپنی پلیٹ اس ویٹرس کے سامنے کر دی جو لوگوں کو کھانا ڈال کے دے رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: "جب سارے لوگ کھانا کھا چکیں گے تو پھر آنا۔" پیچھے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اس نے جرمن زبان میں اسے کچھ کہا۔ اس کی بات سن کے اس نے میری پلیٹ میں کھانا ڈال دیا۔ میں میز پہ آ کر بیٹھ گیا اور میں کھانا کھا تا جا رہا تھا اور میری آنکھوں سے رم جھم جاری تھی۔ میں سوچنے لگا سوئٹزرلینڈ آ کر میں بھکاری بن گیا ہوں۔ پیٹ بھر کے کھانا کھانے کے لیے مجھے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ میں ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جو لوگ یہ کام پیشے کے طور پہ اختیار کرتے ہیں، ان کی دل آزاری شاید نہ ہوتی ہو لیکن جو لوگ کسی مجبوری کے تحت یہ کام کرتے ہیں ان کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ وہی جان سکتے ہیں۔ میں سوچنے لگا پاکستان کتنے عرصے سے دوسروں ملکوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔ حالانکہ پاکستان کے پاس نیوکلیئر پاور ہے۔ اس کے باوجود پچاس فیصد پاکستانیوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا۔ ہنزہ میں جو لوگ پانی پیتے ہیں اس میں ریت ملی ہوتی ہے۔ وہ لوگ یہ پانی پی لیتے ہیں اور دل کو اس طرح تسلی دیتے ہیں اس پانی میں معدنیات ہوتی ہیں جو صحت کے لیے اچھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں سونا بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ لوگ مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، جس کی اصل وجہ پینے کا پانی ہوتا ہے تو پھر یہ شمالی علاقہ جات چھوڑ کے اسلام آباد اور پنڈی کا رخ کرتے ہیں۔ پاکستان نیوکلیئر پاور ہونے کے باوجود انرجی کرائسس، غربت اور دیگر مسائل کا شکار ہے۔ کھانا ختم کر کے میں نے پلیٹ اور گلاس ٹرے میں رکھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کھانا دینے والا سٹاف کچن میں کام کے لیے بلائے گا لیکن انہوں نے مجھے زحمت نہ دی۔ میں اٹھ کے اس جیل نما باغ میں چلا گیا۔ جس کے دوسری طرف وہی گندا نالا بہہ رہا تھا جس کی بو اب مجھے ناگوار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں باغ میں جا کے گھاس کے ایک تختے پہ لیٹ گیا جو دھوپ اور گرمی کی تمازت سے جا بجا جلا ہوا تھا۔ میں اس پہ لیٹتے ہی آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پہ روئی کے گالوں کی طرح بادلوں کے

ٹکڑے اس طرح تیر رہے تھے جیسے نیلے سمندر پہ سفید بادبانی کشتیاں محوِ سفر ہوں۔ جب میں نے ان بادلوں کو غور سے دیکھا تو ایسا لگا جیسے وہ مختلف شکلیں اختیار کر رہے ہیں۔ یہ میری بچپن سے عادت تھی کہ میں بادلوں کے ٹکڑوں میں مختلف شکلیں دریافت کیا کرتا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں نے آپس میں اکٹھا ہونا شروع کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا کسی احتجاجی ریلی کا ارادہ ہو۔ ایک دم بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ہم جلدی سے اس جنگل نما باغ سے ہال کی طرف بھاگے۔ اس طرح کی بارش کو انگریز سمر شاورز کہتے ہیں۔ سوئس لوگ اس بارش کو کیا کہتے ہیں یہ میں نہیں جانتا تھا۔

فٹ بال ورلڈ کپ میں میری خواہش کے مطابق میری من پسند ٹیم جیت چکی تھی حالانکہ مجھے فٹ بال سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا مجھے خوشی اس امر پر تھی کہ اس دفعہ دو مسلمان ٹیمیں کوارٹر فائنل میں پہنچی تھیں۔ ایک سینیگال اور دوسری ترکی۔ مجھے اٹلی کی ٹیم سے کوئی خاص غرض نہیں تھی کہ وہ جیتے یا ہارے لیکن میں اس آدمی کے بارے میں سوچنے لگا جو یہاں پیدا ہوا تھا لیکن اس کا دل انالین تھا۔ ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' والی بات تھی۔ میں صبح بورڈن سے دیکھنے ان لڑکوں کے ساتھ گیا تھا لیکن اب میرا ارادہ تھا کہ میں اکیلا جاؤں۔ مجھے دو گھنٹے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ میں نے سکیورٹی گارڈ کو اپنی ہاؤس وائس دکھائی اور اس سے کہا کہ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔ تم جا سکتے ہو لیکن ڈنر سے پہلے آ جانا جو کہ یہاں شام چھ بجے ہوگا۔

میرے فنگر پرنٹس ہو چکے تھے، تصاویر اُتاری جا چکی تھیں۔ انٹرویو ہو چکا تھا۔ اب میرا میڈیکل باقی تھا۔ جس میں یہ چیک کیا جاتا تھا کہ مجھے ایڈز، ہیپاٹائٹس بی یا بی کی بیماری تو نہیں۔۔۔ یا کوئی اور حساس طبی مسئلہ تو نہیں۔ میڈیکل کے بعد دو دن مزید یہاں رُکنا تھا۔ او کے کی رپورٹ کے بعد مجھے ہی کرائس بھیجا جاتا تھا۔ مجھے کرائس کا مطلب نہیں پتا تھا۔ تاہم اتنا جانتا تھا وہاں مجھے باہر گھومنے پھرنے کی آزادی ہوگی۔ ہفتے کے ہفتے پیسے ملا کریں گے۔ بس اور ٹرین کا پاس ملے گا اور میں اس قید کی زندگی سے نجات حاصل کر لوں گا۔

میں اس بیرک نما عمارت سے باہر نکلا اور اس گندے نالے کے پاس سے گزر کے کرائس لنگن ریلوے سٹیشن کے ساتھ والی سڑک پہ چلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں سٹیشن کے اندر پلیٹ فارم پہ تھا، وہاں قریب ہی کچھ سٹالز پر اخبار، پوسٹ کارڈز اور گفٹ آئٹمز فروخت کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے چند ایک پوسٹ کارڈز دیکھے۔ خریدنا تو چاہتا تھا لیکن جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اس

طرح کی کسمپرسی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خیر میں تھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ بارش کی اس ہلکی سی پھوار کے بعد زمین سے ایک خاص قسم کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ اس برانڈ کی خوشبو دنیا کے کسی پرفیوم یا عطر میں نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوشبو ہے جو سوکھی مٹی اپنی پیاس بجھانے کے بعد ہم تک پہنچاتی ہے گویا خدا کی طرف سے انعام کیے گئے باران رحمت کا شکر یہ ادا کر رہی ہو۔ جون میں عام طور پہ شدید گرمی میں تمام پودے اور درخت کمہلا جاتے ہیں لیکن اس ہلکی سی پھوار نے تمام پودوں اور درختوں میں ایک عجیب قسم کا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ میں راستے پہ چلتے چلتے قدرت کے ان خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نہ جانے سیرالیوان کا وہ لڑکا جادو نے چکوچان کہاں سے آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا "تم جھیل کی طرف جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں میں جھیل کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ اس دو گھنٹے کی آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔ اپنے پھیپھڑوں میں آزادی کی آکسیجن بھرنا چاہتا ہوں۔"

تو کہنے لگا "یہ تم نے ٹھیک کہا۔ پھیپھڑوں کو آکسیجن کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی آزادی کی۔"

ہم دونوں نے جھیل کی طرف جانا شروع کر دیا۔ راستے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے، جو گھر کے باہر لکڑی کے ایک ہٹ نما کمرے میں ٹی۔وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ کسی خاص پروگرام کے منتظر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے حسب عادت ایک آدمی سے پوچھا "میچ کا انتظار کر رہے ہو؟"

کہنے لگا "ہاں، ابھی تھوڑی دیر میں اٹلی اور ساؤتھ کوریا آمنے سامنے ہوں گے۔"

میں پوچھا "تم کس کی طرف ہو۔"

کہنے لگا "ہم اٹالین ہیں۔ ہمیں یقین ہے اٹلی جیت جائے گا۔"

میں نے کہا "وش یو گڈ لک۔"

یہ کہہ کے میں آگے چل دیا۔ چکوچان کہنے لگا "تم میں جھجک نہیں ہے۔۔۔ ہر کسی سے بات کر لیتے ہو۔"

میں نے کہا "میں پاکستان میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ میں ہر طرح کے لوگوں سے ملا ہوں۔ گائیڈنگ کے دوران انسان اچھا خاصا ڈپلومیٹ بن جاتا ہے۔"

اس نے جواب دیا" میرا کام بھی پبلک ڈیلنگ سے متعلق تھا لیکن میرے اندر یہ خوبی پیدا نہیں ہو سکی۔"

"ایسی خوبیاں وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتی ہیں۔ ویسے اگر تمہیں برا نہ لگے تو تم بتا سکتے ہو کہ تم کیا کام کرتے تھے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں ایک ایسی کمپنی میں کام کرتا تھا جو موبائل بنانے والی کمپنیوں کو ہیرے اور سلیکان بیچتی تھی۔"

میں نے کہا" ہیرے اور سلیکان کا موبائل فون کے ساتھ کیا تعلق۔"

تو کہنے لگا" بہت بڑا تعلق ہے۔"

میں نے کہا" وہ کیسے؟"

تو کہنے لگا" تمہیں نہیں پتا کہ موبائل فون کیسے بنتا ہے۔"

میں نے کہا" نہیں۔"

وہ قہقہہ لگا کے ہنسا۔

میں نے کہا" اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔"

تو کہنے لگا" بات ہے۔ تمہیں پتا ہے سلیکان اور ہیرے کے بغیر موبائل فون بن ہی نہیں سکتا۔ دُنیا میں صرف دس ملک ایسے ہیں جہاں بہت زیادہ مقدار میں ہیرا دریافت ہوتا ہے۔ سیرالیون بھی ان دس ملکوں میں شامل ہے۔"

میں نے کہا" میں اس اَمر سے بے خبر ہوں۔"

ابھی ہماری اس موضوع پہ بات ہو ہی رہی تھی کی چکوچان نے جھیل دیکھ لی۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وہ جلدی سے جھیل کے کنارے گیا۔ اس نے اپنی جینز اور ٹی شرٹ اُتاری اور جھیل میں کود گیا۔ میں نے چکوچان کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں آگے جا رہا ہوں۔ اس کا آدھا جسم پانی میں تھا اور آدھا باہر اس نے وہیں سے بائے بائے کے انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔

میں جھیل کے کنارے چلتا چلتا کافی آگے نکل گیا۔۔۔ پھر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے جھیل کو دیکھنے لگا۔ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں پاس ہی ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ اس ٹیلے کے چار اطراف پانی

تھا۔اس طرح یہ ٹیلا چھوٹے سے جزیرے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ کچھ لوگ جھیل کے پانی میں تیر کے اس جزیرے پہ جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ جھیل کے اندر کئی جگہوں پہ ایک بڑی سی رسی میں پلاسٹک کے لال اور سفید گیند پروئے ہوئے تھے اور وہ پانی کی سطح پہ تیر رہے تھے۔ چونکہ یہ جھیل آدھی جرمنی میں تھی اور آدھی سوئس میں۔ اس لیے ان لال اور سفید گیندوں سے پروئی ہوئی رسی سے پانی کے اندر سرحد بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن پانی کے اندر تیرنے والی کشتیاں اس کی پابند نہیں تھی۔ کئی لوگ جھیل کے پانی میں تیرتے ہوئے کافی دور چلے گئے تھے۔ میرا دل تو بہت چاہتا تھا کہ میں بھی اس جھیل کے پانی میں تیراکی کروں، لیکن میں تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے لوگوں کو تیراکی کرتے دیکھ کر محظوظ ہونا ہی میرے لیے آسودگی کا باعث تھا۔ ایک بڑی حیران کن بات یہ تھی کہ یہاں بچے، عورتیں مرد جتنے بھی لوگ نہا رہے تھے انھوں نے اپنے تن پہ کپڑے کا کوئی التزام روا نہیں رکھا تھا۔ میرے خیال میں جھیل کا یہ حصہ ان لوگوں کے لیے مختص تھا جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان جس حالت میں دنیا میں آتا ہے اس کو اسی طرح رہنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو نیچرسٹ کہتے ہیں۔ مجھ سے یہ منظر زیادہ دیر نہ دیکھا گیا۔ میں یہاں سے اٹھ کے واپس آ گیا۔ اب تک چکو چان بھی تیراکی کا شوق پورا کر چکا تھا۔ ہمیں ٹھیک وقت پہ ازیل ہائم یعنی مہاجر کیمپ بھی پہنچنا تھا۔ ہم دونوں جھیل سے نکل کے واپس آ رہے تھے۔ ہم اسی جگہ سے دوبارہ گزرے جہاں پہ لوگ لکڑی کے ہٹ نما کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "کیا ہوا۔ تم لوگ بہت افسردہ دکھائی دے رہے ہو۔۔۔" ان میں سے ایک نے بے دلی سے جواب دیا "ہم میچ ہار گئے ہیں۔" اس کی افسردگی دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ وہ سکیورٹی گارڈ کتنا پُرامید تھا کہ اٹلی جیت جائے گا۔ اس بیچارے نے تو اٹلی کو ورلڈ چیمپین تصور کیا ہوا ہو گا لیکن اٹلی ورلڈ کپ سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے افسوس کا اظہار کیا۔ وہ اپنی گفتگو میں کھلاڑیوں کی خامیوں پر بحث کر رہے تھے۔ کوچ کو برا بھلا کہا جا رہا تھا۔ میں نے ان سے اجازت لی کیونکہ ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ واپسی پہ چکو چان سے موبائل فون پروڈکشن کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی۔ مہاجر کیمپ پہنچے تو کھانا شروع ہونے والا تھا۔ میں ایک دفعہ پھر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اب کے سٹاف بہت اچھا تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔ میں نے کچن میں کام کرنے والی عورت سے کہا اگر تم لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ وہ کہنے لگی۔ اب تم لوگوں کو ٹرانسفر کرنے کا سلسلہ شروع کیا جانے والا ہے۔ تم لوگوں کو تھوڑی دیر میں گارٹیکے ہوٹل جانا ہے۔

میں ہال میں بیٹھ کے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اس دفعہ میں اور چکو چان آخری دو ایسے پناہ گزین تھے جنھیں ڈرائیور کو گارنیگے ہوٹل چھوڑ کے آنا تھا۔ وہ آیا اور ہمیں تھوڑی دیر میں گارنیگے ہوٹل چھوڑ کے چلا گیا۔ یہاں ہم سوتے تھے۔ ہم دونوں جیسے ہی یہاں پہنچے تو چکو چان کہنے لگا، آؤ میرس میں چلتے ہیں وہاں لسٹیں بھی دیکھیں گے اور گپ شپ بھی کریں گے۔ میں نے اس کی تجویز پر آمین کہا" اس طرح ہم دونوں پہلے اس جگہ پہنچے جہاں لسٹیں آویزاں تھی۔ یہاں کئی دوسرے لوگ کھڑے لسٹوں میں اپنا اپنا نام پر تلاش کر رہے تھے۔ چکو چان نے خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا" کیا تمہیں معلوم ہے کہ کل مجھے چکی کرائس بھیجا جا رہا ہے؟"

میں نے کہا" تو اس کا مطلب ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

میرا نام ٹرانسفر لسٹ میں نہیں تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کل میرے ساتھ کیا ہوگا۔ میں نے چکو چان سے کہا" اپنا ای میل لکھ دو۔"

کہنے لگا" بہتر ہوگا کہ تم اپنا لکھ دو۔

میں نے کہا" ٹھیک ہے۔" میں نے اسے کاغذ پہ اپنی ای میل آئی ڈی لکھ کر دی۔ میرے کندھے پہ کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو پیچھے سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس کی شکل سے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی رو پڑے گا۔

میں نے کہا" مجھے بہت افسوس ہے اٹلی میچ ہار گیا۔"

"لیکن تم تو خوش ہو گے، ترکی میچ جیت گیا ہے۔"

میں نے خوشی سے کہا" ظاہر ہے میرے لیے یہ خوش کن امر ہے۔ مسلم ٹیمیں کوارٹر فائنل میں شامل ہو گئی ہیں۔"

تو کہنے لگا" اگر ترکی اور سینیگال کا میچ ہو گیا تو ایک مسلم ٹیم باہر ہو جائے گی۔"

میں نے کہا" تو کیا فرق پڑتا ہے ایک مسلم ٹیم تو سیمی فائنل میں شامل ہو جائے گی نا۔"

اس نے پوچھا" کیا تم سپورٹس ازم میں مذہب پرستی کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا" ہرگز نہیں میں دو مسلم ٹیموں کی حمایت اس لیے کر رہا ہوں کہ لوگ مسلم دنیا کو دہشت گردی کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے سپورٹس کے حوالے سے جانیں۔"

کہنے لگا" ہاں یہ تو ہے۔" چکو چان لسٹ میں اپنا نام پا کے اوپر چلا گیا۔ وہ اپنا سامان سمیت

رہا تھا کیونکہ کل ناشتے کے بعد اسے جانا تھا اور جانے سے پہلے اسے تمام لوازمات جمع کروانے تھے۔

میں کچھ دیر تو اس سیکیورٹی گارڈ سے باتیں کرتا رہا پھر ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ ٹی وی پہ کوئی جرمن چینل چل رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس جرمن میوزک چینل کا وڈیو جے ڈی ۔ بے کسی افریقن ملک کا باشندہ تھا۔ نسل پرستانہ حوالے سے میں سوچنے لگا کہ آج ہٹلر زندہ ہوتا تو اپنی نسلی برتری کے زعم پر خون کے آنسو روتا۔

O

جمعے کے دن نیاٹش ملاتی (malatti) یعنی میڈیکل لیو (Medicle Leave) پہ تھا،
اس لیے وہ ناشتہ کر کے ٹی وی دیکھنے لگا اور میں کلنگ میں مصروف ہو گیا۔ نیاٹش کچن میں آیا اور کہنے
لگا" مازا یہ کیا کر رہے ہو۔" میں نے کہا" ویسے ہی تھوڑے انڈے آلو بنا رہا ہوں۔ رات کو حلیم اتنی
مزیدار تھی۔ ساری ختم ہو گئی۔ میں نے برتن وغیرہ دھو کے رکھ دیے ہیں۔"

نیاٹش بولا" ایک بات پوچھوں۔"

میں نے کہا" پوچھیں نیاٹش بھائی۔"

تو کہنے لگا" تم خود کو تکلفات میں کیوں اُلجھائے رکھتے ہو؟"

میں نے کہا" نیاٹش بھائی تکلف کیسا خود بھی تو کھانا ہوتا ہے۔

مازا میں وہ بات نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو تم روز سبزی، دال گوشت بازار
سے خرید لاتے ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ تم ابھی کام وام بھی نہیں کرتے۔"

"بس نیاٹش بھائی اللہ کا کرم ہے۔ ابھی سلسلہ چل رہا ہے جب کڑکی کا وقت آیا بتا دوں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ ایسا ہے کہ میں تو آج جمعہ کی نماز پڑھنے جاؤں گا۔ میرا وس سے بارہ
بجے کا ڈاکٹر کا کنٹرول ہے۔ کھانا میں آ کے کھاؤں گا۔ ویسے تو جمعے کے دن کام پہ ہوتے ہیں۔ آج
چھٹی ہے تو چلو جمعہ پڑھنے کی سعادت مل جائے گی۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"مازام تم نہیں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "خواہش ہے کہ مجھے بھی یہ سعادت مل جائے ویسے ابھی تو میں لائبریری جا رہا ہوں۔"

اس کے بعد نیائش نماز جمعہ کی تیاری کرنے لگا اور میں چند کاغذ اور بال پین لے کر لائبریری چلا گیا۔ لائبریری سے شام قریباً تین بجے واپسی ہوئی۔ مجھے یقین تھا گھر میں کوئی نہ کوئی مہمان ضرور آئے گا۔ کیونکہ دو چھٹیاں آ رہی تھی۔ اریزو میں ویسے تو لوگ ایک دوسرے کو پانچ دن نظر نہیں آتے لیکن جمعے کی شام اور ہفتے کی شام ایک دوسرے سے ضرور ملتے ہیں۔ میں نے انڈے آلو بنانے کے علاوہ تین روٹیاں بنائیں اور پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ چائے پینے کے بعد میں ٹی وی دیکھنے لگا اور مختلف چینلز سے ہوتے ہوئے ایم ٹی وی چینل پہ رُک گیا۔ اس وقت ٹاپ ٹین لگے ہوئے تھے۔ چینل پر ڈی جے کی اطالین بھی سنی جو اطالین میں انگریزی ملا جلا کے بول رہا تھا۔ چند ایک گانے اچھے تھے۔ میں محظوظ ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ نیائش کے ساتھ کوئی اجنبی تھا۔ میں نے اُٹھ کے سلام دعا کی۔ نیائش کہنے لگا "مازا یہ اریزو میں منہاج القرآن کے پریس سیکرٹری رحمت صاحب ہیں۔ پری پیکر میرا مطلب ہے ثقلین نے ان کے سامنے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔ یہ تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتے ہیں سو میرے ساتھ ہی چلے آئے۔"

میں نے کہا "رحمت صاحب آپ کا صرف نام ہی رحمت ہے یا دوسروں کے لیے واقعی باعثِ رحمت بننے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔"

وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔ "جی بس ویسے ہی۔ ثقلین نے بتایا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اریزو میں منہاج القرآن کی مقامی انتظامیہ نے مسجد بنائی ہے۔ ہم اس سلسلے میں ایک تقریب منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ اہلِ علم لوگوں کا اجتماع ہوگا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں جو اظہار خیال کروں وہ بھی ذرا اعلیٰ پائے کا ہو۔۔۔ چونکہ فی البدیہہ اظہار خیال میرے لیے مشکل ہے اس لیے میں نے خود ثقلین صاحب کو کہا تھا کہ وہ تقریر لکھ دیں انہوں نے کہا ہے تقریر آپ سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔"

میں نے کہا "موضوع کیا ہے۔"

"ویسے ہی اسلامی حوالے سے۔"

میں نے کہا "اسلام دینِ فطرت ہے حوالہ جاتی اعتبار سے دین، دُنیا، فطرت، کائنات، ازل تا ابد ہر لمحہ اور ہر ہر چیز اس کے موضوعاتی محیط میں داخل ہے، اب مجھے نہیں معلوم کہ آپ اپنے اظہارِ خیال میں کس نکتے کو مرکزِ خیال بنانا چاہتے ہیں۔۔۔اس لیے ذرا وضاحت فرمایئے کہ آپ اپنی تقریر میں کس خاص نکتے کو موضوع بنانا پسند کریں گے؟"

تو رحمت کہنے لگا "یہی جو آج کل مسلمانوں کی حالت ہے۔"

میں نے کہا "سیاسی، مذہبی، معاشی، تمدنی، اخلاقی اور رُوحانی وغیرہ میں سے آپ کس حالت کا تذکرہ چاہتے ہیں۔" وہ میرے سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔

میں نے اس شخص سے مزید مکالمہ مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے اس کی گفتگو سے پتا چل گیا تھا کہ یہ شخص جاہلِ مطلق ہے مگر اپنے آپ کو سماج میں نمایاں کرنے کا شوق رکھتا ہے۔

OOO

شام کو میں نے سندھی بریانی بنائی۔ ہم دونوں ثقلین کا انتظار کرتے رہے وہ نہ آیا۔ میں نے سوچا آج ویک اینڈ ہے اس لیے کسی رفاہی کام میں مصروف ہوگا۔ نیاٹش کہنے لگا "ماڑا برتن وغیرہ سمیٹ دو۔ بریانی یہیں پڑی رہے۔ اگر آ گیا تو اس کو مائیکرو ویو میں گرم کر کے دے دیں گے۔ اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ آج نہیں آیا تو اس کی کمی سی محسوس ہو رہی ہے۔"

میں خیال ظاہر کیا "نیاٹش بھائی میرے خیال میں وہ ضرور آئے گا۔"

"ہاں تم نے اس کو نشے پہ جو لگا دیا ہے۔"

ہم چائے پی رہے تھے اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ گھر کی گھنٹی بجی۔ میں نے انٹرکام سے پوچھا "کی اے یعنی کون ہے؟"

دوسری طرف سے جواب آیا "میں ہوں، ثقلین دروازہ کھولیں۔"

میں نے دروازہ کھولا۔ ثقلین جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر آیا۔ آتے ہی کہنے لگا آج مجھے ساتھیوں نے آنے ہی نہیں دیا۔ وہ کہہ رہے تھے تم روز کھانا باہر کھاتے ہو آج ہمارے ساتھ کھاؤ، کیونکہ ہم نے آج بریانی بنائی ہے۔ سو کھانا کھانے میں دیر ہوگئی۔ ورنہ میں پہلے آ جاتا۔"

ثقلین بھائی ہم نے بھی بریانی بنائی تھی۔ اگر ہمارے ساتھ کھانا کھاتے تو بریانی ہی ملتی۔ ویسے چائے تیار ہے لیکن وہ آپ پیتے نہیں۔"

''آج پی لوں گا۔''

''آپ کو پتا ہے ہم کھانا کھاتے وقت ٹیبل پر اب تین پلیٹیں اور تین گلاس رکھتے ہیں۔''

نیائش نے دور سے کہا'' آؤ مازا ساری باتیں دروازے پہ ہی کرتے رہو گے۔''

ثقلین اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے چائے پیش کی۔

اس نے میرے ہاتھ میں چھٹا باب پکڑا دیا۔ میں نے اس سے چھٹا باب جس کا وہ مطالعہ کر چکا تھا۔۔۔ وصول کرتے ہوئے کہا''ثقلین بھائی یہ رہا اگلا باب لیکن ابھی میرے پاس رہنے دیجیے۔۔۔ جاتے ہوئے لے جایئے گا۔''

کہنے لگا'' ٹھیک ہے۔''

ہم تینوں کافی دیر تک گپ لگاتے رہے۔ رات بھیگنے کو تھی کہ ثقلین چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ساتواں باب تھا۔

OOO

صبح سویرے چھ بجے ہم سب کو جگا دیا گیا۔ آج ستمبر ۲۰۰۲ء کی ۱۹ تاریخ تھی۔ ان دو دنوں ۔۔۔ یعنی ۱۹ر اور ۲۰ ستمبر کو کوئی میچ نہیں تھا۔ ۲۱ر اور ۲۲ تاریخ کو چاروں کوارٹر فائنل تھے۔ آج یاد و نے چکو چان کو جانا تھا۔ میں اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کب مجھے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ میرا نام کسی بھی لسٹ میں نہیں تھا۔ اس لیے آج مجھے یہیں رکنا تھا۔ جن لوگوں کو یہاں رکنا تھا وہ ہال میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ہال میں ہمیں ناشتہ دیا جاتا تھا۔ یہاں پہ جو عملہ تھا وہ تھوڑا بہتر تھا۔ ان کا رویہ ہمارے ساتھ نسبتاً زیادہ شائستہ تھا۔ جو آدمی ناشتہ تقسیم کر رہا تھا، اپنے موٹاپے کی بنا پر وہ مجھے عدنان سمیع خان کا ڈوپلیکیٹ دکھائی دیا۔ میں پلیٹ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے میری پلیٹ میں آملیٹ قسم کی کوئی چیز اور اس کے ساتھ کپ میں سبز چائے ڈال دی۔ اب میں اس طرح کی چائے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک دو دن تو میرے سر میں شدید درد ہوا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا درد رفع ہو گیا۔

جب ہم ناشتے سے فارغ ہو گئے تو موٹے آدمی نے ہم سب کو کام پہ لگا دیا۔ مجھے ایک عورت اپنے ساتھ لے گئی اور کہنے لگی تم سارے کمروں میں ویکیوم کلینر سے صفائی کرو گے۔ میں تمہیں سکھاتی ہوں کہ یہ کیسے چلتا ہے۔ میں نے کہا'' میں کر لوں گا تم صرف مجھے کمرے دکھا دو۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی اس نے مجھے وہ کمرے دکھائے جو صاف کرنے تھے۔ کچھ

لڑکوں نے صفائی کرنے انکار کر دیا۔ ان کو وعید سنائی گئی کہ انھیں دوپہر کا کھانا نہیں ملے گا۔ میں کھانے کے لیے کام نہیں کر رہا تھا کیونکہ بیکاری میں میرے لیے وقت گزارنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میں نے اس کے بتائے ہوئے طریقے پہ کمرے صاف کرنے شروع کر دیئے۔ میرے حصے میں وہ کمرے آئے جو ہمارے رہائشی تھے۔ میں آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ دماغ کے نہاں خانے میں زندگی کے مختلف واقعات کی فلم چل رہی تھی۔ یہ بڑا دلچسپ عمل ہوتا ہے۔ میں ہاتھوں اور جسم کو مصروف رکھے ہوئے تھا اور دوسری طرف دماغ اپنے کام میں مصروف تھا۔ کام کے دوران وہ عورت جو میرے کام سے متاثر ہوئی اور کہنے لگی" تم تو ایسے کام کر رہے جیسے اسی کام کے لیے بنے ہو۔"

میں نے کہا" کام ایسے ہی کیا جانا چاہیے۔" وہ مجھ سے ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگی" اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور کہنا۔"

میں فوراً عرض گزارتے ہوئے کہا" میں نے کئی دنوں سے یہ جینز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ اگر کوئی دوسری جینز اور ٹی شرٹ مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔"

وہ کہنے لگی" یہ کوئی مسئلہ نہیں، جب تم کام ختم کر چکو تو میرے پاس آنا میں تمہیں کپڑے دکھاؤں گی۔ جو تمہیں پسند آئے اور پورے بھی ہوئے، پہن لینا اور اپنی اُترن دھونے کے لیے دے دینا۔"

میں کہا" بہت شکریہ۔"

اس کے بعد وہ چلی گئی۔ میں نے تین گھنٹے میں سارا کام ختم کیا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس گیا۔ اس نے پوچھا کہ کام ختم ہو گیا تو میں نے کہا، ہاں ختم ہو گیا۔ کیسے آنا ہو؟ میں نے کہا، تمہی نے تو کہا تھا کہ کام ختم کر کے میرے پاس چلے آنا میں تمہیں لباس دوں گی۔ کہنے لگی، میں معذرت خواہ ہوں۔ میں بھول گئی تھی۔ یہاں پہ کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر روز نئے نئے لوگ آتے ہیں۔ ہر شخص علیحدہ ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ جس کمرے میں وہ مجھے لے کر آئی تھی۔ اس میں بے شمار جینز اور ٹی شرٹس اس کے علاوہ کئی قسم کی قمیصیں ہینگرز پر لٹکی تھیں۔ میں نے ایک دو جینز دیکھیں۔ ایک جینز میرے ناپ کی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ٹی شرٹ پسند کی۔ اٹلی میں روانگی سے پہلے ہی میں جینز، اریزو کے بینیٹن (benetton) اور ٹی شرٹ سیش (sasch) کے سٹور زلی تھی۔ یہی جینز اور ٹی شرٹ میں اٹلی سے پہن کر چلا تھا۔ آج بدھ تھا یعنی مجھے یہ کپڑے پہنے ہوئے پانچواں دن تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ یہ کپڑے ملنے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے

مجھے راحت مل گئی ہو۔ میں نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا اور جلدی سے نہانے چلا گیا۔ نہا کر میں نے جینز اور ٹی شرٹ جو کہ استعمال شدہ لیکن صاف اور دھلی ہوئی تھیں، پہن لیں۔ نشیفن کی جینز اور سینش کی ٹی شرٹ میں نے اس عورت کو دے دی۔ اس نے یہ دونوں چیزیں دھلائی کے لیے بھیج دیں۔ اس دوران دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہی آدمی جو عدنان سمیع خان کا ہمزاد دکھائی دیتا تھا، کھانا تقسیم کر رہا تھا جب کہ ایک عورت بھی کھانا تقسیم کرنے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

مجھے یہاں آئے ہوئے اتنے دن ہو چکے تھے لیکن اس دوران میں مجھے خیال ہی نہ آیا کہ میں مسلمان ہوں اور ہم لوگ حلال کھانا کھاتے ہیں۔ یہاں کئی دفعہ گوشت بھی دیا گیا، مرغی کا گوشت بھی دیا گیا۔ مجھے نہیں پتا انہوں نے شاید سوٴر کا گوشت بھی کبھی پیش کر دیا ہو۔ مجھے تجسس تھا۔ میں اس آدمی کے پاس جو بالکل عدنان سمیع خان کا ہم شکل لگتا تھا، چلا گیا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا'' یہ فوڈ جو تم ہم لوگوں کو کھانے کو دیتے ہو۔ اس میں گوشت بھی ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے۔ یہاں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں۔ کیا تم ہم لوگوں کو ایسا کھانا تو نہیں دیتے جو ہمارے مذہب میں منع ہے۔ جیسا کہ سوٴر کا گوشت۔''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچن کی دیوار پہ لکھا ہوا دکھایا۔ وہاں کئی زبانوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ عربی میں بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا'' یہ کیا لکھا ہوا ہے؟''

کہنے لگا'' میں عربی پڑھ لیتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا۔''

تو کہنے لگا'' تم کس ملک کے ہو۔''

میں نے کہا'' پاکستان۔''

کہنے لگا'' مشرف کا کیا حال ہے۔''

میں نے کہا'' مجھے اپنے حال کی خبر نہیں ہے تم مشرف کی بات کرتے ہو۔''

میرے لیے حیران کن امر یہ تھا کہ ان لوگوں کو جیسے ہی پتا چلتا کہ کوئی پاکستانی ہے تو اس سے فوراً پوچھتے'' مشرف کا کیا حال ہے؟ اُسامہ بن لادن کہاں ہے؟'' جیسے پاکستان میں ان دو کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا ہے۔

اس نے وضاحت کی'' یہاں لکھا ہوا ہے کہ ہمارے ہاں مہاجرین کو سوٴر کا گوشت نہیں دیا جاتا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو حلال گوشت دیا جائے، جو کہ اسلامی طریقے

سے حلال کیا گیا ہو نہ کہ جھٹکے والا۔ اس گوشت کا سارا خون بہایا جاتا ہے۔ جانور پہ تکبیر پڑھی جاتی ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔"

میں نے کہا" یہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔"

اس نے جواب دیا" کیونکہ جس آدمی کے پاس یہاں کھانا تقسیم کرنے کا ٹھیکہ ہے وہ مراکش نژاد ہے۔ مسلم ہے اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔"

میں جب سے سوئس آیا تھا یہاں کے نظام کو تنقیدی نقطہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں کی ہر رو مجھے بُری لگ رہی تھی۔ یہاں کے رہنے کا انتظام، کھانا تقسیم کرنے کا انداز مجھے بہت معیوب لگا تھا لیکن یہ بات سن کر میں بہت خوش ہوا کہ یہاں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جاتا ہے۔

وہ کہنے لگا" میں حیران ہوں کہ تم نے ابھی تک مجھے کسی پاکستانی سنگر سے متشکل نہیں کیا، ورنہ یہاں جو بھی پاکستانی آتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ میری شباہت اور جسامت کسی سنگر سے ملتی جلتی ہے۔ اگر زندگی میں کبھی موقع ملا تو اس سے ضرور ملوں۔ تمہارے پاس اس کی کوئی فوٹو ہے۔"

میں کہا" گوگل سرچ انجن پہ ڈھونڈو، اس کی کوئی نہ کوئی ویڈیو مل جائے گی۔"

کہنے لگا" یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میں زیادہ یاہو سرچ انجن استعمال کرتا ہوں لیکن آج کل گوگل اچھا جا رہا ہے۔"

میں پوچھا" یہاں پہ انٹرنیٹ کا کوئی انتظام نہیں؟"

جواب ملا" نہیں یہاں پہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا" تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے میرے ذہن سے ایک بوجھ اُتار دیا۔ میں سوچ رہا تھا شاید میں اتنے دن سے حرام گوشت کھا رہا ہوں۔ ہمارے مذہب میں مجبوری کی حالت میں ایسا کرنا جائز ہے لیکن یہاں ہم ایسے بھی مجبور نہیں ہیں۔"

وہ بولا" تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ تم جیسے ہی ہگی کرائس میں جاؤ گے تمہیں اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس ہوگی۔ اگر تم نے چھ مہینے گزار لیے اور تمہارا کیس مضبوط ہوا تو اس کے بعد تمہیں کام کرنے کی اجازت ہوگی۔ کیونکہ سوئس میں غیر قانونی طور پر مقیم رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی ایک طریقہ ہے کہ آپ سیاسی پناہ کے لیے درخواست گزار ہوں یا اس دوران میں کوئی لڑکی آپ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔"

میں نے کہا" لیکن اس سارے عمل میں وقت بہت لگتا ہے۔"

"ہاں وقت تو لگتا ہے لیکن سب کو اس راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔"

اس نے میری پلیٹ میں دوبارہ کھانا ڈالا اور میں آ کر میز پہ بیٹھ گیا۔ اب جو میں نے کھانا شروع کیا تو اس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں آ کے میس میں بیٹھ گیا۔ یہاں پہ دو دونوں پاکستانی لڑکے بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ایک جس کے گال پچکے ہوئے تھے اور دوسرا جو خود کو افغانی کہتا تھا ان میں سے ایک مجھ سے پوچھنے لگا" تم اس اہلکار سے کیا باتیں کر رہے تھے۔"

"میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ جو گوشت ہمیں کھانے کو دیا جاتا ہے وہ حلال ہوتا کہ نہیں۔"

"تو اس نے کیا کہا؟"

"اس کا کہنا ہے سو فیصد حلال ہوتا ہے۔"

"میں نے پوچھا" تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ہے مقصود۔"

"افغانی بولا" میں گلبدین ہوں۔"

میں نے کہا" حکمت یار بھی ملا لو۔"

کہنے لگا" ہمارے افغانستان میں گلبدین کئی لوگوں کا نام ہوتا ہے۔"

میں نے کہا" کچھ لوگ خود بھی تو رکھ لیتے ہیں۔"

اس کو میری بات سمجھ نہ آئی۔ میں مقصود اور گلبدین کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک اور موٹا سا لڑکا آیا۔ اس کی عمر اٹھارہ یا بیس سال ہوگی۔ اس نے اجازت طلب کی" میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

میں نے کہا" بیٹھ جاؤ۔"

کہنے لگا" میں کل رات کو آیا ہوں۔"

میں نے کہا" اچھی بات ہے۔ ہم تمہیں ویلکم کہتے ہیں۔"

مقصود اس سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا" ان سے پوچھ لو۔ یہ تمہیں بتائیں گے کہ کون سا کیس کروانا ہے۔"

میں نے پوچھا "تم اسے جانتے ہو؟"

بولا "ہاں، اس کا ایک چچا ہمارے حلقے سے الیکشن لڑتا ہے۔ ہمارے علاقے کا ایم پی اے ہمیشہ وہی بنتا ہے۔ اس کو نون لیگ والے ٹکٹ دیتے تھے۔ آج کل وہ خود کھڈے لائن لگے ہوئے ہیں۔ نئی اسمبلی میں وہ شامل نہیں ہے۔"

وہ موٹا سا لڑکا بولا "میرے والد صاحب اور ایک چچا وزیر تصور رہتے ہیں۔"

میں کہا "تو تمہیں سیاسی پناہ کی کیا ضرورت تھی۔ تم اپنے والد صاحب کے ذریعے امیگریشن کروالیتے۔"

کہنے لگا "میری عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی اس لیے مجھے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔"

میں نے کہا "تمہارا انٹرویو ہو چکا ہے۔"

کہنے لگا "نہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیس بناؤں۔"

مقصود جلدی سے بولا "گے" ہونے کا کیس کرواؤ۔ کہنا میں کسی لڑکے کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میرے گھر والوں کو پسند نہیں تھا۔ یہ کیس منظور ہو جائے گا۔ انہوں نے بھی یہی کیس کروایا ہے۔"

موٹا لڑکا حیرت سے میری شکل دیکھنے لگا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا یہاں مہاجروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کالے، گورے، پیلے، گلابی ہر رنگ کے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔

دھوپ تیز اور گرمی بہت تھی۔ جسم پر ایک عجیب طرح کی چپچپاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ آس پاس درختوں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی بنا پر فضا میں نمی بہت زیادہ تھی۔ درخت بھی نہ جانے کون سی گیس خارج کر رہے تھے کہ فضا میں ایک عجیب طرح کی بساند پھیلی تھی۔ میں نے ہم نشینوں سے اجازت لی اور اٹھ کے ایک کونے میں چلا گیا۔ نیچے باغ میں ایک سکیورٹی گارڈ اپنے جرمن شیفرڈ کتے کے ساتھ چکر لگا رہا تھا۔ میں ٹیرس کے ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ اس سکیورٹی گارڈ نے مجھے نیچے سے ہیلو کہا۔ میرے جوابی ہیلو کے بعد مجھ سے پوچھنے لگا کہاں کے ہو؟ میں نے خود کو پاکستانی بتایا تو اس نے بھی مجھ پر وہی بھونڈے سوال داغ دیے۔۔۔ مشرف کا کیا حال ہے؟ بن لادن کدھر ہے؟ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ عالمی صورت حال کے تناظر میں پاکستان کے صرف دو ہی حوالے معروف ہیں ایک مشرف دوسرا بن لادن۔۔۔ کاش مشرف یا بن لادن کے حوالے سے پاکستان کو

جاننے والے یہ بھی جان سکتے کہ پاکستان میں دُنیا کے بلند ترین پہاڑ ہیں۔ ہمارے ہاں دُنیا کی خوبصورت ترین جھیلیں ہیں۔ دنیا کے بڑے گلیشیرز میں سے ایک پاکستان میں بھی ہے۔ دنیا کی دوسری اُونچی چھوٹی پاکستان میں ہے۔ دنیا کے دس طویل ترین دریاؤں میں سے ایک دریائے سندھ جو کہ انڈس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، پاکستان میں ہے۔ اس کی لمبائی ایک ہزار آٹھ سو کلومیٹر ہے۔ یہ دریائے نیل، دریائے مسی سپی (Mississisipi) اور چینی دریائے پیلا دریا بھی کہتے ہیں کی طرح طویل ہے۔ دنیا کا سب سے اُونچا پولو گراونڈ پاکستان میں ہے۔ دنیا کا سب سے اُونچا درہ پاکسان میں ہے۔ پاکستان دُنیا کی دو قدیم ترین تہذیبوں وادیٔ سندھ کی تہذیب اور گندھارا تہذیب کا وارث ملک ہے۔ یہاں یہ بات کوئی نہیں کرتا۔ حالانکہ میں جب گائیڈنگ کرتا تھا تو اس دنوں، سب سے زیادہ رفاہی ادارے جو پاکستان میں کام کر رہے تھے، وہ سوئس تھے۔ میں انہی خیالوں میں محو تھا کہ ڈنر کا وقت ہوگیا۔ جو شام چھ بجے کا تھا، مجھے یہاں ایک ایک دن گزارنا ایسے لگ رہا تھا جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے مرزا غالب نے کہا تھا:

ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ہم لوگ اپنی اپنی پلیٹ ہاتھوں میں لیے بھکاریوں کی طرح قطار میں کھڑے ہوگئے۔ ہمارے ساتھ وہ لڑکا بھی قطار میں کھڑا ہوا گیا جس کا چچا گجرات شہر سے کئی دفعہ ایم پی اے بن چکا تھا اور جواب پھر سے ایم پی اے ہونے کے لیے انتظار کر رہا ہے، لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے اس وقت اس کا بھتیجا قطار میں بھکاریوں کی طرح کھڑا ہو کے کھانا وصول کر رہا تھا۔

میں نے کہا "تمہیں معیوب نہیں لگ رہا۔"

کہنے لگا "تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ جب کچی کراس مل جائے گی تو میرے ڈیڈی مجھے روز ملنے آیا کریں گے بلکہ میں دن کو انہی کے پاس رہا کروں گا۔"

میں نے کہا "اگر گجرات میں کسی کو پتا چل جائے کہ ان کے ایم پی اے صاحب کا بھتیجا سوئس میں بھکاریوں کی طرح کھانا وصول کر رہا ہے تو وہ کیا کہیں گے۔"

کہنے لگا "انہیں کوئی بتائے گا تو تب بات کریں گے نا۔"

میں نے کہا "یہ لڑکا بھی تمہارے گاؤں کا ہے، مقصود۔"

تو کہنے لگا "اس کی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ یہ میرے بارے میں کوئی ایسی بات کرے۔

جب یہ یہاں سے نکلے گا تو اس کے کام کا بندوبست میرے چچا نے ہی کرنا ہے۔"

میں نے کھانا لیا اور آ کر میز پہ بیٹھ گیا۔ یہاں کا طرز نشست اس بڑے ہال کی طرح نہیں تھا، جہاں لمبے لمبے بنچز پڑے ہوئے تھے بلکہ یہاں پر چھ افراد کے لیے ایک میز تھی۔ جس کا جہاں دل کرتا بیٹھ جاتا۔ میرے ساتھ وہ دونوں پاکستانی آ کر بیٹھ گئے اس کے بعد مونا بھی آ گیا۔ ہماری ٹیبل پہ اب بھی دو افراد کی گنجائش موجود تھی۔ دو افراد ہم سے اجازت لے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں خیال ظاہر کیا "تم لوگ پاکستانی ہو نا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

وہ بولا "میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم چاروں پاکستانی ہیں۔ تم دونوں کس ملک کے ہو۔"

وہ آدمی جو مجھ سے مخاطب ہوا، کہنے لگا "میں لبنان کا رہنے والا ہوں۔"

دوسرا بولا "میں ایرانی ہوں۔"

میں نے کہا "ہمیں دو مسلم ممالک کے افراد سے مل کر خوشی ہوئی۔"

ایرانی مجھے کہنے لگا "مجھے پہلے لگا تم ایرانی ہو کیونکہ تمہارا ناک نقش ایرانیوں جیسا ہے۔"

میں نے کہا "سب کا باوا آدم ایک ہی ہے۔۔۔ کسی ملک کے باشندے کے خدوخال کسی دوسرے ملک کے باشندے جیسے ہونا ایسی اچنبھے کی بات نہیں۔۔۔"

میں نے دونوں سے نام پوچھا۔ لبنانی بولا: "میرا نام عادل ہے۔"

ایرانی نے اپنا تعارف رضا نقی کے نام سے کروایا۔

میں نے کہا "میرا نام فرشتہ سبزواری ہے۔"

میں نے جیسے ہی فرشتہ سبزواری کہا، تو ایرانی چونکا۔ کہنے لگا "یہ نام ایرانی ہے۔ تمہیں پتا ہے سبزوار ایران کا ایک شہر ہے۔"

میں نے کہا "میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہمارے بزرگ ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی ہمارے بزرگ اس علاقے میں رہائش پذیر تھے جو بعد ازاں پاکستان کہلایا۔"

وہ بولا" ایران میں سبزواریوں کو اہلِ علم و ہنر ہونے کی بنا پر خاص شہرت حاصل ہے۔"
میں نے کہا" میں دوسرے سبزواریوں کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن میرے دادا،
کتاب سے عشق کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی کتابوں کی محبت میں
گزاری۔"

جب میں اس ایرانی سے باتیں کر رہا تھا مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ میرے آس پاس کوئی
بیٹھا ہے۔ وہ پاکستانی تو بالکل خاموشی سے بیٹھے رہے لیکن لبنانی کبھی کبھی کوئی لقمہ دے دیا کرتا۔ ایرانی
کی عمر چالیس، پینتالیس کے درمیان تھی جبکہ لبنانی بیس سے چوبیس سال کا نوجوان نظر آتا تھا۔

ایرانی مجھے بہت دلچسپ شخصیت کا حامل انسان لگا کیونکہ میرے نام کے حوالے سے کبھی
بھی کسی نے ایسی بات نہ کی تھی۔ مجھے سکول، کالج میں کوئی سبزواری کی بجائے پیلاواری، کوئی نیلاواری
کہتے ہوئے میرا نام بگاڑتا۔ رضا بیہقی پہلا آدمی تھا جس نے ایرانی شہر سبزوار سے میری نسبت تلاش
کرنے کی کوشش کی تھی۔ رضا بتا رہا تھا کہ سبزوار کے ساکنان کو عموماً سبزیواری یا سبزواری کہا جاتا ہے،
سبزوار میں ایئرپورٹ بھی ہے اور یہ شہر زمینی راستے سے مشہد سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس
کے ایک طرف نیشاپور ہے اور دوسری طرف اسفاران، اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے اور یہاں
دو یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ اس شہر نے علمی اعتبار سے ایران کو بے شمار نابغہ روزگار شخصیات دی ہیں، میں
نے آج تک غور نہیں کیا تھا کہ میرے نام کے لاحقے "سبزواری" کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ میرے دادا،
اس بارے میں جانتے تھے لیکن انھوں نے اس بابت مجھ سے کبھی ذکر نہ کیا۔ میں ایک ہی بات جانتا تھا
کہ اس نام کا کراچی میں ایک اداکار ہے بہروز سبزواری، جو ٹی وی کے ڈراموں میں زیادہ تر مزاحیہ
کردار ادا کیا کرتا ہے۔ یہی ایک سبزواری تھا جس کے بارے میں میں جانتا تھا۔ اس سے بھی ذاتی
طور پر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ نہ ہی کبھی دل میں اس طرح کی کسی خواہش نے جنم لیا۔ اس وقت میں فکری
طور پر ایک کشاکش میں مبتلا تھا۔

میرے ساتھ جب چکو چان کی ملاقات ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے دلچسپ گفتگو
رہے گی۔ لیکن وہ جھیل کی طرف جاتے ہوئے جب موبائل فون کی پروڈکشن کے بارے میں بتا رہا تھا
تو اس نے جیسے ہی جھیل کا پانی دیکھا سب کچھ بھول کے پانی میں کود گیا تھا۔ اس نے موبائل فون
پروڈکشن کے حوالے سے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے میرا تجسس سوا ہو گیا تھا۔ اس کے

بعد اب یہاں رضا توفیق سے ملاقات ہوئی ہے۔ گو کہ رضا عمر میں کچھ زیادہ بڑا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہیں معلوم، مجھے یہاں کتنے دن مزید رکنا ہوگا۔ میرا میڈیکل ابھی باقی ہے۔ آج بدھ تو گزر گیا کل جمعرات ہے اس کے بعد جمعہ۔ ہفتے اور اتوار کو یہ لوگ تعطیل پر ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ان دو دنوں میں میرا میڈیکل ہو جانا چاہیے ورنہ یہاں رہتے ہوئے۔ میرے لیے وقت گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

ہم لوگ کھانا کھا کے اپنی اپنی پلیٹ وہیں ٹرے میں رکھ آئے جہاں سے پلیٹیں لی تھیں۔ اس کے بعد میں کچن میں کھانا تقسیم کرنے والوں کی مدد کرنے چلا گیا۔ وہاں سے گھنٹہ بعد فراغت ملی تو آ کر میرس میں بیٹھ گیا۔ رضا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ تینوں پاکستانی بھی نظر نہ آئے۔ میں نے اپنی نشست چار پانچ افریقن لڑکوں کے ساتھ جمالی۔ ان سب کے نام ولیم، مائیکل، جارج، تھومس، ڈیوڈ تھے۔ مائیکل نے پوچھا "تم کہاں کے ہو؟"

میں نے جب پاکستانی بتایا تو کہنے لگا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا سب سے اچھا دوست پاکستانی ہے۔"

میں نے کہا "کہاں، یہاں سوئس میں۔"

کہنے لگا "نہیں نہیں، نائیجیریا میں۔ اس کا نام ندیم ہے۔ ان کے وہاں کئی سپر سٹورز ہیں۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ پاکستانی نائیجیریا میں بھی ہیں۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ کینیا میں بہت سے ہندی یا اردو بولنے والے ہندوستانی تقسیم ہند سے پہلے کے آباد ہیں لیکن مجھے نائیجیریا کا نہیں پتا تھا۔ ان لڑکوں کی انگریزی میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی نئی قسم کی انگریزی تھی۔ وہ عجیب لب و لہجے میں ڈھاڑ ڈھا کر کے بولتے۔ اور اتنا اونچا بولتے جیسے لڑائی کر رہے ہوں۔ میرے خیال میں وہ انگریزی میں اپنی مقامی زبان ملا کے بول رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے سینیگال کے لوگ اپنی زبان بولتے بولتے کوئی نہ کوئی لفظ فرنچ کا بھی بول دیتے ہیں۔ یہاں پہ کافی دیر گپ شپ کے بعد ہمیں اٹھنے کو کہا گیا۔ ہم سب نے مل کر میرس کی تمام کرسیاں اکٹھی کیں۔ میرس کو صاف کیا۔ اس کے بعد ہم سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ انہی کمروں میں، جہاں ایک ایک کمرے میں سولہ سولہ بستر لگے ہوئے تھے۔

OOO

آج صبح جب ہمیں جگایا گیا تو ہمیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ کون کون اس بیرک نما عمارت سے رخصت ہوگا اور کون کون یہاں رکے گا۔ میرا نام بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے اس بیرک نما عمارت کو خیر باد کہنا تھا۔ آج بھی ورلڈ کپ کا کوئی میچ نہیں تھا۔ آج جمعرات تھی۔ کل دو میچ ہونے تھے۔ دونوں کوارٹر فائنل تھے۔ پہلا میچ جرمنی بمقابلہ امریکہ اور دوسرا انگلینڈ بمقابلہ برازیل تھا۔

میں اس بیرک نما عمارت سے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ نیچے جا کے لانڈری والے سے کہا کہ اگر دھل گئی ہے تو میری جینز اور ٹی شرٹ دے دو۔ ٹی شرٹ کا جواب مجھے اسی وقت دکھائی دے گیا، جب میں نے دیکھا کہ میری ٹی شرٹ ایک عورت نے پہنی ہوئی ہے۔ یہ وہی سری لنکن عورت تھی جس کو میں نے پہلے دن اس افریقن لڑکے کے ساتھ بائبل کے کسی موضوع پہ باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اب میں اس سے کیسے کہتا کہ میری سپیشل ٹی شرٹ اتار دو۔ میں نے بڑے چاؤ سے اریزو شہر کی مشہور گلی کورسو اتالیہ (Corso Italia) سے خریدی تھی۔ جینز البتہ مجھے مل گئی۔ ہیٹیشن کی یہ جینز میں نے اٹلی سے لی تھی۔ کئی دفعہ دھلنے کے بعد اب گھٹنوں سے تھوڑی تھوڑی پھٹ گئی تھی۔ لیکن آج کل فیشن تھا اس لیے بری نہیں لگتی تھی۔ میں نے جلدی سے جینز لی۔ قریب کے ایک باتھ روم میں بدلی اور جو جینز اس عورت نے مجھے دی تھی وہ دوبارہ دھونے کے لیے دے دی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب نے جھیل کی راہ لی۔ میں نے ہمقدم ساتھیوں کو چکما دیا اور کرائس لنگن شہر کی طرف نکل گیا۔ جھیل کی سڑک کے بالکل متوازی ایک اور بڑی سڑک تھی جو سٹیشن کے پاس سے ہوتی ہوئی بازار کی طرف جاتی تھی۔ جو سڑک سٹیشن کے ساتھ ساتھ تھی اسی روڈ پہ وہ انٹرنیٹ کیفے تھا جہاں میں اپنا موبائل فون اس باریک مونچھوں والے آدمی کے پاس امانتاً چھوڑ آیا تھا۔ میں چاہتا تو جا سکتا تھا اور اس سے کہہ سکتا تھا کہ میرا موبائل مجھے واپس کر دو لیکن میں اسے کہاں رکھتا۔ مہاجر کیمپ میں کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ موبائل فون ہونے سے انہیں شک ہو جاتا کہ مہاجرین کے یہاں سوئس میں پہلے سے روابط موجود ہیں اور وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت یہاں اپنے غیر قانونی قیام کو قانونی بنانا چاہتے ہیں۔ میں بازار میں چلتے چلتے آس پاس دوکانوں پر نظر ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ دوکانوں کے برآمدوں میں سیاح بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی دوکانوں، ہوٹلوں اور ریستورانوں کے باہر رنگ برنگے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ کچھ جگہوں پہ فٹ بال کی ٹیموں کی بھی جھنڈے لہراتے دکھائی دیے۔ زیادہ جھنڈے برازیل کے تھے۔ تاہم ایک دو فلیگز ترکی کے بھی دکھائی دیے۔ راستے میں جابجا رنگ برنگی

مصنوعی سوانز (Swans) سجی ہوئی تھیں۔ میں نے راہ چلتے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ سوانز کس نے بنائی ہیں۔ وہ میرے سوال کا جواب تو نہ دے سکا البتہ سوانز میں میری دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں ایک وضاحتی پمفلٹ تھما دیا۔ اس پہ تفصیل سے لکھا ہوا تھا کہ کن کن جگہوں پہ اس طرح کی سوانز سجائی گئی ہیں۔ کل پندرہ سوانز پورے کرائس لنگن میں مختلف جگہوں پہ سجائی گئی تھیں۔ ہر سوان دوسری سوان سے مختلف تھی۔

کرائس لنگن کا یہ بازار بہت صاف ستھرا اور بہت کشادہ تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اُونچے اُونچے درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ چلتے چلتے میں ایک باغ میں داخل ہوا۔ باغ میں سرسبز وشاداب کیاریوں کی مدد سے مختلف نقش ونگار بنائے گئے تھے۔ بے شمار پھول اگے ہوئے تھے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے گمان ہوا کہ میں اسلام آباد کے کسی باغ میں گھوم رہا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ہاں بہار کا موسم مارچ اور اپریل میں شروع ہوتا ہے جبکہ یہاں کرائس لنگن میں بہار جون کے مہینے میں اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔ باغ میں اکا دکا لوگ تھے کیونکہ یہ وقت شہریوں کی فراغت کا نہیں تھا۔ مجھے بارہ بجے سے پہلے واپس بھی جانا تھا کیونکہ معمول کے مطابق ان کے ظہرانے کا وقت یہی طے تھا۔۔۔ میرے پاس ابھی پچاس منٹ تھے۔ میں باغ میں گھومتا رہا اس کے بعد میں سڑک کے کنارے کنارے ہولیا۔ برلب سڑک آہستہ آہستہ دوکانوں کی تعداد میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ سڑک کے اس پار ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ تھی۔ ویسی ہی جیسی اٹلی میں کوپ، اپر کوپ، ایسے لنگا، ڈیسپار، یوروسپار اور پام وغیرہ کے نام سے بزنس کر رہی ہیں۔۔۔ یہاں سوئس میں میگروس (migros) کے نام سے سٹورز کی ایک چین (Chain) بہت معروف ہے۔ یہ سٹور جو سڑک کے اس پار تھا اس کا نام میگروس ہی تھا۔ میرے پاس تو پیسہ دھیلا تھا نہیں اس لیے میرے اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں سڑک کے جس طرف چل رہا تھا، چلتا رہا۔ تھوڑی دُور جا کے دوکانیں، شوروم وغیرہ ختم ہو گئے اور رہائشی علاقہ شروع ہو گیا۔ چند منٹ تک سنسان راستے پر چلتے رہنے کے بعد آخر میں مجھے ایک عمارت نظر آئی۔ یہ تین منزلہ عمارت میرے خیال میں کوئی ہوٹل تھا۔ اس کا رنگ نیلا اور کھڑکیاں سفید تھیں۔ جب میں قریب پہنچا تو میرے اندازہ ٹھیک نکلا۔ اس کا نام تھا بلیو ہوٹل (Blue Hotel) جب سے میں سوئس آیا تھا سوانز کے بعد یہ دوسری چیز تھی۔ جس کے نظارے نے مجھے متاثر کیا۔ نیلے رنگ کی عمارت سفید کھڑکیوں کے ساتھ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے باہر پارکنگ میں چند گاڑیاں

کھڑی تھیں۔ اور ایک کونے میں لکڑی کے سائن بورڈ پہ اس کا نام لکھا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے میں نے سوچا واپس چلنا چاہیے۔ کیونکہ میرا دیر سے پہنچنا میرے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ میں انہی درختوں کی چھاؤں میں واپس چلتا ہوا، اسی روڈ پہ آ گیا جہاں میں پہلے دن آیا تھا گو کہ اب درختوں کے سائے اپنی سایہ داری کے حوالے سے بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ درختوں کا سایہ نوے ڈگری کے زاویے سے بدلتا ہے۔ زمین چونکہ سورج کے گرد گھومتی ہے اسی لیے سال کے تین سو پینسٹھ دن سایہ روز اپنی جگہ بدلتا ہے، یعنی ہر چیز کا سایہ تین سو پینسٹھ رنگ کا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے اس لیے اس کے نکلنے اور نظر آنے کے مناظر ہر مہینے بدلتے ہیں۔ اب میں اس کیفے کے پاس سے گزر رہا تھا جہاں میں نے اپنا موبائل فون چھوڑا تھا۔ اس وقت یہ نیٹ کیفے بند تھا۔ میں سٹیشن کی اسی قتل نما راہ داری جسے "سب وے" کہا جاتا ہے، سے گزر کے پہلے کونساتر سترازے پہ آیا اور اس کے ساتھ ہی میں دوبل لس سترازے کی طرف مڑ گیا جہاں ہمارا مہاجر کیمپ تھا۔ میں سیدھا کیمپ کی طرف گیا۔ سکیورٹی گارڈ نے پہلے میری تلاشی لی اس کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر پہنچا تو عجیب قسم کی ہلچل مچی تھی۔ مقصود مجھے ادھر ایک کونے میں کھڑا مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

اس نے بتایا "انگولا کے کسی لڑکے کی سکیورٹی گارڈ سے ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔"

میں نے پوچھا "لڑائی کیوں ہوئی ہے۔"

کہنے لگا "مجھے نہیں پتا لیکن سب کہہ رہے ہیں سکیورٹی گارڈ کی غلطی تھی۔"

مجھے اس امر کا تجسس ہوا کہ آخر معاملہ کیا تھا؟ انگولا کے اس لڑکے نے، جس کے بارے میں بتایا جا رہا تھا کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔۔۔ چند دن پہلے یہاں مجھے کافی پلا کر اپنا ممنون احسان کر چکا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں باغ میں جا کے ستانے لگا۔ وہاں دوسری لنگن عورت اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھی دھوپ تاپ رہی تھی۔ اس نے میری سیش والی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ مجھے بہت برا لگا لیکن میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ باغ میں مجھے مائیکل مل گیا۔

میں نے مائیکل سے ہیلو ہائے کیا۔ احوال پرسی کے بعد میں نے سوالیہ انداز میں کہا "میں

نے سنا ہے یہاں پولیس آئی تھی۔"

کہنے لگا "ہاں آئی تھی۔ انگولا کے لڑکے نے ایک سکیورٹی گارڈ کو پیٹا ہے۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

"اس سکیورٹی گارڈ نے اسے گالی دی تھی۔"

"لیکن اسے کیسے سمجھ آئی۔"

کہنے لگا "کیا تمہیں نہیں پتا انگولا، پرتگال کی کالونی رہا ہے۔"

میں پوچھا "مجھے نہیں پتا لیکن پرتگال کا انگولا کے لڑکے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

تو کہنے لگا "تعلق ہے۔ انگولا میں سرکاری زبان پرتگالی ہے۔ وہ سکیورٹی گارڈ پرتگالی زبان بولتا تھا۔ ویسے تو وہ سوئس نیشنل ہے لیکن اس کے ماں باپ پرتگال سے ہجرت کر کے سوئس آئے تھے۔ اس سکیورٹی گارڈ نے انگولا کے لڑکے کے ساتھ بدتمیزی سے بات کی۔ جب اس نے احتجاج کے طور پر سکیورٹی گارڈ کی بات نہ مانی تو اس نے اس کو پرتگالی زبان میں گالی دی۔ انگولا کا وہ لڑکا پرتگالی زبان سمجھتا تھا۔ یہ بات شاید سکیورٹی گارڈ کو نہیں پتا تھی۔ اس سکیورٹی گارڈ نے جیسے ہی گالی دی اس لڑکے نے گھوم کے لات ماری اور اس کے سامنے والے دو دانت توڑ دیے۔ سکیورٹی گارڈ کو ایمبولینس لے گئی اور لڑکے کو باقی سکیورٹی گارڈز نے قابو کر لیا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ جان چھڑا لے لیکن وہ اُن کے چنگل سے نہ نکل سکا۔ آخر کار پولیس آ کر اُسے لے گئی۔"

مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے کہا "اب اسے ڈیپورٹ کر دیں گے۔"

مائیکل کہنے لگا "نہیں جب تک اُس کے کیس کا فیصلہ عدالت نہیں کرتی وہ جیل میں رہے گا۔ اور ایسا بھی ممکن ہے کہ اُس کی سیاسی پناہ کی درخواست منظور ہو جائے۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ انگولا کے اس لڑکے نے ایک تنومند سکیورٹی گارڈ کو کیسے زخمی کر دیا۔ بظاہر تو وہ دبلا پتلا نظر آتا تھا۔

OOO

مائیکل جا چکا تھا۔۔۔ میں باغ میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ میرے پاس دو گھنٹے باہر جانے کا اجازت نامہ تھا۔ میں نے سوچا جھیل کنارے چلنا چاہیے۔ میں باغ سے اُٹھا اور سکیورٹی گارڈ کو اپنا کارڈ دکھا کر باہر چلا آیا۔ میں گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا جب بامین ہوف سٹراز ے پہ پہنچا

تو مجھے پیچھے سے کسی کے بلاوے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ٹھان رکھی تھی کہ آج سب سے چھپ کے کہیں اکیلا جاؤں گا لیکن شاید میرے نصیب میں تنہائی کا سکون نہیں تھا۔ وہی پچکے ہوئے گالوں والا مقصود میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ پاس پہنچ کے کہنے لگا آج لگا آج صبح میرا ایک جگہ جانا ہوا، وہاں کتابیں بھی ہیں۔ تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تو میری ساتھ چلو، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔''

میں نے کہا'' تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے کتابیں پڑھنے کو شوق ہے۔''

کہنے لگا'' میرا بلکہ ہم سب کا خیال ہے کہ تم بہت پڑھے لکھے آدمی ہو اسی لیے ہر کسی سے انگریزی میں بات کر لیتے ہو۔''

میں نے کہا'' لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھے کتابوں سے بھی دلچسپی ہو گی میں بہت سے ایسے پڑھے لکھے لوگوں کو جانتا ہوں جن کی زندگی میں کتاب کا کوئی دخل باقی نہیں رہا ہے۔''

میں مقصود کے ساتھ ہولیا کہ چلو کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کو مل جائے گی وقت اچھا گزرے گا۔ ہم دونوں کو ستاز ستراز ے پہ چلتے چلتے ایک عمارت کے پاس پہنچے، جس کے سامنے کسی لیبارٹری کا بورڈ لگا تھا۔ مقصود مجھے اس کے پچھواڑے لے گیا۔ پچھلی طرف لوہے کی مضبوط سیڑھیاں تھیں۔ ہم نے پہلی منزل طے کی اس کے بعد دوسری منزل طے کی۔ تیسری منزل پہ پہنچتے ہی مقصود نے ایک لکڑی کے دروازے پہ دستک دی۔ جھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ ہمارے سامنے ایک سنہرے بالوں والی اُدھیڑ عمر خاتون کھڑی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو اندر داخل ہونے کو کہا۔ مقصود نے اپنی بساط کے مطابق اس عورت کو سمجھایا کہ میں کون ہوں؟ لیکن بالآخر مجھے خود ہی خود کو متعارف کروانا پڑا اور یہ بتانا پڑا کہ میں کون ہوں اور میرا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے جیسے ہی کمرے میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ یہاں مہاجر کیمپ کے اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں عورتیں، بچے، جوان بھی تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ سربیا، کروشیا اور کوسووا کے تھے۔ اس خاتون نے مجھ سے پوچھا، اگر کوئی خواہش ہو تو بتاؤ۔ میں نے کہا، اگر چائے مل جائے تو مجھے دنیا میں جنت مل جائے گی۔ تو کہنے لگی، ہمارے پاس چائے کی پتی موجود ہے اگر تم خود چائے بنانا جانتے ہو تو بنالو۔ وہ کونے میں چولہا ہے۔ میں نے پوچھا پہلے مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہ کون سا ادارہ ہے۔ کہنے لگی، اس ادارے کا نام '' آگاتھو'' (agathu) ہے۔ یہ مجبور اور بے گھر لوگوں کی مدد کے لیے کھولا گیا ہے۔ ہم مہاجرین کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر کسی کو وکیل کی ضرورت ہو تو اس کو مفت وکیل فراہم کرتے ہیں۔''

میں نے طنزاً کہا "کیا سوئس لوگوں کو چیریٹی سنٹر کھولنے کا کچھ زیادہ ہی شوق نہیں۔ اس نے جملے میں میرے طنز کی کاٹ محسوس کرتے ہوئے وضاحتاً کہا "میں اوروں کے بارے میں تو نہیں جانتی لیکن ہمارا یہ ادارہ بالکل صحیح بنیادوں پہ کھولا گیا ہے۔" میں نے کونے میں پڑی الیکٹرک کیتلی میں چائے بنائی۔ چائے تو بے ذائقہ بنی لیکن میں نے بڑی چاہت سے پی۔ میزبان نے مجھے کھانے کو بسکٹ پیش کر دیئے۔ مقصود یہ سب دیکھ کے بڑا حیران ہوا۔

کہنے لگا "میں اسی لیے تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔ ان سے کہو اگر کوئی کپڑے ان کے پاس ہوں تو۔۔۔"

میں نے کہا "میں پوچھ لیتا ہوں لیکن یہ کچھ مناسب نہیں۔"

اس نے اصرار کیا "میری خاطر پلیز" میں جانتا تھا کہ ضرورت انا کو مار دیتی ہے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مقصود کی خاطر میں نے عورت سے پوچھا کہ ضرورتمندوں کے لیے تم لوگوں کے پاس ملبوسات ہیں؟ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ وہاں تہ در تہ ملبوسات رکھے ہوئے تھے۔ کہنے لگی تمہیں جو پسند ہوں لے لو۔ ہمیں یہ ملبوسات مختلف دوکانوں والے بھیجتے ہیں۔ ان کا جو مال نہیں بکتا وہ عموماً رفاہی اداروں کو بھیج دیتے ہیں۔ کچھ ملبوسات ہمیں عام شہری بھی دے جاتے ہیں۔

میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔ میں جلدی سے مقصود کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں لے گیا جہاں ملبوسات پڑے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "تمہیں جو کپڑے پسند ہیں یہاں سے لے لو۔"

مقصود نے میری طرف تشکر بھرے انداز میں دیکھا۔ جیسے میں نے اس کی کوئی بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہو۔ اس کے بعد میں دوبارہ اس کمرے میں آ گیا۔ یہاں بہت سے نیشنل جیوگرافک میگزین پڑے تھے۔ میں نے ان میں سے کچھ ایسے شمارے پسند کیے، جو موضوعات کے حوالے سے مجھے دلچسپ محسوس ہوئے، گو کہ یہ شمارے بہت پرانے تھے لیکن جن کی نظر سے یہ مواد نہیں گزرا تھا ان کے لیے تو نئے تھے۔ میں نے اس خاتون سے پوچھا، کیا میں یہ لے جا سکتا ہوں۔ تو کہنے لگی جب جانے لگو تو لے جانا۔ میں نے کہا، بہت شکریہ۔

یہاں بہت سارے بچوں کے کھلونے، کتابیں، رسالے، اخبار وغیرہ پڑے تھے۔ کمرے کے ایک طرف ایک مستطیل میز پڑی تھی، جس پر ایک لڑکی سر جھکائے کچھ لکھ رہی تھی۔

میں نے اس خاتون سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟

کہنے لگی" آؤ تمہیں اس سے ملواتی ہوں۔"

اس طرح وہ خاتون مجھے اس لڑکی کے پاس لے آئی۔ میں نے ہیلو ہائے کی۔ کہنے لگی" تم کہاں کے ہو۔"

میں نے کہا" پاکستانی ہوں۔ یہاں مہاجر کیمپ میں رہتا ہوں۔"

اس نے کہا" میرا نام مشل ہے۔"

"کیا کرتی ہو۔"

"میں اخبار میں کام کرتی ہوں۔"

"اچھا تو صحافی ہو۔"

"ہاں کہہ سکتے ہیں۔ میں فری لانس جرنلسٹ ہوں، جب کوئی خبر یا سٹوری مل جاتی ہے تو بھیج دیتی ہوں۔"

"پیسے بھی ملتے ہیں یا رضا کارانہ طور پر ہی کام کرتی ہو؟"

"کبھی کبھی۔"

"ہمارے بارے میں بھی لکھو۔ یہاں مہاجر کیمپ میں ہم لوگ کیسے رہتے ہیں۔ ایک ایک کمرے میں اٹھارہ اٹھارہ اور سولہ سولہ بندے سونے پر مجبور ہیں۔"

اس بات پہ وہ خاموش ہو گئی، پھر کہنے لگی" تم بڑی اچھی انگریزی بولتے ہو۔"

میں نے کہا" میں انگریزی کے علاوہ اٹالین اور فرنچ بھی بول سکتا ہوں البتہ جرمن مجھے نہیں آتی۔"

وہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگی۔ لڑکی خوبصورت تھی اور جوان بھی۔ میں نے اس کو اپنی ای میل آئی ڈی دی۔ اس نے اپنے پرس میں رکھ لی۔ کہنے لگی" میں ضرور تم سے رابطہ رکھوں گی۔" میں نے آگاتھو کے اس کمرے میں لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ہمارے وقفے کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا" اب مجھے جانا چاہیے۔ ہماری آزادی کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اگر وقت پہ نہ پہنچے تو کھانا نہیں ملے۔" اس نے افسوس اور دکھ کا اظہار کیا۔

اس طرح ہم نے اس سے اجازت لی۔ میرے ہاتھ میں نیشنل جیوگرافک کے کچھ پرانے

شمار ے تھے۔ ہم دونوں اکا تھو کے دفتر سے باہر نکلے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے مہاجر کیمپ کی طرف آئے۔ یہاں پہنچے تو کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ اب میں ایک طرح کے ذہنی اطمینان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا کیونکہ پہلے دل میں ایک پھانس سی چبھتی تھی کہ میں ایسی چیز کھا رہا ہوں جس کا پتا ہی نہیں کہ حلال ہے یا حرام لیکن جب سے اس آدمی نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں حلال گوشت منگوایا جاتا ہے۔ تو میرے لیے تشویش کی کوئی بات نہ رہی تھی۔

مقصود نے دوسرے دو پاکستانیوں کو بھی میری کہانی سنائی کہ میں کس روانی کے ساتھ اس لڑکی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ مقامی لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں بالکل جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اب اس مہاجر کیمپ میں کئی لوگ میری قابلیت کے قائل ہو گئے تھے۔ وہ موٹا لڑکا جس کا چچا گجرات کا ایم پی اے بنتا تھا، مجھے کہنے لگا "میرے ایک چچا نے جو یہاں ونٹر تھور میں رہتا ہے۔ ایک اٹالین لڑکی سے شادی کی ہوئی ہے۔ اگر تمہیں زیورخ کنٹون میں بھیجا گیا تو تمہاری اس سے ملاقات کرواؤں گا۔"

میں نے کہا "بہت شکریہ۔ ویسے تمہارا چچا کام کیا کرتا ہے۔"

کہنے لگا "وہ پبلیسٹی کا کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ کیا کام ہے۔"

کہنے لگا "وہ مختلف کمپنیوں کے اشتہارات تقسیم کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اکیلے۔"

کہنے لگا "نہیں اس نے ورکرز رکھے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھی کمائی ہو جاتی ہوگی؟"

کہنے لگا "ہاں ہاں، پچھلے سال اس نے دو کروڑ روپیہ پاکستان بھیجا تھا۔ اب بھی اگر الیکشن میں میرا دوسرا چچا کھڑا ہوگا تو میرے ابو اور یہ چچا الیکشن کا سارا خرچہ یہاں سے اُٹھائیں گے۔"

کھانے کے بعد ہمیں دوبارہ گارنیگے سترازے لے جایا گیا۔ وہاں ہم لوگ دوبارہ گارنیگے ہوٹل میں آ گئے۔ میں جیسے ہی ہوٹل میں وارد ہوا۔ میرا واسطہ اسی اٹالین نژاد سوئس سے ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا: "کل دو میچ ہیں۔ تم کس کی طرف ہو۔"

میں نے کہا "جرمنی جیت جائے تو مجھے اچھا لگے گا!"

وہ کہنے لگا" اور دوسرا میچ۔"

میں نے کہا" میری ہمدردیاں برازیل کی ٹیم کے ساتھ ہوں گی۔"

اس نے اپنے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا" پہلے میچ میں میں چاہتا ہوں کہ امریکہ جیت جائے جبکہ دوسرے میچ میں میں تمہاری طرح برازیل کا طرفدار ہوں۔"

میں نے کہا" کیا تم نہیں چاہتے کہ جرمنی جیتے۔"

کہنے لگا" جرمنی کی جیت سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔"

اس نے کوئی خاص وجہ تو نہ بتائی لیکن مجھے بہت عجیب لگا کیونکہ جرمن ٹیم کا لامحالہ اسی خطے سے تعلق تھا۔

میں نے پوچھا" کیا کل بھی تمہاری ڈیوٹی یہاں ہوگی۔"

کہنے لگا" مجھے نہیں پتا۔ میں جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہوں۔ وہ مجھے ہفتے کا پروگرام بتا دیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی پروگرام بدل بھی دیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا" میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ تمہاری پسندیدہ ٹیم جیت جائے۔"

" کیوں۔"

" کیونکہ پچھلی دفعہ تم اپنی حمایت یافتہ ٹیم کے ہارنے کا دکھ اٹھا چکے ہو۔"

" مجھے افسوس ہے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔"

مقصود، وہ لڑکا جسے افغانی ہونے کا دعویٰ تھا اور گجراتی ایم پی اے کا بھتیجا تینوں مجھے گھور رہے تھے۔ وہ اس پہ حیران تھے کہ میں ہر کسی سے بے جھجک بات کر لیتا تھا۔ افغان ہونے کے دعویدار نے پوچھا" اس سے تمہاری کیا بات ہو رہی تھی؟"

میں نے کہا" ہم دونوں فٹ بال کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ فٹ بال کا ورلڈ کپ ہو رہا ہے اور ہاں افغانستان کی بھی تو ٹیم ہے۔ افغانی فٹ بال بہت اچھا کھیلتے ہیں۔"

اس نے افغانیوں کی فٹ بال کے کھیل میں دلچسپی یا عدم دلچسپی پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ افغانی تھا ہی نہیں۔ کھلاڑی یا شائق کے طور پر میں فٹ بال سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا تھا لیکن بات کرنے کو یہ آج کل کا مرغوب ترین موضوع تھا۔

مقصود کہنے لگا" میں جا کر نوٹس بورڈ دیکھتا ہوں۔ کیا خبر ہم میں سے کسی کی ٹرانسفر ہو۔"

میں نے کہا" میرا نام بھی دیکھنا۔"

وہ لسٹ دیکھ کر آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا نام بھی لسٹ میں موجود ہے۔

میں نے خود جا کر تصدیق کی لسٹ میں واقعی میرا نام لکھا ہوا تھا۔ نوٹس بورڈ پر ایک چھوٹا سا خصوصی نوٹ بھی لکھا ہوا تھا کہ" روانگی بغیر ناشتے کے ہوگی۔"

میں سمجھ گیا کل میرے پیشاب اور خون کا ٹیسٹ ہوگا۔ میں نے سکیورٹی گارڈ سے کہا" اگر مجھے کچھ کھانے کو مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ کیونکہ کل میرا میڈیکل ہے اور مجھے بغیر کچھ کھائے پیئے جانا ہوگا۔ میرے لیے صبح تک بھوکا رہنا مشکل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں شب کے لیٹ آورز میں کچھ پیٹ پوجا کرلوں۔

کہنے لگا" میرے ساتھ چلو۔"

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے کچن میں لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے ایک لذانیہ ایک سیب اور تھوڑی سے بروڈ دیتے ہوئے کہا" ہمیں اجازت تو نہیں لیکن کوئی بات نہیں یہ لوازمات ابھی اور یہیں جلدی جلدی کھالو۔ میں تمہارا باہر انتظار کرتا ہوں۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور پیٹ پوجا کے عمل کو اسی وقت سرانجام دے کر کچن سے باہر نکل آیا۔

○
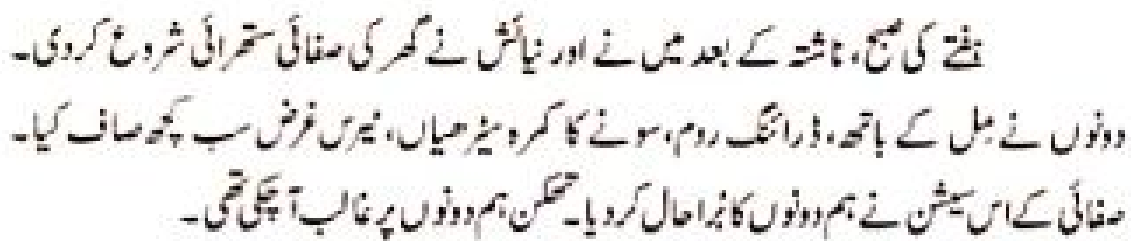
ہفتے کی صبح، ناشتہ کے بعد میں نے اور نیائش نے گھر کی صفائی ستھرائی شروع کر دی۔
دونوں نے مل کے باتھ، ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ سیڑھیاں، میرس غرض سب کچھ صاف کیا۔
صفائی کے اس سیشن نے ہم دونوں کا برا حال کر دیا۔ تھکن ہم دونوں پر غالب آ چکی تھی۔
نیائش کہنے لگا" مازا چائے ہونی چاہیے۔"
میں نے پیشکش کی" میں بناتا ہوں۔"
نیائش نے میری پیشکش رد کرتے ہوئے کہا" چھوڑو، مازا کسی کے ہاں مہمان بن کے جاتے ہیں۔ میں پری پیکر کو فون لگاتا ہوں کہ چائے بنائے ہم آ رہے ہیں۔"
میں نے کہا" جیسے آپ کی مرضی۔"
کچھ دیر بعد میں اور نیائش، گاڑی میں بیٹھ کے ویا پترارکا (via petrarca) چلے گئے جہاں پری پیکر۔۔۔ شکیلن رہتا تھا۔ نیائش اسے اپنی آمد سے مطلع کر چکا تھا اس لیے وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم لوگ جیسے ہی اس کے ہاں پہنچے اس نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ جہاں مقیم تھا اس اقامت گاہ کے رہائشی دیگر لڑکے ذرا سی دیر میں ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گئے، انھوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ہر ایک کی فرمائش تھی۔۔۔ یار کوئی لطیفہ؟ کوئی گپ شپ؟ ان لوگوں کو دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں یہ لوگ کتنی فرسٹریشن میں وقت گزار رہے ہیں۔ چونکہ انھیں ٹی وی کے

علاوہ کوئی دوسرا تفریح کا ذریعہ دستیاب نہیں تھا۔ اس لیے یہ لوگ عام موضوعات سے ہٹ کے ہونے والی بات چیت سے محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ میں کوئی مزاحیہ فنکار تو نہیں تھا لیکن محفل آرائی کے اپنے تجربات میں جو کچھ میں نے حاصل کیا تھا۔۔۔اُسے اُن کی نذر کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا۔ فلم، ڈرامے، کھیل، سیاست، غرض سب کچھ زیرِ بحث آیا مگر ادب یا شاعری کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی۔ میرے خیال میں سوائے ثقلین کے کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ میں لکھتا بھی ہوں۔

ثقلین نے میز پہ سموسے، بسکٹ اور شامی کباب سجائے۔ اس کے بعد چائے۔

میں نے کہا "ثقلین صاحب آپ نے اتنا تکلف کیا۔"

کہنے لگا " تکلف کیسا فرشتہ صاحب۔ آپ پہلی دفعہ میرے گھر آئے ہیں۔ جب کہ میں تو اکثر آپ کے ہاں پایا جاتا ہوں۔۔۔ مہمانداری کے تقاضے پورے نہ کروں؟"

نیائش نے کہا " ماڑا ایک ہی بات ہے۔ تم ہمارے گھر آؤ یا ہم تمہارے گھر آئیں۔"

" فرشتہ صاحب آپ نے اچھا کیا جو اس وقت چلے آئے آج شام میں کچھ مصروف ہوں۔ ہو سکتا ہے ملاقات نہ ہو پائے۔ میں رات کو آپ سے اگلا باب لے لوں گا۔"

" آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ساتھ لایا ہوں۔"

" یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔"

" مجھے آپ کی دلچسپی کا ادراک تھا۔"

" بہت شکریہ۔۔۔ میں رات کو پڑھ لوں گا۔ ویسے کتنے ابواب باقی ہیں۔"

" میرے خیال میں اس کے بعد بارہ ابواب اور ہوں گے۔"

" بہت لمبی کہانی ہے۔"

پھر میں نے ثقلین سے دلگیری کی پیشگی اجازت لیتے ہوئے اس کے ساتھ اقامت پذیر نوجوانوں کو بہت کثیف اور بالغانہ قسم کے لطیفے سنائے۔ سب لوگ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ آخرکار نیائش کو کسی کا فون آیا اور ہم اجازت لے کر گھر آ گئے۔

OOO

صبح چھ بجے ہم لوگ اس بیرک نما عمارت میں تھے۔ ہم لوگوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ چھ بجے سے ساڑھے سات بجے تک ہم کبھی ایک کمرے میں جاتے کبھی دوسرے کمرے میں۔ ساڑھے

سات بجے ہمیں ایک نرس نے بلایا اور ہم سب لوگوں کو، جن کا میڈیکل ہونا تھا اُسی عمارت میں لے جایا گیا جہاں میں پہلے دن آ چکا تھا۔ کیمپ انتظامیہ نے اب کچھ کام اس نئی عمارت میں شروع کر دیئے تھے۔ نرس نے دروازے پہ لگی ایک سنسر مشین کے سامنے اپنا بیج کیا اور کھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ ہم جس عمارت میں داخل ہوئے تھے اس پہ ابھی رنگ وروغن ہونا باقی تھا۔ وہ ہمیں لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پہ لے گئی۔ اس وقت میرا بھوک سے برا حال تھا اس لیے مجھے ہوش نہیں تھا کہ اس عورت کے حسن و جمال یا جسمانی نشیب و فراز کا جائزہ لیتا جو ہمیں میڈیکل لیبارٹری تک لے جانے کے لیے اس وقت اسکارٹ (Escort) کر رہی تھی۔ دوسری منزل پہ ایک خودکار رننگ ڈور (running door) تھا، ہم نے جیسے ہی اس کے سامنے قدم رکھا سائنس فکشن فلموں کے دروازے کی طرح وہ خود بخود کھل گیا۔ جیسے ہی ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ اندر جا بجا مختلف قسم کی مشینیں نصب ہیں۔ اِدھر اُدھر چند ایک بڑے کارٹن پڑے تھے۔ ہمیں اس ہال سے ملحق ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہی نرس جو ہمیں لے کر آئی تھی اس نے ہمارے ہاتھ میں پلاسٹک کا گلاس دیا اور کہا کے باری باری باتھ میں جاؤ اور ٹسٹنگ کے لیے اس میں اپنا قارورہ لے کر آؤ۔"

میرے ساتھی لڑکوں کو اس بات کی سمجھ نہ آئی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ کیا کہہ رہی ہے۔

اب ہم باری باری باتھ میں گئے اور نمونے کے لیے قارورہ لا کر دے دیا۔ اس نرس نے میرے گلاس سے سرنج کے ذریعے دو تین پلاسٹک کی پتلی پتلی ٹیوبز بھریں ان پہ میرا نام لکھا۔ اس کے بعد باقیوں کے گلاسوں سے بھی نمونے یا سیمپل لیے اور متعلقہ ٹیوبز پر ان کے نام بھی درج کر دیئے۔

پھر ہمیں ایک طرف بیٹھنے کو کہا۔ میں اس سارے منظر کا حسب عادت جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بھوک کی وجہ سے ذہن اپنے گرد و پیش میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کے بعد ایک اور نرس نے مجھے گھومنے والے بینچ پہ بیٹھنے کو کہا۔ پھر حکم ہوا "اپنے بازوؤں کو میز پہ رکھو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میز پہ اپنا بازو رکھا۔ اس نے اپنے گرم گرم ہاتھوں سے میرے بازو کو چھوا، اور پھر نرمی سے بازو پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کوئی نس (vein) تلاش کرنے لگی۔ ناکامی کے نتیجے میں اس نے میرے بازو پہ پلاسٹک کی ایک نلکی کس کے باندھ دی۔ اب میرے بازو پہ سبز رنگ کی ایک باریک نس ابھر آئی تھی۔ چند لمحات میں اس نے تین چار پتلی پتلی ٹیوبز میں میرے خون کا نمونہ لیا۔ ہر ٹیوب پہ سٹیکر کی طرح کے ایک لیبل پر میرا نام لکھا۔ اس کام سے فارغ

ہونے کے بعد اس نے مجھے بریف کیا کہ ہم تمہارے خون اور پیشاب کی جانچ کریں گے کہ کہیں تمہیں کوئی بیماری تو نہیں۔ امکان ہے سوموار تک تمہارا رزلٹ آ جائے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے پاس ہی ایک کمرے میں بیٹھنے کو کہا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے سے میرے لیے ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ جب میں ناشتہ کر چکا تو۔ وہی نرس جو مجھے لے کر آئی تھی۔ کہنے لگی" جب باقی لڑکے فارغ ہو جائیں گے تو میں تم سب کو وہیں چھوڑ آؤں گی۔"

میں نے کہا" ٹھیک ہے۔"

اب میں باقی لڑکوں کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب فارغ ہوں اور ہم لوگ دوبارہ اس پرانی بیرک نما عمارت میں واپس جائیں۔ آج امریکہ اور جرمنی کا کانٹے دار میچ بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمن کو جن اتحادیوں نے شکست فاش سے دوچار کیا تھا اور اس پہ دوبارہ آرمی نہ بنانے کی پابندی لگائی تھی۔ امریکہ بھی ان میں سے ایک اہم ملک تھا۔ آج کھیل کے میدان میں دونوں آمنے سامنے تھے۔ میری خواہش تھی جرمنی جیتے لیکن میرا دوانالین گارڈ دوست۔۔۔ میں اسے اس کے دوستانہ رویے کی بنا پر دوست ہی کہوں گا۔ امریکہ کو جیتتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ابھی سوچ کے اسی بھنور میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ نرس جو ہمیں یہاں لے کر آئی تھی، باقی لڑکوں کو بھی لے کر آ گئی اور اس نے استفہامی انداز میں کہا" چلیں" اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اب میں نے اس نرس کا بغور معائنہ کیا۔ دبلی پتلی، خوبصورت نقوش اور سینے کے متناسب اُبھار کی حامل وہ نرس ہمارے آگے آگے مٹکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ ہمیں سکیورٹی گارڈ کے حوالے کر کے چلی گئی۔ روز کی طرح آج بھی ہمارے پاس دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کی آزادی کی سہولت موجود تھی۔

واپس پہنچتے ہی میری نظر ہال میں لگے ٹی وی پہ پڑی میچ کی تیاری ہو رہی تھی، مجھے میچ دیکھنے میں اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ بس میں یہ چاہتا تھا کہ مجھے رزلٹ کا پتا چل جائے۔ میں نے سوچا میچ کیا دیکھنا۔ پہلے میں نیشنل جیوگرافک میگزین کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن میرا ذہن کہیں اور تھا۔ کچھ تصاویر دیکھ کر چھوڑ دیا۔ ہال کے ایک کونے سے مقصود آتا دکھائی دیا۔ کہنے لگا" باہر چلیں۔"

میں نے کہا" کہاں جانا چاہتے ہو۔"

کہنے لگا" جھیل کے کنارے چلتے ہیں۔ اس موٹے نے ابھی تک جھیل نہیں دیکھی۔ اس کے فنگر پرنٹس ہو گئے ہیں اور انٹرویو بھی۔ اس کو بھی باہر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔"

میں نے کہا" چلے جاتے ہیں۔"

ہم تینوں جھیل کی طرف چل دیئے۔ راستے میں اس موٹے نے مجھ سے کئی عجیب وغریب سوال کیے۔ میں نے ان کے بھونڈے سے جواب دیئے، پھر میں نے پوچھا" تم نے کیس کیا بنایا ہے۔"

کہنے لگا" وہی جو آپ نے بتایا تھا۔"

میں نے پوچھا" میں نے کیا بتایا تھا؟"

اس نے جو الفاظ استعمال کیے وہ میں ضابطہ تحریر میں نہیں لا سکتا لیکن اُن کا لب لباب یہ تھا کہ اس نے کیس اس بنیاد پر فائل کیا ہے کہ وہ" ہوموسیکسوئلٹی" کا رجحان رکھتا ہے۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔ اسے کہا" یہ تم نے کیا کیا۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔"

کہنے لگا" کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیس مضبوط ہوگا۔ میرا مترجم بھی شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ اس نوعیت کا پہلا پاکستانی کیس ہے۔"

میں نے کہا" چلو جو ہوا سو ہوا"

مقصود سارے راستے اسے اس کے کیس کی نوعیت کے حوالے سے اُسے مفعول کے طور پر چھیڑتا رہا اور وہ موٹا کھی کھی کر کے ہنستا رہا۔ جب وہ ہنستا تو اس کا سارا جسم تھل تھل کرنے لگتا۔

مجھے کہنے لگا" میں تیرا کی جانتا ہوں۔ کیا میں جھیل میں نہا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا" مچھلیوں کو برا لگا تو وہ پانی چھوڑ کے کہاں جائیں گی۔"

کہنے لگا" آپ مذاق بہت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا" ویسے تو میں اپنی عمر سے چھوٹے لوگوں کے ساتھ مذاق نہیں کرتا لیکن نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مذاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

کہنے لگا" کوئی بات نہیں میں برا نہیں مناتا۔"

مجھے اس کی معصومیت بڑی پسند آئی۔

ہم لوگ جھیل کے کنارے پہنچے تو وہ موٹا جس کا چچا گجرات میں ایم پی اے رہا تھا۔ کپڑے اُتار کے جھیل میں کود گیا۔ پانی سے ایک چھپاکے آواز آئی۔ اس نے تن پر بس ایک دھاری دار جانگیہ پہنا ہوا تھا۔ میں اور مقصود ایک درخت کے نیچے ستانے بیٹھ گئے۔ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے وہاں قریب ہی ایک عورت جھیل کے کنارے ملبوسات کی قید سے آزاد بیٹھی ہوئی تھی۔ میں تو اس طرح

کے مناظر یہاں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن مقصود کے لیے یہ نئی چیز تھی۔ اس نے غالباً عورت کی برہنگی روز روشن میں اس طرح سے نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے ٹک ٹکی باندھ کے دیکھنے لگا۔ پہلے تو اس عورت نے نوٹس نہ لیا لیکن جب اسے محسوس ہوا کہ مقصود اسے مسلسل گھورے چلا جا رہا ہے تو اس نے دور سے ہاتھ ہلا دیا۔ وہ عورت اُدھیڑ عمر تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا لیکن سڈول تھا۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز بہت نمایاں تھے لیکن وہ اپنے آپ میں مگن اپنے بال دھوپ میں سکھا رہی تھی۔ میرے خیال وہ کچھ دیر پہلے ہی جھیل میں اپنا تیراکی کا شوق پورا کر کے نکلی تھی۔

جب مقصود اسے دیکھ دیکھ کے تھک گیا تو مجھے کہنے لگا "ان کو شرم نہیں آتی۔"

میں نے کہا "جیسے تو اُسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ تجھے کونسی آ رہی تھی۔"

"اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو ان کی تہذیب اور تمدن ہم لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ ان کے عصمت و عفت کے معیارات ہم سے مختلف ہیں، ویسے بھی یہ لوگ سمندر یا جھیل کنارے آ کر بے لباسی میں قباحت نہیں جانتے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن تم اس فلسفے میں اپنا دماغ نہ کھپاؤ، منظر سے جی بہلاؤ مجھے تو ذرا آگے بڑھنا تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا "ٹھیک ہے، میں یہیں انتظار کروں گا۔" میں جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں بہت آگے نکل آیا۔ یہاں ریت تو نہیں تھی لیکن بیشمار گول گول پتھر اور چھوٹی بڑی سیپیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ جھیل سے تھوڑا ہٹ کے ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت تھی۔ میں جیسے جیسے جھیل سے دور ہوتا گیا۔ ویسے ویسے آس پاس سبزے میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر ایک طرف مجھے ایک بورڈ نظر آیا۔ یہ کسی ایکیوریم کے بارے میں تھا۔ میں وہاں پہنچا تو اس چھوٹے سے ایکیوریم سنٹر کے سامنے ایک لڑکی کھڑی سگریٹ پی رہی تھی۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا "پلیز یہ بتایئے گا کہ ایکیوریم دیکھنے کے لیے ٹکٹ کی ضرورت ہے یا اس میں داخلہ مفت ہے۔"

کہنے لگی "داخلہ مفت ہے۔"

میں ایکیوریم میں داخل ہوا یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا جہاں بڑے بڑے شیشے کے جار پڑے تھے جن میں مختلف قسم کے پانی کے جانور قید کیے گئے تھے۔ گو کہ یہ ایکیوریم چھوٹا تھا لیکن میرے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔ میں نے دیکھا چھوٹے بڑے شیشے کے ڈبوں

میں رنگ برنگی مچھلیاں قید ہیں۔ ایک جگہ ہی بارس جسے سمندری گھوڑا کہتے ہیں پانی میں ادھر سے اُدھر خرمستیاں کرر ہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں ہینڈی کرافٹ کی دوکانیں تھی۔ یہاں تھوڑی دیر گھوم پھر کے میں واپس آ گیا۔ کیونکہ مہاجر کیمپ میں واپس جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں واپس اس جگہ پہنچا جہاں میں مقصود کو چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، مقصود پہلے ہی واپس جا چکا ہو۔ اس لیے میں نے ازیل ہائم کی راہ لی۔ راستے میں آ گاتھو کا دفتر بھی تھا لیکن میرے پاس سر دست وقت نہیں تھا۔ میں نے سوچا شام کو آؤں گا۔ یہاں سے چائے بھی پیوں گا اور اگر کچھ میگزین وغیرہ ملے تو وہ بھی لے لوں گا۔

جب میں مہاجر کیمپ پہنچا تو مجھے سب سے پہلے مقصود ملا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا ''فرشتہ صاحب سب کچھ خود ہی ہو گیا۔ مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔''

میں نے کہا'' کیا مطلب۔''

''بس کچھ نہ پوچھو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ عورت میرے پاس آ گئی۔ بس کچھ نہ پوچھو۔''

میں نے کہا'' آخر بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟''

''بس کیا بتاؤں۔ کل پھر جانا ہے۔''

میں نے کہا'' میں کچھ سمجھا نہیں۔''

اس نے کہا'' اس عورت نے کام دکھا دیا۔ مجھے بہت شرم آ رہی تھی تھوڑی دیر بعد میری ساری شرم غائب ہو گئی۔''

میں سمجھ گیا اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے مقصود سے اجازت لی اور سکیورٹی گارڈ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ امریکہ اور جرمنی کے میچ کا کیا بنا۔ تو کہنے لگا'' جرمنی جیت گیا ہے، لیکن میچ بہت سخت تھا۔'' مجھے افسوس ہوا لیکن جرمنی کی ٹیم بہت مضبوط تھی۔ شام کو انگلینڈ اور برازیل کا میچ تھا۔ اس کے بارے سب کی خواہش تھی کہ برازیل جیتے اور مجھے گمان، بلکہ یقین تھا کہ برازیل کی ٹیم جیتے گی۔

کھانے کے دوران مقصود نے کوئی بات نہ کی۔ اسے عجیب قسم کی خماری تھی۔ وہ اس موٹے لڑکے کے ساتھ گھومتا رہا۔ مقصود تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سے کوئی بات کرتا اور وہ وہیں

کھڑے کھڑے تحلیل ہونے لگتا۔ ہنستے ہوئے وہ ایسے لگتا جیسے کوئی بہت بڑی گھڑی ہل رہی ہو۔

ہفتے اور اتوار کو چھٹی تھی۔ میرا خون اور پیشاب ٹیسٹ ہونے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں ہیپاٹائٹس بی اور سی کی جانچ کے لیے ٹیکے لگانے تھے۔ ایڈز کا چیک اپ کرنا تھا۔ دیگر قسم کے میڈیکل چیک اپ کے بعد ہمیں ہی کراس بھیجا جاتا تھا۔ ہیپاٹائٹس کے ٹیکے کے بعد وہ یہ چیز دیکھتے تھے کہ ہمیں اس ٹیکے کا انفیکشن تو نہیں ہوا۔ جن لوگوں کے بازو کی جلد ٹیکے کے بعد لال ہو جاتی ان کو یہاں روک لیا جاتا اور جن لوگوں کی جلد پہ کسی قسم کا کوئی بھی نشان نہ بنتا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ شخص بالکل صحت مند ہے۔ میں بھی اس آئیں کا منتظر تھا کہ میں مکمل طور پہ صحت مند ہوں یا نہیں۔

کھانے کے بعد میں باغ میں جا کے لیٹ گیا۔ وہی باغ جہاں میں کئی دفعہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اب مجھے یہ جیل کی طرح لگنے لگا تھا۔ میرے پاس ایک نیشنل جیوگرافک میگزین تھا، میں اسے کھول کے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دروازے میں ایک عورت آ کے کھڑی ہوگئی۔ یہ وہی عورت تھی جو سب کو بہت کرخت آواز میں بلاتی تھی۔ کہنے لگی "مجھے دو بندوں کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "کس کام کے لیے۔"

کہنے لگی "کچھ سامان آ رہا ہے وہ اتارنا ہے۔"

میں نے کہا "میں چلتا ہوں۔" مائیکل بھی پاس ہی تھا وہ کہنے لگا "میں بھی چلتا ہوں۔"

میں نے سوچا چلو تھوڑا وقت ہی گزر جائے گا۔

اس نے سکیورٹی گارڈ کو بتایا کہ میں ان دونوں کو لے کر جا رہی ہوں۔ وہ کہنے لگا ٹھیک ہے۔ ہم لوگوں نے جیسے ہی باہر قدم رکھا۔ ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ پولیس کی گاڑی سے وہ انگولا کا لڑکا اُتر رہا تھا جس کی کچھ دن پہلے سکیورٹی گارڈ سے لڑائی ہوئی تھی۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ چوٹیں اور نیلے نشانات نمایاں تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسے پولیس نے چھوڑ کیسے دیا۔ اس نے تو اس سکیورٹی گارڈ کے دو دانت توڑ دیے تھے۔ خیر وہ لنگڑاتا ہوا ہال میں داخل ہوا، میں اور مائیکل اس عورت کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ وہ ہمیں اسی عمارت میں لے گئی جہاں صبح ہمارا یورین اور بلڈ ٹیسٹ ہوا تھا۔ وہ ہمیں مختلف کمروں سے گزار کے ایک بڑے سے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کی تین دیواروں پہ شیلف بنے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ میں ملبوسات وغیرہ پڑے ہوئے تھے اور کچھ خالی تھے۔

وہ کہنے لگی "تم لوگوں کو میں بتاتی جاؤں گی اور تم جینز ایک طرف رکھتے جانا، ٹی شرٹس ایک طرف، قیمصیں ایک طرف اور ٹراپیکل پینٹس ایک طرف۔" تھوڑی دیر میں گھنٹی بجی۔ وہ کہنے لگی "میرے ساتھ آؤ۔" ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔ ان نے کمرے سے ملحق دروازہ کھولا۔ پیچھے گلی تھی۔ وہاں ٹرک کھڑا تھا۔ جو بندہ ٹرک لے کر آیا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور بال گھنگھریالے تھے۔ دبلے پتلے جسم کا مالک تھا۔ مائیکل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا" یہ لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔" وہ گھنگھریالے بالوں والا شخص بولا" میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ تمھیں بہت اچھے طریقے سے رکھتے ہیں۔" میں بڑا حیران ہوا کہ یہ شخص انگریزی جانتا ہے۔ میں نے پوچھا" تم انگریزی کے علاوہ اور کون کون سی زبانیں جانتے ہو۔"

کہنے لگا" جرمن، ہسپانوی، فرنچ اور عربی۔"

میں نے تجسس بھرے لہجے میں کہا" عربی۔"

کہنے لگا:" ہاں یہ میری مادری زبان ہے۔"

میں نے کہا" تم مراکش کے ہو۔"

کہنے لگا" ہاں، تمھیں کیسے پتا چلا۔"

میں نے کہا" کیوں کہ میں نے سنا ہے جو بندہ کھانا سپلائی کرتا ہے وہ مراکش کا ہے۔"

کہنے لگا" تم نے ٹھیک سنا ہے، کھانا لانے کا ٹھیکہ میرے ہی پاس ہے۔"

ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا جب اس عورت نے ہمیں اس ٹرک سے خاکی رنگ کے بڑے بڑے تھیلے اتارنے کو کہا۔ ہم نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ جب ساری گانٹھیں اتر چکیں تو اس نے کہا" اندر سے ٹرالی لاؤ اور یہ ساری گانٹھیں اس ٹرالی کے اندر رکھو اور اندر کمرے میں لے کر جاؤ۔" میں گیا اور کونے میں پڑی ٹرالی لے آیا۔ ہم نے مل کر اس میں گانٹھیں رکھیں اور ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے کمرے کے وسط میں لے گئے۔ میں نے اور مائیکل نے مل کے ٹرالی خالی کی۔ اس کے بعد ایک ایک گانٹھ کھولنے اور اس میں جینز، ٹی شرٹس اور قیمصیں علیحدہ علیحدہ کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ کام کے دوران ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ کافی وقت گزر چکا ہے۔ میں نے اور مائیکل نے تمام شیلفز میں ملبوسات بڑے قرینے سے سجا دیے۔ وہ عورت دو تین چکر لگا چکی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم دونوں ٹھیک کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ جب ہم کام مکمل کر چکے تو اس نے ہم دونوں کی پذیرائی کے لیے آفر کرتے

ہوئے کہا" شاک میں سے تم دونوں کو جو بھی جینز اور ٹی شرٹس پسند ہوں لے لو۔" ایک جینز اور ٹی شرٹ میں نے پسند کی اور ایک جینز اور ٹی شرٹ مائیکل نے۔ وہ کہنے لگی:" آؤ میں تمہیں ہال میں چھوڑ آؤں۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت ہو جائے گا۔"

مائیکل تھوڑا آگے چل رہا تھا، میں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عورت سے سوال کر دیا:" تم ہر وقت اتنے غصے میں کیوں رہتی ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ مہاجرین کے ساتھ تمہارا رویہ عموماً تلخ ہوتا ہے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے ساتھ برے طریقے سے پیش آتی ہو۔ جب کہ اپنے عمومی رویے کے برعکس تم نے آج ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک روا رکھا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ کہنے لگی:" تم نے جس ٹرک سے مال اتارا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ شخص کون ہے۔"

میں نے کہا" جہاں تک میں جان پایا ہوں، وہ مراکش کا ہے اور کافی زبانیں جانتا ہے۔"

جرمن زبان میں گالی دیتے ہوئے کہنے لگی" وہ میرا شوہر تھا۔ اس نے مجھ سے شادی کی۔ دس سال پہلے وہ اس کیمپ میں آیا تھا۔ ہر روز مجھے پھول پیش کرتا تھا۔ اس مہاجر کیمپ میں رہتے ہوئے اس نے مجھے محبت کا ایسا جھانسہ دیا کہ میں نے اس سے شادی کر لی۔ اس کو ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کروایا۔ دن رات محنت کر کے اس کو جرمن زبان سکھائی۔ یہ ٹھیکہ بھی اسے میں نے ہی دلایا تھا۔

جب سوئس پاسپورٹ ملا تو اس نے جو پہلا کام کیا جانتے ہو وہ کیا تھا۔"

میں نے کہا" مراکش گیا ہوگا۔"

"نہیں، اس نے مجھے طلاق دی۔ مجھے طلاق دینے کے بعد مراکش سے اپنے سے بیس سال چھوٹی لڑکی بیاہ کر یہاں لے آیا۔ اب میں جب بھی اس کو دیکھتی ہوں تو جذباتی طور پر شدید دباؤ کا شکار ہو جاتی ہوں۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی جذباتی رنجیدگی دوسروں کے ساتھ تلخی کی صورت میں رفع کرو۔"

کہنے لگی" یقین کرو میں دانستہ طور پر ایسا نہیں کرتی اور نہ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا ہوتا ہے۔"

اُس نے پوچھا" ویسے تم کہاں کے ہو۔"

میں نے کہا" میں پاکستانی ہوں۔"

کہنے لگی " لگتے نہیں۔"

" لیکن ہوں۔"

ہال کے اندر پہنچے تو وہاں کھانا پیش کیا جا رہا تھا۔ میں بھی بھکاریوں کی طرح پلیٹ لے کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قطار میں وہ موٹا لڑکا بھی کھڑا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہمیں گارنیگے ہوٹل منتقل کر دیا گیا جو کہ اب گارنیگے ہاٹم بن چکی تھی۔ وہاں پہنچ کے کوئی میرس میں چلا گیا۔ کوئی باتھ میں، کوئی کمرے میں، کوئی ہال میں بیٹھ گیا۔ میں نے وسط ایشیائی پرندوں کے بارے میں ایک آرٹیکل پڑھنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ کسی نے میرے منہ کے سامنے سے نیشنل جیوگرافک ہٹایا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے وہ اناطین نژاد سوئس کھڑا ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا " ارے تم۔"

" مبارک ہو تمہاری دونوں من پسند ٹیمیں جیت گئیں۔"

میں نے کہا " مجھے امریکہ کے ہارنے کا اس لیے افسوس ہے کہ تمہاری خواہش تھی کہ امریکہ جیتے، جہاں تک برازیل کی بات ہے تو اس نے جیتنا ہی تھا اور میرا خیال ہے کہ ورلڈ کپ بھی وہی جیتے گا۔"

تو کہنے لگا " تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری دلچسپی کے لیے ابھی چین کا کوریا سے میچ باقی ہے۔ تاہم مجھے ترکی اور سینیگال کے میچ سے کوئی غرض نہیں۔۔۔ جو بھی جیتے!"

میں نے کہا " لیکن مجھے غرض ہے۔ میرے دوست کیونکہ دونوں مسلمان ٹیمیں کھیل رہی ہیں۔ لیکن طے شدہ امر یہ کہ دونوں میں سے ایک کو تو ہارنا ہی پڑے گا۔ ویسے چین کے کھیل سے بھی میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ مجموعی طور پر چین کی ٹیم اس دفعہ بہت اچھا کھیل رہی ہے۔"

کہنے لگا " یہ واقعی بہت اچھا کھیل رہے ہیں۔"

میں نے کہا " ایک سوال پوچھوں اگر تمہیں برا نہ لگے۔"

کہنے لگا " ہاں ہاں پوچھو۔"

میں کہا " یہ اس انگولا کے لڑکے اور تمہارے ساتھی کا کیا چکر ہے۔"

کہنے لگا " مجھے افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سکیورٹی گارڈ نے زیادتی کی ہے۔"

میں نے کریدا " اصل کہانی کیا ہے؟"

تو کہنے لگا" بات اصل میں یہ ہے کہ وہ سکیورٹی گارڈ خود تو یہاں پیدا ہوا ہے لیکن اس کے ماں باپ پرتگال کے ہیں۔ وہ میرے ماں باپ کی طرح یہاں ہجرت کر کے آئے تھے۔ تمہیں شاید پتا نہیں انگولا پہلے پرتگال کے زیرِ تسلط تھا۔ جب وہاں خانہ جنگی شروع ہوئی تو جہاں انگولا کے لوگ مرے وہاں پرتگالی فوجی بھی مرے۔ اس گارڈ کے چچا کا خاندان بھی اس جنگ کی نذر ہو گیا۔ وہاں پرتگالیوں نے کثرت سے عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ سکیورٹی گارڈ جب بھی ازیل ہائم میں کسی انگولا کے مہاجر کو دیکھتا ہے اس سے اُلٹی سیدھی باتیں کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اس لڑکے کو اس نے کہا تھا۔ "ہم لوگوں نے تمہاری ماؤں اور بہنوں کے ساتھ بہت تفریح منائی ہے۔" جس پر اس لڑکے کو غصہ آ گیا۔ اس نے گھما کے لات جمائی جس سے اس کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں کہا" واقعی اس نے تہذیب، اخلاق اور شائستگی کے معیار سے گری ہوئی بات کی۔ لیکن پولیس نے تو اس انگولا کے لڑکے کو چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں جج ایک غیر متعصب آدمی ہے۔ اس نے لڑکے کو چھوڑتے ہوئے اس سکیورٹی گارڈ پر جرمانہ عائد کرنے کا فیصلہ سنایا ہے۔ اس معاملے کی منصفانہ طور پر جمعت کرتے ہوئے۔"

"لیکن وہ لڑکا لنگڑا کے کیوں چل رہا تھا۔"

"اس نے پولیس والوں کے ساتھ بھی بدتمیزی کی تھی اس لیے لازم بات ہے، انہیں سختی سے کام لینا پڑا ہوگا۔"

"تمہارے ماں باپ بھی تو اتالین ہیں۔ وہ بھی مہاجر تھے لیکن تم بہت اچھے انسان ہو۔"

کہنے لگا" ہر ملک اور ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ دُنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہمیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا۔"

میں نے کہا" کچھ ماں باپ کی پرورش کا بھی اثر ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔ میرے ماں باپ نے تو مجھے یہی سکھایا ہے کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ سب کا احترام کیا جانا چاہیے۔" پھر اس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا" میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا ہے اس لیے میں چلتا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

میں نے کہا" میں بھی چلتا ہوں۔ اب میں جا کے نہاؤں گا اور نئی جینز اور نئی شرٹ پہنوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے تولیہ تھاما اور باتھ میں چلا گیا۔ خوش قسمتی سے باتھ خالی تھا۔ میں

نے جلدی سے شاور لیا۔ نئی جینز اور ٹی شرٹ پہنی جو اس عورت نے مجھے دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ جینز اور ٹی شرٹ استعمال شدہ تھی یا نئی لیکن نئے لباس ایسی صاف ستھری تھی۔ جو جینز اور ٹی شرٹ میں نے اُتاری، نیچے لانڈری والوں کو دھونے کے لیے دے آیا۔ میرا خیال تھا۔ اگر میڈیکل کے بعد مجھے یہاں سے جانا پڑا تو کم از کم میرے پاس ایک جوڑا صاف کپڑوں کا ضرور ہوگا۔ یہاں قیام پذیر ہوتے ہی انڈر ویئر کو میں نے خیر باد کہہ دیا تھا۔ شروع میں کچھ دن بغیر انڈر ویئر پہنے گھومنے سے اُلجھن ہوئی لیکن اب میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ میں نہا دھو کے ایک دفعہ پھر ٹیرس میں آ گیا۔ جہاں کالے، گورے، پیلے، گلابی ہر رنگ کے لوگوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں میلے کچیلے کپڑوں والا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میں مائیکل کے پاس گیا اور اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ تو کہنے لگا اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ میں نے کہا، میں جا کے بات کرتا ہوں اُس سے۔ میں اس کے پاس گیا اور اس سے انگریزی میں ہیلو ہائے کی، جس کا جواب اُس نے جرمن میں دیا۔ مجھے جرمن نہیں آتی تھی اس لیے میں نے دوبارہ انگریزی میں پوچھا "تم کون ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو۔" کہنے لگا "میں جرمن ہوں۔ گاڑیاں ٹھیک کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہاں کیا کر رہے ہو۔"

کہنے لگا "میں نے یہاں سیاسی پناہ کی درخواست دی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا جرمن سیاسی پناہ کی درخواست دے سکتے ہیں۔"

کہنے لگا "کیوں نہیں۔" پھر مجھے ہاتھ کے اشارے سے کہنے لگا۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں نے اس کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا اور آ کے مائیکل کو اس کی بابت آگہی دی۔

اس شخص کو اس کیمپ میں سیاسی پناہ کا درخواست گزار دیکھنے کے بعد میرا یہ نظریہ بدل گیا کہ صرف غریب ملکوں کے لوگ ہی کسی دوسرے ملک میں سیاسی پناہ کی درخواست دیتے ہیں۔ ابھی میں اسی نظریاتی تبدل پذیری کے عمل میں اُلجھا ہوا تھا کہ مجھے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ وہ بندہ اٹالین زبان میں کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کا تلفظ بہت مختلف تھا جیسے ناپولی (نیپلز کے لوگ) بولتے ہیں۔ میرے دماغ کے اندر ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ میں ابھی ابھی ایک جرمن سے مل کر آ رہا تھا اور اب یہ اٹالین وارد ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کوئی نیا سکیورٹی گارڈ آ گیا ہے جو اٹالین بولتا ہے۔

میں نے مڑ کے دیکھا تو عام کپڑوں میں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ میں نے اطالین میں کہا ''کیا مسئلہ ہے۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔۔۔اس نے سوچا ہوگا کہ کوئی ایشائی اتنی شستہ اطالین کیسے بول سکتا ہے۔اس نے بتایا'' میں آج ہی آیا ہوں مگر یہاں کا ماحول مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا''تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

''لمبی کہانی ہے۔ مجھے جان پیاری تھی اس لیے یہاں بھاگ آیا۔جنیوا ایکٹ کے مطابق کوئی بھی شخص جس کی جان کو اپنے ملک میں خطرہ ہو وہ دوسرے ملک میں جا کے سیاسی پناہ کی درخواست دے سکتا ہے۔ میں یہاں آ گیا۔''

''لیکن سیاسی پناہ کی کیا ضرورت تھی۔تم ویسے بھی آ سکتے تھے۔''

''میں جن لوگوں سے بھاگ کے آیا ہوں۔ اگر میں ویسے ہی آ جاتا تو وہ مجھے یہاں آ کر جان سے مار دیتے۔''

''اگر وہ اتنے زیادہ طاقتور ہیں تو وہ یہاں بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن کم از کم میں نے کوشش تو کی ہے۔''

میں نے کہا''ادھر آ کے بیٹھ جاؤ۔''

اس نے پوچھا''تم کہاں کے ہو۔''

میں اس سوال کا کئی دفعہ جواب دے چکا تھا۔ میں نے کہا''پاکستان کا رہنے والا ہوں۔''

''تم لوگ تو کرکٹ کھیلتے ہوں۔''

''ہاں،لیکن تم کیسے جانتے ہو۔''

''میں اٹلی کے شہر ناپولی سے آیا ہوں۔وہاں بہت سے پاکستانی رہتے ہیں۔وہ چھٹی کے دن کرکٹ کھیلتے ہیں۔اس لیے میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کرکٹ کے زیادہ شوقین ہو۔''

میں نے کہا''تمہارا نام کیا ہے۔''

کہنے لگا''سالواتورے مولیتیرنو(Salvatore Molitierno)اور تمہارا؟''

میں نے کہا''فرشتہ سبزواری۔''

''تمہارا کیا مسئلہ ہے۔''

میں نے کہا" کوئی خاص نہیں، غلطی سے آ گیا ہوں۔"

"تم نے اٹالین کہاں سے سیکھی ہے۔"

میں نے کہا" پاکستان سے۔"

"میرا نہیں خیال کہ اس طرح کی اٹالین پاکستان میں سیکھی جا سکتی ہے، اگر تم انگریزی بولتے تو میں شک کی نگاہ سے نہ دیکھتا۔"

"میں پاکستان میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ میں فرنچ بھی جانتا ہوں، انگریزی بھی جانتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں فرانس اور انگلینڈ بھی رہا ہوں۔"

"چھوڑو اس بحث کو فٹ بال کی سناؤ۔"

"اٹلی تو باہر ہو گیا ہے۔ اب تم کس کے ساتھ ہو۔"

"میں تو برازیل کے ساتھ ہوں اور تم؟"

"میں بھی برازیل کے ساتھ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان ٹیم بھی ورلڈ کپ کے فائنل میں آئے۔"

"ترکی کا چانس ہے لیکن سیمی فائنل۔۔۔ میرا نہیں خیال۔"

"ظاہر ہے دونوں کا کوارٹر فائنل آپس میں جو ہے۔ ایک ٹیم تو باہر جائے گی ہی۔"

"کل دو میچ ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

باتیں کرتے کرتے ہمیں پتا نہ چلا کہ رات کے نو بج چکے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈ نے سب کو یہاں سے اُٹھنے کا کہا۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں نے اس اٹالین کو چاؤ چس کہا اور اپنے کمرے میں چل دیا۔ ہاؤس کا قانون تھا کہ یہاں دس بجے تک ہمیں اپنے بستر پہ ہونا چاہیے۔ میں اپنے کمرے کے سامنے ٹیرس سے جہاں سے سامنے والے گھروں کے باغیچے نظر آتے تھے۔ نظر ڈالی تو جس باغیچے میں کچھ دن پہلے میں نے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا تھا اب وہ سنسان پڑا تھا۔ میں اس اٹالین کے بارے میں سوچنے لگا۔ کتنا مختلف انسان ہے۔ اس نے مجھ سے مشرف کا نہیں پوچھا، طالبان کا نہیں پوچھا، اُسامہ بن لادن کا نہیں پوچھا۔ ورنہ یہاں پہ لوگوں کو جیسے ہی پتا چلتا کہ میں پاکستانی ہوں، پہلا سوال ہی یہی ہوتا ہے۔ اُسامہ بن لادن کدھر ہے؟ وہ مجھ سے ایسے پوچھتے جیسے میں اسے جیب میں لیے گھومتا ہوں۔ میں اس اٹالین کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اٹلی سے آیا ہوں لیکن میں نے

کسی انجانے خوف کی وجہ سے اسے سچ نہ بتایا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ ازیل ہائم والوں نے یہاں کے لوگوں کو جانچنے کے لیے، ان کی جاسوسی کی غرض سے اس طرح کے بندے داخل کیے ہوئے ہوں۔ ایک جرمن تھا دوسرا اطالین تھا۔ جو بھی ہو یہ اطالین اس جرمن سے تھوڑا بہتر لگتا تھا۔ تراش خراش بھی ٹھیک تھی اور لگتا بھی پڑھا لکھا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اگلی ملاقات میں اس سے تفصیل سے پوچھوں گا کہ کیا کرتا ہے۔ اس نے ایسا کون سا کام کیا ہے کہ اسے اپنے ہمسایہ ملک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

OOO

مقصود جب سے جھیل کے کنارے سے ہو کر آیا تھا بدلا بدلا تھا۔ وہ موٹا لڑکا بھی اس کے ساتھ چپکا رہتا۔ جو شخص خود کو افغانی کہتا تھا وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ افغانی ہے حالانکہ وہ افغانی نہیں تھا۔ چکوچان میرے ذہن میں ایک عجیب سے تشنگی چھوڑ گیا تھا۔ رضا تشنگی بھی مجھے دلچسپ آدمی لگا تھا لیکن وہ بھی غائب تھا۔ اب یہ سالوا تورے تھا۔ مجھے یہ جگہ کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ وقت کٹتا ہی نہیں تھا۔ میں خود کو کوسنے لگا کہ یہاں کیوں آیا۔ مجھے نیائش کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ مجھ پہ ٹون ٹاور کے گرنے کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوا تھا۔ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تھا۔ میں نے خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈالا۔ پاکستان میں جہاں سولہ کروڑ دوسرے لوگ رہ رہے ہیں۔ میں بھی رہ لیتا۔ مجھے اپنی غلطی کا بڑی شدت سے احساس ہونے لگا۔ پھر میں سوچنے لگا، میرے دادا جی بھی تو اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں وہاں جا کے کیا کرتا۔ بھائیوں نے جائیداد پہ قبضہ کر لیا۔ میرے حصے میں دادا کی چھوڑی ہوئی کتابیں آئیں۔ پھر خیال آیا اگر یہاں نہ آتا تو اتنے لوگوں سے کیسے ملتا۔ یہاں رہتے رہتے میں اچھا خاصا اینتھرو پولوجسٹ بن گیا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں قبل ازیں انگولا کا باشندہ نہیں دیکھا تھا۔ سیرا لیون کہاں ہے مجھے نہیں پتا تھا۔ فلسطین کا صرف نام سنا تھا۔ سوزی کا بھی ذکر تھا۔ اگر وہ مجھے زیورخ ریلوے سٹیشن پہ لینے آ جاتی تو میں اس وقت یہاں نہ ہوتا۔ میں نے یہ بات نیائش سے بھی چھپائی تھی۔ مجھے ہلکی سی جلن مقصود سے بھی تھی۔ وہ کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ شکل و صورت بھی ایسی وجاہت آشنا تھی، لیکن جنسی آسودگی کے حوالے سے وہ مجھ سے بہتر رہا۔ لسانی ناآشنائی کے باوجود ایک سوئس عورت کے ساتھ جھیل کے کنارے گھر سے اڑاتا رہا۔ جلد ہی مجھے ناشتہ کی میز سے اٹھنا پڑا کیونکہ ہمیں دوبارہ بیرک نما عمارت میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ میرا نام

ٹرانسفر میں تھا۔ وہاں جانے کا یہ فائدہ تھا کہ وہاں ہمیں صبح اور شام دو گھنٹے باہر جانے کی آزادی تھی۔ اس کے علاوہ دو میچ بھی تھے۔ ٹی وی تو یہاں بھی تھا لیکن وہاں ہال میں میچ دیکھنے کا مزہ آتا تھا۔ پہلا میچ ساؤتھ کوریا اور چین کا تھا اور دوسرا اسپینگال اور ترکی کا تھا۔

ہم اسی نوینا وین میں لائے لیجائے جاتے۔ مجھے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ بہت جلد یہ وین کا سلسلہ بند ہو جائے گا کیونکہ جو نئی عمارت بنی ہے وہاں ہر چیز کا انتظام ہے۔ وہاں رہائش کمرے ہیں، ڈائننگ ہال ہے۔ میڈیکل سینٹر ہے۔ ہر چیز کی سہولت موجود ہے۔ مجھے آج پورے سات دن ہونے کو تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں یہاں سات برسوں سے رہ رہا ہوں۔ چند لوگوں سے میری دوستی بھی ہوگئی تھی اور میں کرائس لنکن کی سیاحت بھی کر چکا تھا۔ میں نے یہاں کا سمندری میوزیم بھی دیکھ لیا تھا۔ جہاں انہوں نے کچھ مچھلیاں اور پرانی چیزیں گلاس کنٹینرز میں بند کی ہوئی تھیں۔ جن کو انگریزی میں ایکیوریم کہتے ہیں۔

پہلے میرا خیال تھا کہ سیاسی پناہ صرف غریب ملکوں کے لوگ حاصل کرتے ہیں لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا تھا۔ اب پناہ گزینوں میں یہاں ہمارے ساتھ دو یورپین بھی تھے۔ ایک جرمن تھا، دوسرا اٹالین۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سالواتورے سے خوب گپ شپ لگاؤں، اس سے دانتے کے بارے میں بات کروں، بوکاچو کے بارے میں بات کروں۔ لیونارڈو داونچی کے بارے میں بات کروں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا کہ وہ تاپولی کا ہے پتا نہیں اسے ان چیزوں سے لگاؤ ہوگا بھی کہ نہیں۔ اگر رضا ہوتا تو مجھے بالکل بوریت نہ ہوتی۔ میرا خیال نہیں یقین تھا کہ وہ بہت زیادہ صاحب علم ہے۔

جیسے ہی میں نے ہال میں قدم رکھا میں حیران رہ گیا۔ وہاں رضا موجود تھا۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی فارسی میں حال احوال پوچھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میری فارسی ختم ہوگئی۔ میں نے انگریزی میں پوچھا "آغائی رضا آپ کہاں تھے۔"

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے میں نے کوئی غلط سوال پوچھ لیا۔ خیر اس نے مجھے جواب دیا "میں پولیس کی حراست میں تھا۔ میرا یہاں کے عملے سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اتنے سارے بندوں والے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے درخواست کی مجھے علیحدہ کمرہ دیا جائے۔ وہ مجھے جیل میں لے گئے۔ وہاں میرے پاس علیحدہ کمرہ تھا۔ پھر واپس یہاں لے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ میں سمجھا شاید آپ کو جرمنی یا کسی اور ہمسایہ ملک

بھیج دیا گیا۔"

"یہ لوگ ایسا کیسے کر سکتے ہیں، میں تو جہاز کے ذریعے یہاں آیا ہوں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں سوئس گورنمنٹ پہ مقدمہ کر دوں گا۔ انہیں یونائینڈ نیشن بہت زیادہ فنڈ دیتی ہے۔ لیکن یہ اس کا چوتھائی بھی ہم پہ خرچ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کا رویہ بھی بہت برا ہے۔ قانوناً یہ غلط ہے۔"

"لیکن پاکستان میں جو افغان مہاجرین ہیں ہم کون سا ان سے اچھا سلوک کر پاتے ہیں اور تو اور ان کو ابتدائی طبی سہولتیں بھی نہیں فراہم کر پاتے۔"

"افغان مہاجر تو ایران میں بھی ہیں۔ ہم لوگ ایران اور پاکستان کا مقابلہ سوئٹزر لینڈ سے نہیں کر سکتے۔ تم ایران اور پاکستان میں افغانیوں کی تعداد دیکھو۔ پورے یورپ میں اتنے مہاجرین نہیں ہیں جتنے مہاجرین ایران اور پاکستان میں ہیں۔"

"یہ بات تو درست ہے۔"

"لیکن اس بات کا تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ اس کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں فنگر پرنٹس کا کوئی رواج نہیں۔ نہ ہی ان کے داخلے پہ کسی قسم کی پابندی ہے۔ مسلمان اور ہمسایہ ہونے کے ناتے انہیں اندراجاتی نظم وضبط سے ماورا قرار دے دیا گیا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"آپ کا جنیل کا دورہ کیسا رہا؟"

"بہت مشکل۔ وہاں زیادہ سختی تھی۔ اب یہاں جیسا بھی ہو رہنا پڑے گا۔ آٹھ دس دن تو تکلیف میں کاٹنے ہی پڑیں گے۔"

دور سے سالوا تو رے آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے اٹالین میں کہا "ادھر آ جاؤ۔"

وہ آ کے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ غصے سے کہنے لگا "نہ جانے کتنے دن اس دوزخ میں گزارنے پڑیں گے۔ میں نے سنا تھا کہ دو تین دن بعد دوسری جگہ بھیج دیں گے۔ لیکن آج ہفتہ اور کل اتوار۔ جو بھی ہوگا سوموار کو ہوگا۔"

میں نے کہا "جناب سوموار کو تمہارے فنگر پرنٹس ہوں گے، اس کے بعد تصاویر اتاری جائیں گی۔ اس کے بعد انٹرویو ہوگا۔ پھر پیشاب اور خون کا ٹیسٹ ہوگا۔ پھر باقی میڈیکل چیک اپ ہوگا۔ اس کے بعد تمھیں دوسری جگہ بھیجا جائے گا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ تمہارے فنگر پرنٹس کا حامل فرد

کسی اور ملک میں مقیم نہ کل آیا تو!''

اس نے اطالین میں گالی دی۔ کہنے لگا، پورکا میزیریا (porac miseria)، یعنی ہائے ری قسمت۔ مجھے کیا پتا تھا اتنے دن لگیں گے۔'' پھر کہنے لگا ''تمھیں کیسے پتا ہے کہ اتنے دن لگیں گے۔''

میں نے کہا ''میں ان تمام مراحل سے گزر چکا ہوں۔ اب میرے میڈیکل چیک اپ کا کچھ عمل باقی ہے۔ میرا خیال ہے سوموار کو ہو جائے گا۔ اس کے بعد امید ہے مجھے بھی کراس بھیج دیا جائے گا۔''

رضا بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے رضا کا تعارف سالواتورے سے کروانا چاہیے تھا۔ رضا نے کہا ''بہت خوب، تم اطالین بھی جانتے ہو۔''

میں نے کہا ''میں فرنچ اور انگریزی بھی جانتا ہوں۔''

''اور اردو تمہاری مادری زبان ہے۔''

میں نے اس کی تصحیح کی ''اردو میری قومی زبان ہے۔''

پھر میں نے رضا اور سالواتورے کو باہم متعارف کروایا ''سالواتورے، رضا، سالواتورے۔''

سالواتورے انگریزی جانتا تھا اس لیے ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ انگریزی میں ہی گفتگو کی جائے۔

رضا کہنے لگا ''فرشتہ انگریزی تو تمہارے ملک کی دفتری زبان ہے لیکن تم نے فرنچ اور اطالین کیوں سیکھی۔''

''میرے دادا جی کہتے تھے کہ اگر کسی شخص کو ایک زبان آتی ہے تو وہ ایک شخص ہوتا ہے۔ اگر اسے دو زبانیں آتی ہیں تو وہ دو انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح جتنی زبانیں سیکھے گا اس کا اثر و رسوخ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ ان زبانوں کی وجہ سے مجھے کام ملا۔ لوگوں کے ساتھ ملنے ملانے کے مواقع میسر آئے۔''

سالواتورے بولا ''فرنچ کی مجھے بھی کچھ شد بد ضرور ہے لیکن پاکستان میں اطالین، یہ بات میری پلے نہیں پڑ رہی۔''

میں نے جواب دیا ''یورپین کا یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کی صلاحیتیں انڈر اسٹیمیٹ کرتے ہیں، ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ ہمارے ہاں اسلام آباد میں ایک یونیورسٹی ہے وہاں ساری زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔''

رضا کہنے لگا" فارسی بھی؟"

میں نے کہا" فارسی تو ہمارے ہاں بعض سکولوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ فارسی جانتے ہیں۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں فارسی سکھانے کا ادارہ" خانۂ فرہنگ" موجود ہے۔"

رضا نے سالواتورے سے پوچھا" تم اٹلی میں کس شعبے سے منسلک تھے۔"

سالواتورے بولا" میں نے کلاسیکی ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔ اس کے علاوہ لاطینی اور فرنچ پڑھی ہے۔ میں ناپولی میں ایک اخبار کے لیے لکھتا تھا۔"

میں بولا" لکھتا تھا مطلب۔"

سالواتورے بولا" اب نہیں لکھتا، لیکن جیسے ہی کوئی پلیٹ فارم ملے گا، پھر سے لکھنا شروع کردوں گا۔"

رضا بولا" کلاسیکی ادب میں آپ نے کیا پڑھا ہے۔"

سالواتورے بولا" میں نے دانتے، بوکاچو اور پترارکا کو پڑھا ہے۔"

میں نے کہا" ورجل کو نہیں پڑھا۔"

سالواتورے بولا" پڑھا ہے لیکن اس کا مطالعہ میرے کورس کا حصہ نہیں تھا۔ ویسے تو کلاسیکی ادب میں دانتے ہی کافی ہے۔"

رضا بولا" میں نے دانتے (Dante) کی ڈیوائن کامیڈی (Divina Commedia) بھی پڑھی ہے اور بوکاچو (Boccaccio) کی ڈیکیمرون (Decameron) بھی۔"

میں نے کہا" رضا تم کیا کرتے تھے ایران میں۔"

رضا بولا" میں میٹریل انجینئر تھا اور اب بھی ہوں۔"

سالواتورے بولا" کون سا میٹریل انجینئر۔"

رضا کہنے لگا" وہی جو عمارتوں کے بننے سے پہلے میٹریل کی جانچ کرتے ہیں۔ اس کی سپیسفک گریوٹی (specific gravity) دیکھتے ہیں۔ اس کے میلٹنگ پوائنٹ (melting point) کے بارے میں رائے دیتے ہیں۔ میٹریل کی مولیلیٹی (molality) اور مولیرٹی (molartiy) بتاتے ہیں۔"

گفتگو کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔

O

جب ہم ثقلین کے گھر سے نکلے تو نیائش مجھے گھر اتار کے نہ جانے کہاں نکل گیا۔ میں نے سارا دن گھر پہ لکھنے میں گزار دیا۔ نہ تو ٹی وی دیکھنے پر طبیعت مائل ہوئی اور نہ ہی کچھ پڑھنے کو دل چاہا۔ میں رات کا کھانا کھا کے سو گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو نیائش گھر پہ موجود نہیں تھا۔ میرے پاس موبائل فون نہیں تھا کہ وہ مجھے فون کر کے بتا پاتا جب کہ مجھے فون کرنے کے لیے باہر جانا پڑتا۔ فون کر کے نیائش کا پتہ کرنے کی کوئی ضرورت میں نے اس لیے بھی محسوس نہ کی کہ کبھی کبھار چوبیس چوبیس گھنٹوں کے لیے کہیں اچانک نکل جانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ ناشتہ کر کے میں پھر لکھنے بیٹھ گیا۔ ابھی میں لکھ ہی رہا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے تین چار پاکستانی افراد کھڑے تھے۔ میں نے ان سے اندر آنے کو کہا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک بولا "نیائش بھائی کدھر ہیں۔"

میں نے کہا "وہ گھر پہ نہیں ہیں۔ مجھے بتائیں میں اگر کسی کام آ سکوں تو۔"

"نہیں ہمیں انہی سے کام تھا۔ ہم منہاج القرآن کی طرف سے آئے ہیں۔ ہم مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ وہاں سکول بن رہا ہے۔ بچوں کے لیے درس کی جگہ بن رہی ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لیے درس و تدریس کا علیحدہ انتظام کیا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "نیائش بھائی کے آنے پر میں آپ کی آمد کی غرض و غایت سے انھیں مطلع کر

دوں گا۔"

"آپ بھی تشریف لائیے گا۔ وہاں ذکر کی محفل ہے۔ قائد کا پیغام بھی سنایا جائے گا۔"

میں نے کہا" اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پیغام کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے۔ اسے بھی مقدم رکھا جائے گا، یا نہیں؟"

"میری اس بات سے ان سب کی شکلیں ایسی ہو گئیں جیسے ان کے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو۔"

وہ سب مجھے سلام کیے بغیر ہی چلے گئے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو ان کو برا لگا۔ اب میرا لکھنے کو بالکل جی نہ چاہا۔ میں جا کے پی سی او پہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں گپ شپ کے لیے کوئی نہ کوئی واقف کار مل جاتا۔ کچھ لوگ تو مجھ سے اجتناب فرماتے، کچھ میری باتوں سے محظوظ ہوتے۔ ذہنی طور پر میرے لیے یہ بہت بڑی ریفریشمنٹ ہوتی۔ میں اس طرح اپنا کتھارسس کر کے دوبارہ لکھنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

ooo

رات کو نیائش آیا تو اس کے ساتھ ثقلین بھی تھا۔ دونوں کسی موضوع پہ بحث کر رہے تھے۔ میں کھانا کھا چکا تھا جب کہ وہ کھانا کھا کے آئے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی نیائش نے کہا" ماڑا میں شام کو سانسے پولکرو (Sansepolero) چلا گیا تھا۔ وہاں ہنوں سے میرا ایک دوست آیا ہوا تھا اس کے پاس رک گیا۔ اسے میں نے بہت کہا کہ اریزو چلو لیکن وہ نہ مانا اس لیے مجھے رات وہیں رُکنا پڑا۔"

میں نے کہا" کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے سب کچھ بتانے کے پابند تو نہیں۔"

"ماڑا تم موبائل فون بھی تو استعمال نہیں کرتے۔ ورنہ میں تمھیں اطلاع دے دیتا۔"

ثقلین بولا" ہاں فرشتہ صاحب آپ موبائل فون کیوں نہیں استعمال کرتے۔"

میں نے کہا" ویسے ہی۔"

"کوئی تو وجہ ہوگی۔"

"آپ چھوڑیں اس بات کو آپ کو اگلا باب چاہیے؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

میں نے نواں باب ثقلین پری پیکر کے ہاتھ میں تھمایا۔

OOO

چین اور کوریا کا میچ بڑا کانٹے دار تھا۔ ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چین کو شکست ہو جائے گی۔ ساؤتھ کوریا نے چین کو ہرا دیا۔ اب سینیگال اور ترکی کا میچ تھا۔ مجھے تو کھانے کے بعد دو گھنٹے کے لیے باہر جانے کی آزادی تھی لیکن سالواتورے اور رضا کو ابھی اس کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے ان دونوں کو گپ شپ کے لیے چھوڑا اور خود ہوا خوری کی غرض سے باہر چلا گیا۔ میں اس گندے نالے کے کنارے چلا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ آج کہاں جانا چاہیے۔ سٹیشن کے پلیٹ فارم سے ہوتا ہوا اس سڑک کی طرف چل پڑا جو جھیل کی طرف جاتی تھی۔ یہ ایک شارٹ کٹ تھا۔ آج ۲۱ جون ۲۰۰۲ء کا ٹمپریچر نسبتاً زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے حبس میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے سانس روک دی ہو یا کسی نے فضا میں کچھ ایسا مادہ چھوڑا ہو کہ جس کی وجہ سے آکسیجن کم ہو گئی ہو۔ میں نے راستے میں چلتے ہوئے پکا ارادہ کر لیا کہ جھیل میں آج میں بھی نہاؤں گا۔

میرے پاس سوئمنگ کا سٹیوم تو تھا نہیں اس لیے یا تو میں کپڑوں سمیت نہاتا یا فطری لباس میں۔ میرے لیے فطری لباس میں سرِ عام نہانا تھوڑا مشکل تھا۔ میں مقصود کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس نے جھیل کے کنارے اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں، مجھے یاد ہے میں جب سوزی کے ساتھ اپنا اولیں سفر کر رہا تھا تو میں نے بھولے سے بھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ شاید پاکستان میں ایسا کرنا مشکل تھا لیکن یہاں پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر بھی ایک انجانا سا خوف، ایک عجیب سی شرم وحیا، مجھے اس نوع کے معاملات سے دامن بچائے رکھنے کی ترغیب دیتی تھی۔ خیر میں جب جھیل کے کنارے پہنچا۔ تو پہلے دور دور تک نظر دوڑائی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا حالانکہ میں جب سے یہاں آیا تھا میں کتنے ہی سوئس لوگوں کو فطری لباس میں دیکھ چکا تھا۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد، جوان سبھی شامل تھے۔ ایک جگہ چند افریقن فطری لباس میں نہا رہے تھے اور کنارے پہ ان کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں اور آگے چل دیا۔ ایک جگہ مجھے ایسی نظر آئی جہاں کوئی متنفس قریب نہیں تھا۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو راضی کیا۔ پہلے میں نے اپنے سینڈل نما جوتے اُتارے، اس کے بعد کپڑے اُتارے۔ میں حالتِ برہنگی میں پانی میں اُتر گیا۔ مجھے تیرنا نہیں آتا اس لیے خود پر نظر ڈالے بغیر کنارے پر رہنے ہی میں عافیت تھی۔ میرا آدھا دھڑ پانی میں تھا اور آدھا باہر، جہاں میں کھڑا تھا وہاں نیچے بڑے بڑے پتھر تھے۔ پانی صاف شفاف تھا اس لیے جسم پانی کے اندر نیچے تک نظر آ رہا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ جسم پانی میں تھوڑا میڑھا نظر آ رہا تھا۔ میں نے گرمی کی شدت سے تنگ آ کر پانی میں فطری لباس میں اترنا گوارہ کیا تھا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا اس لیے تھوڑی دیر پانی میں رہنے کے بعد مجھے فرحت محسوس ہونے لگی۔ میں نے تین چار دفعہ پانی میں ڈبکی بھی لگائی لیکن بہت احتیاط سے کہ کہیں پھسل ہی نہ جاؤں۔ ڈبکی لگانے سے میرے منہ میں پانی چلا گیا لیکن پانی اتنا صاف تھا کہ مجھے بالکل اُلجھن نہ ہوئی۔ عام طور پر ٹھہرے ہوئے پانی کو ناپاک خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ پانی بہت صاف ستھرا تھا۔ جھیلوں کا پانی عموماً زیر زمین رواں چشموں کا مرہون منت ہوتا ہے اس لیے مصفّا اور تر و تازہ ہوا کرتا ہے۔ کافی دیر پانی میں رہنے کے بعد میں جھیل سے باہر نکل آیا۔ میں نے گیلے جسم پہ جلدی سے جینز چڑھائی، مجھے یہی ڈر تھا کہ مجھے کوئی حالت برہنگی میں دیکھ نہ لے۔ پھر ٹی شرٹ پہنی۔ اس کے بعد میں نے اپنے سینڈل نما جوتے پہنے اور جھیل کے کنارے بیٹھ کے رنگ برنگی بادبانوں والی کشتیوں کو دیکھنے لگا جو پانی کے بہاؤ پہ آہستہ آہستہ رواں تھیں۔ مجھے پانی کے درمیان ان گیندوں سے جرمن، سوئس بارڈر کی حد بندی عجیب سی لگی جو رسی میں پروئی ہوئی تیر رہی تھیں اور جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آدھی جھیل جرمنی اور آدھی جھیل سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جھیل سے ایک کتا برآمد ہوا۔ اس نے پانی سے نکلتے ہی اپنے کانوں کو زور سے جھٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جھرجھری لی۔ جسم سے پانی کو صاف کیا۔ مجھے یہ سوچ کے کراہت آنے لگی کہ میرے منہ میں ایسی جھیل کا پانی گیا ہے کہ جس میں کتا بھی نہایا ہے۔ یورپین لوگوں کے لیے کتا گھر کے فرد کی طرح ہوتا ہے لیکن مجھے کتے سے ڈر بھی لگتا ہے اور میں کتے کو ایک نجس جانور خیال کرتا ہوں لہٰذا جس پانی میں کتا نہا کے نکلے وہ پانی میرے منہ میں گیا ہو تو فطری طور پر مجھے قے آ جانی چاہیے۔ میرا دل خراب ہونے لگا۔ خود کو کوسنے لگا کہ میں نے جھیل میں تیراکی کا رسک کیوں لیا۔ میرا جھیل کے کنارے مزید بیٹھنے کو جی نہ چاہا۔ اس لیے میں نے واپسی کی راہ لی۔ راستے میں اسی عمارت کے پاس سے گزرا جہاں "آگاتھو" کا دفتر تھا۔ میں اس عمارت کی پچھلی طرف گیا۔ لوہے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیسری منزل پہ پہنچا جہاں ان کا دفتر تھا۔ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ آج بھی یہاں بہت سے لوگ مہاجر کیمپ سے وارد ہوئے تھے۔ پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں ایک عورت تھی۔ لیکن آج دو عورتیں تھیں۔ ایک جوان العمر اور دوسری وہی، جس سے میں پہلے ملا تھا۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ انہوں نے چائے کا پوچھا تو میں نے کہا، میں خود بناؤں گا۔ میں نے خوشی خوشی چائے

بنائی۔ اپنے لیے دودھ بھی ڈالا لیکن انہوں نے کہا ہمارے لیے اس پاکستانی چائے کا قہوہ ہی ٹھیک رہے گا۔ میں نے سنک میں رکھے برتن دھوئے اور اپنی چائے لے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس جوان لڑکی سے پوچھا کہ اگر انگریزی میں کوئی کتاب مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ وہ کہنے گی، ہمارے پاس نیشنل جیوگرافکس ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو میں پہلے بھی لے کر گیا تھا۔ تو کہنے لگی اس کے علاوہ ہمارے پاس انگریزی میں کوئی میگزین نہیں۔ میں یہاں پڑی ہوئی مختلف کتابیں اُلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ کچھ میگزین تھے۔ کچھ نقشے تھے۔ کتابوں میں میری دلچسپی کا کچھ نہ تھا اس لیے جلد ہی اُکتا گیا اور واپس چلا آیا۔

ازیل ہائم واپس پہنچا تو یہاں کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کتنی عجیب بات تھی مجھے یہاں رہتے ہوئے پورا ہفتہ ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن ابھی یہ بات ماننے کو آمادہ نہیں تھا کہ رات کو کھانا کھانے کا وقت چھ بجے بھی ہو سکتا ہے حالانکہ مجھے اب تک عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں ابھی تک خود کو قائل نہ کر سکا تھا۔

یہاں آ کے پتا چلا کہ ترکی میچ جیت گیا ہے۔ مجھے سینیگال کے ہارنے کا بہت افسوس تھا لیکن ترکی سیمی فائنل میں آ گیا تھا اس کی خوشی بھی تھی۔ اب چار ٹیمیں بچی تھیں۔ برازیل جس کے فائنل جیتنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ جرمنی، ساؤتھ کوریا اور ترکی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جرمنی اور برازیل کا فائنل ہوگا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے میچز کیسے آتے ہیں۔

کھانے کا وقت ہوا تو ہمارے ساتھ جہاں غریب ممالک کے لوگ تھے وہاں قطار میں ایک جرمن بھی تھا اور ایک اٹالین بھی۔ ہم سب لوگ بھکاریوں کی طرح قطار میں کھڑے ہو گئے۔ جب جرمن نے اپنی پلیٹ اس عورت کے سامنے کی جو سب کی پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے بعد اٹالین تھا۔ میرے پیچھے رضا تنقی تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا "فرشتہ یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اخلاقی طور پر ٹھیک نہیں۔ یہ انسانیت کی تضحیک ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے قیدی ایک طرف، مجھے تو اپنا آپ دوسری جنگِ عظیم کے یہودیوں کی طرح محسوس ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی پہلے دن ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اب تو یہاں کی بس ایک ہی بات عجیب لگتی ہے کہ یہ لوگ رات کا کھانا دن کے چھ بجے سرو کر دیتے ہیں۔ سردیوں میں رات جلدی ہو جاتی ہے اس لیے محسوس نہیں ہوتا لیکن جون کے مہینے میں سورج شام کے

نو بجے بلکہ یہاں تو ساڑھے نو بجے غروب ہوتا ہے۔ رات کا تصور تو اندھیرے کے ساتھ ہے۔ یہاں کھانے کے لیے تو رات چھ بجے ہی ہو جاتی ہے لیکن باہر سورج چمک رہا ہوتا ہے۔"

بتقی بولا" میں اس کے خلاف لکھوں گا۔"

سالواتورے جو میرے آگے کھڑا تھا وہ کہنے لگا" میں بھی لکھوں گا۔ یہاں کی ساری کارستانی لکھوں گا۔"

میں نے سالواتورے سے کہا" پہلے اپنی پلیٹ میں کھانا تو ڈالوا لے اس کے بعد لکھنا۔" اس نے اپنی پلیٹ کھانے کے لیے اس عورت کو پیش کی۔" سالواتورے نے اٹالین زبان میں گالی دی۔ وہ عورت جو پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی کہنے لگی" گالی کیوں دیتے ہو۔" سالواتورے کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا" اٹالین ہر اس جگہ ہوتے ہیں جہاں آلو اور پیاز ہوتے ہیں۔" میں نے لقمہ دیا" اور ٹماٹر بھی۔"

اس کے بعد میری باری آئی پھر رضا کی۔ ہم تینوں اپنی اپنی پلیٹ میں کھانا لے کر میز پہ آ گئے۔ رضا پوچھنے لگا" تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔" میں نے کہا" میں جھیل کنارے گیا تھا۔ یہاں کرائس لنگن میں ایک جھیل ہے جو آدھی جرمنی اور آدھی سوئس میں ہے۔ اس کا نام ہے بودن سے۔ اس کو لاگو دی کوستانسا بھی کہتے ہیں یعنی کوستانسا جھیل۔"

سالواتورے بولا" جھیل، جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ اس میں نہانے کی بھی اجازت ہے؟"

میں نے کہا" یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہاں لوگ نہاتے ہیں۔ میں بھی آج نہایا ہوں لیکن آئندہ کبھی نہیں نہاؤں گا۔"

رضا بولا" کیوں۔"

" کیونکہ اس میں کتے بھی نہاتے ہیں۔"

سالواتورے بولا" اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

رضا بولا" تمہاری تہذیب میں کتا گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم مسلمانوں میں کتا گھر کی حفاظت کے لیے تو رکھا جا سکتا وہ بھی مجبوری کی حالت میں لیکن یہ اگر آپ کے جسم کو چھو جائے تو جسم ناپاک ہو جاتا ہے۔"

سالواتورے بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا" میں نے یہ پہلی دفعہ سنا ہے کہ کتے کے چھونے سے جسم ناپاک ہو جاتا ہے۔"

رضا بولا "ہمارے ساتھ رہو گے تو بہت کچھ نیا سننے کو ملے گا۔ ہم تمھیں وہ نہیں بتائیں گے جو تم اٹالین ٹی وی میں ہمارے بارے میں سنتے اور دیکھتے ہو بلکہ ایران اور پاکستان اصل میں کیسے ہیں ہم اس بارے میں تمھیں بتائیں گے۔"

اور پھر میری طرف منہ کر کے بولا "کیوں فرشتہ، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر پوچھا "اچھا یہ بتاؤ، میرے بعد سالواتورے سے کس موضوع پر بات ہوتی رہی؟۔۔۔ "ادب کے بارے میں" کیا موضوع تھا؟"

"کچھ نہیں یہ دانتے کی تعریف کرتا رہا اور میں فردوسی، رودکی، خیام، سعدی اور رومی کی۔"

سالواتورے بولا "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایرانی ادب میں اتنے بڑے بڑے قلمکار اور شاعر گزرے ہیں۔"

ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو سیکیورٹی گارڈ نے آ کر بتایا کہ سب لوگوں کو گارنیچے ہوٹل جانا ہے۔ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ پھر وہی ٹویوٹا وین تھی اور ہم تھے۔ ہماری باری آتے آتے شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ آج گرمی کافی تھی۔ اس لیے ہم لوگ جیسے ہی ہوٹل پہنچے سب نے باری باری شاور لیا۔ گو کہ اب بھی بہت سے لوگ باتھ کے باہر ہوتے لیکن میں ان سات دنوں میں ہر وقت باتھ کی سہولت پانے کا راز جان گیا تھا۔ اس عمارت میں ایک باتھ تہہ خانے میں بھی تھا۔ وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس لیے میں نے رضا اور سالواتورے کو بھی یہ راز بتا دیا۔ جب ہم نہا دھو کے فارغ ہو چکے تو ہم تینوں گارنیچے ہوٹل کی ٹیرس کے ایک کونے میں کرسیاں لے کر بیٹھ گئے۔

میں نے سالواتورے سے کہا "تم نے بتایا نہیں تم کیا کام کرتے تھے یا کرتے ہو؟"

سالواتورے بولا "میں نے ویسے تو ادب میں ڈگری لی ہے لیکن میں فری لانس جرنلسٹ ہوں۔ میں اٹلی کے کئی اخباروں کے لیے مضامین لکھا کرتا تھا۔ اور اب بھی لکھوں گا۔"

"لیکن اس کا سیاسی پناہ سے کیا تعلق ہے۔"

"تعلق ہے۔ تم نے دنیا کی سب سے بڑی ڈرگ مارکیٹ کا نام سنا ہے۔"

میں نے کہا "شاید پاکستان یا افغانستان میں ہے۔"

"نہیں دنیا کی سب سے بڑی ڈرگ مارکیٹ اٹلی میں ہے۔ وہاں ایک شہر ہے ناپولی۔ ناپولی میں ایک علاقہ ہے سکامپیا (Scampia)۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی ڈرگ مارکیٹ کا مرکز ہے۔

میں شروع شروع میں تو چھوٹے موٹے مضامین ہی لکھتا تھا لیکن بعد میں میں نے اس علاقے کے بارے میں تفصیلی طور پر لکھنا شروع کیا۔ ایک دن ایڈیٹر کو دھمکی ملی کہ تم نے اگر اس علاقے کے بارے میں لکھنا بند نہ کیا تمہارا دفتر غائب ہو جائے گا اور تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ یہ محض دھمکی نہیں تھی بلکہ وہ لوگ یہ سب کر دکھانے کی طاقت رکھتے تھے اور پھر انھی کے جارحانہ اقدامات کی بنا پر ایڈیٹر جان بچا کے ڈنمارک چلا گیا اور میں یہاں آپ کے سامنے ہوں گے۔''

رضا بولا ''تمہیں اٹلی کی پولیس تحفظ فراہم نہیں کر سکتی۔''

''اٹلی کے دوسرے علاقوں میں انتظام و انصرام بہت اچھا ہے لیکن جیسے ہی روم سے آگے جائیں تو حکومت کی گرفت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ پورے یورپ میں اٹلی واحد ایسا ملک ہے جہاں اس طرح کا مسئلہ درپیش ہے۔ اٹلی کی ڈرگ مافیا اس قدر منظم اور طاقتور ہے کہ اگر کوئی ان چیزوں کے خلاف لکھے یا ان کو تنقید کا نشانہ بنائے یا ان کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو وہ خود ختم ہو جاتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں بلکہ پوری دنیا جانتی ہے لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

رضا بولا ''چلو چھوڑو ان باتوں کو کسی اور موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''مثلاً؟''

تو رضا بولا ''ادب پہ بات کی جا سکتی ہے۔ میری اور سالواتورے کی پہلے بھی ادب پہ بڑی دلچسپ گفتگو ہو چکی ہے۔''

سالواتورے بولا ''تم نے دانتے کو پڑھا ہے۔''

میں نے کہا ''کیا مطلب۔ دانتے کو پڑھا ہے۔''

''مطلب یہی کہ تم نے ''دیوینا کومیدیا'' پڑھی ہے۔''

''میں نے اس کا انگریزی ترجمہ ''ڈیوائن کامیڈی'' پڑھا ہے۔ اس میں جنت دوزخ اور برزخ کا ذکر ہے۔''

''اگر دیوینا کومیدیا کا صحیح مزہ لینا ہے تو اسے اطالین میں پڑھو۔ بلکہ لنگوا ولگارے (lingua vulgare) میں پڑھو۔''

رضا بولا ''دانتے کا جن لوگوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ان میں سے ایک ترجمہ تو ڈوروتھی سیئر اور باربرا رینالڈ (Dorothy Sayer and Barbara Reynold) کا ہے اور

دوسرا مشہور ترجمہ جو کہ عام فہم ہے وہ مارک موسیٰ (Mark Musa) کا ہے۔ مارک موسیٰ کا ترجمہ مجھے پسند آیا ہے۔ اس نے بڑی تحقیق کر کے ترجمہ کیا ہے۔"

سالواتورے بولا" لیکن اطالین میں اس کا قافیہ اور ردیف ہے۔ جس کو پڑھ کے مزہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شعر کے ساتھ تاریخی حوالے ہیں، سائنس سے متعلق چیزیں ہیں۔"

میں نے کہا" میں نے بھی مارک موسیٰ کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس نے تاریخی حوالوں کا بڑی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ آپ کو گبلینی (Ghibellini) اور گویلفی (Guelphi) کی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔ اس نے تو یہاں تک لکھا ہے گبلینی اور گویلفی دو جرمن قبیلے تھے جو جرمنی سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ چونکہ اطالوی لوگوں کے لیے زویلف (Zwelf) اور زیولینی (Zuellini) کہنا مشکل تھا۔ اس لیے "ز" کو "گ" کہنے لگے اور اس طرح زویلف، گویلف بن گیا۔"

سالواتورے میری شکل دیکھنے لگا۔ کہنے لگا" یہ مجھے نہیں پتا تھا۔"

رضا نے کہا" اس نے تو ان تاریخی شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ڈیوینا کومیڈیا میں ذکر آیا ہے۔ جیسا کہ فلپو آرجنٹینی (Fillipo Argentini)۔ مارک موسیٰ نے بہت زیادہ تحقیق کی ہے۔"

سلواتورے بولا" ویسے دانتے کی" ڈیوینا کومیڈیا" کے ایک ایک شعر پہ ایک ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔"

رضا بولا" اس میں کوئی شک نہیں۔"

میں نے پوچھا" ویسے سالواتورے تمہارے خیال میں دانتے نے" ڈیوائن کامیڈی" کا مرکزی خیال کہاں سے لیا؟"

سالواتورے بولا" یہ مرکزی خیال دانتے کے دماغ کی ہی تخلیق ہے۔ تاہم کچھ اس نے بائبل سے اور کچھ دوسری الہامی کتابوں سے اخذ کیا ہوگا۔"

رضا بولا" جنت، دوزخ اور برزخ کا تصور اسلام میں بھی ہے۔ ہندو اس کو سورگ اور نرک کہتے ہیں۔ ہر مذہب میں جنت دوزخ کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے دانتے اس بات سے واقف تھا کہ وہ جس چیز کے بارے میں لکھنے جا رہا ہے وہ کوئی نئی نہیں لیکن اس نے اس کو ایک دیومالائی کہانی بنا کر پیش کیا۔"

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا" ویسے میں پاکستان میں جب ٹورسٹ گائیڈ تھا تو

ان دنوں مجھے بدھ ازم پہ بہت سی کتابیں پڑھنے اور بہت سی خانقاہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پاکستان میں ایک جگہ ہے ٹیکسلا جو میرے آبائی شہر راولپنڈی سے پینتیس کلومیٹر دور ہے۔ پانچ سات دہائی پہلے آثار قدیمہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ انگریز ماہر سر جان مارشل نے ایک خانقاہ دریافت کی تھی۔ یہ بدھ مت پیروکاروں کی درسگاہ تھی۔ یہاں سے ایک سٹوپا نکلا ہے۔ اس کی سات چھتریاں تو ٹوٹ گئی ہیں لیکن نیچے کا حصہ سلامت ہے۔ اس سٹوپے میں جنت دوزخ کا منظر دکھایا گیا ہے۔ اس میں "ڈیوائن کامیڈی" کی طرح دوزخ کے مختلف مراحل دکھائے گئے ہیں۔ یہ سٹوپا جولیاں میں ہے۔ اس کی ہر تہہ میں دوزخ کی میں سزا پانے والوں کی مختلف قسمیں مرتسم کی گئی ہیں۔ گناہ کے حساب سے ان کو تکلیف میں دکھایا گیا۔ اس کے اوپر بدھا کی عبادت کی مختلف مدرائیں ہیں۔ جب میں نے "ڈیوائن کامیڈی" پڑھی تو میرا خیال اس کی طرف گیا۔"

سالواتورے کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگا "میں بدھ ازم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن یہ واقعی حیران کن بات ہے۔ اس کا مطلب ہے دانتے نے اپنی "ڈیوینا کومیدیا" کا مرکزی خیال کہیں اور سے لیا کیونکہ دانتے بدھ ازم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا ہوتا تو بعید نہیں تھا کہ دوزخ کے کسی خانے میں گوتم بدھ کو بھی پھینک دیتا۔"

میں نے کہا "کچھ دانتے کے بارے میں بتاؤ۔"

رضا بولا "میں بتاتا ہوں۔

دانتے ۱۲۶۵ میں اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا۔ دانتے نے "ڈیوائن کامیڈی" میں اپنے اجداد کو رومن بتایا ہے۔ وہ فلورنس کے ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا جو گویلف کے حامی تھے۔ گویلف پاپا کے حق میں تھے اور گھیلینی پاپا کے خلاف تھے۔ اس لیے ان دونوں جماعتوں میں اکثر لڑائی رہتی۔ دانتے نے گویلف کے لیے گھیلینی کے خلاف ایک جنگ میں بھی حصہ لیا۔ اس عظیم اطالوی شاعر کی ماں اسے دس سال کی عمر میں چھوڑ کے اس دنیا سے چلی گئی۔ دانتے کی عمر جب بارہ سال ہوئی تو اس کی شادی ایک امیر خاندان کی لڑکی جیما (Gemma) سے طے پا گئی۔ ان دنوں چھوٹی عمر میں شادیوں کا رواج تھا۔ جبکہ دانتے اس دوران ایک لڑکی بیاٹریشے (Beatrice) کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔ دانتے کی شادی جیما (Gemma) سے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا۔ اس دوران اس کی ملاقات دوبارہ "بیاٹریشے" سے ہوئی۔ دانتے نے "بیاٹریشے" کے فراق میں پیار بھری نظمیں لکھنی

شروع کر دیں۔ اس نے اس بارے میں اپنی بیوی جیما کو بھی نہ بتایا۔
دانتے نے ابتدائی تعلیم گھر پہ ہی حاصل کی۔ اس کے بعد حصول علم کے لیے وہ سسلی کے ادبی سکول میں چلا گیا۔ جب یورا یورپ علم وادب میں پسماندہ و تھا۔ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت سسلی علم وادب میں بام عروج پہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سسلی مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔
دانتے نے لاطینی زبان پہ عبور حاصل کیا اور اس نے اپنی ابتدائی شاعری لاطینی زبان میں کی۔ شاعری میں کسب فیض کے لیے سب سے پہلے اس نے اپنے عصر کے معروف شاعر ڈولچے سٹل نووو (dolce stil nuovo) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ جب دانتے کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اس کی ملاقات گوئیدو کاوالکانتی (Guido cavalcanti)، چینو دی پستویا (Cino di Pistioa) اور برونو لیتینی (Bruno lettini) سے ہوئی اور ان سے متاثر ہو کر اس نے شاعری کے انداز میں کمال حاصل کیا اور اپنے پیشرؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔
جب گویلف نے گھبلینی کو شکست دی تو گویلف دو حصوں میں بٹ گئے۔ سفید گویلف اور کالے گویلف۔ دانتے سفید گویلف کے ساتھ تھا اور یہ پاپا کے خلاف تھے۔ بعد میں کالے گویلف نے فرانس کے بادشاہ کے ساتھ مل کے فلورنس کو قبضے میں لے لیا۔ دانتے کو فلورنس سے جلاوطن کر دیا گیا۔ دانتے یہاں سے ویرونا (Verona) گیا اور اس نے اٹھارہ سال جلاوطنی میں گزارے اور جب وہ پارادیزو (Paradiso) جس کو انگریزی میں "پیراڈائز" لکھا جاتا ہے، لکھ رہا تھا تو ان دنوں وہ راوینا (Ravenna) میں تھا۔ اس نے جیسے ہی پارادیزو مکمل کی، اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔
دانتے نے اٹھاون سال کی عمر میں راوینا میں وفات پائی اور اس شہر میں اس کا مقبرہ ہے۔"
سالواتورے سر کھجاتے کھجاتے بولا "رضا تم دانتے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو، جتنا اٹالین بھی نہیں جانتے۔"
رضا بولا "ذوق کی بات ہے۔"
میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم میٹریل انجینئر ہو لیکن اصل میں تو تم ادب کے اُستاد لگتے ہو۔"

اب میں نے رضا کو آپ کے بجائے تم کہنا شروع کر دیا تھا وہ کہتا تھا تکلف سے انسان کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور انسان ادب واحترام کے چکر میں کھل کے بات نہیں کر

سکتا۔ انگریز نے تو خود کو اس مصیبت سے آزاد کر لیا۔ انگریزی میں " آپ " ہوتا ہی نہیں۔ سب تو یا تم ہوتے ہیں۔

رضا کہنے لگا " اصل میں میری بیوی روبی۔ ادب کی پروفیسر ہے۔ اسے ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ یہ سارا علم اسی کی وجہ سے ہے۔"

سالواتورے بولا " تمہاری بیوی کہاں ہے۔"

" وہ بچوں کے ساتھ ایران میں رہتی ہے۔ مجھے جیسے ہی موقع ملے گا میں ان کو یہیں بلا لوں گا۔"

میں نے کہا " ہم دانتے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ تم نے اس کے مرکزی خیال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

رضا بولا " اس بارے میں سالواتورے سے پوچھنا چاہیے۔"

سالواتورے بولا " تمہاری موجودگی میں میرا علم کچھ بھی نہیں۔ تم بتاؤ کہ تمہارے خیال میں دانتے نے دیوینا کامیدیا کا مرکزی خیال کہاں سے لیا۔"

رضا بولا " اجازت ہے؟"

ہم دونوں نے یک زبان ہو کر کہا " ارشاد۔"

رضا نے بولنا شروع کیا " دانتے کے بارے میں تو تم تھوڑا بہت جان ہی چکے ہو۔ انگریزی میں اس کی شہرۂ آفاق تخلیق کو ڈیوائن کامیڈی (Divine Commedy) کہتے ہیں اور اطالین میں اس کا نام لا دیوینا کومیدیا (La Divina Commedia) ہے۔ دانتے نے دیوینا کومیدیا ۱۳۰۸ میں لکھنی شروع کی اور ۱۳۲۱ میں مکمل کی۔ یعنی اسے دیوینا کومیدیا لکھنے میں تیرہ سال لگے۔ یہ ایک دیو مالائی طرز کی نظم ہے اور یہ اطالوی ادب کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر فارسی زبان میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔ فارسی زبان کی موجودہ شکل شاہنامہ کی تخلیق کے بعد ہی ظہور پذیر ہوئی اور مزے کی بات یہ ہے کہ فارسی زبان کی موجودہ شکل آج بھی نوے فیصد ویسی ہی ہے جو آج سے ہزار سال پہلے تھی۔ فردوسی کا " شاہنامہ " دانتے کی " دیوینا کومیدیا " سے تین سو سال پہلے لکھا گیا۔ دانتے نے " دیوینا کومیدیا " لاطینی زبان میں لکھنے کے بجائے لنگوا وانگارے میں لکھی جو کہ عام لوگوں کی زبان تھی جبکہ اس زمانے کے شرفاء اور امراء لنگوا وانگارے بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دانتے نے جس لنگوا وانگارے میں " دیوینا کومیدیا " لکھی اٹلی کے ریجن توسکانہ (Regione Toscana) میں

آج بھی اسی فیصد وہی زبان رائج ہے۔ یعنی سات سو سال پہلے لکھی جانے والی شاعری کی کتاب آج بھی اسی فیصد لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ جبکہ جوفرے چوسر (Goeffery Chauer) نے کینٹبری ٹیلز (Cantbery Tales) کی کہانیاں آج سے سات سو سال پہلے لکھی تھیں آج ان کا بیس فیصد حصہ بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ انگریزی زبان بہت زیادہ بدل چکی ہے۔"

میں رضا کی بات میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن رہ نہیں سکا اور بول پڑا "رضا برصغیر پاک و ہند کے مشہور شاعر مرزا غالب نے بھی تو یہی کیا تھا۔ اس نے مشکل اردو کو ختم کر کے عام فہم اردو رائج کی۔"

رضا بولا "تم بالکل درست کہتے ہو۔ میں نے غالب کا فارسی کلام پڑھا ہے۔ وہ قدیم فارسی شعراء سے بہت متاثر تھا۔ تو بات ہو رہی تھی دانتے کی "دی وینا کومیدیا" کی۔ دانتے مذہبی نقطۂ نگاہ کیتھولک تھا اور وہ تھومس ایکویناس (Thomas Aquinos) کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اس نے تشبیہ اور استعارے کے انداز میں جنت دوزخ اور برزخ کے مناظر کو پیش کیا۔

پہلے دانتے کی کتاب "دی وینا کومیدیا" کا یک لفظی نام "کومیدیا" ہی تھا۔ بعد میں جب جووانی بوکاچو (Giovanni Boccaccio) نے اس کتاب کو پڑھ کے اس کی اہمیت کو سمجھا تو اس کا نام "دی وینا کومیدیا" کر دیا۔ اس نام کے ساتھ پہلی دفعہ یہ کتاب ایک وینشین مزاح نگار لودوکوڈو لچے (Lodovico Dolce) کے کہنے پر گبریئل جولیتو (Gabrielle Guilietto) نے ۱۵۵۵ء میں چھاپی۔

دانتے کی دی وینا کومیدیا چودہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کو اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ دوزخ کا ہے۔ اس کے تینتیس کینٹوز (Canto) ہیں۔ ہر کینٹو میں ایک سو چھتیس سے ایک سو چھیالیس اشعار ہیں۔ اشعار کی تعداد طاق ہے۔ تین تین اشعار کا بند ہے۔ اس دور میں شاعری کا یہ نیا انداز شروع ہوا تھا۔ گوئیدو کاولکانتی (Guido Cavalcanti) اور چینو دی پستویا (Cino di Pistioa) اس انداز کے پیشرو مانے جاتے ہیں، لیکن دانتے نے اس انداز میں ملکہ حاصل کیا۔ دوزخ کے بعد برزخ ہے اس کے بھی تینتیس کینٹو ہیں۔ جنت آخری حصہ ہے۔ اس کے چونتیس کینٹوز ہیں۔" سالواتورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا "فرشتہ کو تو پتا ہے کہ مسلمانوں میں تسبیح نماز میں ۳۳،۳۳،۳۴ کی ترتیب ہوتی ہے۔ لیکن سالواتورے تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ

"ڈیوینا کومیڈیا" میں علم الاعداد کا بڑا عمل دخل ہے۔"

دانتے دوزخ میں اپنے استاد ورجل (Virgil) کے ساتھ نکلتا ہے۔

Nel mezzo del cammin di nostra vita

mi ritrovai per una

selva oscura che la diritta via era smarrita

یہ ڈیوینا کومیڈیا کے ابتدائی تین شعر ہیں۔ مارک موسیٰ کا خیال ہے کہ دانتے نے اپنی کومیڈیا کا ابتدائیہ ماریما (Maremma) کے جنگل کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ تینوں دوزخ سے گزرتے ہوئے تین جانوروں سے ملتے ہیں جو کہ شیر، تیندوے اور بھیڑیے کی مونث کی صورت میں ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام ناقدوں کا خیال ہے کہ یہ جانور تشبیہی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تین جنگلی جانور انسان کے اندر پائی جانے والی بری خصلتوں کا استعارہ ہیں۔ وہ بری خصلتیں، ذاتی مفاد، تشدد اور حسد ہیں۔ ان تینوں برائیوں کو دانتے تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس طرح دوزخ کی تین منازل بن جاتی ہیں۔ پہلی منزل کو وہ پانچ دائروں میں تقسیم کرتا ہے یہ دوزخ کی اوپر والی منزل ہے۔ دوسری منزل پہ دو دائرے ہیں چھ اور سات۔ یہ دوزخ کی نچلی منزل ہے۔ تیسری اور سب سے نچلی منزل میں دو دائرے ہیں چھ اور سات۔ یہ دوزخ کی نچلی منزل ہے۔ تیسری اور سب سے نچلی منزل میں دو دائرے ہیں جو کہ آٹھ اور نو پر مشتمل ہیں۔ دانتے اور ورجل ان تمام مراحل سے اور منازل سے اکٹھے گزرتے ہیں۔ یہ ساری کہانی دانتے ورجل کو تینتیس کینٹوز میں سناتا ہے۔

جب دانتے دوزخ سے برزخ میں داخل ہوتا ہے تو دانتے اور ورجل کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے کیونکہ ورجل کرسچن نہیں تھا۔ اس لیے وہ یہاں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے برزخ میں دانتے کی معشوقہ بیاٹریشے (Beatrice) اس کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ دانتے جب برزخ میں داخل ہوتا ہے۔ یہ قطب کے دوسری طرف والی پہاڑی ہے۔ یہاں دانتے قرون وسطیٰ کی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اس کے ساتھ وہ لکھتا ہے کہ یہ پہاڑی یروشلم کے نیچے ہے۔ اس میں انسان میں پائی جانے والی سات بدترین برائیوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے تینتیس کینٹوز ہیں۔ وہ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ دانتے نے اپنی "ڈیوینا کومیڈیا" میں بوعلی سینا اور ابن رُشد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس نے ان کی تخلیقات سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

"ڈیوینا کومیڈیا" کا آخری حصہ جنت ہے۔ اس میں دانتے عیسائیت کے چار مشہور رہنماؤں سے ملتا ہے۔ جن میں تھومس ایکویناس (Thomas Aquinos)، سینٹ بوناوینچورا (Saint Buonaventura)، سینٹ جون (Saint John) اور سینٹ پیٹر (Saint Peter) شامل ہیں۔ جنت کے نو مراحل ہیں۔ جب تمام مراحل گزر جاتے ہیں تو ایک مقام پہ دانتے کو بیاٹریشے بھی چھوڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ایک خاص مقام سے آگے وہ بھی نہیں جا سکتی۔ "ڈیوائن کامیڈی" میں جب خدا کا ظہور ہوتا ہے تو پڑھنے والا یہی سوچتا ہے کہ وہ ابھی خدا کے بارے میں لکھے گا کہ وہ کیسا ہے لیکن دانتے نے یہاں تثلیث کو پیش کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کو امر دکھایا ہے۔ جہاں تک خدا کے وجود کا سوال ہے تو وہ خدا کی جگہ لکھتا ہے کہ نور ہی نور ہے۔ روشنی ہی روشنی ہے۔ اس کے بعد "ڈیوینا کومیڈیا" کا اختتام ہو جاتا ہے۔ جنت کے چونتیس کینٹوز ہیں۔ دانتے نے جنت کے منظر میں خدا، بی بی مریم اور حضرت عیسیٰ ان تینوں کو اکٹھا پیش کر کے تثلیث کے نظریئے کو اجاگر کیا ہے۔

دانتے کے ہاتھ کا لکھا ہوا "ڈیوینا کومیڈیا" کا کوئی بھی مخطوطہ یا نمونہ وجود نہیں رکھتا۔ جب بوکاچو نے کومیڈیا کو "ڈیوینا کومیڈیا" کا نام دیا تو اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند نمونے پائے جاتے ہیں۔ "ڈیوینا کومیڈیا" کو پہلی دفعہ کتابی شکل میں فولینیو (Foligno) کے ایک جرمن نژاد شخص نے ۱۴۷۲ء میں چھاپا۔ دانتے کی "ڈیوینا کومیڈیا" کو سائنسی نقطۂ نگاہ سے بھی اہم تصورات کی حامل کتاب گردانا جاتا ہے۔

اب آتے ہیں "ڈیوینا کومیڈیا" کے نظریۂ تخلیق کے بارے میں کہ دانتے نے یہ خیال کہاں سے لیا۔ سپین کے ایک فلاسفر اور پادری نے ۱۹۱۹ء میں ایک کتاب لکھی۔ پروفیسر میگیل آسن پلاکو (Proffessor Miguel Asanplaco) اپنی کتاب "اسلامک ایسکھاٹولوجی اینڈ ڈیوینا کومیڈیا" میں لکھتا ہے کہ دانتے کے "ڈیوینا کومیڈیا" کے بہت سے مناظر ابن عربی کی کتاب الاسراء اور معراج سے لیے گئے ہیں۔ ابن عربی کی کتاب قصص الاسراء و معراج میں حضرت محمد ﷺ کے ساتھ آسمانوں کی سیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت محمد ﷺ اپنے کمرے سے جب نکلتے ہیں تو دروازے کی کنڈی ہل رہی ہوتی ہے اور وہ سات آسمانوں کی سیر کر کے جب واپس آتے ہیں تو وہ کنڈی اسی طرح ہل رہی ہوتی ہے۔ یعنی بہت مختصر عرصے میں سات آسمانوں کی سیر کر کے آ جاتے ہیں۔ اس میں جبرائیل امین انہیں سارے مناظر دکھاتے ہیں۔ ایک ایک چیز کی تفصیل بتاتے ہیں اور ایک مقام پہ پہنچ کے وہ کہتے

ہیں اس سے آگے جاتے ہوئے میرے پر جلتے ہیں اس طرح وہ آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو نوری نور ہوتا ہے۔ واقعہ معراج کا کتابوں میں ذکر آیا ہے اور احادیث میں ذکر آیا ہے۔

ابن عربی کی یہ کتاب ۱۲۶۴ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئی۔ صرف یہی نہیں ایک اور کتاب بھی ہے جس میں جنت، دوزخ اور برزخ کا ذکر آیا ہے۔ ایک عرب فلاسفر ال ماری نے کتاب لکھی جس کا نام ہے رسالۃ الغفران۔ ''ڈیوینا کومیدیا'' کی اس کتاب کے مندرجات سے بھی کئی جگہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ میکیل آسن کا خیال ہے کہ قصص المعراج کا ترجمہ بونا وینچورا دی سینا (Buonaventura di Sienna) نے عربی سے لاطینی میں کیا۔ دانتے کا استاد اور گرو برونیتو لاطینی (Brunetto Latini) اس کتاب کا ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اس نے ابن عربی کی کتاب قصص الاسراء و معراج کا لاطینی ترجمہ دانتے کو دیا۔ اس طرح دانتے مختلف کتابوں کے ماخذات کی بنا پر نقوش و نگارے کا شاہکار لکھنے میں کامیاب ہوگیا۔''

جب رضا دانتے کے بارے میں اور ''ڈیوینا کومیدیا'' کے بارے میں تفصیل بیان کر چکا تو سالواتورے نے پوچھا ''تم نے یہ ساری معلومات کہاں سے اکٹھی کی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ تمہیں سارا کچھ یاد بھی ہے۔''

رضا بولا ''جہاں تک لٹریچر سے رغبت کی بات ہے بنیادی طور پر یہ میری بیوی کو شوق تھا جس کا اثر مجھ پر بھی ہوا۔ دانتے اور ''ڈیوینا کومیدیا'' کے سلسلے کی تمام جانکاری اسی کی معرفت مجھے حاصل ہوئی۔

اس کے علاوہ محمد ﷺ کے واقعہ معراج کے بارے میں ہر مسلمان جانتا ہے۔ صرف ایک ہی فرقہ ہے جس کو اس سے اختلاف ہے وہ ہے معتزلہ۔'' میں بولا ''یہ جنت، دوزخ اور برزخ کا نظریہ تو اور مذاہب میں بھی ہے۔''

رضا بولا ''اس طرف بھی آتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ابھی کچھ باقی ہے۔''

رضا بولا ''تمہیں پتا ہوگا کہ اسلام کی آمد سے پہلے ایران میں پارسی مذہب کا غلبہ تھا۔ پارسیوں کو یورپین ملکوں میں زرتشتی کہا جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان کے ہاں سات

آسمانوں، جنت، دوزخ اور برزخ کا ذکر ہے۔ اس قصے کا نام ہے "ارداورازنامگ" ہے۔ یہ قصہ واقعہ معراج سے چار سو سال پہلے لکھا گیا۔ ابنِ مسعودی اور ابنِ وارق نے اپنی کتابوں میں اس ایرانی "ڈیوینا کومیدیا" کا ذکر کیا ہے۔"

میں اور سالواتورے، رضا کی شکل دیکھنے لگے۔ جو خود کو میٹریل انجینئر بتاتا تھا اور ادب کے بارے اتنا کچھ جانتا تھا کہ جیسے اس نے میٹریل انجینئرنگ نہیں پڑھی بلکہ ادب میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔

میں نے پوچھا "تو تمہارے خیال میں دانتے کی کتاب "ڈیوینا کومیدیا" میں مختلف کتابوں کا عکس نظر آتا ہے۔"

رضا کہنے لگا "کہہ سکتے ہیں۔"

سالواتورے بولا "تاریخ بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث ہے اس سے استفادہ ہر تخلیق کار کا حق ہے۔ دیکھا یہ جانا چاہیے کہ دانتے نے اپنی تخلیقی قوتوں کے بل پر ایک تخلیق کو کتنے زمانوں کے لیے امر کر دیا ہے۔"

رضا بولا "نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں کہ دانتے کی "ڈیوینا کومیدیا" کی کوئی اہمیت نہیں۔ چودہ ہزار امر اشعار لکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ دانتے کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ وہ اتنا پڑھتا تھا کہ آخری دنوں میں اسے کم دکھائی دینے لگا۔ اس کی نظر کمزور ہوگئی تھی۔ لیکن دانتے کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اس کی یادداشت کے بارے میں کئی قصے مشہور ہیں۔ چند ایک قصے فرانکوساکیتی (Frnco Sachetti) نے بھی لکھے ہیں۔ فرانکوساکیتی اور بوکا چو دونوں دانتے کے بہت بڑے مداح تھے۔"

سالواتورے بولا "لیکن رضا جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے یہ بہت دلچسپ ہے۔ تمہارا مطالعہ بھی لگتا ہے دانتے سے کسی طور کم نہیں۔"

رضا بولا "ایسی بات نہیں ہے۔ بس لٹریچر سے کمٹمنٹ کی بات ہے۔"

رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اب سکیورٹی گارڈز نے ٹیرس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اُٹھانا شروع کر دیا تھا کیونکہ دس بجے لائٹس بجھا دی جاتی تھیں جس کا مطلب ہوتا کہ ہمارے سونے کا وقت ہو گیا ہے لہٰذا ہمیں ہر صورت میں ٹیرس سے اُٹھنا ہوتا۔ رضا کہنے لگا "اس کا مطلب ہے اب

ہمیں سونا ہوگا۔"

میں نے کہا" ہاں انہی کمروں میں جہاں ایک ایک کمرے میں سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ بندے سوتے ہیں۔"

رضا بولا" یہی تو مسئلہ ہے۔"

سالواتورے نے اطالین میں گالی دی اور بولا" یہ بہت گھٹیا ہیں۔" میں ان کے بارے میں ضرور لکھوں گا۔"

ہم یہاں سے اٹھ کے اپنے اپنے کمروں میں چل دیئے۔ رضا اور سالواتورے کا کمرہ دوسری طرف تھا۔ میں نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میں روز کی طرح اپنے کمرے کے سامنے والے ٹیرس میں کھڑا ہوگیا۔ میرے سامنے جو گھروں کے پچھلی طرف کے لان تھے وہ خالی پڑے تھے۔ وہاں بچوں کے کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ گھاس کاٹنے کی مشینیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر گھر کی اپنی اپنی مشین تھی۔ میرے سامنے ایک ہی طرح کے چھ سات گھر تھے۔ رات کے پونے دس بجے بھی اتنی روشنی تھی کہ سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے سکیورٹی گارڈ کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی نیا شخص تھا۔ اس نے مجھ سے مشرف کا نہ پوچھا۔ بس اتنا کہا، ٹیرس سے ہٹ جاؤ۔ سونے کا وقت ہے۔ میں نے اس شخص اور اس کے کتے پہ ایک نظر ڈالی اور آ کر اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ جو دوسری منزل پہ تھا۔ اپنے سرہانے وہ کاغذ رکھ دیا جس کو سوئس لوگ ہاؤس والس کہتے ہیں اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کسی کو این والی ملتی ہے، کسی کو ایف والی ملتی ہے۔ کسی کو سی والی اور جب بی والی مل جائے تو آپ کے سب مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ وہ موٹا گجراتی نوجوان اکثر کہتا کہ جب مجھے "بے" مل جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جرمن زبان میں بی کو بے کہتے ہیں۔ اور میں اس سے ہمیشہ کہتا تمھیں یہاں نہ "بے" ملے گی نہ "بے بے"۔ پنجابی زبان میں "بے" یا "بے بے" ماں کو بھی کہتے ہیں۔ وہ میری اس بات پہ کھی کھی کر کے ہنس دیا کرتا۔ میں لیٹتے ہی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ میں نے پچھلے ہفتے کی صبح سفر شروع کیا تھا۔ جب میں رات کو کرائس لنگن پہنچا تھا تو میں کتنا تھکا ہوا تھا۔ آج مجھے یہاں آئے ہوئے پورا ہفتہ ہو چلا تھا۔ ایسا لگتا تھا مجھے اس ایک ہفتے کو گزارنے میں صدیاں بیت گئی ہیں۔ ہر دن کتنا لمبا لگتا۔ یہاں میں اس مختصر عرصے میں کتنے لوگوں سے مل چکا تھا۔ کئی ملکوں کے لوگ تھے۔ انگولا، سیرالیون، نائیجیریا، تیونس، مراکش، فلسطین، ایران،

جرمنی، اٹلی، کوسوا، کروشیا بے شمار ملکوں کے لوگ تھے۔ کتنی ہی بولیاں اور زبانیں تھیں۔ کل اتوار کی چھٹی تھی۔ کسی قسم کی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ نہ کوئی فٹ بال میچ تھا اور نہ ہی کوئی اور تقریب۔ اتوار کو اکاتھو بھی بند ہوتا ہے۔ میں سوچنے لگا کل کا دن کیسے گزرے گا۔ رضا اور سالواتورے کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے کل کوئی دلچسپ موضوع زیر بحث آجائے اور گفتگو کے دوران وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلے۔ آج مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں کئی چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے بارے میں یہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ نہ ہی مجھے کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتانے کا اشتیاق تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب تک گزری ہوئی میری زندگی فلم کی طرح چلنے لگی۔ میں نے سکول ختم کیا۔ کالج گیا۔ یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد فرنچ زبان سیکھی۔ ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری کی۔ پاکستان کی سیاحت کی۔ چند ایک یورپین ملکوں کی سیاحت کی۔ پھر اٹلی میں رہنے کے بعد یہاں آ گیا۔ مجھے میرے دادا جی کی یاد شدت سے ستانے لگی۔ اُن کی ذات دنیا کی واحد ایسی ہستی تھی جو مجھ سے پیار کرتی تھی۔ ورنہ میری شخصیت سے کسی کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ میرے دادا جی نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ یہ شاید انہی کی تربیت تھی کہ میں یہاں اس ازیل ہائم میں رک گیا تھا۔ میری جگہ میرا کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو وہ کب کا بھاگ گیا ہوتا۔

میں خود پہ حیران ہوتا ہوں کہ میں نے کافی استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں اٹلی میں کام کر چکا تھا۔ میری ٹریننگ ہو چکی تھی۔ اگر میں سیدھا پاکستان سے یہاں آتا تو مجھے کافی دقت پیش آئی ہوتی۔

یہاں میں یادونے چکو چان سے ملا۔ انگولا کے لڑکے سے ملا۔ رضا سے ملا۔ سالواتورے سے ملا۔ رضا نے تو ہم سب کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچنے لگا اگر کل ہماری بیٹھک ہوئی تو میں بوکا چوکا ذکر چھیڑوں گا۔ میں نے بوکا چوکی "ڈیکیمرون" پڑھی ہے۔ شاید وہ اس بارے میں کوئی دلچسپ بات بتائے۔ اگلے دن کا پروگرام بناتے بناتے مجھے نیند آ گئی۔

O

سوموار کو نیائش کام پہ اور میں لائبریری چلا گیا۔ اب مجھے لکھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ میں نے دن میں سات آٹھ گھنٹے لکھنا شروع کر دیا۔ اب تک میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے نو ابواب ثقلین کی نظر سے گزر چکے تھے۔ میرا ارادہ بیس باب لکھنے کا تھا لیکن مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میرے دماغ کا پیالہ آہستہ آہستہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔ میں اپنے ہی لکھے کو جب دوبارہ پڑھتا تو مجھے مزہ آتا۔ اپنے ہی تخلیق کیے ہوئے تجسس کو پڑھ کے مجھے مزہ آنے لگا تھا۔ میں اس تحریر کے اختتام کے بارے سوچنے لگا کہ کیسے ختم کروں گا۔ گزشتہ اتوار ثقلین سے میری بات ہوئی تھی کہ وہ شام کو آئے گا اور اگلا باب لے جائے گا۔ اس نے شرط عائد کی تھی کہ نہ ہی وہ کھانا کھائے گا نہ ہی رکے گا۔ میں نے اس کی یہ شرط مان لی تھی۔ ایسی شرائط وہ کئی دفعہ پہلے بھی عائد کر چکا تھا لیکن میری اور نیائش کی عادت کچھ ایسی تھی کہ ہم اپنے مہمان کو کھانے کے بغیر جانے ہی نہ دیتے تھے۔ بھلے وہ کچھ کھا کے آیا ہو، ہمارا ساتھ دینے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا۔

میں صبح بھی لائبریری گیا تھا اور شام کو بھی۔ گھر آ کے کھانا بنایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ثقلین آئے گا۔ میں اور نیائش کھانا کھا چکے تھے۔۔۔ کافی دیر تک وہ نہیں آیا۔۔۔

اب یہی لگتا تھا کہ وہ نہیں آئے گا۔ لیکن رات کو دس بجے کے قریب وہ آ دھمکا۔ اندر کام پہ ہی کہنے لگا۔ میں اوپر نہیں آؤں گا۔ ہم دونوں نے بہت کہا کہ اوپر آ جاؤ لیکن وہ نہ آیا۔ مجھ سے دسواں

باپ لے کر رخصت ہو گیا۔

OOO

صبح چھ بجے ہمیں اُٹھا دیا گیا۔ سب نے واش روم کی طرف دوڑ لگائی۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کو یہاں رہنا تھا اور کچھ کو اُسی بیرک نما عمارت میں جانا تھا۔ رات باتوں باتوں میں مجھے لسٹ میں اپنا نام دیکھنا یاد ہی نہ رہا کہ مجھے یہاں رُکنا ہے یا رخصت ہونا، یہاں رُکنا ہوتا یا وہاں جانا ہوتا اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہاں ہر کسی کی کوشش ہوتی کہ وہ باتھ استعمال کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جائے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بعد میں باری کا علم نہیں ہوتا تھا کہ کب آئے؟ اگر باری آ بھی جاتی تو باتھ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کراہت کے بغیر استعمال کیا جا سکے۔ میری یہی کوشش ہوتی کہ کم از کم میں دانت صاف کر لوں۔ نیچے تہہ خانے میں جو باتھ تھا اس کا کم ہی لوگوں کو پتا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے جا رہا تھا تو راستے میں مجھے رضا ملا۔ میں نے پوچھا "کدھر جا رہے ہو؟"

بولا "نہانے جا رہا ہوں لیکن کوئی باتھ فارغ نہیں۔ میں صبح پانچ بجے سے اُٹھا ہوا ہوں۔ نہ جانے یہ افریقی باتھ میں کیا کرتے رہتے ہیں۔ سب بہت دیر لگاتے ہیں۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ مجھے یہاں سات دن ہو چکے ہیں۔ یہاں کے سارے چور راستے جان گیا ہوں اور تم تو جانتے ہی ہو کہ جہاں چاہ، وہاں راہ۔"

وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ جب میں اسے تہہ خانے والے باتھ کی طرف لے کر گیا تو وہ بڑا حیران ہوا۔ لیکن باتھ اندر سے بند تھا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ کیونکہ اس باتھ کے بارے میں کوئی پناہ گزین نہیں جانتا تھا کہ یہاں نہانے کا بھی انتظام ہے۔ میں نے کہا "دو ہی باتیں ہیں، یا تو کوئی اندر ہے یا سکیورٹی والوں نے اس کو بند کر دیا ہے۔"

میں نے دروازے کے ہینڈل کو ایک دو دفعہ گھما کے دیکھا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ دروازہ اندر سے یا باہر سے لاک کیا گیا تھا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے رضا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ کھٹک سے دروازہ کھلا۔ اندر سے سالوا تورے نکلا۔ میں نے کہا "تمھیں اس باتھ کا کس نے بتایا؟"

کہنے لگا "میں ناپولی کا ہوں۔ ہم سب سے پہلے وہ چیز ڈھونڈتے ہیں جو کسی کو نہ پتا ہو۔"

میں نے کہا "میں نے ناپولی کے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا آج دیکھ بھی لیا۔"

خیر میں نے رضا سے کہا "پہلے تم نہا لو میں بعد میں نہا لوں گا۔"

رضا نے میرے کہنے پہ عمل کیا اور وہ باتھ میں داخل ہو گیا۔ میں اور سالواتورے باہر کھڑے باتیں کرنے لگے۔ جب رضا نہا کر باہر نکلا تو میں نہانے چلا گیا۔ میں جیسے ہی نہا کر باہر نکلا ہم تینوں نے ڈائیننگ ہال کی راہ لی۔ وہاں پہ ناشتہ پیش کیا جا رہا تھا۔ میں نے ناشتے کی قطار میں کھڑے ہونے سے پہلے لسٹ میں اپنا نام دیکھا۔ اتفاق سے ہم تینوں کا نام ٹرانسفر لسٹ میں موجود تھا۔

میں نے آ کر رضا اور سالواتورے کو خوشخبری سنائی کہ ہم تینوں کا نام ٹرانسفر لسٹ میں ہے۔

وہ ناشتے کی قطار میں کھڑے تھے۔ سالواتورے حسب عادت گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے کہا" تم ہر وقت گالیاں کیوں بکتے رہتے ہو۔"

کہنے لگا" اس سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ہم اٹالین بات دل میں نہیں رکھتے۔ ایک لمحے میں بندے کے کپڑے اتار کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے ہم ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ سو میرا تو یہی وطیرہ ہے۔ مجھے قطار میں بھکاریوں کی طرح کھڑے ہو کر کھانا لینا پسند نہیں اس لیے میں گالیاں دے رہا ہوں۔ لیکن جیسے ہی میرے پیٹ کی آگ بجھ جائے میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔"

رضا بولا" یہ تو اچھی بات ہے۔ اس طرح انسان کے دل پہ کوئی بوجھ نہیں رہتا۔"

ہم لوگ اپنا اپنا ناشتہ لے کر کھانے کی میز پہ آ گئے۔ میں سالواتورے اور رضا ایک ہی میز پہ بیٹھے۔ یہاں گارنیکے ہوٹل میں کھانے کی میز اس بیرک نما عمارت کے ہال کی طرح نہیں تھی جہاں ایک ہی میز پہ بیس بیس بندے بیٹھ کے کھانا کھا سکتے۔ یہاں چار سے چھ بندوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ہم لوگ ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ ناشتے میں ہمیشہ کی طرح وہی سوئس بروڈ، جیم، مکھن کی چھوٹی ٹکیا اور ساتھ وہ چائے جو قہوہ نما تھی۔ مجھے یہ پیلے رنگ کا پانی جسے سوئس لوگ چائے کہتے تھے، بہت ناپسند تھا۔ خیر اس نے تو یہ قہوہ پیا ہی نہیں۔ ناشتہ زہر مار کرنا میرے لیے بہت کٹھن ہوتا۔ ہماری ساتھ والی میز پہ وہ موٹا گجراتی لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کا چچا ایم پی اے رہا تھا اور اس کے ساتھ مقصود تھا۔ مقصود جب سے اس عورت کے ساتھ تفریح منا کے آیا تھا، کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا۔ اسے ایسے لگنے لگا جیسے اسے سرخاب کے پر لگ گئے ہوں۔ مجھے اس کے اس چلن پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہ لیا۔۔۔

ہم لوگ جب ناشتہ کر چکے تو سب نے حسب معمول اپنی اپنی ٹرے لے جا کر کاؤنٹر پہ رکھ

دی۔ سکیورٹی گارڈ نے اونچی آواز میں کہا۔" جو لوگ ناشتہ کر چکے ہیں۔ ان میں سے جن کا نام ٹرانسفر لسٹ میں شامل ہے وہ نیچے پہنچ جائیں۔ اس طرح میں، سالواتورے اور رضا نیچے جا کے اسی ٹویوٹا وین کے پاس کھڑے ہو گئے جس کے ذریعے میں پہلے بھی کئی دفعہ آ جا چکا تھا اور ایک مرتبہ تو اس میں مجھے اس جگہ بٹھایا گیا تھا جو جگہ کتا بٹھانے کے لیے مختص کی گئی تھی۔

جب وین بھر گئی تو ہم تینوں بھی وین میں بیٹھ گئے۔ وین انہی آڑے ترچھے راستوں سے ہوتی ہوئی اس بیرک نما عمارت کے پاس پہنچی۔

آج جون کی ۲۳ تاریخ تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ کسی قسم کی کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ میں نے رات کو سوچا تھا اگر ہم لوگ مل بیٹھے تو آج کا موضوع "بوکاچو" رکھوں گا۔ ایسا ممکن ہے اس حوالے سے رضا یا سالواتورے میری معلومات میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ آج چونکہ آ کا تھو بھی بند تھا۔ صبح صبح میرا کہیں جانے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا، جیسے ہی وین نے ہمیں اُتارا، ہمیشہ کی طرح اس بیرک نما عمارت میں داخل ہونے سے پہلے ہماری تلاشی لی گئی۔ جامہ تلاشی کے بعد ہمیں اندر جانے دیا گیا۔ یہاں کچھ لوگ صفائی کر رہے تھے، کچھ کچن میں مصروف تھے۔ کچھ باغ سے سگریٹ کے جلے اور ادھ جلے ٹکڑے اُٹھا رہے تھے۔ میں، سالواتورے اور رضا اس ہال کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہال کے اندر بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہاں بھی ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ جس کے شیشے بہت گندے تھے۔ شاید کافی عرصے سے صاف نہیں کیے گئے تھے۔ سالواتورے بولا" کل دانتے پہ بڑی اچھی گفتگو رہی۔"

رضا کہنے لگا" جہاں کرنے کو کچھ نہ ہو وہاں کسی نہ کسی موضوع پہ گفتگو کر کے وقت اچھا گزر جاتا ہے۔"

میں نے کہا" آج کا موضوع کیا ہونا چاہیے؟"

یہ بالکل طرح مصرعہ کی طرح تھا۔ کوئی بندا شعر شروع کرے اور باقی اس کی تائید کرتے ہوئے اس سلسلے کو آگے لے کر چلیں۔

رضا بولا" کوئی بھی ہو۔"

سالواتورے بولا" رضا تم نے "بوکاچو" کو پڑھا ہے۔"

میں نے کہا" میں رات کو سوچ ہی رہا تھا کہ کل ہم لوگ "بوکاچو" پہ بات کریں گے۔

سالواتورے نے مسئلہ حل کر دیا۔"

رضا بولا "تم لوگوں نے "ڈیکیمرون" پڑھی ہے۔"

میں نے اور سالواتورے نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں۔"

رضا بولا "پہلے کس چیز پہ بات کریں، بوکاچو کے حالات زندگی پہ یا اس کی لکھی ہوئی کتابوں پہ۔"

میں نے کہا "میں تو صرف "ڈیکیمرون" کے بارے میں ہی جانتا ہوں۔ وہ میں نے پڑھی ہے۔ اس کی دیگر کتابوں کے بارے میں نہیں جانتا۔"

سالواتورے بولا "ہم اطالین لوگ دانتے اور بوکاچو کے بارے میں اتنا شوق سے نہیں پڑھتے کیونکہ ان کی کتابیں ہمارے تعلیمی نصاب کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں اتنا کچھ اتنے تواتر سے سنتے ہیں کہ ہمیں ان سے چڑ ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات درست ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہے لیکن کسی ملک کی قدیم تہذیبی روایات سے آگہی کے لیے اس ملک کے لٹریچر کا مطالعہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

رضا بولا "جیسے فردوسی، رومی، جامی اور سعدی کے بغیر نہ تو ہمارا ادب مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخ لیکن طلبا بھی بھی ان کا ذکر تسلسل سے سن کے اکتا جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "بوکاچو کے حالات زندگی سے شروع کرتے ہیں۔"

سالواتورے بولا "رضا تم بتاؤ۔ کہیں کوئی غلطی ہوئی تو میں تصحیح کر دوں گا لیکن خیال رہے غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔" رضا بولا "اٹلی کا یہ مشہور افسانہ نگار جس کا پورا نام جووانی بوکاچو (Giovanni Boccaccio) تھا۔ اٹلی کے مشہور ریجن تسکانہ (Toscana) میں پیدا ہوا۔ ویسے تو یورپین اٹلی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یورپ کا دل اٹلی ہے۔ اٹلی کا دل تسکانہ ہے۔ تسکانہ کا دل فلورنس ہے۔ فلورنس کے پاس ایک علاقہ ہے چیر تالدو (Certaldo) جووانی بوکاچو ۱۳۱۳ میں یہاں پیدا ہوا۔ کون سے دن یا مہینے میں پیدا ہوا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں سالواتورے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

سولواتورے بولا "جب تم غلطی کرو گے تو میں تمہیں بتا دوں گا۔ ویسے کسی کو بھی کلاسک ادیبوں اور شاعروں کی صحیح تاریخ پیدائش یاد نہیں ہوتی۔ خیر تم آگے بتاؤ۔"

''بوکا چو نے زندگی کے ابتدائی ایام فلورنس میں گزارے کیونکہ اس کا باپ اس وقت کی مشہور بینکنگ کمپنی کمپانیہ دی باردی (campagnian di bardi) کے لیے کام کرتا تھا۔ بوکا چو نے ابتدائی تعلیم جووانی مازولی (giovanni mazzoli) سے حاصل کی۔ جس نے اس کو دانتے سے متعارف کروایا۔ چونکہ بوکا چو امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اسے اس وقت کے بہترین اُستاد میسر آئے۔ بوکا چو کا باپ جس بینک کے لیے کام کرتا تھا انہوں نے اس کی ٹرانسفر ناپولی (نیپلز) کر دی۔ اس طرح بوکا چو بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ ناپولی چلا گیا۔''

سالواتورے نے دخل اندازی کی۔۔۔'' آج ناپولی کی حالت دیکھو، وہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔''

رضا نے اپنی گفتگو جاری رکھی'' اُس زمانے میں ناپولی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ خیر بوکا چو کے باپ نے اس کو بینک میں نوکری دلوائی لیکن اس نے اس کام میں بالکل دلچسپی نہ لی۔''

میں بولا'' ظاہر ہے اگر بینک میں دلچسپی لیتا تو ڈیکیمرون کیسے لکھتا۔''

رضا بولا'' ظاہر ہے، انسان کو جس چیز میں دلچسپی ہو اس کے آثار شروع ہی نظر آ جاتے ہیں۔ بوکا چو کا باپ چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس میں پیسہ ہو۔ جیسے ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے۔ جب اس نے بینک میں دلچسپی نہ لی تو اس نے اس کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاء کالج میں داخل کروا دیا۔ اس وقت ناپولی میں قانون کی تعلیم کے لیے سٹوڈیم (studiam) سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ چھ سال تک بوکا چو قانون کی تعلیم حاصل کرتا رہا لیکن وہاں رہتے ہوئے اس نے زیادہ دلچسپی سائنس اور ادب میں لی۔ ناپولی میں قیام کے دوران بوکا چو کے باپ نے اس کا تعارف ناپولی کے ایک ایسے امیر شخص سے کروایا جس کا فرانس کی حکومت میں خاصا اثر و رسوخ تھا۔ اس وقت ناپولی کا بادشاہ رابرٹ تھا، جسے تاریخی حوالوں میں رابرٹ دی وائز (robert the wise) کے نام جانا جاتا ہے۔ یہاں ناپولی کے شاہی محل میں وہ کنگ رابرٹ کی شادی شدہ بیٹی کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔

اس دوران بوکا چو کی شناسائی پاؤلو دی پیروجا (paolo di perugia) سے ہو گئی۔ وہ پرانی دیومالائی کہانیوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ ناپولی میں بوکا چو بہت سی علمی و ادبی شخصیتوں سے متعارف ہوا۔ ناپولی میں قیام کے دوران بوکا چو نے دو شعری مجموعے فیلوستر ادو (filostrado) اور تسیدا

(Taseada) تخلیق کیے۔ اس کے ان دو شعری مجموعوں سے متاثر ہو کر انگلینڈ کے شاعر جوفرے چوسر (Goeffery Chaucer) نے اپنی مشہور زمانہ طویل نظم لکھی۔ اس کے بعد بوکاچو نے نثری فن پارہ فیلوکولو (filocolo) تخلیق کیا، جو کہ ایک فرانسیسی کہانی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

بعض سیاسی وجوہات کی بنا پر بوکاچو نے ناپولی چھوڑ دیا اور واپس فلورنس آ گیا۔ بوکاچو، پترارکا (Petrarca) کا بہت بڑا مداح تھا۔ جب اس نے ناپولی چھوڑا تو ان دنوں پترارکا ناپولی آیا ہوا تھا لیکن بوکاچو کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جب بوکاچو فلورنس واپس آیا تو ان دنوں فلورنس سیاسی ابتری کا شکار تھا۔ بوکاچو مختلف موضوعات پر لکھتا رہا۔ ۱۳۴۷ء کے اوائل میں پورے یورپ کو پلیگ نے گھیر لیا۔ اس کا اثر فلورنس پر بھی ہوا۔ قریباً ایک تہائی آبادی طاعون کی نذر ہو گئی۔ ان دنوں بوکاچو نے کچھ وقت راوینا (ravenna) میں گزارا۔ بوکاچو دوبارہ فلورنس واپس آیا اور اس نے ڈیکیمرون پہ کام شروع کیا۔ تین سال کے عرصے میں اس نے اپنی یہ کتاب مکمل کی۔ بوکاچو جب فلورنس واپس آیا تو اس کی ملاقات پترارکا سے ہوئی۔ پترارکا سے اس کی ملاقات بہت تعمیری ثابت ہوئی۔ اس کے لکھنے کے انداز میں تبدیلی آئی۔ اس دوران اس نے کئی ادبی فن پارے تخلیق کیے۔ آخرکار ۱۳۷۵ء میں تریسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی باقیات کو اس کی خواہش کے مطابق جلا دیا گیا۔ بوکاچو نے اپنی زندگی میں کئی لڑکیوں سے تعلقات استوار کیے لیکن شادی نہ کی۔ ان تعلقات سے اس کے تین بچے پیدا ہوئے۔''

سالواتورے نے آفرین کہتے ہوئے کہا ''بہت خوب، رضا تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔''

رضا بولا ''ابھی تو میں نے بہت سی ذیلی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ بتاتا تو تم دونوں اکتا جاتے۔''

میں نے کہا ''میں نے بھی ڈیکیمرون پڑھی ہے اور سالواتورے نے بھی۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کو پڑھ کے سالواتورے کے دماغ میں کیا خیال آیا لیکن جب میں نے ڈیکیمرون پڑھی تو میرا دھیان ایک دم قصہ چہار درویش کی طرف گیا۔ اس قصے میں چار درویش ایک دوسرے کو اپنی داستان سناتے ہیں۔ اس میں ہر درویش جب اپنی کہانی سناتا ہے تو اس کی کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے۔ ڈیکیمرون کے کردار بھی اسی انداز سے ایک جگہ بیٹھ کے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سناتے

ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ چار ہوتے ہیں جبکہ ڈیکیمرون کے اساسی کرداروں کی تعداد دس ہے۔ سات لڑکیاں اور تین لڑکے۔''

سالواتورے بولا'' بوکاچو نے اس کہانی میں سات لڑکیاں اور تین لڑکوں کے کردار علامتی انداز میں پیش کیے ہیں۔''

رضا بولا'' مطلب۔''

سالواتورے بولا'' ڈیکیمرون کے دس کردار اصل میں دس مختلف انسانی خصائل یعنی غصہ، شہوت، یقین، اُمید، برداشت، پیار، کینہ، انصاف، تکبر، اور طاقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

رضا بولا'' بہت خوب، جیسا کہ فرشتہ نے کہا ڈیکیمرون پڑھنے کے بعد اس کا دماغ ایک دم قصہ چہار درویش کی طرف چلا گیا، لیکن جب میں نے پہلی دفعہ ڈیکیمرون میں بوکاچو نے اس کتاب میں دس کردار رکھے ہر کردار روز ایک ایک کہانی سناتا ہے۔ دس دنوں میں یہ لوگ سو کہانیاں سناتے ہیں۔ ڈیکیمرون مجھے بالکل ہزار داستان کی طرح لگی۔ میں اس کی تحقیق میں لگ گیا۔ میری بیوی کا تھیسس بھی یہی تھا۔ میں اس کی مدد کیا کرتا۔ اس دوران میں نے کئی نئی چیزیں دریافت کیں۔''

سالواتورے متجسس انداز میں بولا'' کیا دریافت کیا۔ کچھ پتہ بھی تو چلے؟''

میں نے کہا'' ویسے میں ایک بات کا اضافہ کردوں۔ میں نے جس قصہ چہار درویش کا ذکر کیا ہے وہ میر امن دہلوی نے انگریز پروفیسر آرنلڈ کے کہنے پہ فارسی زبان کے ایک قصے، قصہ چہار درویش کو اُردو میں باغ و بہار کے نام سے لکھا۔''

رضا بولا'' یہی میں سوچ رہا تھا کہ قصہ چہار درویش تو فارسی کی کتاب ہے۔ جس میں خواجہ سگ پرست کی کہانی بھی ہے۔''

میں بولا'' بالکل یہی ہے۔ اس میں کہانی سے کہانی نکلتی ہے۔''

سالواتورے بولا'' ایسا عین ممکن ہے بوکاچو نے کسی فارسی کتاب کا لاطینی میں ترجمہ پڑھا ہو اور اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے ڈیکیمرون کو اس طرح کے نمونے میں ڈھالا ہو۔''

رضا بولا'' فارسی میں نہیں بلکہ عربی میں کیونکہ ان دنوں اٹلی کے ایک جزیرے سسلی میں سلطنت عثمانیہ کی عملداری قائم تھی۔ اس زمانے میں مسلمان علم و ادب میں عروج پہ تھے۔ عربی سکالرز صرف عربی میں بلکہ لاطینی اور ہسپانوی میں بھی لکھا کرتے۔''

سالواتورے بولا "میں نے کہیں پڑھا ہے کہ سسلی میں بہت سے مسلمان شعرا گزرے ہیں۔"

رضا بولا "تم نے بالکل ٹھیک پڑھا ہے۔ اب آتے ہیں ڈیکیمرون کی طرف۔ ڈیکیمرون، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈیکا۔ ڈیکا یونانی زبان میں دس کو کہتے ہیں۔ اس کہانی کے دس کردار ہیں۔ ہر کردار روز ایک کہانی سناتا ہے۔ اس طرح ایک دن میں دس کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ دس دنوں میں سو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ یہ دس لوگ فلورنس کے پاس ایک جگہ ہے فیسولے وہاں رہتے ہیں۔ یہ دس کے دس پلیگ سے بچنے کے لیے یہاں آ کر پناہ لیتے ہیں اور وقت گزارنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

میں بولا "جیسے ہم لوگوں نے وقت گزارنے کے لیے ہال کے اس کونے میں پناہ لے رکھی ہے۔"

رضا بولا "انسان وقت گزارنے کے لیے کئی طریقے ڈھونڈتا ہے۔ بوکاچو نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اس کا نام ڈیکیمرون رکھا لیکن ساتھ ساتھ اس کا نام پرنس گالیوتی (prince galleotti) بھی رکھا۔ ان دنوں کتاب کے دو عنوان رکھنے کا رواج عام تھا۔ ڈیکیمرون کی کہانیوں کی شہرت کا یہ حال تھا کہ اس کی کئی کہانیاں جوفرے چوسر کی کینٹ بری ٹیلز میں پائی جاتی ہیں۔"

سالواتورے بولا "یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ دانتے کی "ڈیوینا کومیدیا" کے ڈانڈے بھی عربی یا فارسی لٹریچر سے ملتے ہیں اور بوکاچو کی ڈیکیمرون کے بھی۔"

رضا بولا "اس کی تفصیل تھوڑی لمبی ہے۔"

میں بولا "اس کا مطلب ہے عربی سے پہلے کوئی کہانی تھی جس کا اثر بوکاچو نے لیا، شاید فارسی سے۔"

رضا بولا "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بوکاچو کی نظر سے عربی کی ترجمہ شدہ کتاب گزرنے کا امکان ہو سکتا ہے لیکن میں تحقیقی حوالے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بوکاچو کی ڈیکیمرون کا سلسلہ سنسکرت سے ملتا ہے۔"

سالواتورے بولا "یہ کس کی تحقیق ہے۔"

رضا بولا:

"آئرلینڈ کے اطالین زبان کے پروفیسر ڈبلیو۔ ایچ۔ میک ولیم (W.H.Mc.William) نے جووانی بوکاچو کی کتاب ڈیکیمرون کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کئی لوگوں نے ڈیکیمرون کا ترجمہ کیا لیکن میک ولیم نے اس کے ترجمے کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی کی۔ اس کی ترجمہ شدہ کتاب عام فہم ہے اور جامع بھی۔"

سالواتورے بولا "ڈیکیمرون کے مرکزی خیال یا یوں کہنا چاہیے کہ جس نمونے پہ لکھی گئی اس کی بات ہو رہی تھی۔ بقول تمہارے سنسکرت کی کسی کتاب سے اس کا نمونہ یا خاکہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس بارے میں بات ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں میرے لیے یہ بہت دلچسپ بات ہوگی۔"

میں نے کہا "میرے لیے بھی۔"

رضا بولا "تم لوگوں نے پنچ تنتر کا نام سنا ہے۔ یہ کتاب ۵۰۰ عیسوی میں سنسکرت میں لکھی گئی۔ پنچ تنتر کا پہلا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اس وقت کی فارسی زبان کو پرانی فارسی کہتے ہیں کیونکہ اس وقت اس کا نام پژندہ تھا پھر پہلوی ہوا اور آج یہ فارسی کے نام جانی جاتی ہے۔ پرانی فارسی سے پنچ تنتر کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ عربی سے عبرانی اور عبرانی سے لاطینی میں۔ بوکاچو نے پنچ تنتر کا ۱۰۰ لاطینی ترجمہ پڑھا اور اس ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے ڈیکیمرون لکھی۔"

میں بولا "یہ پنچ تنتر کیا ہے۔"

رضا بولا "میک ولیم نے لکھا ہے کہ پنچ تنتر (۵۰۰) سو عیسوی میں لکھی گئی لیکن جن لوگوں نے پنچ تنتر کے بارے میں گہرائی سے تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں یہ کتاب جو کہ نظم اور نثر کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے ۳۰۰ عیسوی میں لکھی گئی۔ اس کے بعد اس کو کئی بار لکھا گیا۔ اس کا آخری اور مکمل نسخہ ۵۰۰ عیسوی میں لکھا گیا۔ اس کے بعد اس کا پہلوی میں ترجمہ برزویہ نے ۵۷۰ عیسوی میں کیا۔ پھر اس کا ترجمہ شامی زبان میں کلیلگ ودمنگ کے نام سے ہوا۔ پھر فارسی زبان کے ایک فلاسفر عبداللہ ابن المقفع، جو کہ عربی کا بھی عالم تھا، نے ۷۵۰ عیسوی میں اس کا عربی ترجمہ کیا۔ اس نے اس کا نام کلیلہ ودمنہ رکھا۔ اس کا پہلوی میں تو ترجمہ ہو ہی چکا تھا لیکن پہلوی وقت کے ساتھ ساتھ جب فارسی بنی تو اس میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ اس کا جدید فارسی میں ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کا نام کلیلہ ودمنہ ہی رکھا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو انوار سہیلی کے نام سے بھی جانا جانے لگا۔"

میں بولا ''اور اس کے بعد؟''

رضا بولا ''پہلے میں اپنی بات مکمل کر لوں پھر کوئی سوال کرنا۔ پنچ تانتر۔ پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پنچ یعنی پانچ۔ اس میں وشنو شرما، پہلی کہانی شروع کرتا ہے۔ اس کا نام مترا بھید رکھتا ہے۔ اس میں جانوروں کی کہانیاں ہیں اور ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے۔ پنچ تانتر کی کئی کہانیاں سدھارتھ گوتم بدھ کی جاتکاؤں میں بھی پائی جاتی ہیں۔''

سالوا تورے بولا ''تم نے بتایا تھا کہ اس کا پہلا ترجمہ پہلوی میں ہوا۔ بقول تمہارے بورزویا نے اس کا ترجمہ کیا لیکن بورزویا تک یہ کتاب کیسے پہنچی؟''

رضا بولا '' یہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ فردوسی اپنے شاہ نامہ میں لکھتا ہے کہ ساسانی دور حکومت میں ایران کا بادشاہ خسرو اول تھا۔ اس کا شاہی حکیم اپنے بادشاہ سے اجازت لے کر انڈیا جاتا ہے اور اپنے سفر کی وجہ یہ بتاتا کہ وہاں کے پہاڑی علاقوں میں ایک ایسی بوٹی ہے جس کے استعمال سے یا پانی میں گھول کے پلانے سے مردہ دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے شاہی حکیم کو سفر کی اجازت دے دیتا ہے۔

بورزویا جب انڈیا پہنچتا ہے تو اس طرح کی کوئی بوٹی نہیں ملتی جس سے مردہ دوبارہ زندہ ہو جائے۔ بہت سے پنڈتوں اور گیانیوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتا ہے کہ علم زندگی ہے اور بغیر علم کے انسان مردہ جسم کی طرح ہے۔ یعنی علم وہ بوٹی ہے جو مرے ہوئے انسان کو زندہ کر دیتی ہے۔ یہاں اس کو پنچ تانتر کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ وہ مختلف پنڈتوں کی مدد سے پنچ تانتر کو پڑھتا ہے اور اس کا ترجمہ کرتا ہے۔''

میں بولا '' یہ تو ہو گیا پہلوی میں ترجمہ۔ جس کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ اب یہ فرمائیے کہ عربی میں اس کا ترجمہ کیسے ہوا۔''

رضا بولا ''بورزویا کا ترجمہ تو کہیں غائب ہو گیا لیکن بورزویا کی کتاب کا ترجمہ شامی زبان میں ہو چکا تھا۔ اس لیے ابن المقفا نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں ۷۵۰ء میں کیا۔ اس کا نام کلیلہ و دمنہ رکھا۔''

سالوا تورے بولا ''لیکن یہ عربی ترجمہ لاطینی تک کیسے پہنچا۔''

رضا بولا ''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ عربی سے اس کا ترجمہ دوبارہ شامی زبان میں ہوا۔ پھر اس کا ترجمہ یونانی زبان میں ہوا۔ عبدل مالی نصر اللہ منشی نے اس کا جدید فارسی میں ترجمہ ۱۱۲۱ء میں

گیا۔ پھر اس کا ترجمہ ہسپانوی زبان میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کاتالان (Catalan) زبان میں ۱۲۵۲ء میں ہوا۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک یہودی رابی جوئیل نے اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں کیا۔ جس کی بنا پر اس کتاب کا تعارف یورپ میں ہوا۔ عبرانی زبان سے اطالین سکالر جواوانی دی کوپوا (Givoanni di copova) نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ جووانی بوکاچو نے جووانی دی کوپوا کا لاطینی ترجمہ پڑھا اور اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈیکیمرون لکھی۔"

میں نے کہا "ذرا یہ تو بتایئے رضا کہ قصہ چہار درویش کیا ہے؟"

رضا بولا "اس کا قصہ یوں ہے کہ امیر خسرو کے استاد اور صوفی بزرگ شیخ نظام الدین اولیاء بیمار پڑ گئے۔ امیر خسرو نے ان کا دل بہلانے کے لیے ہزار داستان جسے الف لیلہ کا نام بھی دیا جاتا ہے کے انداز میں کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ اس کا نام فارسی میں ہزار و یک شب رکھا۔ یعنی ایک ہزار ایک راتیں۔ امیر خسرو کی کہانیاں سن کر شیخ نظام الدین اولیا کی طبیعت بحال ہو گئی۔ انہوں نے دعا کی کہ کوئی بھی یہ کہانیاں پڑھے یا سنے تو اس کی بیماری جاتی رہے۔ ان کہانیوں کا اصل خالق امیر خسرو تھا۔ اس نے ان کہانیوں کا نام "قصہ چہار درویش رکھا تھا۔ فارسی زبان کے اس قصے کو کسی گمنام ادیب نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ بعد میں جب انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو وہاں پروفیسر گلکرسٹ نے میر امن دہلوی سے درخواست کی کہ اس قصے کا اردو ترجمہ کرے۔ میر امن دہلوی نے اس کتاب کا فارسی سے آسان اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام باغ و بہار رکھا۔ وہ جو تم نے کہا تھا کہ اس کو پروفیسر آرنلڈ کے کہنے پر دوبارہ لکھا گیا تھا میں اسے تسامح سمجھتا ہوں۔ میں اپنے تئیں بہت شرمندہ ہوا۔ میں اپنی یادداشت سے کچھ کہا سکتا تھا لیکن جو تفصیل رضا نے بتائی تھی اس کو چیلنج ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سالواتورے بولا "تو اس کتاب کا نام ہزار و یک شب یا ہزار داستان رکھے جانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

رضا بولا" کہتے ہیں کہ مسعودی نے پہلی دفعہ الف لیلٰی کے نام سے یہ کتاب ۹۵۶ میں لکھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے ابن الندیم نے یہ کتاب ۹۸۷ میں لکھی۔ اس کہانی کا سیاق وسباق یہ ہے کہ فارس کا ایک بادشاہ شہریار اپنی کسی بیوی پہ بھی اعتبار نہیں کرتا۔ وہ شادی کے دوسرے دن اپنی بیوی کو اپنے محل سے اس بنا پر نکال دیتا ہے کیونکہ اسے شک گزرتا ہے کہ اس کی بیوی کنواری نہیں تھی۔ شہریار کا وزیر بھی بہت پریشان ہوتا ہے کیونکہ اسے کوئی بھی ایسی لڑکی نہیں ملتی جو بادشاہ کے معیارات

کے مطابق کنواری ہو۔ ہوتی تو وہ کنواری ہیں لیکن بادشاہ ان سے مطمئن نہیں ہوتا۔ نتیجتاً کوئی بھی ملکہ ایک شب سے زیادہ محل میں نہیں رہ پاتی۔ وزیر کی بیٹی شہرزاد اپنے باپ کو پریشان دیکھ کر کہتی ہے کہ شہریار سے میں شادی کروں گی۔ پہلے تو وزیر نہیں مانتا لیکن آخر کار وہ مان جاتا ہے۔ شہریار کی شادی شہرزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہرزاد سہاگ کی پہلی رات شہریار کو کہانی سناتی ہے اور اس کا انجام نہیں سناتی۔ وہ نہایت فراست سے کہانی کا انجام اگلے دن تک ٹال دیتی ہے۔ شہریار کہانی کا اختتام سننے کے لیے اس کو محل سے نکالنے کا ارادہ اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ روز کہانی ہزار ایک کہانیاں سناتی ہے۔ اس دوران شہریار کو شہرزاد سے پیار ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کے خوابوں کی ملکہ قرار پاجاتی ہے۔"

سالواتورے بولا" لیکن اس کا ڈیکیمرون سے کیا تعلق ہے۔"

رضا بولا" کیونکہ بوکاچو نے دس لوگوں سے روز ایک ایک کہانی سنوائی ہے اور دس دنوں میں سو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ اب تک میں نے جتنی بھی گفتگو کی ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ بوکاچو نے ان کہانیاں کا ترجمہ کیا ہے یا ان کہانیوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ میری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ پنچ تنتر، قصہ چہار درویش، کلیلہ و دمنہ، باغ و بہار اور ڈیکیمرون سب میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ اور کہانی سے کہانی نکلتی ہے۔ ڈیکیمرون میں بھی ہر روز نیا موضوع دیا جاتا ہے اس کے مطابق کہانی سنائی جاتی ہے۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا اس میں دس کردار استعارے کے طور پہ پیش کیے گئے ہیں اور دس انسانی خصائل تکبر، انصاف، حماقت، یقین، اُمید، پیار، کینہ، غصہ، شہوت اور برداشت کو موضوع رکھا گیا ہے۔ ہر روز ایک موضوع ہوتا ہے۔ بوکاچو نے پرانی کہانیوں کی پیشکش کے نمونے کو بنیاد بناتے ہوئے اُسی سٹائل میں ڈیکیمرون لکھی ہے اور یہ اطالوی ادب کا نادر نمونہ ہے۔ اگر بوکاچو" کمپانیا ناردی" میں بینکر بن جاتا یا وہ باپ کی خواہش کے مطابق وکیل بن جاتا تو آج ہم تین لوگ صدیوں بعد اس کے بارے میں بات نہ کر رہے ہوتے بلکہ بوکاچو کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔ وہ ادیب بنا۔ اس نے مطالعہ کیا، کتابیں لکھیں اور سب سے بڑھ کے ڈیکیمرون لکھی۔ اور اطالوی ادب پہ بہت بڑا احسان کیا۔ اس لیے آج ہم اسے یاد کر رہے ہیں۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے لوگ اسے یاد کرتے رہیں گے۔"

سالواتورے رضا کی تعریف کرتے ہوئے بولا" جتنا علم بوکاچو کے بارے میں تمہیں ہے

رضا۔۔۔اتنا علم تو کسی اطالین پروفیسر کو بھی نہیں ہوگا۔"

رضا بولا" میں ایسا صاحب علم آدمی نہیں ہوں۔۔۔یہ تو بس ادبی تحقیق سے لگاؤ کی بات ہے۔البتہ تم اگر میری بیوی سے ملو تو پریشان ہو جاؤ کیونکہ شیکسپیئر کی بابت اس کا تحقیقی علم یہ بتاتا ہے کہ شیکسپیئر نے کوئی بھی ڈرامہ خود نہیں لکھا۔"

میں نے اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں ہم اپنے موضوع سے ہٹ نہ جائیں، کہا" فی الحال تو ہم بوکاچو کی بات کر رہے ہیں۔"

رضا مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا" فرشتہ تمہیں ڈیکیمرون میں کیا پسند آیا؟"

میں نے کہا" مجھے اس کی کئی کہانیاں پسند آئیں، لیکن اس کی ایک دو کہانیوں میں تین کردار بہت پسند آئے۔بفلما کو، کلاندرینو اور برونو (bifalmacho, calanderino, bruno)۔اس کے علاوہ کئی کہانیاں بہت دلچسپ ہیں۔جن میں تاریخی حوالے ہیں۔"

سالوا تورے بولا" اس نے جو دس کردار چنے ہیں پامپینیا، فیامیتا، فیلومینا، ایمیلیا، لاؤریتا، نے فلے، ایلیزا، پانفیلو، فیلوستراتو، دیونیو Pampina(the flourishing one), Fiammetta (small flame), Filomena (faithful in love), Emilia (rival), Lauretta (wise, crowned with laurels), Neifile (cloudy), and Elissa (God is my vow).

Panfilo (completely in love), Filostrato (overcome by love), and (Dioneo (lustful).

یہ دس کے دس کردار بھی علامتی یا استعاراتی انداز میں ہیں۔صرف فیامیتا اس کی محبوبہ تھی۔ اس نے اپنی کتاب فولوکولو میں فیامیتا کا بہت ذکر کیا ہے۔بلکہ وہ کتاب اس کے بارے میں لکھی ہے۔"

رضا بولا" یہ تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دس افسانوں کے نام دیتے ہوئے انسان کے دس خصائل کو موضوع بنا کر بوکاچو نے بہت اچھی ادبی کاوش کی ہے۔ڈیکیمرون کی کہانیوں کا محور صرف اٹلی نہیں بلکہ اس میں چین، فرانس، ترکی، مصر، انگلستان اور یونان بھی ہے۔اس نے سو کہانیاں خود تخلیق کی ہیں۔اس میں کوئی بھی کہانی نچ تانتر سے نہیں لی گئی۔یہ الگ بات ہے کہ اس کا بوکاچو نے خود اعتراف کی ہے کہ اس نے ڈیکیمرون میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ان میں سے بیشتر اس نے سن رکھی تھیں لیکن ان میں ادبی چاشنی نہیں تھی۔نہ ہی یہ کہانیاں کسی کتابی صورت میں تھیں یا یوں کہنا

چاہیے کہ لکھی ہوئی صورت میں تھیں۔ میرے خیال بوکاچو نے ڈیکیمرون لکھ کر اطالوی ادب پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس طرح ہم آج سے سات سو سال پہلے کے اٹلی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ اُس دور کی سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت کو جان سکتے ہیں۔"

رضا کے یہ جملے سن کے سالواتورے کے چہرے پہ تھوڑی سی رونق آ گئی۔ کیونکہ رضا کافی دیر سے ڈیکیمرون کے ڈانڈے قدیم ادب سے ملا رہا تھا۔ ہم لوگ باتوں میں اتنے محو تھے کہ ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ جب میں نے مڑ کے دیکھا تو ان افراد میں سے جو لوگ کچن میں کام کرتے تھے۔ دو افراد ہماری گفتگو کی طرف متوجہ تھے۔ ان دو افراد میں سے ایک لڑکی اطالین تھی، جس کے ماں باپ کئی سال پہلے سوئس آ گئے تھے اور یہ محترمہ یہیں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ انگریزی سمجھتی تھی۔ دانتے اور بوکاچو کو بھی جانتی تھی۔ رضا کی گفتگو تمام ہونے پر اُس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ وہ تمام مکالمہ بہت توجہ سے سن رہی تھی۔۔۔ رضا سے کہا "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی ایرانی اور پاکستانی اس ازیل ہائم میں دانتے اور بوکاچو پہ بات کریں گے اور جو کچھ رضا نے بتایا یہ اتنا مفید ہے کہ اگر رضا کتاب لکھے تو ہاتھوں ہاتھ بکے۔"

رضا بولا "یہ کام مجھ سے پہلے میک ولیم کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، وکٹر برانکا (Victor Branca)، جورج بل (George Bull) اور مارک موسیٰ (Mark Musa) نے اپنی ساری زندگی اسی کام میں گزار دی۔ میک ولیم کا ابھی پچھلے سال جنوری ہی میں انتقال ہوا ہے۔"

وہ لڑکی بولی "اصل میں، میں یہ کہنے آئی تھی کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے، پلیز میزیں وغیرہ لگا دیں۔۔۔"

ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ ہم لوگ تین گھنٹے سے باتیں کر رہے ہیں۔

رضا بولا "اب پھر گداگروں کی طرح قطار میں کھڑے ہو کے کھانا لینا پڑے گا۔ میری تو عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ایک دو دن ایسا محسوس ہوگا پھر عادت بن جائے گی۔ شروع شروع میں مجھے بھی بہت برا لگتا تھا لیکن اب عجیب نہیں لگتا۔ اب یہاں بھوکے تو نہیں رہ سکتے نا۔"

سالواتورے بولا "یہ تم ہے۔ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ اگر کوئی اطالین کھانا دیا گیا تو میں دو دفعہ کھاؤں گا۔"

میں بولا "ہاں کھانا دو دفعہ مل سکتا ہے اگر بچ جائے تو۔"
سالواتورے بولا "تم مجھے نہیں جانتے۔ میں پڑھا لکھا ضرور ہوں۔ جرنلسٹ بھی ہوں لیکن میری اندر سے ناپولی کی عادات نہیں جاسکتیں۔"
جب ہم لوگ تمام میزیں لگا چکے، بیٹھنے والے لمبے لمبے بنچز بھی رکھ دیے۔ پھر قطار میں کھانا لینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم تینوں ایک ساتھ ہی کھڑے تھے۔ وہ لڑکی جو ہماری باتیں سن رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر خوش نہیں تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس سارے کھیل کا حصہ تھا۔
اتفاق کی بات ہے کہ کھانے میں پاستہ (Pasta) تھا۔ میں نے سالواتورے سے کہا
"آج اگر خدا سے کچھ اور بھی مانگتے تو مل جاتا۔"
رضا بولا "یہ سزا بہت سخت ہے۔"
میں نے کہا "ابھی تو بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ انٹرویو، فنگر پرنٹس، خون اور پیشاب کا ٹیسٹ، ایڈز اور ہیپاٹائٹس سی اور بی کا ٹیسٹ اس کے بعد کہیں جا کے جان چھوٹے گی۔"
سالواتورے بولا "اگر کسی کو ایڈز ہو تو کیا کرتے ہیں۔"
میں بولا "میرا خیال ہے اسے یہیں رکھ لیتے ہیں۔"
سالواتورے نے اٹالین میں گالی دی۔
کھانا کھا چکے تو میں اسی انتظار میں تھا کہ سالواتورے کوئی کرتب دکھائے گا لیکن اس نے کچھ نہ کیا۔ میں نے پوچھا "تم کچھ کرنے والے تھے۔"
کہنے لگا "یہ کھانا اتنا ثقیل تھا کہ طبیعت بوجھل ہو گئی ہے۔۔۔ اب بس کہیں سے کافی مل جائے تو مزا آ جائے۔"
میں نے کہا "یہاں تو قہوہ ملتا ہے۔"
سالواتورے نے عجیب سا منہ بنایا۔ میں نے اور رضا نے کھانے کے بعد قہوہ پی لیا لیکن سالواتورے کا مزاج تھوڑا بگڑ گیا۔ میں نے کہا "یہاں سیلکٹا (Selecta) کی وینڈنگ مشین لگی ہوئی ہے۔ اس میں سکے ڈالو اور کافی پی لو۔"
کہنے لگا "یار یہ بھی کافی ہوتی ہے۔ دنیا کی سب سے گھٹیا کافی اس مشین سے دستیاب ہے۔"

میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کچن میں چلا گیا۔ اُس لڑکی جس کے دل میں ہمارے لیے نرم گوشہ تھا، میں نے اس سے آہستگی سے کہا "ہمارا دوست کافی کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اگر ایک کپ کافی مل جائے تو مزہ آ جائے۔"

وہ کہنے لگی "میرے ساتھ آؤ۔" میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے اپنے کیبن میں دو کپ کافی بنائی۔ ایک مجھے دیا اور دوسرا اپنے لیے رکھ لیا۔ کہنے لگی "میں سوئس میں ضرور پیدا ہوئی ہوں لیکن کافی میرے خون میں شامل ہے۔ یہاں بہت گرمی ہوتی ہے لیکن کافی پینے سے ساری تھکن اُتر جاتی ہے۔"

میں نے کافی کا کپ ہاتھ میں اُٹھایا، اس کا شکریہ ادا کیا اور کچن سے باہر آ گیا۔ سالواتورے نے جب میرے ہاتھ میں کافی کا کپ دیکھا تو زور سے شور کرنے لگا "براوو، براوو، پاکستانو، پاکستانو۔"

میں نے کہا "ہر جگہ ناپولی کے حربے کام نہیں آتے کہیں کہیں پاکستانی انداز بھی کام آ جاتا ہے۔"

سالواتورے نے دو گھونٹ میں کافی پی لی۔ ہم لوگ جیسے ہی فارغ ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی پلیٹ ٹرے میں رکھی۔ پلاسٹک کے خالی کپ بن کی نظر کیے۔ اس کے بعد ساری میزیں بند کر کے ایک کونے میں رکھیں۔ وہ لمبے لمبے بینچز وہیں چھوڑ دیے۔ پھر کچھ لوگوں کو صفائی کے کام پہ لگا دیا گیا۔ میں کچن میں ان کی مدد کرنے چلا گیا۔ رضا اور سالواتورے باغ سے سگرٹ کے جلے اور ادھ جلے ٹکڑے اٹھانے لگے۔

آج ہم نے ادب پہ اتنی گفتگو کی تھی کہ میرا اب مزید گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں کچن کے کام سے فارغ ہوا تو میں نے سوچا۔ میرے پاس دو گھنٹے باہر جانے کی اجازت ہے۔ میں جھیل کے کنارے جاتا ہوں۔ وہاں تھوڑا سا آرام بھی کروں گا۔

رضا اور سالواتورے کے ابھی فنگر پرنٹس نہیں ہوئے تھے اس لیے انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اکیلے ہی جانا تھا۔ میں اس بیرک نما عمارت سے باہر نکلا۔ سکیورٹی گارڈ کو باؤس وائس دکھائی تو کہنے لگا۔ اب تو تمہیں ہفتہ ہو گیا ہے۔ اب ہم سب تمہیں پہچاننے لگ گئے ہیں۔ میں اس کی بات سن کے مسکرا دیا۔ میں نے گندے نالے کے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ میں اس راستے سے کئی دفعہ گزرا تھا اور جب بھی میں اس راستے سے گزرتا مجھے یہاں پر اپنا پہلا دن جھٹ سے یاد آ جاتا۔ میں سٹیشن پہ پلیٹ فارم سے گزر کے جایا کرتا۔ کبھی کتابوں پہ نظر پڑ جاتی، کبھی اخباروں پر گو کہ مجھے جرمن

زبان کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آتا تھا لیکن سٹیشن کے بک سٹال پہ دھرے اخبارات، میگزینز وغیرہ دیکھ کے عجیب سا سکون ملتا۔

پلیٹ فارم کے ساتھ جو سڑک جھیل کی طرف جاتی تھی میں ہمیشہ کی طرح اسی سڑک پہ چلتا ہوا جھیل کے کنارے پہنچا۔ جھیل کے کنارے چلتے چلتے میری اچانک نظر پڑی۔ مقصود کسی عورت کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کو میں نے پہلی دفعہ ننالیاس کے دیکھا تھا اور مقصود کو چھوڑ کے چل دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے مقصود اس سے روز ملنے آتا ہے۔ مجھے تھوڑی سی جلن بھی ہوئی۔ میں تھوڑی سی ہمت یا دوسرے لفظوں میں "بے شرمی" کا مظاہرہ کرتا تو آج میں اس کی گود میں سر رکھ کے نیلے آسمان کو دیکھ رہا ہوتا۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا، اور ایسے ظاہر کیا کہ جیسے انھیں دیکھا ہی نہیں۔ میں ان کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کے آگے چل دیا۔ میں جھیل کے کنارے کنارے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج رضا نے کتنی دلچسپ گفتگو کی اور مجھے اور سالوا توری کو کتنی معلومات فراہم کیں۔ میں تعلیم مکمل کر کے جب گائیڈ بھرتی ہوا تھا تو میں یہ سمجھتا تھا کہ میں بہت زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں سے ملتا گیا، کتابیں پڑھتا گیا تو مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہونے لگا۔ میں نے بدھ ازم کے بارے میں پڑھا۔ پاکستان کی تاریخ پڑھی۔ گندھارا، دوار اوتی، پالی آرٹ کے بارے میں پڑھا۔ اتنا کچھ پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں اور بہت زیادہ صاحب علم ہو گیا ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں کسی یورپین کو بتاتا تھا کہ سوات کے بعض علاقوں میں اٹالین آرکیالوجسٹ جوزپے توچی (guissepe tucci) نے ۱۹۵۵ء میں کھدائی کی تھی تو ٹورسٹ بہت حیران ہوا کرتے۔ ان میں سب سے مشہور جگہ بت کارا تھی۔ یعنی کالا بت کالے بُت کی اس خانقاہ میں ساری چیزیں کالے پتھر سے بنائی گئی تھیں۔ کارا ترکش زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے کالا۔ میں ان ساری باتوں کے بارے میں جاننے کے بعد یہ سمجھتا تھا کہ میں نے سب کچھ جان لیا ہے، میں تھوڑا سا متکبر بھی ہو گیا تھا۔ لیکن جب رضا ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی، میں خود کو جاہل مطلق سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ظاہر ہے علم ایسا سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

میں اپنے دھیان میں مگن جھیل کنارے چل رہا تھا۔ جھیل میں ہمیشہ کی طرح رنگ برنگے بادبانوں والی کشتیاں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آ، جا رہی تھیں۔ ایک کونے میں سفید رنگ کی سوانز نظر آئیں۔ ان سوانز کا رنگ بہت ہی سفید تھا۔ دودھ کی طرح سفید۔ ان میں سے ایک نے اپنی

لمبی اور پتلی گردن پانی کے اندر ڈالی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ ان سوانز کو دیکھ کر مجھے پاکستان کے شمالی علاقے سکردو میں پائے جانی والی کچورا جھیل یاد آ گئی جس کے ارد گرد شنگریلا ریزورٹ بنا ہوا ہے۔ اس جھیل میں دو کالے رنگ کی بہت خوبصورت سوانز تھیں۔ اس جھیل کے کنارے ہر جگہ اردو، انگریزی بلکہ فرنچ میں بھی لکھا ہوا تھا کہ اس جھیل میں مچھلیوں کا شکار منع ہے لیکن پھر بھی لوگ مچھلیوں کے شکار سے باز نہ آتے۔ ایک دفعہ ان سوانز میں سے ایک کی خوبصورت گردن کے گرد مچھلی پکڑنے والی ڈوری پھنس گئی تھی۔ شنگریلا ریزورٹ کے مالک نے اس سوان کو ہیلی کوپٹر کے ذریعے راولپنڈی بھیجا تھا۔ لیکن وہ جب ٹھیک ہو کر واپس آئی تو اس میں پہلے والی بات نہ رہی۔ ایک دفعہ میں ایک امریکی گروپ کے ساتھ تھا۔ ہمیں یہاں دو راتیں رکنا تھا۔ اتفاق سے چاند کی چودھویں رات تھی۔ میں گروپ کے ساتھ کھانا کھا کے فارغ ہوا تو جھیل میں تیرتی سوانز کو دیکھنے لگا۔ میرے پاس گروپ کی ایک بوڑھی عورت آ کے بیٹھ گئی۔ مجھے کہنے لگی: ''تمھیں یہ سوانز پسند ہیں۔''

میں نے کہا ''زیادہ تو نہیں لیکن آج یہ جھیل میں تیرتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

کہنے لگی ''تم جانتے ہو، یہ سوانز یہاں خوش نہیں۔ یہ بہت جلد مر جائیں گی۔''

کہنے لگی ''میں نے پرندوں کے بارے میں بہت سٹڈی کی ہے۔ میں نیشنل جیوگرافک کے ساتھ کام کرتی رہی ہوں۔ تم ان سوانز کو دن کے وقت دیکھنا ان کی آنکھوں کے نیچے کالے نشان ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ سوانز یہاں خوش نہیں۔ اس نسل کی سوانز یہاں سکردو میں پائی ہی نہیں جاتیں۔ انھیں اس ریزورٹ کا مالک کہیں اور سے لایا ہے۔''

میں نے کہا ''ہو سکتا ہے۔ میں دن کی روشنی میں انھیں دیکھوں گا۔''

میں جھیل کے پانی میں چاند کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ رہا تھا۔ چاند پانی میں لہریں پیدا ہونے کی وجہ سے کبھی چھپ جاتا کبھی سامنے آ جاتا۔ مجھے یہ منظر بہت بھلا لگا تھا۔

لیکن اس وقت میں پاکستان سے ہزاروں میل دور جرمنی کے بارڈر پہ اکیلا بون سے نئے اتالین میں لاگو دی کوستانزا بھی کہتے ہیں کے کنارے بیٹھا ان خوبصورت سوانز کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بات میں نے محسوس کی کہ وہ کالی سوانز جو میں نے سکردو کے کچورو جھیل میں دیکھی تھیں وہ واقعی اتنی خوش نہیں تھیں جتنی یہ سفید سوانز نظر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے وہ امریکن خاتون ٹھیک کہتی تھی کہ پرندے جس علاقے کے نہ ہوں اور اپنے علاقے سے دور ہو جائیں تو اداس ہو جاتے ہیں۔ میں بھی تو

اپنے ملک سے ہزاروں میل دور تھا۔ اس لیے میں بھی اُداس تھا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایسے لگتا تھا زمانہ ہو گیا ہے۔ میرا دل یہاں بالکل نہیں لگا تھا۔ گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ میں اس گھٹن کو دور کرنے کے نئے نئے حیلے بہانے ڈھونڈا کرتا۔ کبھی کچن میں ازیل ہاؤس انتظامیہ کی مدد کرتا، کبھی صفائی میں ان کی مدد کرتا۔ وہاں کا عملہ تو اس بات سے ناواقف تھا کہ میری حالت ان کالی سوانز جیسی تھی جو اپنی ڈار سے بچھڑی ہوئی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان سوانز کو زبردستی لایا گیا۔ وہ بول تو نہیں سکتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں کے گرد کالے نشان ان کی اُداسی کی داستان سنا رہے تھے۔ سوانز کی آنکھوں کے سیاہ حلقے میں نے تو کبھی نہ دیکھے تھے لیکن اس امریکن عورت نے ان کی طرف میری توجہ دلائی تھی۔ جہاں تک پردیس آنے کا معاملہ تھا تو پردیس میں خود آیا تھا۔ میں نے خود اختیاری جلاوطنی کی یہ سزا اپنے لیے خود تجویز کی تھی۔ انسان کے دل اور دماغ کی عدالت میں جب فیصلے کے لیے مقدمہ پیش ہوتا ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ غلطی انسان سے خود سرزد نہیں ہوتی۔ کوئی دوسری طاقت یہ کام اس سے کرواتی ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا مجھے ایسا لگتا تھا کسی غیبی قوت نے مجھ سے یہ عمل کروایا ہے۔

آزادی کے دو گھنٹے گزرنے والے تھے۔ میں نے واپسی کی راہ لی۔ میں خیالوں کی راہداریوں میں اتنی دور چلا گیا تھا کہ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ کب دو گھنٹے گزر گئے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ازیل ہاؤس کی طرف واپس آیا۔ یہاں پہنچا تو شام کے کھانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

رضا اور سالواتورے میزیں کھول رہے تھے۔ ان کے آس پاس کچھ نوجوان لمبے لمبے بنچز سیدھے کر کے رکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی رضا کہنے لگا "فرشتہ تمہاری موج ہے۔ دو گھنٹے کے لیے تمہیں آزادی مل جاتی ہے۔"

میں نے کہا "جب تمہارے فنگر پرنٹس ہو جائیں گے تو تمہیں بھی یہ نعمت میسر ہو جائے گی۔"

کھانا لینے کے دوران قطار اور شرمندگی والی حالت پھر درپیش تھی لیکن مجھے تو اب عادت ہو چکی تھی۔ اس لیے عجیب نہیں لگتا تھا لیکن سالواتورے اور رضا ابھی تک خود کو اس انداز میں تقسیم ہونے والے کھانے کے لیے تیار نہ کر سکے تھے۔

ہم تینوں نے کھانا کھایا، پھر صفائی کی۔ اب ہمیں یہاں سے واپس گارنیگے ہوٹل ٹرانسفر کیا جانا تھا۔ وہی نو نو ٹا وین تھی اور ہم تھے۔ پندرہ سولہ پھیروں میں اس نے ہم سب کو پہنچا دیا۔ وہ موٹا

ڈرائیور مجھے کئی دن نظر نہ آیا جس نے پہلے دن مجھے کتے والی جگہ بٹھایا تھا۔ خیر ہم لوگ جب گاریگے ہوٹل پہنچے تو میں نے سب سے پہلے نوٹس بورڈ دیکھا۔ میڈیکل والی لسٹ میں میرا ابھی نام تھا۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے یہاں سے جان چھوٹ جائے گی۔ رضا اور سالواتورے کا نام بھی ٹرانسفر لسٹ میں شامل تھا۔ میں یہاں کے انتظام سے بڑا متاثر تھا۔ ہر کام بڑے منظم انداز میں سرانجام دیا جاتا تھا۔

ہم تینوں ہمیشہ کی طرح ٹیرس میں ایک کونے میں جا کے بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دور سے مقصود آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی کہنے لگا "کل تمہارا میڈیکل ہے۔"

میں نے کہا "ہاں ہے۔"

کہنے لگا "میرا بھی میڈیکل ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر۔"

کہنے لگا "یہ کسی طرح رک نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

کہنے لگا "میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔"

اب مجھے سمجھ آئی کہ اس کی پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے؟ میڈیکل کے بعد جس کی رپورٹ او کے ہو اس کو بھی کراس بھیج دیا جاتا تھا۔ مقصود بھی کراس میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ یہیں اپنی معشوق کے ساتھ وقت بتانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "اگر تمہاری میڈیکل رپورٹ او کے نہ ہوئی تو تمھیں یہاں رُکنا ہوگا۔"

وہ بولا "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن اگر تمہارا پیٹ خراب ہو جائے یا بخار ہو جائے تو تم مزید ایک ہفتہ رک سکتے ہو۔"

مجھے سالواتورے اور رضا پوچھنے لگے کہ اس کا کیا مسئلہ ہے۔

میں نے انہیں جھوٹ موٹ بتایا کہ کل اس کا میڈیکل ہے۔ اس کو زبان نہیں آتی اس لیے پریشان ہے کہ کیا کرے گا؟ اس نے میرا نام لسٹ میں دیکھا تو میرے پاس چلا آیا۔ میں نے اس کو تسلی دی ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔

وہ دونوں میری بات سے مطمئن ہو گئے۔ ڈائننگ ہال کے ساتھ والے کمرے میں ٹی وی

چل رہا تھا۔ آج فٹ بال کا کوئی میچ نہیں تھا۔ ٹی وی پہ کوئی جرمن چینل چل رہا تھا۔ چونکہ یہ شہر جرمن بارڈر پہ تھا اس لیے جرمنی کے سارے چینل نظر آتے تھے۔

ہم تینوں مختلف موضوعات پہ باتیں کرتے رہے۔ ساڑھے نو بجے رضا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سالواتورے بھی چلا گیا۔ میں اکیلا یہاں بیٹھ کے کیا کرتا میں بھی اپنے اسی کمرے میں آ گیا جہاں ایک ہی کمرے میں میرے سمیت سولہ انسان نیند کی دیوی کے چرنوں میں حاضری کے منتظر تھے۔

منگل کا دن بھی اسی طرح گزرا جیسے سوموار کا دن گزرا تھا۔ اب میری عادت سی ہوگئی تھی کہ میں ناشتہ کرکے اریزو کی لائبریری چلا جایا کرتا۔ وہاں کوئی کتاب دیکھ لیا کرتا۔ کسی اخبار کا مطالعہ کرلیا کرتا۔ لائبریری کے انتظامی عملے سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں میں انٹرنیٹ بھی استعمال کرلیا کرتا۔ یہاں صرف فوٹو کاپی کرنے کی ادائیگی کرنا پڑتی۔ وہ بھی بازار سے کم ریٹ پر۔ میرے ہاتھ میں لکھنے کے لیے سفید کاغذ اور پین ہوتا۔ کبھی کبھی میں ایک تھیلا نما بیگ میں پیپرز وغیرہ ڈال کے لے جایا کرتا۔ لائبریری میں کام کرنے والے یہ جانتے تھے کہ میں پاکستان ہوں لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کیا لکھتا ہوں۔ ایک دن وہاں کام کرنے والی ایک عورت نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم کیا کرتے ہو۔ تو میں نے اسے بتایا کہ میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس کے لیے لائبریری سے اچھی جگہ کوئی نہیں۔ وہ پوچھنے لگی، اطالین میں لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا، نہیں میں اردو میں لکھ رہا ہوں۔ وہ بڑی متجسس ہوئی۔ کہنے لگی، یہاں چھپواؤ گے۔ میں نے کہا، یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن لکھتا چلا جارہا ہوں۔

شام کو جب میں اور نیاش کھانے سے فارغ ہوئے تو نیاش کہنے لگا "مازاوو پری پیکر نہیں آیا۔ ایسا تو نہیں کہ وہ ناراض ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں نیاش بھائی۔ رات کو آیا تھا لیکن اس وقت آپ سوچکے تھے۔"

"ماڑا میں نے سوچا اگر ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اس سے معافی مانگ لیتے ہیں۔"

میں عادتاً کھانے کے بعد چائے ضرور پیتا تھا لیکن نیائش چائے کم ہی پیا کرتا اور خاص کر جب اُسے کام پہ جانا ہو تو ڈر نہ برتا میں چائے بنا رہا تھا۔ گھر کی گھنٹی بجی۔ نیائش نے دروازہ کھولا۔ ثقلین سامنے کھڑا تھا۔

نیائش نے آتے ہی کہا "ماڑا ناراض ہو گئے ہو۔ کل دیر سے آئے۔"

وہ بولا "نہیں نیائش بھائی، آج کل کام بہت زیادہ ہے۔ فیکٹری میں بہت بڑا آرڈر آیا ہوا ہے۔ سب لڑکے اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔ دیر سے فارغ ہوتا ہوں۔ اس لیے دیر سے آتا ہوں۔"

نیائش بولا "شکر ہے، میں سمجھا شاید تمھیں ہماری کوئی بات بری لگی ہے۔"

ثقلین ہنس دیا۔

میں نے پوچھا "چائے چلے گی۔"

کہنے لگا "چلے گی نہیں بلکہ دوڑے گی۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ یہ سارا ہفتہ ایسے ہی گزرے گا۔"

میں نے پوچھا "کھانا؟"

ثقلین بولا "کھانا میں نے وہیں سے کھایا ہے۔ فیکٹری کا مالک اچھا آدمی ہے۔ کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ منگوا دیتا ہے۔"

اب میں مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے چائے کی کیتلی میں پہلے سے ڈالے ہوئے پانی، دودھ، پتی اور چینی میں تھوڑا اور اضافہ کر دیا۔ میں اور ثقلین بیٹھ کے چائے پینے لگے اور نیائش اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

ثقلین مجھے کہنے لگا "فرشتہ صاحب، وہ بوکا چوکی ڈیکیمرون پر مکالمہ تو بہت دلچسپ ہے۔ اور رضا کا کردار کمال کا ہے۔"

میں نے کہا "اگلا باب تیار ہے۔"

ثقلین نے دسواں باب میرے ہاتھ میں تھمایا اور گیارہواں باب لیتے ہوئے کہنے لگا "اگر میں چائے پی کے چلا جاؤں تو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "نہیں کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اگر برا نہ لگے تو یہ ابواب میں آپ کے گھر آ کے دے جایا کروں گا۔"

تو کہنے لگا "اگر آئندہ تین چار دن ایسا ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔"

میں نے کہا "کوئی مسئلہ نہیں۔"

وہ بولا "تو ٹھیک ہے کل ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔

ooo

صبح چھ بجے ہمیں سکیورٹی گارڈ جگانے آیا کرتا تھا۔ اب تو عادت سی ہو چکی تھی کہ صبح ساڑھے پانچ بجے خود بخود ہی آنکھ کھل جاتی۔ جب وہ جگانے آتا تو میں جاگ رہا ہوتا۔ چند ایک کروٹیں لے کر اُٹھ جایا کرتا۔ پہلا کام ہاتھ میں جانا ہوتا۔ دانت صاف کرتا، نہاتا، دیگر حاجات سے فارغ ہوتا یہ میرا روز کا معمول تھا۔ آج صبح بھی سکیورٹی گارڈ ہمیں جگانے آیا۔ آج صبح اس بیرک نما عمارت میں جانا تھا۔ مجھے ناشتہ بھی وہیں کرنا تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کے نیچے آ گیا۔ نیچے وہی ٹویوٹا وین تیار کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ وہی موٹا آدمی بیٹھا تھا جو مجھے پہلی دفعہ اس جگہ بٹھا کے لایا تھا جو کتے کو بٹھانے کے لیے مخصوص تھی۔ میں جلدی سے جا کے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ اب وہ ابتدائی عاجزی و انکساری ختم ہو چکی تھی۔ ویسے بھی میں اب سینئر پناہ گزین تھا۔ بہت سارے نئے لوگ آ گئے تھے۔ میرے ساتھ کے زیادہ تر لوگ چلے گئے تھے۔ ڈرائیور نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ مجھے جرمن میں کچھ کہنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی بات پہ اتنی توجہ نہ دی۔ نہ ہی مجھے سمجھ آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب وین بھر گئی تو اس نے وین سٹارٹ کی اور دس یا پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ہمیں اس بیرک نما عمارت میں لے آیا۔

دوسرے پھیرے میں سالواتورے، رضا اور مقصود بھی آ گئے۔ ہم لوگوں کو ہال میں پہنچا دیا گیا۔ ناشتے میں وہی سوئس بریڈ تھی، قہوہ تھا، مکھن اور جیم کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تھیں۔ سالواتورے کھانے کے دوران ہمیشہ سوئس حکومت کو گالیاں دیا کرتا۔ کیونکہ ناشتے میں کافی نہ ہوتی۔ جب ہم لوگ ناشتہ کر کے فارغ ہو گئے تو مجھے اور مقصود کو ایک طرف کر دیا گیا اور سالواتورے اور رضا کو ایک طرف۔ میرا اور مقصود کا میڈیکل تھا۔ ہمیں پیشاب اور خون کی رپورٹس ملنی تھیں۔ اس کے علاوہ ہیپاٹائٹس سی اور بی کا چیک اپ ہونا تھا۔ ایڈز کا چیک اپ ہونا تھا۔ میرے خیال میں ہمارے پھیپھڑوں کا ایکسرے بھی ہونا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمیں ٹی بی یا دمہ تو نہیں۔ رضا اور سالواتورے کے آج فنگر پرنٹس ہونے تھے۔ تصاویر اُتاری جانی تھیں۔ ایک عورت رضا، سالواتورے اور چند دوسرے پناہ گزینوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ مجھے اور مقصود کو وہی عورت اپنے ساتھ لے گئی جو کرختگی سے بولا کرتی تھی۔ اس

عورت نے مجھے اپنی رام کہانی سنائی تھی۔ اب مجھے یہ عورت مظلوم لگنے لگی تھی۔ خیر ہم دونوں اس کے ساتھ ہو لیئے۔ وہ میرے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتی چلی جا رہی تھی اور مقصود گونگوں بہروں کی طرح ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا۔ میری دوستی یا بات چیت زبانی جمع خرچ ہی ہے۔ اس کا حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ مقصود جو میرے ساتھ گونگوں بہروں کی طرح چل رہا ہے، تفریح تو یہ منا رہا ہے۔ پھر میں نے سوچا محض جنس کی بنیاد پر جملہ انسانی رویوں کو جانچنا اور کوئی فیصلہ صادر فرما دینا شاید معقول بات نہ ہو مگر حقیقت یہی تھی کہ میں خود کو نفسیاتی حوالے سے مریضانہ احساسات کا شکار ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

ہم تینوں اس نئی عمارت کے پاس پہنچے۔ اب مجھے اس عمارت سے تھوڑی سی شناسائی ہو گئی تھی۔ اس عورت نے اپنا کارڈ مشین کے سامنے کیا اور وہ چھوٹا سا لوہے کا دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اس عمارت میں لفٹ بھی تھی لیکن وہ ہمیں سیڑھیوں کے ذریعے لے کر گئی۔ پہلی منزل تو وہ تھی جہاں ہمارا خون اور پیشاب ٹیسٹ ہوا تھا۔ ہمیں آج ان ٹسٹوں کی رپورٹس بھی ملنا تھیں۔ وہ ہمیں دوسری منزل پہ لے آئی۔ اس عمارت کے جس کمرے میں وہ ہمیں لے کر آئی تھی وہ کمرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا نیچے تھا۔ اس کمرے میں جدید انداز کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں، مگر اس طرح کی نہیں جس طرح کی اس ہال میں تھیں جس میں ہم کھانا کھاتے تھے۔ وہ عورت ہمیں چھوڑ کے یہ کہتے ہوئے چلی گئی کہ ''شاید اور لوگوں کو بھی لانا پڑے۔''

میں اور مقصود دونوں انتظار میں بیٹھے تھے۔ مقصود بالکل خوش نہیں تھا۔ میں نہ خوش تھا نہ ہی اداس تھا۔ مقصود کو سو فیصد یقین تھا کہ اسے کل پکی کراس میں بھیج دیا جائے گا۔ ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اس دوران ایک نرس آئی۔ وہ ہمیں ایک اور کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ جدید میڈیکل انسٹرومنٹس سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک کمپیوٹرائزڈ ایکس رے مشین تھی۔ اس کے علاوہ دیگر مشینیں تھیں۔ یہاں تین نرسز کام میں مصروف تھیں۔ پہلے میرا نام بلایا گیا۔

میں اس سفید کوٹ والی نرس کے پاس گیا۔ اس گوری چٹی، پتلی ناک والی نرس کی عمر بیس سال ہوگی۔ اس کے سفید کوٹ کی جیب کے پاس اس کا نام لکھا ہوا تھا: ''لاورا''

''لاورا'' ایک اطالوی نام تھا۔ میں نے دل میں سوچا اس کا مطلب ہے یہ لڑکی اطالین ہے یا اس کے ماں باپ اٹلی سے ہجرت کر کے آئے ہوں گے۔ اس نے ایک ڈسپوزابل سرنج نکالی۔

اس کو روئی سے صاف کیا۔ پھر اس نے اسے ایک چھوٹی بوتل میں ڈال کے بھر لیا۔ جب سرنج بھر چکی تو اس نے سرنج کو تھوڑا سا دبا کے چند قطرے نکالے۔ اس کے بعد مجھے انگریزی میں کہا "اپنا بازو سامنے کرو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے میرا بازو پکڑا۔ میں ہمیشہ یہ چیز نوٹ کیا کرتا ہوں کہ جب مجھے کوئی عورت یا لڑکی چھوئے تو اس کا لمس گرم ہوتا ہے یا ٹھنڈا! اس لڑکی کے ہاتھ نرم اور ٹھنڈے تھے۔ حالانکہ جون کا مہینہ تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے اس عمارت میں ایئر کنڈیشنڈ چل رہا ہو یا یہ ساری عمارت سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ہو۔ اس نے بہت آرام سے میرا بازو دبایا۔ اس کے بعد روئی پہ کچھ لگا کے میرا بازو سہلایا اور اس کے بعد مجھے وہ ٹیکہ لگا دیا جو اس نے اس چھوٹی سی بوتل سے بھرا تھا۔ اس نے جیسے ہی سوئی میرے بازو میں چبھوئی، میری منہ سے سی کی آواز نکلی اس نے فوراً سرنج کو پیچھے سے دبا کے ساری دوائی میرے بازو میں داخل کر دی۔ یہ ٹیکہ چیچک، ٹائیفس بی اور سی سے بچاؤ کے لیے تھا۔ اس کے بعد اس نے سوئی میرے بازو سے نکالی اور وہی روئی میرے بازو پہ مل دی۔ پھر کہنے لگی "اس کو پکڑ کے رکھو۔"

میں نے ایک مہذب بچے کی طرح اس کی ہدایت پہ عمل کیا۔ اس کے بعد مقصود کو بھی اس عمل سے گزرنا تھا۔ اس نے مقصود کو انگریزی میں کہا۔ "اپنا بازو آگے کرو۔" مقصود سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ "وہ بازو آگے کرنے کو کہہ رہی ہے۔ ٹیکہ لگائے گی۔"

مقصود نے پورے بازوؤں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس نے سارا بازو اوپر کو موڑ دیا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس نرس نے ٹیکہ لگایا اس کے بعد سوئی نکال کے اس کے بازو کو روئی سے صاف کیا اور اس سے یہی کہا اس کو پکڑ کے رکھو۔

اب ہم دونوں اپنے بازو پہ روئی کے اس ٹکڑے کو پکڑے بیٹھے تھے۔ اس کے بعد ہمارا ایکسرے ہونا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمیں ٹی بی یا دمہ تو نہیں۔ ہمارے پھیپھڑے ٹھیک ہیں کہ نہیں۔ ہم دونوں انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران اور بھی مہاجرین آ رہے تھے۔ وہ دبلی پتلی لڑکی ان آنے والے مہاجرین کو بھی انجکشن لگا رہی تھی۔ اب ہماری تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس دوران ایک اور نرس آئی۔ اس نے بھی سفید رنگ کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ تھوڑی دراز قد تھی۔ میری نظر اس کی ٹانگوں پر پڑی۔ اس نے پاؤں میں وہی خاص قسم کے جوتے پہن رکھے

تھے جو ہسپتالوں میں پہنے جاتے ہیں۔ اس کی پنڈلیاں بہت سڈول تھیں۔ کوٹ لمبا تھا جس کی وجہ سے اس کی سکرٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے نیچے کچھ نہ پہنا ہو۔ چہرے مہرے سے پچیس یا تیس سال کی لگتی تھی۔ بہت خوبصورت نین نقش والی نرس تھی۔ ناک اتنی متناسب تھی جیسے کسی مجسمہ ساز نے تراشی ہو۔ اس کے کوٹ کی جیب کے پاس لگے نیم ٹیگ پر اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ کیتھرین۔ مجھے یہ نرس فرنچ لگی۔ اس نے جب انگریزی بولی تو اس کے تلفظ سے صاف لگا کہ یہ فرنچ ہے۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بورڈ اٹھایا ہوا تھا جس پہ ایک کاغذ چپکا تھا۔ اس نے اس کاغذ پر نظر ڈال کر مجھ سے کہا "سب سے پہلے تمہاری باری ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھے فرنچ لگتی ہو۔"

کہنے لگی "کیوں نہیں فرنچ آتی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں مجھے فرنچ آتی ہے اور اٹالین بھی۔"

اس نے لاورا کو آواز دی اور اسے کہا "لاورا تم اس سے اٹالین میں بات کر سکتی ہو۔ یہ اٹالین میں بات کر سکتا ہے۔"

اس نے مجھ سے پوچھا "ویسے تم کہاں کے ہو۔"

میں نے کہا "میں پاکستانی ہوں۔"

وہ حیرت سے بولی "تم پاکستانی ہو اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور اٹالین بھی جانتے ہو۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔"

میں نے کہا "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بہت سے یورپین ہماری زبان سیکھ لیتے ہیں۔"

کہنے لگی "نہیں مجھے حیرت اس لیے ہوئی ہے کیونکہ ہمارا یہاں ایسے کئی لوگوں سے پالا پڑتا ہے جو اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ ہم لوگ ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے کام چلا لیتے ہیں یا ان کو اشاروں سے سمجھاتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے زبانیں سیکھنے کا شوق ہے۔"

وہ کہنے لگی "خیر یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ پہلے تم سارے کپڑے اُتار کے یہ حفاظتی جیکٹ پہن لو۔ اس کے علاوہ یہ کور (Cover) نچلے دھڑ پہ باندھنے کے لیے ہے۔"

میں نے کہا "یہ تکلف کس لیے ہے۔"

کہنے لگی "جب ہم لوگ ایکسرے کرتے ہیں تو اس کی شعاعیں جسم کے دیگر حصوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان شعاعوں کے جسم کے نازک حصوں پر پڑ جانے کے اثرات سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اس لیے ہم جسم کے تمام نازک حصوں کو اس جیکٹ اور اس کور سے ڈھک دیتے ہیں تا کہ ریز کے مضر اثرات سے محفوظ رہا جا سکے۔"

میں نے کہا "میں یہ چیز پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں اور سن بھی پہلی دفعہ رہا ہوں۔"

کہنے لگی "ویسے تو ایکس ریز، ڈاکٹرز کو پہلے سے معلوم تھا کہ جسم کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے مزید دریافت کیا کہ کن کن چیزوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں، کیا تم جانتے ہو کہ کوئی شخص کئی دفعہ ایکسرے کے عمل سے گزرے تو ایک خاص عرصے کے بعد اس کا ایکس رے نہیں کیا جاتا۔"

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ کیتھرین جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی خوش نوا بھی تھی۔ دل کرتا تھا اس سے باتیں کرتا رہوں۔ لیکن اس نے نہ جانے کتنے لوگوں کے ایکس رے کرنے تھے۔ میں نے اس کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں جا کے کپڑے اُتارے اور جسم پہ وہ فولادی کپڑے پہن لیے جو اس نے مجھے دیے تھے۔ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں پرانے دور کا کوئی جنگجو ہوں، پھر اس نے ایک بستر پہ پردہ تان دیا اور مجھے اس پہ لٹا دیا۔ ایک عجیب وغریب سی مشین میرے اُوپر لائی، جس کی خیرہ کرنے والی روشنی میرے اوپر پڑتی رہی۔ وہ اس بستر سے ملحق مونیٹر پہ میرے جسم کی تصویریں دیکھتی رہی۔ پھر مجھے کہنے لگی، "اب تم یہ حفاظتی لباس اُتار کر اپنے کپڑے پہن سکتے ہو۔"

میں نے پوچھا "سب ٹھیک ہے کیا؟"

کہنے لگی "تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہارے لیے فکر کرنے کی ایک چیز رہ گئی ہے وہ یہ کہ اگر تمہارے بازو پہ لگائے گئے ٹیکے کا نشان لال ہو گیا اور تمہیں بخار ہو گیا تو پھر مسئلہ ہو سکتا ہے۔۔۔ ورنہ تمہارے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہمارا خون اور پیشاب ٹیسٹ ہوا تھا اس کا کیا بنا۔"

کہنے لگی "وہ سب ٹھیک ہے ورنہ تمہیں ایکسرے کے لیے نہ بلایا جاتا۔ تمہیں ایڈز، ٹی بی یا

دمہ نہیں ہے۔ آخری ٹیکہ جو تمہیں تھوڑی دیر پہلے لگایا گیا ہے یہ اس لیے لگایا ہے کہ تمہیں اگر ہیپا ٹائیٹس سی یا بی نہیں ہوا تو آئندہ بھی نہ ہو۔ ویسے تمہارے بلڈ ٹیسٹ میں دیکھ چکی ہوں کہ تمہیں اس طرح کی کسی بیماری کا کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے پوچھا" یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

کہنے لگی" کیونکہ میرے پاس تمہاری رپورٹ موجود ہے۔"

میں نے پوچھا" مجھے یہاں کتنی دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔"

کہنے لگی" ویسے تو آدھے گھنٹے میں پتا چل جاتا ہے لیکن تمہیں دو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ اگر سب کچھ ٹھیک ہوا تو کل تمہیں دوسری جگہ بھیج دیا جائے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ مجھے کسی کرائس بھیج دیا جائے گا۔ جہاں مجھے ہفتے کے ہفتے پیسے بھی ملا کریں گے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی ہوگی۔

کہنے لگی" کیا سوچ رہے ہو۔"

میں نے کہا" کچھ نہیں۔"

کہنے لگی" وہ دوسرا لڑکا بھی میرے خیال میں پاکستانی ہے۔ اس سے کہو۔ کپڑے اتار کے یہ حفاظتی جیکٹ پہن لے۔"

میں نے کہا" اچھا میں اسے کہہ دیتا ہوں۔"

میں مقصود کے پاس آیا۔ وہ گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے خیال میں اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے وہ یہاں رک جائے۔ میں نے کہا" مقصود۔ اب تمہارا ایکسرے ہوگا۔ وہاں چلے جاؤ۔ کمرے میں جا کے اپنے کپڑے اُتارو اور وہ نرس جو چیز دے گی وہ پہن لینا۔"

کہنے لگا" میرے ساتھ آؤ۔ مجھے سمجھ نہیں آئے گی۔"

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے کیتھرین کو بتایا کہ میں اس کی مدد کرنے آیا ہوں۔"

کہنے لگی" ہاں ہاں۔ مجھے آسانی ہو جائے گی۔ کئی دفعہ تو ہمیں کافی دیر ہو جاتی ہے لوگوں پر یہ واضح کرنے میں کہ کیا کرنا ہے۔"

میں مقصود کو اس چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ میرے پاس وہ فولادی جیکٹ بھی تھی،

اور نیچے باندھنے والا کور بھی۔ میں منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے سارے کپڑے اُتارے۔

میں نے منہ موڑے ہی کہا" انڈرویئر نہ اتارنا باقی سب کچھ اُتاردو۔"

کہنے لگا" انڈرویئر تو میں نے پہنا ہی نہیں۔"

میں نے کہا" جو بھی ہو۔ پہلے یہ جیکٹ پہن لو۔ اس کے بعد اپنے نیچے والے حصے پہ یہ کور (Cover) باندھ لو۔"

اس نے میری ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے جیکٹ بھی پہن لی اور وہ کور بھی۔ کہنے لگا" اس کا تو بڑا وزن ہے۔"

میں نے کہا" ظاہر ہے۔ اس کے اندر لوہا ہے، وزن تو ہوگا۔"

میں نے کیتھرین کو فرنچ میں مقصود کی حالت بتائی۔ وہ کہنے لگی میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اسے کہو کہ جلدی سے اس بستر پہ لیٹ جائے۔ مقصود کے بستر پہ لیٹنے سے پہلے اس نے بستر پہ کاغذ کی بنی ایک نئی چادر بچھا دی تھی۔ مقصود اس پہ لیٹ گیا۔ اس نے جلدی جلدی مقصود کا ایکسرے کیا۔ پھر مجھے کہنے لگی" اسے بتاؤ کہ اس کا شوگر لیول ہائی ہے۔ اس کی عمر اتنی نہیں لیکن یہ حالت اس عمر میں نہیں ہونی چاہیے۔"

میں نے مقصود کو بتایا" تمہارا شوگر لیول ہائی ہے۔"

کہنے لگا" اس سے کیا ہوگا۔ اب میں یہاں رک سکتا ہوں۔"

میں نے کیتھرین سے پوچھا" اس کو یہاں رکنا ہوگا یا اسے ہم کراس بھیج دیں گے۔"

کہنے لگی" نہیں ہم اسے گولیاں دے رہے ہیں۔ تم اسے استعمال کا طریقہ بتا دینا۔ اس کا علاج وہیں ہوگا جہاں یہ جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے اس کو زیورخ بھیج دیں۔"

میں نے مقصود کو یہ بری خبر سنائی" تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ یہ تمہیں دوائی دیں گے۔ استعمال کا طریقہ میں بتا دوں گا۔"

مقصود کی شکل رونے والی ہوگئی۔ میں نے پوچھا" مسئلہ کیا ہے؟ لوگ شکر کرتے ہیں کہ انہیں اس جیل سے نجات ملے اور تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

کہنے لگا" تم نے وہ عورت دیکھی ہے جس کے ساتھ میں نے۔۔۔"

میں نے کہا" ہاں مجھے پتا ہے تم اس سے روز ملتے ہو۔"

مقصود بولا "میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی راضی ہے۔"

میں نے کہا "تو مسئلہ کیا ہے؟"

وہ بولا "مسئلہ یہ ہے کہ وہ جرمن ہے۔ مجھے اس کے ساتھ جرمنی جانا ہوگا۔ بڑا لمبا کام ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "تم کچی کراس چلے جاؤ۔ وہاں سے اس کو فون کر دینا۔ اس کے بعد جو بھی کرنا ہوا کر لینا۔"

کہنے لگا "مجھے ڈر لگتا ہے اگر میں چلا گیا تو میں اس کو کھو دوں گا۔"

میں نے کہا "اگر تمہارے پیار میں "تڑ" ہوئی تو وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔" معلوم نہیں مقصود پنجابی لفظ "تڑ" کی معنویت اور فقرے کی ذومعنویت تک پہنچا یا نہیں۔۔۔ شکایتی انداز میں بولا "پیار و یار کی بات چھوڑو۔۔۔"

"اسے تو بس ایک ہی کام کا شوق ہے اب تو میری ٹانگوں اور کمر میں بھی درد ہونے لگا ہے۔"

کیتھرین مجھ سے مخاطب ہوئی "تم نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کا شوگر لیول ہائی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں میں نے بتا دیا ہے۔"

کیتھرین بولی "ایک بات پوچھوں؟"

میں نے کہا "پوچھو!"

وہ بولی "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہ میں بھی نہیں جانتا۔"

ہمارے سارے ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ مجھے اور مقصود کو فارغ کر دیا گیا۔ کیتھرین کہنے لگی "اب شام کو تمہارا آخری چیک اپ ہوگا۔ پھر تمہیں کچی کراس بھیج دیا جائے۔ میرا خیال ہے کل تمہیں جانا ہوگا۔"

میں نے اور مقصود نے لاورا اور کیتھرین کو خدا حافظ کہا۔ اس کے بعد وہی عورت جو ہمیں یہاں لے کر آئی تھی وہ ہم دونوں کو اس ہال میں چھوڑ آئی۔ وہاں کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ رضا اور سالواتورے مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ میں نے انہیں اپنا بازو دکھایا۔ رضا بولا "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ ہیپاٹائٹس کے بچاؤ کے لیے لگائے گئے انجکشن کا نشان ہے۔ ایسا ہی

ممکن ہے کہ کل مجھے یہاں سے بھیج دیا جائے۔"

سالواتورے بولا "اچھا ہے۔۔۔ تمہیں اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔"

رضا کہنے لگا "میرے لیے تو یہ بُری خبر ہے۔ اب تو بہت بوریت ہوگی۔"

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں رضا، جلد ہی تم لوگوں کا بھی نمبر آ جائے گا۔ ویسے تو مجھے لگتا ہے پناہ گزینوں کا سارا دفتر ہی یہاں سے شفٹ ہونے والا ہے۔"

رضا بولا "جتنی جلد ایسا ہو جائے اچھا ہے۔ یہاں تو جہنم کا ماحول طاری لگتا ہے۔"

اتنے میں کھانا تقسیم کرنے والا عملہ آ گیا۔ ہم لوگوں نے میز کھول کھول کے رکھنے شروع کر دیئے۔ پھر بہت سے لوگ۔ بچے، عورتیں، مرد۔ برتنوں کی آواز، چمچوں کی کھنکھناہٹ۔ لوگوں کے کھانا کھانے کی آواز۔ پانی کے گلاس اور جگ ٹکرانے کی آواز۔ کھانا کھاتے ہوئے رضا نے پوچھا "کچھ اندازہ ہوا کہ یہ تمہیں کہاں بھیج رہے ہیں؟"

میں نے کہا "یہ تو کل ہی پتا چلے گا۔ شام کو ڈاکٹر یا نرس چیک کرنے آئے گی۔"

سالواتورے بولا "اس کا مطلب ہے تم رک بھی سکتے ہو۔"

میں نے کہا "میں اس حوالے سے تیقن کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

کھانا کھا کے ہم سب نے جلدی جلدی برتن سمیٹے۔ پلیٹیں، گلاس، سب چیزیں اکٹھی کیں۔ میں ہمیشہ کی طرح کچن میں چلا گیا۔ کچن کے عملے کی مدد کی۔ برتن دھوئے۔ برتن سکھانے میں ان کی مدد کی۔ پھر اس عورت نے مجھے ہمیشہ کی طرح کچھ کھانے کو دیا۔ میں نے سالواتورے کے لیے کافی کی فرمائش کی۔ اب ایک ہفتے میں میری اتنی جان پہچان ہو گئی تھی کہ کچن کا عملہ میری کسی چھوٹی موٹی ضرورت یا مطالبے کو رد نہیں کرتا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی نے کافی بنا کے دی۔ میں نے کافی کا کپ اٹھایا اور سالواتورے کے پاس آ گیا۔ سالواتورے نے مجھے تشکر آمیز انداز میں دیکھا۔ پھر کہنے لگا "اگر کل تم چلے گئے تو مجھے کافی کون لا کر دیا کرے گا۔"

میں نے کہا "یہ بہت آسان ہے۔ تم کچن میں ان کی مدد کروا دیا کرنا۔ اس کے بدلے وہ تمہیں کافی دے دیا کریں گے۔"

سالواتورے بولا "میں کوشش کروں گا لیکن میرے لیے یہ تھوڑا مشکل کام ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر کافی پینی ہے تو کچھ نہ کچھ قربانی بھی دینی پڑے گی۔"

رضا بولا" ویسے فرشتہ تمہاری بڑی ہمت ہے۔ تم خود کو مصروف رکھنے کے لیے کیسے کیسے کام کرتے رہتے ہو۔"

میں نے کہا" کام فٹنیس کے لیے بھی ضروری ہے ویسے سارا دن بندہ باتیں بھی تو نہیں کر سکتا۔"

رضا نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا" یہ تو ہے۔"

ابھی میں ان دونوں سے باتیں کر رہا تھا کہ میرے پاس مقصود آیا اور کہنے لگا" تم میرے ساتھ جھیل پہ جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا" مسئلہ کیا ہے۔"

کہنے لگا" میں تمہاری ملاقات اُس سے کروانا چاہتا ہوں۔ تم اسے سمجھاتا۔"

"اُس" سے اُس کی مراد اُس کی محبوبہ تھی۔

میں نے کہا" ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں گا۔" میں نے رضا اور سالواتورے سے اجازت لی اور مقصود کے ساتھ ہو لیا۔ ہم دونوں نے اپنا اپنا کارڈ سکیورٹی گارڈ کو دکھایا اور اس ہال سے باہر نکل آئے۔ ہم اس گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پھر سٹیشن آیا۔ اس کے بعد آگاتھو کا دفتر آیا۔ پھر ہم لوگ جھیل پر پہنچ گئے۔ ہم خراماں خراماں جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ آج یہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ دور ایک کونے میں درخت کے نیچے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اور مقصود کو آتے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مقصود اس کے پاس پہنچا تو اس نے اُسے گلے لگا لیا۔ اُس عورت نے جرمن میں کچھ کہا، جو میں نہ سمجھ سکا۔ میں نے انگریزی میں اپنا تعارف کروایا۔ پھر مجھے جس طرح مقصود نے بتایا تھا۔ اس کو تفصیل سے بتا دیا۔ وہ رونے لگی۔ کہنے لگی" میں مقصود کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ میرے ساتھ جرمنی کیوں نہیں بھاگ جاتا۔"

میں نے کہا" اس کا کیس بگڑ جائے گا۔" تم اپنا موبائل نمبر دے دو۔ یہ جہاں بھی جائے گا تمھیں اپنا پتا دے دے گا۔ تم اس سے رابطہ قائم کر لینا۔"

کہنے لگی" جانا کب ہے۔"

میں نے کہا" شاید کل۔"

"کتنے بجے۔"

میں نے کہا" یہ تو کل ہی پتا چلے گا۔"

کہنے لگی" کل میں صبح آٹھ بجے کرائس لنکن کے ریلوے سٹیشن پہ آجاؤں گی۔"

میں نے کہا" اتنی جلدی آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر بہت بھی جلدی ہوا تو ہم لوگ گیارہ بجے نکل پائیں گے۔"

وہ کہنے لگی" یہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔"

میں نے کہا" مجھے یہاں رہتے ہوئے دس دن ہو چلے ہیں۔ روز کسی نہ کسی کی روانگی ہوتی ہے اور وہ لوگ ہمیشہ اسی وقت جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے پکا یقین ہے یہی وقت ہوگا۔"

کہنے لگی" تو ٹھیک ہے میں ٹھیک دس بجے سٹیشن پہ آجاؤں گی۔"

میں نے مقصود سے کہا" میں نے اسے سب سمجھا دیا ہے۔ کل یہ دس بجے ریلوے سٹیشن پہ آجائے گی۔"

اس کے بعد میں نے ان دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔ انہوں نے مجھے جاتے ہوئے دیکھا تو اسی درخت کی اوٹ میں چلے گئے جہاں وہ عورت پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں جھیل کے کنارے ٹہلتا رہا۔ جب سے میں نے اس جھیل سے کتے کو نکلتے دیکھا تھا۔ میرا اس کے شفاف پانیوں میں نہانے کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میں جھیل میں پانی کی سطح پہ رواں کشتیوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے ان کے رنگ برنگے بادبان بہت ہی بھلے لگ رہے تھے۔ آج وہ سفید سوانز نظر آئیں جن کو دیکھ کے مجھے مجبوراً جھیل کی کالی سوانز یاد آگئی تھیں۔ آسمان کا رنگ بھی نیلا تھا اور جھیل کے پانی کا رنگ بھی نیلا نظر آرہا تھا۔ آسمان پہ اکا دکا بادل کے ٹکڑے ادھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ مجھے مناظر فطرت بہت بھلے لگتے ہیں اور اس وقت بھی یہ سارا منظر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں یہاں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب میں ہفتے کے دن رات کو ساڑھے گیارہ بجے کرائس لنکن ریلوے سٹیشن پہنچا تھا تو اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس چھوٹے سے شہر کے بارے میں اتنا کچھ جان لوں گا۔ اس وقت تو مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے سامنے سارا منظر فلم کی طرح چلنے لگا۔ میں کس طرح سٹیشن کے ایک طرف چلا گیا تھا پھر دوسری طرف۔ اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیوروں سے ازیل ہائم کا پتا پوچھا تھا۔ پھر میں انٹرنیٹ کیفے میں چلا گیا تھا۔ میں نے اپنا موبائل فون بھی وہاں چھوڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں اس نے اب تک اپنے پاس رکھا ہوگا یا پھینک دیا ہوگا۔ موبائل اتنا

قیمتی نہیں تھا بس اس میں چند ضروری ٹیلی فون نمبر فیڈ تھے جو میرے کام آ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں انٹرنیٹ کیفے سے پھر سٹیشن کی دوسری طرف آ گیا تھا۔ پہلے دو دن، ہفتے اور اتوار کی رات تو بہت مشکل سے کٹی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی وقت بھی میرا دم گھٹ جائے گا اور مر جاؤں گا۔ پھر فنگر پرنٹس ہوئے، تصاویر اتاری گئیں۔ انٹرویو ہوا، پیشاب اور خون کا ٹیسٹ ہوا۔ آج ایکسرے ہوا، جیاناٹینس سی اور بی سے بچاؤ کے لیے ویکسینیشن ہوئی۔ اب کچھ باقی نہیں تھا۔ ہمارا یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بس اب شام کو نرس یا ڈاکٹر کو آ کے ہمارے بازو دیکھنے تھے۔ میں ان نو دنوں میں کتنے لوگوں سے مل چکا تھا۔ مجھے جادو نے چکوچان بھی یاد آیا۔ وہ انگولا کا لڑکا بھی یاد آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا جامنی رنگ کے نشانات سے اٹا چہرہ آ گیا۔ اس کو نہ جانے سوئس پولیس نے کتنا مارا تھا۔ بیچارہ جب واپس آیا تھا تو چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ پھر وہ جرمن موٹر میکینک، اٹالین اخبار نویس۔ سب سے کمال کی شخصیت جس سے میں اب تک ملا تھا وہ رضا تھا۔ اس نے مجھے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ میں خود کو بہت زیادہ صاحب علم سمجھتا ہوں، رضا کے علم کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہ اتنا کچھ جانتا تھا کہ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے وہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہو بلکہ وہ تو مائیکروپیڈیا تھا۔ بات کو اتنی جزیات سے بتاتا کہ کچھ پوچھنے اور بولنے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ اب یہاں سے مجھے کل کون سی کنٹون میں بھیجا جائے گا یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہاں کرائس لنگن میں آج کی رات میرے قیام کی آخری رات ہے۔

کسی نے میرے کندھے کو ہولے سے ہلایا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو مقصود کھڑا تھا۔ کہنے لگا

"واپس نہیں چلنا۔ دو گھنٹے پورے ہونے والے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تو پہنچنے میں لگ جائیں گے۔"

میں نے کہا "تم نے اپنا کام کر لیا۔"

"ہاں کر لیا۔ کل ریلوے سٹیشن پہ آئے گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سی کنٹون ہو گی۔"

مقصود بولا "میری کنٹون زیورخ ہی ہو گی کیونکہ جو لوگ کرئس لنگن از یل ہائم میں آتے ہیں ان کو عموماً اسی کنٹون میں بھیجا جاتا ہے جہاں جرمن بولی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔"

کہنے لگا "یہ مجھے موٹے نے بتایا ہے، موٹا وہ اس لڑکے کو کہہ رہا تھا جس کا چچا گجرات کا

سابقہ ایم پی اے تھا۔"

میں نے کہا "چلو دیکھتے ہیں۔"

ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ازیل ہاؤس پہنچے۔ وہاں پہنچے تو سکیورٹی گارڈ بے چین تھا۔ کہنے لگا۔ تم دونوں کہاں تھے۔ نرس دو دفعہ تمہارا پوچھ چکی ہے۔

ہم دونوں سر جھکائے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اتنی دیر میں کیتھرین نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی نیلے رنگ کا بورڈ تھا جس پہ کچھ کاغذ لگے ہوئے تھے۔ آتے ہی اس نے ہم دونوں کے بازو دیکھے۔ نہ میرے اور نہ مقصود کے بازو پہ کسی قسم کا نشان تھا۔ وہ کہنے لگی "تم دونوں کو متلی تو نہیں ہوئی یا ہو رہی ہے۔

میں نے کہا "میرا نہیں خیال۔"

کہنے لگی "اس کا مطلب ہے کل تم دونوں کنٹون جا رہے ہو۔"

میں نے پوچھا "کون سے کنٹون بھیجیں گے۔"

کہنے لگی "یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میرا خیال ہے زیورخ کے آس پاس ہی بھیجیں گے۔"

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ اس کا مطلب ہے مقصود کا انداز ہ ٹھیک تھا۔

میں نے معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پوچھا "ویسے کیتھرین کسی کی رپورٹ میں کوئی مسئلہ بھی آیا ہے۔"

کہنے لگی "ہاں، دو افریقن لڑکوں کو ایچ آئی وی پوزیٹو (HIV positive) نکلا ہے۔ ایک کو ہیپاٹائٹس سی ہے۔"

میں نے پوچھا "اب کیا ہو گا۔"

کیتھرین دکھ بھرے انداز میں بولی "ایڈز والوں کا کوئی حل نہیں البتہ ہیپاٹائٹس والا لڑکا ٹھیک ہو جائے گا۔"

اپنی تسلی کر کے کیتھرین چلی گئی۔ مقصود کہنے لگا "کیا کہتی ہے۔"

"یہی کہتی ہے کہ کل ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ ہماری تمام رپورٹس او کے ہیں۔"

کہنے لگا "کہاں بھیجیں گے؟"

"وہی جو تم نے کہا تھا۔ زیورخ کے آس پاس۔"

ہم دونوں ہال میں داخل ہوئے۔ شام کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ رضا اور سالواتورے ایک کونے میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اب دونوں کے رویے میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ جب کھانا تقسیم ہونے کا اعلان ہوا تو دونوں ایک دم اٹھے اور میزیں کھولنے لگے لمبے لمبے بینچ سیدھے کرنے لگے۔ مجھے دیکھتے ہی رضا بولا: "کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا "میں جھیل کے کنارے گیا ہوا تھا۔ تمہارا کیا بنا۔ فنگر پرنٹس ہو گئے؟ تصاویر بنوالیں؟"

سالواتورے بولا "ہاں یہ کام تو ہو گیا۔ اب انٹرویو باقی ہے۔ اس کے بعد ہمیں بھی دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو باہر جانے کی آزادی ہوگی۔"

میں نے کہا "لیکن میں تو کل جا رہا ہوں۔"

رضا کہنے لگا "سچ مچ جا رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں واقعتاً کل جا رہا ہوں، لیکن تم دونوں کو اپنا ای میل ایڈریس دے کر جاؤں گا۔ رابطے میں آسانی رہے گی۔"

رضا بولا "ٹھیک ہے۔ آج کھانے کے بعد جب ہمیں گارنیکے ہوٹل ٹرانسفر کریں گے تو وہاں جا کے ٹیرس میں خوب گپ شپ لگائیں گے۔ پتا نہیں بعد میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔"

سالواتورے بولا "دیکھیں ادبی حوالے سے آج کون زیرِ بحث آتا ہے؟"

میں نے کہا "چھوڑو یار ادب کو۔ کوئی اور بات کریں گے۔"

رضا بولا "یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ اب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ کھانا تقسیم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہم تینوں بھکاریوں کی طرح قطار میں کھانا لینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اب رضا اور سالواتورے کی انا بھی اس اہتمام سے کمپرومائز کر چکی تھی۔ دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ جو لڑکی کھانا تقسیم کر رہی تھی اس کے سامنے اپنی اپنی پلیٹ کر دی۔ ہم تینوں کھانا لے کر واپس ان لمبی لمبی میزوں پہ آ گئے جن کو ہم نے چند لمحے پہلے کھولا تھا۔ کھانے کے دوران رضا بولا "ایک بات پوچھوں اگر برا نہ لگے۔"

میں نے کہا "پوچھو۔"

"تم اس لڑکے کے ساتھ جھیل پہ گئے تھے۔ وہ شکل سے بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ کوئی خاص

مسئلہ ہے کیا؟"

میں نے کہا" میرا وہ ہم وطن پیارے مسئلے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کاغذات کے مسئلہ میں اُلجھا ہوا تھا اور اس سلسلے سے اسے میری مدد درکار تھی۔"

رضا بولا" اوہ۔۔۔میں اب سمجھا۔"

میں نے کہا" مسئلہ یہ ہے کہ کل ہم جا رہے ہیں۔ نرس نے او کے کی رپورٹ دے دی ہے۔ ابھی جب ہم گارنیکے ہوٹل جائیں گے تو وہاں جن لوگوں کو بچی کراس بھیجا جائے گا ان کی لسٹ پہلے سے لگی ہوگی یا شام تک لگا دی جائے گی۔ اب اس لڑکے کا مسئلہ یہ ہے کہ جس لڑکی سے یہ جھیل کے کنارے ملا ہے وہ جرمن ہے اور یہ محترم کوئی بھی زبان نہیں جانتے۔ اشاروں کی زبان سے گزارا چلاتے ہیں اس کے علاوہ اپنی جنسی صلاحیت عمل میں لاتے ہیں جو بقول ان کے کثرت استعمال سے کم ہوتی جا رہی ہے۔"

سالوا تورے پھکڑپن سے بولا" اسے میری مدد کی ضرورت ہو تو میں تیار ہوں۔"

ہم تینوں نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ آس پاس بیٹھے لوگ ہمیں دیکھنے لگے۔ مقصود اور موٹا ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے کھانا ختم کیا اس کے بعد وہی پیلے رنگ کا قہوہ جسے میں چینی کے چار پانچ چمچ ڈال کے پی لیا کرتا تھا۔ رضا اور میں نے تو پی لیا لیکن سالوا تورے کے لیے مسئلہ تھا۔ اس کے لیے میں آج بھی کچن سے جا کے کافی لے آیا۔ وہ بہت حیران ہوتا جب میں اس کے لیے کافی لے کر آتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک آ جاتی جیسے کسی بچے کو کھلونا مل جائے۔ اس کے بعد ہم تینوں جا کے باغ میں بیٹھ گئے جو کہ اس گندے نالے کے کنارے تھا۔ جس سے اب بو نہیں آتی تھی۔ ان دس دنوں میں، میں نے نوٹ کیا کہ گھاس کافی حد تک جل چکی ہے۔ ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی ہوگی کہ سکیورٹی گارڈز نے آ کے اعلان کیا کہ سب کو گارنیکے ہوٹل منتقل کیا جا رہا ہے۔ پھر وہی ٹویوٹا وین تھی جس میں ہم روز جاتے تھے۔ آج اس وین کا ڈرائیور وہی موٹا آدمی تھا جس نے مجھے پہلے دن اس جگہ بٹھایا تھا جہاں وہ کتے کو بٹھایا کرتا تھا۔ آج بھی جب وین بھر گئی تو اس نے رضا کو کتے والی جگہ بیٹھنے کو کہا۔ میں نے رضا کو پکڑ کے ایک طرف کر دیا اور کہا" یہاں مت بیٹھنا۔ یہ جگہ کتے کے بیٹھنے کی ہے۔ ویسے بھی اسے اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔ یہ ایک چکر زیادہ لگا لے گا۔"

اس موٹے کو میری بات سمجھ نہ آئی لیکن وہ یہ جان گیا کہ میں نے رضا کو منع کیا ہے۔ اس

دوران سکیورٹی گارڈ قریب آ گیا تو اس نے پوچھا: کیا مسئلہ ہے؟ میں نے اس کو ساری تفصیل بتائی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ڈرائیور کو بہت غصہ آیا۔ مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگا۔ وین سٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔ میں رضا اور سالواتورے اگلے اور آخری پھیرے کا انتظار کرنے لگے۔ کافی دیر بعد وہ موٹا ڈرائیور وین لے کر آیا ہم تینوں مزے سے پچھلی سیٹوں پہ بیٹھ گئے۔ وہ ڈرائیور اتنے غصے میں تھا کہ اس نے ہم تینوں کو جرمن زبان میں بے شمار گالیاں دیں۔ مجھے ایک ہی بات سمجھ آئی۔ شائیزے، آ شلوکھ۔ ان دس دنوں میں جرمن زبان کی یہ دو گالیاں سیکھی تھی۔ میں نے رضا اور سالواتورے کو نہ بتایا ورنہ ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ قانوناً تو ہم اس پہ گالیاں دینے کا مقدمہ کر سکتے تھے لیکن آج جو کچھ اس کے ساتھ ہو گیا تھا کافی تھا۔ میرے خیال میں یہ موٹا بہت زیادہ تعصب پسند تھا۔ وہ غصے سے وین کا سٹیئرنگ موڑتا ہوا ہمیں گارٹینگلے ہوٹل لے آیا۔ اس نے انجن سوئچ آف کیا اور وین سے اتر کے کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا کہ ہم اتریں تو وہ جائے۔ ہم لوگ شرارتاً وین میں بیٹھے رہے اس نے تھوڑا سا انتظار کیا اس کے بعد وین کا سلائیڈنگ ڈور کھولا اور غصے سے کہنے لگا: ''بتے۔'' اس نے بتے اس انداز میں کہا جیسے کہہ رہا ہو، شائزے۔ ہم تینوں مسکراتے ہوئے وین سے اُترے اور اُسے کہا ''فیلن دانک یعنی بہت شکریہ۔'' اس نے بنا جواب دیئے وین کا سلائیڈنگ ڈور بند کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اور وین لے کے چلا گیا۔ مجھے اس بات کی جلدی تھی کہ میں فوراً ڈائینگ ہال جاؤں اور جا کے ٹرانسفر لسٹیں دیکھوں۔ یہاں سکیورٹی گارڈ نے ہمیشہ کی طرح ہمیں چیک کیا اس کے بعد ہم ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ راستے میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اپنی مخصوص جگہ جا کے شاور لیا۔ میرے نقش قدم پہ چلتے ہوئے رضا اور سالواتورے نے بھی شاور لیا۔ نہا دھو کے جب ہم فارغ ہوئے تو میں نے کہا ''چلو میس پہ چلتے ہیں۔'' ابھی شام کے ساڑھے سات بجے ہوں گے لیکن باہر دن کی طرح کا سماں تھا۔

رضا بولا ''تمہیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ تمہارا لسٹ میں نام ہے کہ نہیں۔''

میں نے کہا ''کہہ سکتے ہیں۔''

ہم تینوں اندر کی سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے میس پہ آ گئے۔ میں نے نوٹس بورڈ پہ جا کے لسٹیں دیکھیں۔ بکی کرائس والی لسٹ میں میرا ابھی نام تھا۔ لیکن یہاں یہ نہیں لکھا تھا کہ کرائس کون سی ہے۔ میں نے آ کے رضا اور سالواتورے کو بتایا ''میرا نام لگ گیا ہے۔ کل میں جا رہا ہوں۔''

میں جب لسٹ میں اپنا نام دیکھ رہا تھا مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے امتحانات کا نتیجہ نکل آیا ہو۔

رضا ایک طویل ٹھنڈی آہ بھر کے کہنے لگا ''اچھا تو تم ہمیں چھوڑ کے جا رہے ہو۔''

میں نے کہا ''تم لوگ بھی یہاں رُکنے کو تھوڑی آئے ہو۔ چند دنوں میں تمہیں بھی یہاں سے جانا ہوگا۔''

سالواتورے بولا ''میں تو شکر کروں گا جب اس جہنم سے جان چھوٹے گی۔''

رضا بولا ''تم کہاں جا رہے ہو۔''

میں نے کہا ''بس وہاں کنٹون ٹرانسفر لکھا ہوا ہے۔ جگہ کا نام نہیں لکھا۔''

مقصود ہانپتا ہوا آیا ''تم نے دیکھا ہے میرا نام بھی لسٹ میں ہے۔''

میں نے کہا ''میں نے غور نہیں کیا۔''

کہنے لگا ''مجھے تو لگتا تھا کہ مجھے یہاں روک لیا جائے گا اور تو اور۔۔۔ انہوں نے جگہ کا نام کیوں نہیں لکھا، پلیز تم ان سے پوچھ کے بتاؤ کہ ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''تم کہتے ہو تو میں پوچھ لیتا ہوں لیکن سکیورٹی گارڈ کو کچھ نہیں پتا ہوتا۔''

میں نے رضا اور سالواتورے سے اجازت لی اور سکیورٹی گارڈ سے پوچھا کہ کل ہمیں یہاں سے ٹرانسفر کر رہے لیکن اس پہ لکھا نہیں ہے کہ کہاں بھیجیں گے۔''

کہنے لگا ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ کہاں بھیجیں گے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو زیورخ کنٹون میں ہی رکھا جائے گا۔ اس کے آس پاس ونٹرتھور (Winterthure)، اور بیول (Ohrbuhl) اورلیکون (Orlekon) ہیں۔ اس کے علاوہ اور چھوٹے مقامات ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ تم کیسے جانتے ہو۔''

کہنے لگا ''ہم جس ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں اس کا نام ہے سکیوریتاس۔ تم نے یہ نام ضرور سنا ہوگا۔ اس کا ہیڈ آفس زیورخ میں ہے۔ ہماری ڈیوٹی ان تمام مقامات پہ لگتی رہتی ہے۔ اس لیے مجھے پتا ہے کہ کون کون سے مقامات ہو سکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''بہت شکریہ۔''

میں نے آ کے مقصود کو بتایا ''وہ کہتا ہے اسے یقین سے نہیں پتا لیکن اس کا اندازہ ہے کہ ہمیں زیورخ بھیجا جائے گا۔''

کہنے لگا "میں اس لڑکی کو کیسے بتاؤں گا۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس اس کا موبائل نمبر ہے۔"

کہنے لگا "ہاں ہے۔"

"جب ہم ازیل ہائم سے نکلیں گے تو اس کو فون کریں گے۔"

وہ کہنے لگا "مجھے تو زبان نہیں آتی۔"

میں نے کہا "میں بات کروں گا۔ اس کو سمجھا دوں گا۔"

وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "کل ملتے ہیں۔"

وہ چلا گیا اور ہم تینوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آج میرس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کافی گرمی تھی اس لیے سارے لوگ میرس کا رخ کر رہے تھے۔ مجھے لوگ آ کر مبارک دے رہے تھے کہ میں ہر کی کرائس میں جا رہا ہوں۔ ایک شخص جو کسی ایسٹرن یورپین ملک کا تھا مجھے کہنے لگا۔ تمہیں اگر زیورخ بھیجا گیا تو تم بہت جلد کوئی نہ کوئی لڑکی پھنسا لو گے۔ میری رائے ہے وہاں ڈسکو تھیک ضرور جانا۔ اگر تمہیں ڈانس آتا ہے تو لڑکیاں تمہارے آگے پیچھے ہوں گی۔ تم چند دنوں میں کابریو (ایک قسم کی کار) میں گھومو گے۔ وہ مجھے بیٹھے بیٹھے بڑے بڑے سپنے دکھا رہا تھا۔ رضا اور سالوا تورے بولے "تم تو یہاں کافی ہر دلعزیز ہو۔"

میں نے کہا "ان میں سے چند مجھے دس دنوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ جان گئے ہیں کہ میں کسی سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتا نہیں اور سب سے گھل مل کر رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

رضا بولا "اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم تین یورپین زبانیں جانتے ہو۔"

میں نے کہا "کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے۔"

رضا کہنے لگا "دل تو چاہتا ہے کہ ساری رات بیٹھ کے باتیں کرتے رہیں لیکن ابھی سکیورٹی گارڈ آ جائے گا اور کہے گا کہ میرس خالی کر دو۔"

رضا نے ابھی اس خدشے کا اظہار کیا ہی تھا کہ سکیورٹی گارڈ آ گیا اور کہنے لگا "میرس خالی کر دو۔"

میں نے کہا "رضا لگتا ہے اس نے تمہاری آواز سن لی ہے۔"

ہم سب نے آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کر دیا۔

رضا اور سالوا تو رے یک زبان ہو کر بولے" صبح ملاقات ہوگی یا ایسے ہی چلے جاؤ گے۔"

میں نے کہا" ظاہر ہے۔ ہم لوگ ناشتہ اکٹھے کریں گے۔ اس کے بعد جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے دس بجے نکلیں گے۔"

سکیورٹی گارڈ نے شور کرنا شروع کر دیا۔ جلدی کرو۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ ہم سب نے مل کے کرسیاں اکٹھی کیں اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچتے ہی دوسری منزل پہ اپنے بستر پہ پہنچ گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ مجھے جلدی نیند آ جائے لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے یہاں سے جانا تھا ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی جنت میں چلا جاؤں گا۔ میری دنیا بدل جائے گی۔ سر دست مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے کہاں بھیجا جائے گا۔ میں اُس انٹرنیٹ کیفے کے بارے میں سوچنے لگا جہاں میں اپنا موبائل فون چھوڑ کے آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کل جب میں جاؤں گا تو سٹیشن پہ جانے سے پہلے میں اس نیٹ کیفے سے اپنا موبائل فون بھی لے لوں۔ معلوم نہیں کتنے بندے میرے ساتھ ہوں گے؟ پتا نہیں جا سکوں گا کہ نہیں؟

O

رات کے دس بجے گھر کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے ثقلین کھڑا تھا۔

میں نے کہا "خیریت ہے۔ ثقلین صاحب آج کل بہت دیر سے آتے ہیں۔"

وہ بولا "فرشتہ صاحب آپ کو بتایا تھا کہ فیکٹری میں بہت زیادہ کام ہے۔ یہ ہفتہ ایسے ہی گزرے گا۔ اس دفعہ تو ہفتے کو بھی کام پہ جانا ہے۔"

میں نے کہا "آپ کا اگلا باب تیار ہے۔"

"فرشتہ صاحب مجھے اب تک پتا نہیں چلا کہ آپ موبائل فون کیوں نہیں استعمال کرتے۔"

"ثقلین صاحب آپ ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں۔ ویسے یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ بس ویسے ہی۔"

"چلیں آپ نہیں بتانا چاہتے، آپ کی مرضی۔"

میں نے کہا "آگے چل کے آپ کو پتا چل جائے گا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں لیکن کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ کسی کی بات دل کو چھو جاتی ہے۔ اس کا انسان پہ بہت اثر ہوتا ہے۔"

وہ استفہامی انداز میں بولا "نیا کش بھائی؟"

"وہ سو گئے ہیں۔ انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ ناراض ہو گئے ہیں یا آپ پر ہماری کوئی

بات گراں گزری ہے۔"

وہ بولا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ورنہ میں آتا ہی کیوں؟"

میں نے پوچھا "چائے پیتی ہے؟"

وہ بولا "نہیں صبح جلدی اُٹھنا ہے۔"

میں نے کہا "جیسی آپ کی مرضی۔"

میں نے اگلا باب دیا۔ ثقلین نے باب ہاتھ میں پکڑا اور کہنے لگا "میں چلتا ہوں۔"

میں دروازے تک اسے چھوڑنے آیا۔

OOO

رات کو سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح سکیورٹی گارڈ کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ آج ۲۰۰۲ء، جون کی ۲۵ تاریخ تھی۔ آج پہلا سیمی فائنل تھا۔ جرمنی اور ساؤتھ کوریا کا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا۔۔۔ ایک مجھے کیا اکثریت کو یقین تھا کہ جرمنی جیت جائے گا۔ میں سوچنے لگا نہ جانے میں سیمی فائنل دیکھ سکوں گا کہ نہیں۔ خیر میں نے میچ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا اور باتھ کی طرف نکل گیا۔ میں اسی باتھ میں گیا جس میں کوئی نہیں جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے شاور لیا۔ دانت صاف کیے۔ اس کے بعد ہم سب ہال میں اکٹھے ہو گئے۔ جن لوگوں کو کنٹون جانا تھا ان سے کہا گیا کہ اپنے اپنے بستر کی چادر، تکیہ کا غلاف اوپر اوڑھنے والی چادر، تولیہ غرض جو بھی چیزیں انھیں فراہم کی گئی تھیں نیچے پہلی منزل پہ جا کے جمع کروا دیں۔ ہم سب نے اپنی اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور نیچے چلے گئے جہاں ایک افریقن لڑکا اور ازیل ہائم کا ایک ملازم کھڑا تھا۔ وہ چادریں علیحدہ جگہ ڈال رہے تھے اور غلاف علیحدہ۔ یہ کام روز ہوتا تھا لیکن ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی چادریں اس تھیلے میں ڈالیں جہاں وہ افریقن چادریں اکٹھی کر رہا تھا اور دوسرے تھیلے میں تکیے کا غلاف ڈال دیا۔ جب ہم لوگ اس کام سے فارغ ہوئے تو سکیورٹی گارڈ نے کہا۔ ٹرانسفر کے لیے وین تیار ہے۔ ہم سب لوگ وین کی طرف دوڑے۔ باقی لوگ پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں یہ دیکھ کے خوش ہوا کہ وہ موٹا ڈرائیور ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا۔ ہم جیسے ہی وین میں بیٹھے ڈرائیور نے وہ ٹویوٹا وین سٹارٹ کر دی۔ میں نے مڑ کے گارنیگے ہوٹل پر الوداعی نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ میں اس گارنیگے ہوٹل کی عمارت میں دس دن رہا لیکن ایسا لگنے لگا جیسے میں یہاں بہت عرصے سے رہ رہا ہوں۔ میں نہ صرف اس عمارت

کو آخری دفعہ دیکھ رہا تھا اس ٹویوٹا وین میں بھی میرا آخری سفر تھا۔ مجھے یہاں کرائس لنکن میں بھی اب چند گھنٹے ہی رکنا تھا۔ میں وین میں بودن سے یعنی لاگودی کوستانزا یعنی کوستانزا اجیل کے بارے میں سوچنے لگا۔ آگاتھو کے بارے میں سوچنے لگا۔ راستوں پر سجائی ہوئی خوبصورت اور رنگ برنگی سوانز کے بارے میں سوچنے لگا۔ وین ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ میں بھی خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔ وین سے اتر کے ہمیں فوراً ہال میں جانا تھا۔ وہاں پہ ناشتہ تیار تھا۔ وہی بریڈ، پیلی چائے، مکھن اور جیم کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں۔ یہاں پہ مقصود بھی تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے یا کوئی خطرناک بیماری لگ گئی ہے۔ میں نے کہا "مرے کیوں جاتے ہوں۔ ناشتہ کر کے اس لڑکی کو فون کرنے کا کوئی طریقہ نکالتے ہیں۔"

رضا اور سالواتورے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کہا "تم لوگ کب آئے۔"

رضا بولا "آج ہم دونوں کا انٹرویو بھی ہے اور پیشاب اور خون کا ٹیسٹ بھی۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

سالواتورے حسبِ معمول بولا "میں تو شکر کروں گا جب اس جہنم سے جان چھوٹے گی۔"

میں اس کے منہ سے یہ فقرہ بیسیوں بار سن چکا تھا۔

رضا بولا "نہیں یار یہاں نہ آتے تو ایک دوسرے سے ملاقات کیسے ہوتی۔"

سالواتورے بولا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" پھر بولا "فرشتہ تم اپنا ای میل ایڈریس دو اور اگر کوئی موبائل نمبر ہے تو وہ بھی دے دو۔"

میں کچن میں گیا۔ اسی لڑکی سے جس سے میں روز کافی لے کر آتا تھا۔ کاغذ اور پین لایا۔

اس پہ انھیں اپنی ای میل آئی ڈی لکھ کر دی۔ رضا کہنے لگا "میری بھی لکھ لو۔"

میں نے کہا "تم لوگ یہاں سے نکلو گے تو اپنی میل دیکھو گے نا۔"

رضا بولا "پھر بھی لکھ لو۔ اس نے اور سالواتورے نے اپنی اپنی ای میل آئی ڈی لکھ کر دی۔

مجھے مقصود نے بلایا۔ کہنے لگا "کسی طریقے سے اس لڑکی کو فون کرو۔"

میں نے کہا "اچھا کرتا ہوں۔"

میرے پاس پیسے تو تھے نہیں۔ میں اسی لڑکی سے ایک سوئس فرانک لایا جو مجھے سالواتورے

کے لیے کافی بنا کے دیا کرتی تھی۔اس ہال میں ایک ٹیلی فون بوتھ بھی تھا جس میں سکے ڈالتے تھے لیکن میں نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ فون کسے کرتا؟اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے پاس یہاں پیسے تھے ہی نہیں۔ خیر میں نے فون بوتھ میں جس جگہ سکہ ڈالتے ہیں اس سلاٹ میں سکہ ڈال دیا۔مقصود مجھے نمبر بولتا گیا اور میں ڈائیل کرتا گیا۔ جب نمبر ڈائیل کر چکا تو فون کا ریسیور میں نے کان کے ساتھ لگا لیا۔فون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن فون کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔کافی دیر گھنٹی بجنے کے بعد دوسری طرف سے کیسٹ بولنے لگی۔ میں نے کیسٹ میں اپنا پیغام ریکارڈ کروایا اور ریسیور رکھ دیا۔

مقصود کہنے لگا" اس نے فون نہیں اٹھایا۔اب جانے سے پہلے اس سے ملاقات بھی ہوگی کہ نہیں۔"

میں نے کہا" میں نے پیغام ریکارڈ کروا دیا ہے۔دس بجے کا وقت بتا دیا ہے۔اگر اس نے آنا ہوا تو آجائے گی۔"

مگر مقصود کی مسلسل بڑھتی ہوئی بے چینی نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔سکیورٹی گارڈ نے ہمارے نام پکارے۔ میں رضا اور سالواتورے کے پاس گیا دونوں سے گلے ملا ، مجھے رضا سے بچھڑنے کا صحیح معنوں میں دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے دل میں یہی دعا کی کہ اس سے دوبارہ ضرور ملاقات ہو۔ کیونکہ رضا نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔سکیورٹی گارڈ ہمیں لے کے چل دیا۔ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ سکیورٹی گارڈ ہمیں اسی عمارت کے پاس لے آیا جہاں میں پہلے دن اور اس کے بعد بھی کئی دفعہ آ چکا تھا۔اس نے کارڈ مشین کے سامنے کیا۔ وہی چھوٹا سا لوہے کا دروازہ کھل گیا۔ ہم سب اندر داخل ہوئے۔ میں یہاں کئی دفعہ آیا تھا لیکن کبھی غور ہی نہ کیا کہ ایک طرف ریلوے سٹیشن طرز کی کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جہاں سے ٹکٹ لیتے ہیں۔سکیورٹی گارڈ نے کہا" اس قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔"

ہم نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی بتائی ہوئی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سامنے تین کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جس طرح ریلوے سٹیشنوں پہ عموماً بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر کھڑکی کے پیچھے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر کھڑکی کے سامنے قطار بنی ہوئی تھی۔ جس قطار میں میں اور مقصود کھڑے تھے اس قطار کا ایک بندہ ہاتھ میں ایک کاغذ وصول کر کے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس طرح قطار آگے چلتی گئی۔ لوگ جاتے گئے۔ آخر کار میں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے میری باؤس وائس دیکھی اور میرے ہاتھ میں ٹرین کا ایک ٹکٹ پکڑا دیا۔ اس کے بعد مجھے ہاتھ میں ایک فوٹو

سٹیٹ کیا گیا کاغذ تھمایا۔ اس پہ کوئی نقشہ بنا ہوا تھا۔ اور پیلے رنگ کے ہائی لائٹر کے ساتھ ایک لائن ہائی لائٹ کی گئی تھی۔ وہ مجھے سمجھانے لگی کہ میں نے تم کو کرائس لنگن سے زیورخ کا ٹکٹ دیا ہے۔ تم نے کرائس لنگن سے ونٹرتھور جانا ہے۔ وہاں سے زیورخ کی ٹرین پکڑنی ہے۔ اس کے بعد سٹیشن سے نکل کے اس راستے پہ جانا۔ یہ جگہ سٹیشن کے پاس ہی ہے۔ قریباً دس منٹ پیدل کا راستہ ہے۔ یہاں تم نے جا کے رپورٹ کرنی ہے، سمجھ گئے نا۔۔۔ میں نے کہا سمجھ گیا اور یہ کہہ کے میں کھڑکی کے آگے سے ہٹ گیا۔ اب مقصود کی باری تھی۔ اس نے مقصود کو بھی یہی کچھ کہا، سارا کچھ سمجھایا۔ پھر کہا کہ سمجھ آ گئی ہے تو مقصود میری شکل دیکھنے لگا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا، اس کو میں سمجھا دوں گا۔ وہ کہنے لگی اس نے وہیں جانا ہے جہاں تم نے جانا ہے۔ اس کو ساتھ لے جانا۔ میں نے کہا، ظاہر ہے اس کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ پھر بولی اب تم فارغ ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے جیل سے رہائی مل گئی ہو۔ میں تو اس عمارت سے خوشی خوشی نکلا لیکن مقصود کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا جب میں نے سوزی کو فون کیا تھا اور وہ نہیں آئی تھی لیکن اب میں اس غم کو بھول چکا تھا۔ ہم نے سکیورٹی گارڈ کو اپنی ہاؤس وائس دکھائی اور ٹکٹ بھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اس عمارت کے سامنے جون کی ۱۵ تاریخ کو غلطی سے آ گیا تھا۔ میں نے گھنٹی پہ ہاتھ بھی رکھا تھا۔ آج میں یہاں سے جا رہا تھا۔ آج میں آزاد تھا، مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں بہت عرصہ بعد کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ ہم لوگ ابتدائی ایام سے قطع نظر، قریباً روز ہی دن میں دو دفعہ دو دو گھنٹے کے لیے باہر جاتے تھے لیکن اس میں عجیب قسم کی پابندی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی غلام کو تھوڑی دیر کے لیے آزادی ملی ہے۔ لیکن اب مکمل آزادی تھی۔ ہم دونوں اسی بیرک نما عمارت کے سامنے سے گزرے جہاں میں پہلے دن آیا تھا اور اندر بیٹھ کے بڑی حسرت سے باہر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا تھا۔ میں نے اپنی آزادی خود سلب کی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی رات اس بیرک نما عمارت کی زمین پہ کمبل بچھا کے گزاری تھی۔ کس طرح اس کمرے سے ملحق باتھ روم کی ٹونٹی سے پلاسٹک کے گلاس میں پانی پیا تھا۔ مجھے اس گندے نالے سے کتنی بو آئی تھی۔ بو کے بھبھوکے میری ناک سے گزر کے دماغ میں گھس گئے تھے۔ اتنا برا حال تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ لیکن اب بالکل محسوس نہ ہوا کہ اس گندے نالے سے بو آ رہی ہے۔ ہم دونوں اس نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سٹیشن کے اسی سب وے سے گزرے جہاں میں نے پہلے دن دو چکر لگائے تھے۔ مقصود بالکل چپ اور میں اپنے خیالوں میں مگن تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ٹرین کے آنے میں تھوڑی

دیر ہوئی تو میں انٹرنیٹ کیفے سے اپنا موبائل فون لے آؤں گا۔ ہم سب وے سے نکل کے سٹیشن پہ آ گئے۔ ہمارے پاس ٹرین کے ٹکٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں پیسے نہیں دیئے تھے۔ بس ٹرین ٹکٹ ہی ہمارا کل اثاثہ تھی۔ میرا خیال تھا ازیل ہائم سے نکلنے سے پہلے کسی سے ایک دو سوئس فرانک لے لوں گا اور مقصود کی معشوق کو فون کر دوں گا کہ ہم لوگ زیورخ جا رہے ہیں لیکن سارا کچھ اتنا جلدی ہوا کہ مجھے موقع ہی نہ ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ رضا اور سالواتورے کو خدا حافظ کہوں گا لیکن ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے ان سے ای میل آئی ڈی لے لی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اُن سے رابطہ رکھوں لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب ممکن ہو پائے گا یا نہیں۔

ہم دونوں ریلوے سٹیشن پہ آ کے کھڑے ہو گئے۔ ٹرین کے آنے میں چندرہ منٹ باقی تھے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں انٹرنیٹ کیفے سے جا کے اپنا موبائل فون لے لیتا۔ اس طرح میری ٹرین نکل جاتی اور اگلی ٹرین دو گھنٹے بعد تھی۔ مقصود نے پوچھا "تمہارے پاس پیسے ہیں؟"

میں نے کہا "میں بھی تمہاری طرح قلاش ہوں۔ میرے پاس پیسے کہاں سے آئے؟"

"اس کو فون کرنا ہے۔ اس کو بتانا ہے کہ ہم لوگ زیورخ جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے سامنے فون تو کیا تھا مگر اس نے اٹینڈ ہی نہیں کیا۔۔۔ خیر میں نے پیغام تو ریکارڈ کروایا ہے۔ اب اگر اُسے آنا ہوا تو ضرور آئے گی۔"

مقصود کہنے لگا "وہ موٹا لڑکا تم جانتے ہو، وہ کہتا تھا اگر تمہاری شادی ہو گئی اس عورت سے تو تمہیں "بے" مل جائے گی۔"

میں نے کہا "واہیات آدمی، بیوی کیا "بے" ہوتی ہے؟"

وہ بولا "میرا مطلب پنجابی والی بے بے نہیں بلکہ جرمن بے ہے یعنی وہ باؤس وائس جس پہ بے لکھا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میرے لیے یہ افسوس ناک بات ہے مقصود کہ تمہیں اس عورت سے کوئی لگاؤ نہیں مگر بے کے چلے جانے کا دُکھ ہے۔"

مقصود بولا "فرشتہ، میرا اس عورت سے کیا لینا دینا۔ نہ جانے کتنے مردوں کے ساتھ سو چکی ہے۔ مجھے کاغذ مل جائیں تو بھاڑ میں جائے۔"

میں یہ بات سن کے چپ ہو رہا۔ آج میچ بھی تھا۔ ساؤتھ کوریا اور جرمنی کا۔ مجھے یقین تھا

جرمنی جیتے گا۔ سٹیشن پہ اتنی گہما گہمی نہیں تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پہ آ کے رکی۔ ہم دونوں جلدی سے ٹرین میں سوار ہوئے۔ ہمارے پاس ٹکٹ تھا، باؤس وائس تھی۔ جہاں ہم نے جانا تھا وہاں کا نقشہ تھا۔ ٹرین چند منٹ رکی اس کے بعد ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ چلی۔ میں نے کرائس لنگن پہ آخری نظر ڈالی۔ یہاں کی جھیل، وہ سوانز جو کرائس لنگن کی مختلف جگہوں پہ سجائی گئی تھیں۔ ہر سوانز دوسری سے مختلف تھی۔ پھر وہ جھیل میں رنگ برنگے بادبانوں والی کشتیاں۔ جھیل کے درمیان جرمنی اور سوئس کا بارڈر۔۔۔ گارنیگے ہوٹل جس میں ہم رات کو سونے جاتے۔ وہ بیرک نما عمارت۔ جہاں میں پہلے دن آیا تھا۔ وہ ہال جس میں ہم کھانا کھاتے تھے۔ انگا تھو، وہاں پی ہوئی چائے، وہاں کے نیشنل جیوگرافک میگزینز جو میں بغیر پڑھے گارنیگے ہوٹل میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ وہ ٹویوٹا وین جس میں ہمیں لایا لے جایا جاتا تھا۔ وہ موٹا ڈرائیور جس نے مجھے وین میں کتے والی جگہ بٹھایا تھا۔ وہ فرنچ نرس جو مجھے خوبصورت لگتی تھی۔ وہ عورت جو بہت کرخت انداز سے بولتی تھی۔ جس کو اس مراکش کے لڑکے نے دھوکہ دیا تھا۔ وہ اطالین سکیورٹی گارڈ، وہ موٹا آدمی جو ہمیں گارنیگے ہوٹل میں کبھی کبھی کھانا تقسیم کرتا تھا۔ جو بالکل پاکستانی گلوکار عدنان سمیع خان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ہمارا ٹیرس پہ بیٹھنا۔ میری، رضا اور سالواتورے کی ملاقات وانتے اور بوکاچو کی بابت شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو۔۔۔ تصورات کی ٹرین چلتی رہی اور میں کرائس لنگن میں گزرے واقعات کو ذہن میں لاتا رہا۔ ان گیارہ دنوں میں ایسے لگتا تھا جیسے میں یہاں کئی سال اقامت پذیر رہ کر جا رہا ہوں۔ ٹرین چلتی رہی۔ مقصود کچھ نہ بولا۔ اس کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ عورت ریلوے سٹیشن پہ نہیں آئی تھی۔ ٹرین فرائن فیلڈر ریلوے سٹیشن پہ رکی۔ چند منٹ رک کے ٹرین پھر چل پڑی۔ مقصود بولا "اگر ہمیں زیورخ ہی رکنا پڑا تو بہت اچھا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ کیوں۔"

"کیوں کہ وہاں مجھے کام مل جائے گا۔ وہاں مونے کے چچا کا اپنا کاروبار ہے۔ اس نے مجھے اس کا فون نمبر دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

مقصود کے دماغ میں نہ جانے کیا ہل چل مچی ہوئی تھی لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم جس دفتر میں جا رہے ہیں وہ کیسا ہوگا۔ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کم از کم اتنا ضرور تھا کہ اب بارہ بجے کھانے کے میز نہیں کھولنے پڑیں گے۔ اتنے دن صبح چھ بجے ناشتہ کرنا، بارہ بجے دن کا کھانا کھانا اور رات کا کھانا

شام کے چھ بجے کھانا۔ ایک عادت سی بن گئی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور جیب میں پیسے بھی نہیں تھے۔ میری یہی خواہش تھی کہ میں اور مقصود جلد از جلد اپنی منزل مقصود پہ پہنچ جائیں۔ ٹرین چلتی رہی۔ آخر ونٹرتھور کے بورڈ نظر آنے شروع ہوئے۔ ٹرین جیسے ہی ونٹرتھور ریلوے سٹیشن پہ رکی، ہم دونوں تیزی سے ٹرین سے اُترے۔ یہاں سے ہم نے زیورخ کی ٹرین لینی تھی۔ میں سٹیشن پہ لگے ہوئے بڑے بڑے ڈسپلیز پہ دیکھنے لگا کہ زیورخ کے لیے اگلی ٹرین کون سی ہے۔ ایک طرف آنے والی ٹرینوں کا لکھا ہوا تھا جو زیورخ سے آ رہی تھیں اور آگے جا رہی تھیں اور دوسری طرف جانے والی ایسی ٹرینوں کا لکھا ہوا تھا جو زیورخ جا رہی تھیں۔ یہاں ہر سٹیشن پہ چار زبانوں میں معلومات تحریر ہوتی ہیں۔ اٹالین، جرمن، فرنچ اور چتر ورومانو زیورخ جانے والی ٹرین ساتھ والے پلیٹ فارم پہ کھڑی تھی۔ ہم ایک لمحے کے لیے دیر کر دیتے تو اگلی ٹرین پہ جانا پڑتا۔ ہم دونوں ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹوں کی آواز کے ساتھ ٹرین کے دروازے بند ہو گئے ہم دونوں جس کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے اس کی سیٹیں بڑی جدید تھیں۔ کہیں دائرہ بنا ہوا تھا۔ کہیں تکون بنی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہیں ہم لوگ کسی غلط ٹرین میں تو نہیں بیٹھ گئے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ ٹرین "یوروسٹار" تو نہیں۔ وہ کہنے لگا یہ عام ریجنل ٹرین ہے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ مجھے اٹلی کی ٹرینوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن وہاں کی ریجنل ٹرین کا تو برا حال ہے۔ میں سوچنے لگا اگر یہ ریجنل ٹرین ہے تو یوروسٹار کا کیا حال ہوگا۔ جب میں لوگانو سے آیا تھا اس وقت میں ذہنی طور پر کہیں اور تھا اس لیے میں نے سوچا ہی نہ تھا کہ میں کس قسم کی ٹرین میں بیٹھا ہوں۔ ہمیں ٹرین میں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ زیورخ کے سائن بورڈ نظر آنے لگے۔ مقصود نے پوچھا "ہم لوگ جب ٹرین سے اُتریں گے تو کہاں جائیں گے؟"

میں نے کہا "تم فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہمارے پاس جو نقشہ ہے اس پہ سارا راستہ بنا ہوا ہے۔ ہم اس پیلے نشان کو دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے اور اس جگہ پہنچ جائیں گے۔" (میں نے اسے نقشہ دکھاتے ہوئے کہا)

ٹرین رُکی ہم دونوں ٹرین سے اُترے۔ یہ وہی ریلوے سٹیشن تھا جہاں مجھے سوزی سے ملنے کی اُمید تھی۔ اب میں کسی سوزی کے انتظار میں نہیں تھا۔ وہی پلیٹ فارم، سٹیشن پہ بنے ہوئے وہی چھوٹے چھوٹے کیبن جن میں سینڈوچ اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جب میں لوگانو سے یہاں آیا تھا۔ یہاں اتر کر میں نے سینڈوچ کھایا تھا، کوک پی تھی۔ یہیں میں نے اپنی جیب خالی کی

تھی۔ اب میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ صرف ٹکٹ تھا بلکہ وہ بھی اب استعمال ہو چکا تھا۔ اب ہمیں زیورخ ریلوے سٹیشن سے پیدل جانا تھا۔ یقیناً یہاں سے کوئی نہ کوئی بس بھی جاتی ہوگی لیکن ہمیں انہوں نے بس کا ٹکٹ نہیں دیا تھا۔ وہی الیکٹرونک ڈسپلے تھے۔ سٹیشن پہ گہما گہمی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ یہاں کرائس لنگن کی طرح نہیں تھا۔ بہت سے ٹورسٹ، مہاجرین اور دیگر لوگ تھے۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن سے باہر نکلے۔ زیورخ ریلوے سٹیشن کے باہر بڑا سا گھڑیال نصب تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں فلم بیک ٹو دا فیوچر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے نقشہ دیکھا۔ اس پہ ہم جس طرف کھڑے تھے اس کے سامنے ٹرام کا سٹاپ تھا۔ ہم دونوں نے ریلوے سٹیشن کا چکر لگایا۔ ہمیں باہن ہوف پلاٹز (Bahnhof Platz) پہ آنا تھا۔ میں نقشے کے مطابق وہاں پہنچا۔

مقصود بولا "تمہیں یقین ہے کہ ہم وہ دفتر ڈھونڈ لیں گے۔"

میں نے کہا "تم مجھ پہ اور نقشے پہ بھروسہ رکھو۔"

باہن ہوف پلاٹز کے سامنے تین سڑکیں تھیں۔ ایک تو باہن ہوف سٹرازے (Bahnhof Strasse) تھا یہ سڑک بہت بڑی تھی۔ اس پہ بڑے بڑے سٹورز واقع تھے۔ دوسری سڑک لنتھ ایسکر (Linthesker) تھی ہمیں لووِن سٹرازے (Lowenstrasse) پہ جانا تھا۔

میں نے مقصود سے کہا "مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

ہم دونوں لووِن سٹرازے پہ پہنچے یہاں سے چلتے چلتے ایک چوک میں پہنچے۔ یہاں سے دو تین سڑکیں نکلتی تھیں۔ اس کے ایک طرف ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں دوسری جنگِ عظیم کی کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ایک شخص کو روک کے پتا پوچھا۔ وہ کہنے لگا۔ یہاں سے دس منٹ کا راستہ ہے۔ میں نے کہا۔ دس منٹ تو انہوں نے ہمیں بتایا تھا۔ ہم دس منٹ سے زیادہ چل چکے ہیں۔ خیر ہم اس کے بتائے راستے پہ چل دیے۔ تھوڑی تگ و دو کے بعد ہمیں وہ دفتر مل گیا۔ وہاں اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ ایک کاؤنٹر پر کئی قسم کے پمفلٹ پڑے تھے۔ کاؤنٹر کلرک کے پاس کوئی سائل کھڑا تھا۔ میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگا، جیسے ہی وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹا میں نے اپنے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے مجھے ٹرین کا ٹکٹ دیا۔ اس کے بعد مجھے بتایا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ میں نے اپنا ایڈریس دیکھا "اوربیول" (Ohrbuhl)۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ کہاں ہے۔"

کہنے لگا "تمہیں زیورخ سے ونٹرتھور جانا ہوگا۔ وہاں سے تم ایک بس میں بیٹھ کے

اوور بول جا سکو گے۔ اس پہ میں نے سٹاپ کا نام لکھ دیا ہے اس پہ اُتر جانا اور کسی سے پوچھ لینا۔ ویسے یہ مشہور جگہ ہے۔"

میرے بعد مقصود کا نمبر تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس جانے سے پہلے مجھے کہنے لگا "اگر ہمارا کمرہ ایک ہی ہوا تو ہم دونوں اکٹھے کھانا کھایا کریں گے۔"

میں نے کہا "کیا مطلب۔"

کہنے لگا "یہاں سوئس میں ریڈ کراس میں لوگوں کے گروپ بنا دیے جاتے ہیں۔ ایک گروپ میں تین تین بندے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہ سب کیسے جانتے ہو۔"

کہنے لگا "یہ بات مجھے مونے نے بتائی ہے۔"

کاؤنٹر کلرک نے مقصود کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے مقصود کو بھی بس کا ٹکٹ تھما دیا۔ اس کے بعد جہاں اس نے جانا تھا وہاں کا ایڈریس دیا۔ اس نے ایڈریس مجھے تھما دیا۔ میں نے ایڈریس دیکھا۔ اس پہ زیورخ کا ایڈریس تھا۔ میں نے کہا "مقصود اس پہ زیورخ کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔ تم میرے ساتھ نہیں جا رہے ہو۔"

مقصود کی شکل ایسے ہو گئی جیسے ابھی رو دے گا۔ کہنے لگا "اس سے کہو کہ مجھے تمہارے ساتھ ہی بھیج دے۔"

میں نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا کیا "اس کی ریڈ کراس بدل نہیں سکتی؟"

وہ کہنے لگا "یہ میرے اختیار میں نہیں۔ میرے پاس جس طرح لسٹ آتی ہے میں اس کے مطابق تم لوگوں کو ٹکٹ وہاں کا پتا اور نقشہ دے دیتا ہوں۔"

میں نے مقصود سے کہا "یہ ممکن نہیں۔"

کاؤنٹر کلرک کہنے لگا "تم لوگوں نے آج ہی یہاں پہنچنا ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں اس دفتر سے نکلے۔ مقصود کہنے لگا "چلو سٹیشن تک اکٹھے چلتے ہیں۔"

ہم دونوں واپس سٹیشن کی طرف چل دیے۔ ہم پندرہ منٹ میں زیورخ ریلوے سٹیشن پہ تھے۔ مقصود کو میں نے نقشہ سمجھایا۔ اس کے بعد ونٹر تھور جانے والی ٹرین پہ بیٹھ گیا۔ مقصود نے ہاتھ

ہلایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی بچے کو اکیلا چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ مقصود کو کم از کم اس بات کی تسلی ضرور ہوگی کہ وہ کسی مشکل میں اسے موٹے لڑکے کے چچا سے رابطہ تو کر ہی سکتا ہے جو یہاں زیورخ میں مقیم ہے۔ خیر ٹرین چلی تو میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ یا میں یہاں رہتے ہوئے خود غرض ہو گیا تھا۔ قریباً دن کے پونے ایک بجے میں ونٹر تھور پہنچا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ سٹیشن سے باہر نکلا۔ میرا خیال تھا چھوٹا سا ریلوے سٹیشن ہوگا۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ باہر آیا ایک طرف ایک نئی عمارت تھی۔ اس کے ساتھ ایک پرانی عمارت تھی۔ ایک کونے میں ایک پرانی طرز کی آئس کریم کی ٹرالی تھی جس پہ بہت خوبصورتی سے رنگ کیا گیا تھا۔ وہاں کھڑا ایک موٹا سا آدمی، مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ میں نے کہا" مجھے اس ایڈریس پہ جانا ہے۔"

کہنے لگا" اوور بیول آئم۔"

میں نے کہا" ہاں۔"

مجھے وہ شکل سے اطالین لگا۔ میں نے اطالین میں پوچھا" تم اطالین ہو۔"

کہنے لگا" تمہیں کیسے پتا چلا۔"

میں نے کہا" میرا خیال تھا۔"

کہنے لگا" ہاں میں اطالین ہوں۔ یہاں پہ سارے بس ڈرائیور بھی اطالین ہیں۔ تمہیں اوور بیول جانے کے لیے وہ سامنے جو بس سٹاپ ہے وہاں جانا ہوگا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جا کے اس بس سٹاپ پہ بیٹھ گیا۔ یہ بس سٹاپ سارے کا سارا شیشے سے بنا ہوا، اور بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بس کھڑی تھی۔ میں جرمن نہیں جانتا تھا۔ کبھی انگریزی سے، کبھی اطالین اور کبھی فرنچ سے کام چلا لیتا۔ یہاں بس سٹاپ پہ چند افریقن لڑکے بھی بیٹھے تھے۔ میرے خیال میں نائیجیریا کے تھے۔ ان کی دھاڑ دھاڑ والی انگریزی مجھے کم ہی سمجھ آتی تھی۔ میں نے پوچھا" تم لوگ اوور بیول جا رہے ہو۔"

ان میں سے ایک بولا" میں اوور بیول جا رہا ہوں اور باقی سپیکٹرم (Spectrum) جا رہے ہیں۔"

مجھے کیا معلوم تھا سپیکٹرم کیا بلا ہے۔ میں نے اوور بیول جانا تھا۔ بھوک بڑی شدت سے ستا رہی تھی۔ مجھے دن کے بارہ بجے کھانا کھانے کی عادت ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا" رام رام گنگا، اوپر لیا

پنگا۔'' میں اچھا خاصہ اٹلی آیا تھا۔ پاکستان جارہا تھا۔ پہلی غلطی یہ کی کہ اٹلی رک گیا دوسری غلطی سوئس آ کر کی۔ دل بہت گھبرا رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ جیسے ہی بس آئی وہ افریقن کہنے لگا "یہ ہماری بس ہے۔"

میں بس میں اس کے ساتھ سوار ہوگیا۔ بس چلی۔ میں نے ڈرائیور کو غور سے دیکھا۔ اٹالین ہی تھا۔ میں سوچنے لگا۔ وہ آئس کریم بیچنے والا بھی اٹالین تھا۔ یہ بس ڈرائیور بھی اٹالین ہے۔ نہ جانے کون کون سے کام میں اٹالین گھسے ہوئے ہیں۔ بس نے پہلا سٹاپ ٹیکنیکم سترازے (Tecknikum strasse) پہ کیا۔ اس کے بعد اندسٹری آیا۔ ایک دو سٹاپوں کے بعد اوور ریول آ گیا۔ بس تو آگے چلی گئی لیکن ہم دونوں بس سٹاپ کے پچھلی طرف ایک سڑک پہ ہو لیے۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ آئندہ میں اس سڑک پہ تین مہینے چل کے آؤں جاؤں گا۔ ایک طرف ایک دوکان تھی جہاں پہ صرف اور صرف سکیٹنگ کا سامان تھا۔ تھوڑا سا آگے آئے تو ایک فیکٹری تھی۔ پوری دنیا میں ان کے بنائے ہوئے بجلی کے بورڈ اور سرکٹ بکتے ہیں۔ اے بی بی (ABB) ان ساری چیزوں کو میں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ افریقن میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ذہنی حالت کیا ہے۔ چلتے چلتے ہم دونوں ایک عمارت کے سامنے پہنچے۔ اس عمارت کے ساتھ ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک طرف لکڑی کے بہت سے "کھوکھے" پڑے ہوئے تھے ان کو اٹالین میں بنکالی کہتے ہیں۔ یہ کسی ادارے کا سٹور تھا۔ جہاں مال آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس کے سامنے وہ عمارت تھی جہاں میں نے جانا تھا۔ ایک طرف بورڈ پہ لکھا تھا "ازیل ہائم، اوور ریول۔" اس عمارت کے اُوپر شیشے کی کھڑکیوں سے اس طرح نظر آرہا تھا جیسے کوئی لیبارٹری ہو۔ داخلی دروازہ جو کہ نیچے کی طرف جاتا تھا ایک ڈھلوان راستے کی نشاندہی کررہا تھا۔ میں نے سوچا نہ جانے اب مجھے کب تک اس کا اس تہہ خانہ نما عمارت میں رہنا ہوگا۔ اس کے آس پاس چھوٹا سا باغیچہ بنا ہوا تھا۔ وہ افریقن لڑکا کہنے لگا "کیا دیکھ رہے ہو۔ ہمیں اندر جانا چاہیے۔"

میں نے اپنی آنکھوں کے کیمرے سے اس جگہ کا معائنہ بند کیا اور اس کے ساتھ اس ڈھلوان نما جگہ پہ اتر گیا۔ یہاں ایک کھلی جگہ پر دو بڑے بڑے صوفے دھرے تھے۔ ان صوفوں پہ مختلف ملکوں کے لوگ براجمان تھے۔ میں نے ان لوگوں پہ اچٹتی نظر ڈالی اور اس افریقن لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ جس جگہ پہ میں چل رہا تھا یہ جگہ لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ یہ بنگامی بنیادوں پہ بنائی گئی ہے۔ راستے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ہم دونوں جیسے ہی اندر داخل ہوئے۔

دیکھا کہ ایک طرف میز پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف ایک لکڑی کا نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا، جس پہ جابجا پولورائیڈ کیمرے سے کھینچی گئی تصاویر لگی تھیں جیسے ہی ہم داخل ہوئے تو سامنے سے ایک گورا چٹا آدمی اٹھ کے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "تم کرائس لنگن سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔" اس کو میں نے اپنے کاغذات دکھائے۔ تو کہنے لگا "میرا نام شیفر ہے۔ میں یہاں کا ہاؤس ماسٹر ہوں۔ اس کے علاوہ شنائیڈر بھی ہاؤس ماسٹر ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

اس ہاؤس ماسٹر نے بغیر بازوؤں والی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی چھاتی ڈھلکی ہوئی اور توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے بازوؤں پہ عجیب سے لال لال دھبے تھے جس کی وجہ سے اس کو یہ ٹی شرٹ بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا انگریزی بولنے کا تلفظ بہت عجیب تھا۔ ابھی ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو ہی رہے تھے کہ سامنے گلبدین آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھتے ہی شور کرنا شروع کر دیا "مازا آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔"

مجھے پتا تھا یہ افغانی نہیں لیکن جھوٹ موٹ کا افغانی بنا ہوا ہے وہ جان بوجھ کے پٹھانوں کے انداز میں بولتا تھا ورنہ اس کا لب ولہجہ مانسہرہ کے لوگوں جیسا تھا۔

ہاؤس ماسٹر شیفر مجھے کہنے لگا "تم ایک دوسرے کو جانتے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں ہم دونوں کرائس لنگن میں اکٹھے تھے۔ یہ مجھ سے پہلے آ گیا مجھے وہاں گیارہ دن رکنا پڑا۔"

ہاؤس ماسٹر نے ہاتھ میں پولورائیڈ کیمرہ اٹھایا ہوا تھا۔ کہنے لگا "یہاں جو بھی آتا ہے ہم یادگار کے طور پہ اس کی ایک تصویر ضرور لیتے ہیں۔ تم سامنے کھڑے ہو جاؤ تمہاری بھی تصویر لی جائے گی۔"

میں جب سے یہاں آیا تھا لوگوں کے حکم کی تعمیل کرتا آیا تھا۔ اس لیے شیفر کی بات مانتے ہوئے میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے پولورائیڈ کیمرے سے میری تصویر لی۔ فلیش لائٹ میرے چہرے پہ پڑی اور چشم زدن میں کیمرے کے نیچے سے میری تصویر باہر نکل آئی۔ شیفر نے تصویر ہاتھ میں پکڑی اور اسے سکھانے لگا۔ جب تصویر سوکھ گئی تو اس نے اس کے پیچھے مارکر سے میرا نام لکھا اور تصویر اسی نوٹس بورڈ پہ چسپاں کر دی جہاں دیگر تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں سیاسی پناہ گزین نہیں بلکہ کوئی اشتہاری مجرم ہوں۔ یہ ایک کھلا ہال تھا۔ ایک دیوار پہ سگریٹ نوشی

منع ہے کا نوٹس لگا ہوا تھا۔ اس سے تھوڑا آگے ایک دروازہ تھا جو بار بار کھلتا اور بند ہوتا کیونکہ کوئی نہ کوئی اندر جاتا اور کوئی نہ کوئی باہر آتا۔ مجھے نہیں پتا تھا اندر کیا ہے۔ اس سے آگے ایک اور لکڑی کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پہ مختلف اخباروں سے کاٹی ہوئی سرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ پمفلٹ چسپاں تھے۔ اس دیوار سے آگے ایک اور دروازہ تھا۔ پھر میں نے گھوم کے دیکھا۔ ہال کے وسط میں چار میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ فولڈنگ میزیں تھیں جس طرح کی کرائس لنکن میں تھیں۔ ان چاروں میزوں کو جوڑ کے لگایا گیا تھا۔ ان کے آس پاس بہت ساری کرسیاں تھیں۔ ہاؤس ماسٹر شیفر نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دو تین لڑکے اور بھی آئے۔ اس دوران گلبدین نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور شنائیڈر بھی آ گیا۔ اس نے چیک دار قمیض اور سبز رنگ کی ''کورڈ رائے'' پتلون پہن رکھی تھی۔ آتے ہی مجھ سے اور باقی لڑکوں سے ہاتھ ملایا۔ شیفر اور شنائیڈر نے آپس میں کوئی بات کی۔ وہ دونوں آپس میں جرمن زبان بول رہے تھے لیکن مجھے ایسا لگا جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ دونوں میں سے کون ہمیں ہاؤس کے قانون اور قاعدے بتائے گا۔

شنائیڈر بولا جو شکل سے بالکل جرمن لگتا تھا۔ اس کی ناک عجیب سی تھی۔ ''تم سب کو ازیل ہائم کی ٹیم کی طرف سے خوش آمدید۔ میں اور شیفر دونوں مل کے اس ازیل ہائم کا انتظام و انصرام سنبھالتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ہم دونوں یہاں کے خادم ہیں۔ ہفتے میں تین دن شیفر کام پہ آتا ہے اور تین دن میں۔ کبھی کبھی ہمیں باقی دن بھی آنا پڑتا ہے جیسے کہ آج یا جس دن ہم سوشل سکیورٹی کا چیک دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ دوسرے لوگ بھی کام کرتے ہیں۔ ہر بندہ چھ گھنٹے کام کرتا ہے۔ یعنی یہاں ہمارے علاوہ چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی آپ لوگوں کی مدد کے لیے موجود رہتا ہے۔ یہ یہاں کا ہال ہے۔ (میں نے ہال کا بغور جائزہ لیا اس ہال کا کوئی حال نہیں تھا۔ خیر!) سامنے کچن ہے۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ ہے یہ یہاں کا ایمرجنسی ایگزٹ ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک ٹیلی فون بھی لگا ہے جس پہ آپ فون کال سن سکتے ہیں لیکن یہاں سے فون کر نہیں سکتے۔ اس کمرے کے ساتھ باتھ رومز ہیں۔ جہاں منہ ہاتھ دھونے کے لیے، شیو کرنے کے لیے جگہ بنی ہوئی ہے۔ جب تم لوگ اندر جاؤ گے تو دیکھو گے کہ اندر شیشے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس ہال کے ساتھ ٹی وی روم ہے۔ جہاں پر ٹی وی رکھا ہوا ہے۔ ایک دو دنوں میں ہم لوگ ڈش انٹینا کا بھی انتظام کر دیں گے جس کے ذریعے تم لوگ دو سو سے زیادہ چینل دیکھ سکو گے۔ ٹی وی روم کے ساتھ بیڈ رومز ہیں۔ ہم لوگوں نے کمروں کو براعظموں کی

تخصیص کی بنا پر تقسیم کیا ہوا ہے۔ ایشیائی لوگ ایک کمرے میں، افریقن لوگ دوسرے کمرے میں اور رُوسی ریاستوں کے لوگ تیسرے کمرے میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت تاؤ آیا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ یہ کتنی گھٹیا بات ہے۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے شنائیڈر کے چہرے پہ ہٹلر کا چہرہ لگ گیا ہے۔ وہ آرین نسل کو علیحدہ رکھنا چاہتا تھا۔ شنائیڈر نے مجھے سوچتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا "تم کیا سوچ رہے ہے۔"

"کچھ نہیں۔" کہتے ہوئے میں نے فی الوقت اپنے خیالات کا اظہار مناسب نہ جانا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہر کمرے میں اُوپر نیچے تین تین افراد سوتے ہیں۔ یہاں بستر تین منزلہ ہیں۔ یعنی ایک کمرے میں اٹھارہ بستر لگے ہوئے ہیں۔"

یہ سن کے میرا سر گھوم گیا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ کون سا سوئٹزرلینڈ ہے۔ وہاں کرائس لنگن میں ایک کمرے میں سولہ افراد سوتے تھے۔ میں بگی کرائس کا اس لیے انتظار کر رہا تھا کہ شاید یہاں سونے کے لیے علیحدہ کمرہ ملے گا۔ یہاں اس سے بھی زیادہ برا حال تھا۔ فرق صرف اتنا تھا یہاں ہم آزاد تھے۔ دو گھنٹے کی بجائے جب چاہتے یہاں سے باہر جا سکتے تھے۔

شنائیڈر پھر بولا "مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔"

وہ پھر بولا "ہم لوگ تمھیں ایک ایک تولیہ، بستر کی چادر، تکیہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ اور برش دیں گے۔ اگر کوئی چیز ختم ہو جاتی ہے تو سوشل ویلفیئر کی رقم سے لانی ہوگی۔ ہفتے میں دو دفعہ بستر کی چادر دھونی ہوگی۔ یہاں پہ نہانے کے لیے ایک ہی بڑا باتھ ہے۔ اس کے اندر دس شاور لگے ہوئے ہیں اور درمیان میں پلاسٹک کے پردے لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح ایک ہی وقت میں دس افراد نہا سکتے ہیں۔" میرا دل چاہتا تھا اس وقت یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اتنا کہہ کر شنائیڈر چپ ہو گیا۔ اس کے بعد شیفر بولا "یہاں پہ مختلف ملکوں کے لوگ ہیں۔ اگر کسی کو کوئی ایسی زبان آتی ہے تو جو ہم نہیں جانتے تو ہماری مدد کرے ہمیں خوشی ہوگی۔ ہاؤس کے اصولوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ جو کوئی ہاؤس کے اصولوں کی پابندی نہیں کرے گا اس کی رپورٹ خراب ہو جائے گی، جس کا اس کے کیس پہ بُرا اثر پڑے گا۔ کبھی کبھی ہمیں پولیس کو بھی بلانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں رہنے والے ڈرگز کا استعمال نہیں کر سکتے۔ نہ ہی چوری کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ ہمیں اکثر آس پاس کے دوکانداروں کی

شکایت موصول ہوتی ہے کہ ازیل ہائم میں رہنے والے لڑکے چوری کرتے ہیں۔ کسی کو کوئی مسئلہ ہو تو ہماری غیر موجودگی میں یہاں کے عملے کو بتا سکتا ہے۔ ہم نے یہاں چھوٹے ریفریجریٹرز کا انتظام کیا ہے۔ ہر ریفریجریٹر کو تین افراد استعمال کرتے ہیں۔ ایک دو دن میں ان ریفریجریٹرز کو چھوٹے تالے بھی لگ جائیں گے۔ اس تالے کی تین چابیاں ہوں گی۔ ہر متعلقہ فرد کے پاس ایک اپنی چابی ہوگی کیونکہ یہاں ایک دوسرے کے ریفریجریٹر سے چیزیں چوری کرکے کھانے کی شکایات عام ہیں۔ یہاں ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اگر کسی کو کوئی بات سمجھ نہیں آئی تو اس کا ہم زبان اس کو سمجھا سکتا ہے۔''

اتنا کہہ کر شیفر چپ ہو گیا۔ پھر شنائیڈر بولا'' تم لوگ دو دن ہمارے مہمان ہو۔ تمھیں کھانے پینے کی چیزیں ہم دیں گے۔ پھر جب تم لوگوں کو سوشل ملے گی تو اپنی خریداری خود کیا کرنا اور خود پکایا کرنا۔ تم میں سے جو لوگ زبان سیکھنا چاہتے ہیں، ہم ان لوگوں کے لیے زبان سیکھنے کا انتظام کریں گے۔ بس کا ماہوار ٹکٹ ہماری طرف سے دیا جائے گا۔ جو کہ اوور ریول اور ونٹر تھور کے آس پاس استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو کپڑے دھونے ہوں تو باتھ روم میں مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ دھونے کی بھی اور سکھانے کی بھی۔ ان مشینوں کے اندر جوتے دھونے کی اجازت نہیں ہے۔ مشین کو چلانے کا طریقہ ہم سکھا دیں گے۔ جس کسی کو کپڑے دھونے ہوں وہ ہم سے یا سٹاف کے کسی بھی بندے سے سرف (کپڑے دھونے کا پاؤڈر) خریدے گا اور کپڑے دھوئے گا۔ جو لوگ یہاں رہتے ہیں ان کو باہر کام کرنے اور رات باہر گزارنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی کے بارے میں پتا چل گیا کہ وہ کام کرتا ہے تو اس کی سوشل بند ہو جائے گی۔ جس کسی کو رات باہر گزارنی ہو وہ ہم سے اس کی باقاعدہ اجازت لے گا۔'' شنائیڈر چپ ہو گیا۔

شیفر بولا'' ونٹر تھور میں ایک بہت بڑا سینٹر ہے۔ وہ تم لوگوں کے لیے ہے۔ وہاں پہ کمپیوٹر کے ذریعے جرمن زبان سیکھنے کا انتظام ہے۔ وہاں پہ فٹنس سینٹر ہے، وہاں پہ چھوٹی سی لائبریری ہے، وہاں پہ کھیلنے کے لیے مختلف انڈور گیمز کا اہتمام ہے۔ وہاں پہ انٹرنیٹ پوائنٹ بھی ہے۔ ایک کیفے بھی ہے جہاں کھانے پینے کی چیزیں بہت سستی ملتی ہیں۔ یہ تو تھی باؤس کے بارے میں باتیں۔ ایک بات اور یہاں ایک فی میل اٹینڈنٹ بھی اپنے فرائض سرانجام دے گی، اس کا نام انجا ہے وہ ایک بجے سے سات بجے تک یہاں رہے گی۔ وہ کسی بھی وقت یہاں آ جائے گی۔ اس وقت وہ تمہارے کھانے کے

لیے کچھ لانے کے لیے مارکیٹ گئی ہوئی ہے۔ اگر کسی کو کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "ہمیں جو سوشل کا چیک ملے گا وہ کہاں سے کیش ہوگا۔"

شیفر بولا "ہم لوگ تم کو ایک ٹوکن دیں گے۔ جسے تم لوگ ونڑ تھور، مارکیٹ گاس سترازے کے ایک مخصوص بینک سے کیش کراؤ گے۔ ویسے جب چیک ملتا ہے تو سب وہیں جاتے ہیں۔ اس لیے تمہیں بینک ڈھونڈھنے میں دقت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "اور بس کا ٹکٹ۔"

شیفر بولا "اس کے لیے تمہیں ریلوے سٹیشن جانا ہوگا۔ اس کے لیے بھی ہم تمہیں ایک ٹوکن دیں گے۔ تم وہ ٹوکن دکھاؤ گے تو وہ تمہیں ایک مہینے کا بس پاس دے دیں گے۔"

میں نے کہا "تم نے پہلے کہا تھا اگر کسی کو کوئی زبان آتی ہو اور وہ ہماری مدد کرنا چاہے تو ہمیں خوشی ہوگی۔ میں انگریزی کے علاوہ فرنچ اور اٹالین بھی جانتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کسی کے کام آسکوں۔"

شیفر اور شنائیڈر مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی عجیب و غریب بات کر دی ہو۔

شیفر اور شنائیڈر نے ہم سے اجازت لی۔ اس دوران وہ لڑکی جو ہمارے کھانے پینے کے لیے کچھ لینے گئی تھی وہ بھی آگئی۔ مجھے بہت زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ اس کا نام انیتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کے تھیلے تھے۔ اس نے تھیلے میز پہ رکھے اور کہنے لگی "تم لوگ یہ آپس میں بانٹ کے کھالو۔ رات کے لیے کچھ بچا لینا۔"

میں نے انیتا کا بغور معائنہ کیا۔ دبلی پتلی لڑکی تھی قد بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ بال لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔ چہرے سے لگتا تھا جیسے کوئی نشہ کرتی ہے۔ ناک نقشہ بھی عجیب سا تھا اس پہ اس نے دونوں پلکوں کے کونوں پہ بالیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اس کی ناک اور نیچے والا ایک ہونٹ چھدا ہوا تھا۔ اس نے کھلی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی لیکن اس کا جسم لکڑی کے تختے کی طرح بالکل سپاٹ اور سیدھا تھا۔ اس کی ٹی شرٹ پہ کسی قسم کی نسوانیت کے ابھار نظر نہیں آرہے تھے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی تھا جیسے ستاروں کے بغیر آسمان، مرچ مصالحے کے بغیر کھانا۔ نیچے اس نے شلوار سٹائل کی کوئی چیز پہنی ہوئی تھی جس کے پائینچے تنگ تھے۔ پاؤں میں ہوائی چپل۔ میں اس کا حلیہ دیکھ کے بڑا حیران ہوا۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں سمجھا کے چلی گئی۔ میں نے پلاسٹک کے تھیلوں کو کھول کے دیکھا۔ اس

میں ٹن والی ٹیونا فش تھی، بسکٹوں کے ڈبے تھے، پینے کے لیے کوک کی دو بڑی بوتلیں تھیں، سوئس کی مشہور بریڈ تھی، کیچ اپ اور میونیز تھی۔ کھانے کو بہت تھا لیکن ہم پاکستانی روٹی کھانے والوں کا اس قسم کے فاسٹ فوڈ سے کہاں پیٹ بھرتا ہے۔ خیر ہم لوگوں نے جیسے تیسے کر کے پیٹ کی آگ بجھائی۔ جب میں کھانا کھا چکا تو مجھے تھوڑا سا ہوش آیا۔ میں نے سوچا اس ازیل ہائم کا معائنہ کرنا چاہیے۔ میں نے پہلے دفتر کے بورڈ پر لگی ہوئی اپنی پولورائیڈ تصویر دیکھی۔ نیچے میرا نام لکھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں بستہ "ب" کا مجرم ہوں۔ ایک طرف پین اور کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ میز پہ ایک ٹیپ ریکارڈر پڑا ہوا تھا۔ یہاں پہ ایک کمرہ تھا جو کہ بند تھا۔ میرے خیال میں یہ شیفر اور شنائیڈر کا آفس تھا۔ ایک دیوار پہ سوئٹزرلینڈ کا بہت بڑا نقشہ لگا ہوا تھا۔ میں نقشے کو بغور دیکھتے ہوئے خصوصاً وہ مقامات دیکھنے لگا جہاں جہاں سے گزر کے میں یہاں تک آیا تھا۔ کومو، کیاسو، لوگانو، بیلنزانو، زیورخ، ونٹرتھور، کرائس لنگن اور کرائس لنگن کی جیل۔ اس نقشے میں میرے لیے جو نئی انفرمیشن تھی، اور وہ تھی ایک چھوٹے سے ملک "لیکٹھن سٹائن کے بارے میں۔ میں نے یہ نام پہلی دفعہ سنا تھا۔ لیکٹھن سٹائن (Leichtenstein) کے دارالحکومت کا نام واڈز (Vaduz) لکھا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا، میں خود کو کتنا بڑا تیس مار خان سمجھا ہوں لیکن مجھے "لیکٹھن سٹائن" کا نہیں پتا۔ خیر میں نقشے پہ یہ دیکھنے لگا اگر مجھے سوئس سے واپس اٹلی جانا پڑے تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میرا دل ہاؤس ماسٹر کی باتیں سن کے کھٹا ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں سے فوراً بھاگ جاؤں۔ پیسے دو دن بعد ملنے تھے۔ اس ہال سے نکل کے میں اس سے ملحق کمرے میں چلا گیا۔ اندر دو بڑے بڑے صوفے پڑے تھے۔ یہاں پینے کے پانی کا ایک ٹینک بھی موجود تھا۔ صوفوں کے سامنے ایک میز تھی، جس پہ ریموٹ کنٹرول پڑا ہوا تھا۔ ایک صوفے پر ایک لڑکا سو رہا تھا اور دوسرے صوفے پر تین افراد بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی پہ کوئی فلم چل رہی تھی۔ ایک طرف کرسیوں پہ دو افریقن لڑکے سہمے سہمے سے بیٹھے تھے۔ میں بہت حیران ہوا۔ لوگ افریقہ کے لوگوں سے ڈرتے ہیں یہاں یہ دو افریقن ڈرے بیٹھے تھے۔ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ میں ان لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ کے آخری کمرے میں چلا گیا جہاں میرے سونے کی جگہ تھی۔ یہاں میرا بستر نیچے والی منزل پہ تھا۔ اس پہ ایک تکیہ، بستر کی چادر، تکیے کا غلاف، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، ڈسپوزایبل ریزر اور چھوٹی سی شیونگ ٹیوب تھی۔ یہاں سے نکل کے میں نے سوچا باتھ کا معائنہ کروں۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں جس طرح پاکستان میں سناروں کی دوکانوں میں بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں

اس طرح کے بڑے بڑے اور لمبے آئینے لگے ہوئے تھے۔ آئینوں کے سامنے اور درمیان میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے ٹونٹیاں فٹ تھیں۔ ایک طرف پانچ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جن کے اندر ڈبلیو سی لگی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں دو بڑی بڑی واشنگ مشینیں اُوپر تلے پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ کپڑے سکھانے کی مشین تھی۔ میں یہاں سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ تھا یہ ایمرجنسی ایگزٹ تھا۔ دروازہ کھولا تو اندر جا بجا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچن تھا۔ کچن کا دروازہ کھولا تو اندر دو تین بندے کچھ پکاتے نظر آئے۔ میں اندر داخل ہوا۔ ایک دُبلا پتلا افریقن لڑکا دیگچی میں کوئی پیلی سی چیز گھول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا چمچہ تھا۔ یہاں پہ چار بجلی کے چولہے تھے۔ ہر چولہے پہ پکانے کے لیے چار چار پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ کچن سے عجیب قسم کی بو آ رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے اتنے دن پکا پکایا کھانا کھایا تھا اور ہمارا کھانا باہر سے پک کے آتا تھا اس لیے میں شاید کلنگ کی مخصوص بو کا عادی نہیں رہا تھا۔ میں کچن سے باہر آ گیا۔ آگے آتے ہوئے میں نے سوچا جہاں شاور لگے ہوئے ہیں وہ جگہ دیکھوں۔ کوریڈور سے گزرا تو یہ وہی کوریڈور تھا جہاں سے میں کچھ دیر پہلے گزر کے آیا تھا۔ یہ تختوں کا بنا ہوا تھا۔ جب میں اس پہ چل رہا تھا، یہ زور زور سے ہل رہا تھا۔ میں اُس جگہ داخل ہوا جہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ شاور لگے ہوئے ہیں۔ باہر بہت سے سلیپر پڑے تھے جو اس بات کی نشانی تھے کہ اندر کچھ لوگ نہا رہے ہیں۔ میں نے سوچا باہر چلنا چاہیے۔ جہاں سے داخل ہو کر آیا تھا۔ جگہ بالکل ایسی تھی جیسے گاڑیاں پارک کرنے والا کوئی گیراج ہو۔ یہاں صوفوں پہ اب بھی کچھ صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں سے باہر نکلا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا باغیچہ بنا ہوا تھا۔ یہاں مار بل کے چھوٹے چھوٹے بنچز نصب تھے۔ ایک کونے میں گلبدین بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ میں نے کہا" گلبدین تم اتنی گرمی میں یہاں کیا کر رہے ہو۔"

کہنے لگا" گرمی سے نجات پانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم تو جانتے ہو، اس گرمی کا ایک ہی حل ہے بیئر، اور وہ بھی ٹھنڈی۔" مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا کہ گلبدین بیئر پی رہا ہے۔ میں نے سوچا فٹ بال کے بارے میں کسی سے پوچھوں۔ ایک افریقن لڑکا بھی گلبدین کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا" فٹ بال میچ کا کیا بنا ہے؟"

کہنے لگا" جرمنی جیت گیا ہے لیکن میچ بڑا سخت تھا۔"

میں سوچنے لگا اب کل ترکی اور برازیل کا میچ ہے۔ ترکی کی جیت کے بہت کم امکانات

تھے لیکن کوئی معجزہ بھی ہو سکتا تھا۔

گلبدین مجھ سے کہنے لگا "ہم لوگ کھانا اکٹھے کھایا کریں گے۔ میں نے ہاؤس ماسٹر سے بات کر لی ہے۔ ہمارے ساتھ ایک بنگالی بھی ہے لیکن میں اس کو بالکل پسند نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "تم افغانی ہو، تمہیں بنگالی کیوں ناپسند ہے۔"

میں نے کہا "اگر نفرت ہونی چاہیے تو مجھے ہونی چاہیے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے افغانستان کے ساتھ تو نہیں کی۔"

گلبدین نے کہا "کچھ بھی ہو موقع ملا تو میں اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "اس طرح نہیں سوچتے۔ وہ بھی مسلمان ہے تم بھی مسلمان ہو۔ ہم تینوں مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب میں تعصب سختی سے منع کیا گیا ہے۔"

پہلے مجھے شک تھا اب یقین ہو چلا تھا کہ یہ پاکستانی ہے۔ کچھ پاکستانی بیوقوفوں کی طرح، حقائق جانے بنا ہی دوسری قوموں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ مجھے گلبدین پہلے بھی پسند نہیں تھا لیکن اب مجھے مزید برا لگنے لگا تھا۔ میرے علم کے مطابق مجھے یہاں تین مہینے رہنا تھا۔ اس کے بعد میری کرائس بدل جانی تھی۔ میں سوچنے لگا، مجھے اس کے ساتھ تین مہینے گزارنے پڑیں گے۔ میں مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن کبھی کبھی انسان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ میں گلبدین کو چھوڑ کے اندر آ گیا۔ ہاؤس ماسٹر کے کمرے کے سامنے جو میز پڑی ہوئی تھی۔ وہاں میز پہ سر جھکائے انجیا کچھ لکھ رہی تھی۔ میں نے کہا محسوس نہ کرو تو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے؟"

کہنے لگی "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو!"

میں نے کہا "میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ اگر مجھے بس کا ٹکٹ مل جائے تو میں ونٹر تھور کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔"

کہنے لگی "میں تمہیں بس کا ٹکٹ دیتی ہوں۔ یہ دو دفعہ استعمال ہو سکتا ہے۔ ویسے پرسوں تمہیں بس کے پاس کا ٹوکن مل جائے گا۔"

وہ کمرے میں گئی اور اندر سے بس کا ٹکٹ اُٹھا لائی۔ میں نے اس سے بس کا ٹکٹ لیا اور ازیل ہائم سے باہر آ گیا۔ میں بس سٹاپ کی طرف جا رہا تھا۔ پیچھے سے گلبدین نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں ونڑتھور جا رہا ہوں۔ تم نے جانا ہے تو چلو۔"

کہنے لگا "نہیں تم جاؤ، میرے مہمان آ رہے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے اس سے اخلاقاً پوچھا تھا۔ وگرنہ اس کی صحبت اختیار کرنے کو بھی طبعاً آمادہ نہیں تھا۔ اس کو خدا حافظ کہہ کے میں بس سٹاپ پہ آ گیا۔ تھوڑی دیر میں بس آ گئی۔ میں بس میں سوار ہوا۔ بس دو تین سٹاپوں کے بعد ونڑتھور کے اسی مقام پر رکی جہاں سے گزر کے میں پہلے آیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب بس سٹاپ اُلٹے ہاتھ تھا۔ سیدھے ہاتھ کی طرف بازار تھا۔ میں بس سے اتر کے بازار میں داخل ہوا۔ میں نے گلی کا نام پڑھا۔ مارکیٹ گاز ستراز ے۔ میں نے سوچا گویا یہ ونڑتھور کا مین بازار ہے۔ باہر ایک دو برگر اور سافٹ ڈرنکس کے کھوکھے تھے۔ گلی کی ابتدا میں دونوں طرف ریستوران تھے۔ چند قدم آگے بڑھا تو ایک بینک تھا۔ میں سمجھ گیا یہ وہی بینک ہے جس سے مجھے پرسوں پیسے کیش کروانے آنا ہے۔ میں ٹورسٹ کی طرح مارکیٹ گاز ستراز ے پہ گھومتا رہا۔ کبھی ایک گلی میں جاتا کبھی دوسری گلی میں۔ جب چل چل کے میرے پاؤں شل ہو گئے تو میں ازیل ہائم واپس آ گیا۔

گلبدین نے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ مجھے انہی کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بنگلہ دیش کا لڑکا بھی تھا۔ میں نے اس بنگلہ دیشی سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے۔"

اس کو اردو آتی تھی لیکن بہت کم۔ کہنے لگا "بدرالدین۔"

میں نے کہا "میرا نام ہے فرشتہ ہے۔"

وہ کہنے لگا "یہ کیسا نام ہے۔"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میرے دادا جی ابوالقاسم فرشتہ سے بہت متاثر تھے۔ مجھے یہ نام انہی کا ودیعت کردہ تھا۔ اب تو وہ اس دنیا میں بھی نہیں رہے تھے۔

میں نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی میل ہے۔ مجھ میں میل تھی بھی نہیں۔ کھانا کھانے کے بعد میں گلبدین سے کہا "یہاں چائے مل سکتی ہے۔"

گلبدین کہنے لگا "میرے پاس چائے کا سامان موجود ہے۔ میں ابھی چائے بناتا ہوں۔"

میں نے کہا، عجیب آدمی ہے۔ خود کو افغانی بتاتا ہے اور چائے بھی پیتا ہے۔ اسے تو قہوہ پینا چاہیے تھا۔ اگر بدرالدین کہتا تو مجھے عجیب نہ لگتا۔ میں افغانستان تو نہیں گیا لیکن میرا پاکستان میں کئی افغانیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ خیر گلبدین چائے بنا کے لے آیا۔ چائے پیتے پیتے میں نے گلبدین سے

پوچھا "تمہارے مہمان آئے تھے؟"

کہنے لگا "ہاں آئے تھے۔ وہ ہرات کے رہنے والے ہیں۔ وہ زیادہ تر فارسی بولتے ہیں۔ ان کو پشتو کم ہی آتی ہے۔ وہ مجھے کھانے پہ بلا رہے تھے۔ سوچ رہا ہوں جاؤں کہ نہ جاؤں۔"

میں نے کہا "وہ تمہارے ہم وطن ہیں ضرور جاؤ۔ میں نے کئی دفعہ کابلی پلاؤ کھایا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔"

کہنے لگا "مجھے تو بالکل پسند نہیں۔ چاول نمکین اچھے لگتے ہیں۔ یہ افغانی اس میں خواہ مخواہ میوہ ڈال دیتے ہیں۔ اس سے چاول میٹھے ہو جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "تو کیا تم افغانی نہیں ہو؟"

کہنے لگا "میرے ماں باپ جس گاؤں سے آئے تھے وہاں اس طرح کا پلاؤ کوئی نہیں کھاتا تھا۔"

اسے اپنی غلطی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ انسان جو نہ ہو وہ بنے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اچھا خاصا پاکستانی تھا لیکن سوئس میں سیاسی پناہ کی خاطر افغانی بنا ہوا تھا کیونکہ پاکستانی کا کیس منظور نہیں ہوتا تھا۔ بدرالدین ڈبا پتلا لڑکا تھا۔ عمر یہی کوئی چوبیس سال ہوگی۔ اس نے ٹی شرٹ کے نیچے چیک دار دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بڑا معصوم لگا۔ میں سوچنے لگا۔ نہ جانے گلبدین اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ وہ اس کے سامنے تھوڑا سہما ہوا لگ رہا تھا۔ گلبدین کا چہرہ ہی اتنا خوفناک تھا۔ ایک آنکھ کی پتلی میں کچھ عجیب سی چیز تیرتی نظر آتی۔ ایسا لگتا جیسے بہت سے کنکر جلتے چلتے جا رہے ہیں، جب وہ اپنے مخاطب کی طرف دیکھتا تو اُس کا مخاطب سر سے پاؤں تک کانپ جاتا۔

چائے پینے کے بعد گلبدین تو بیئر کا کین لے کر باہر چلا گیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تکیے پہ غلاف چڑھایا۔ اس کے اُوپر ایک سفید چادر بچھائی۔ اس چادر کے اُوپر فوجیوں والا گرے رنگ کا کمبل بچھایا۔ ایک کونے میں تولیہ، صابن کی چھوٹی سی ٹکیہ، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور ڈسپوزیبل ریزر سنبھال کے رکھا اور کمبل میں گھس گیا۔ جون کی آخری تاریخیں تھیں بہت گرمی تھی لیکن اس تہہ خانے میں ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خوش تھا کہ صبح سویرے کوئی جگانے نہیں آئے گا۔ اس خوشی کا اعجاز تھا کہ بہت جلد مجھے گہری نیند نے آ لیا۔

○○○

O

میں اور نیائش بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ نیائش بولا" مازا یہ پری پیکر بدل گیا ہے۔ آج کل ہمارے گھر دیر سے آتا ہے۔"

میں نے کہا" ایسی کوئی بات نہیں، آج کل اس کی فیکٹری میں کام زیادہ ہے اس لیے وہ زیادہ کام کرتا ہے۔ کام سے فراغت پاتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے۔ وہ کھانا بھی وہیں کھاتا ہے۔"

نیائش بولا" کیا یہ سچ ہے؟"

میں نے کہا" ہاں بالکل سچ ہے۔"

"چلو اس کو فون کر کے دیکھتے ہیں۔"

نیائش نے ثقلین کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ موبائل فون بند تھا۔

نیائش بولا" اس کا مطلب ہے وہ واقعی کام پہ ہے۔ فرشتہ بات یہ ہے کہ ہم پشاوری لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے گھر کوئی مہمان بن کے آ جائے تو ہم اس کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ اگر تمہارا واسطہ پشوریوں سے پڑتا رہا ہے تو تم جانتے ہو گے کہ وہاں پشاور میں دو قسم کے پشتون رہتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو مہمان کے لیے جان دے دیتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو مہمان سے جان چھڑاتے ہیں۔ اب دونوں پشتو بولتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پشوریوں کی دوسری قسم مادری زبان کے طور پہ ہندکو بولتی ہے جبکہ پہلی قسم ہندکو نہیں بولتی بلکہ وہ پشتو کے علاوہ اگر کوئی دوسری زبان

بول سکتے ہیں تو وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو ہوتی ہے۔ پشاور شہر میں ہندکو بولنے والے پٹھان بھی ہیں اور پشتو بولنے والے بھی۔ ثقلین کے نہ آنے کی وجہ سے میرے دل کو بالکل چین نہیں آتا کیوں کہ وہ پہلے روز کھانے کے وقت آتا تھا اب نہیں آتا تو عجیب سا لگتا ہے۔''

میں نے کہا'' مجھے ٹورسٹ گائیڈنگ کے دوران کئی دفعہ پشاور جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں پٹھانوں کے ان دونوں اقسام سے واقف ہوں۔''

نیائش کا موبائل بولا۔ اس نے نمبر دیکھا تو ثقلین کا تھا۔ اس نے موبائل اٹینڈ کرتے ہوئے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی:'' نیائش بھائی خیریت ہے؟'' فون کی آواز اونچی تھی۔ اس لیے صاف سنائی دے رہا تھا کہ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے۔

نیائش بولا'' ماڑا کام کر رہے ہو یا ہمارے ہاں آنا پسند نہیں کرتے؟ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معافی چاہتے ہیں!''

ثقلین بولا'' نہیں نیائش بھائی ایسی کوئی بات نہیں۔ کام بہت ہے۔ دیر سے فارغ ہوتے ہیں۔ ابھی کھانا کھانے کے لیے بیٹھے ہیں۔ میں نے موبائل آن کیا تو آپ کی مس کال دکھائی دی اس لیے فون کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ ہفتے کے روز ملاقات ہوگی۔''

'' ماڑا فرشتہ سے آ کے مل لیتے ہو۔ ہم میں کیا برائی ہے۔''

'' اگر آپ جاگ رہے ہوئے تو آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے میں ایک گھنٹے بعد یہاں سے نکل رہا ہوں۔''

نیائش نے کہا'' چلو اگر جاگ رہا ہوا تو ملاقات ہو جائے گی ورنہ ہفتے والے دن ملتے ہیں۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور موبائل فون بند ہوگیا۔

میں اور نیائش اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ مجھے نیچے سے کسی کی آواز سنائی دی۔ باہر خاموشی تھی کیونکہ جس علاقے میں ہم رہتے تھے یہ جگہ ہنگام بازار سے ذرا ہٹ کے تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو نیچے ثقلین کھڑا تھا۔ میں نے کھڑکی سے ہی کہا ثقلین بھائی اوپر آ جاؤ۔ وہ جیسے ہی اُوپر آیا تو نیائش نے پہلی بات یہی کی'' دیکھو میں تمہارے لیے جاگ رہا ہوں۔ ماڑا ہم یاروں کے یار ہیں۔''

ہم تینوں نے تھوڑی دیر مختلف موضوعات پہ بات کی ثقلین پری ہیکرا اگلا باب لے کر چلا گیا۔

OOO

میں رات کو جلد سو گیا تھا اس کے باوجود صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ آج صبح جگانے والا کوئی نہ تھا۔ آج ۲۶ جون ۲۰۰۲ء کو برازیل اور ترکی کا سیمی فائنل تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ برازیل جیتے گا لیکن نہ جانے کیوں دل چاہتا تھا کہ ترکی جیتے کیونکہ ترکی اور جرمنی کا اگر فائنل ہوگا تو بڑا کانٹے دار ہو گا۔ میں اُٹھ کے سب سے پہلے باتھ میں گیا۔ حاجات ضروریہ سے فارغ ہوا۔ اس کے بعد دانت صاف کیے۔ اپنی شکل دیکھی تو ایسے لگا جیسے منہ پہ بہت سی چیونٹیاں نہ جانے کہاں سے آ گئی ہوں۔ یہاں سنار کی دوکان کی طرح دونوں طرف لمبے لمبے آئینے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو بہت دور تک پچھلے آئینوں میں میرا عکس نظر آ رہا تھا اور ایک خاص مقام پہ جا کے غائب ہو جاتا۔ میں نے خود کو عکاسی کے اس بھنور سے نکالا۔ سوچا پہلے ناشتہ کرتے ہیں۔ کچن میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے کسی کے زیرِ قبضہ تھا۔ میں چولہے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچن کا دروازہ کھلا، گلبدین اندر داخل ہوا۔ وہ خود کو افغانی ظاہر کرتے ہوئے پشتونوں کے انداز میں کہنے لگا ''ماڑا ہم چائے بنائے گا۔ تم ہمارا مہمان ہے۔''

میں نے کہا ''بناؤ لیکن چولہے فارغ نہیں ہیں۔''

''ماڑا ابھی فارغ ہو جاتے ہیں۔ تم باہر ناشتے کے لیے انتظار کرو میں ابھی ناشتہ لے کر آتا ہوں۔''

میں ہال کے اندر پڑی ان چار مستطیل میزوں میں سے ایک کے ساتھ کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ میں گلبدین چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے کل بھی چائے اچھی نہیں بنائی تھی آج بھی اس کا رنگ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ناشتہ زہر مار کرنے والی بات تھی۔ میں نے دل میں سوچا کل پیسے ملیں گے تو میں خود چائے کا سامان۔ بریڈ، انڈے اور کوکنگ آئل لاؤں گا۔ میں سوچنے لگا، یہ میری زندگی کا کتنا بڑا تجربہ ہے۔ دنیا کی کسی یونیورسٹی میں یہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ مجھے سوئس آئے ہوئے ابھی دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے اور اتنا کچھ دیکھ چکا تھا جو میں نے اپنی سابقہ زندگی میں اب تک نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ گائیڈنگ کے دوران کچھ پروفیسروں کے ساتھ وقت گزارنے اور سو دو سو کتابیں پڑھنے کے بعد میں بڑا جینئس ہو گیا ہوں لیکن ایسا بالکل نہیں تھا۔ یہاں آنے سے قبل مجھے ہر چیز تیار ملتی تھی۔ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، کہاں سوتا ہے، کیا کھاتا ہے۔ کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی تھی، جب کہ

یہاں مجھے کُل ۴۵ سوئس فرانک ملنے تھے اور اس میں ہی مجھے اپنا پورا بجٹ تیار کرنا تھا۔ ۴۵ سوئس فرانک قریباً ۳۰ یورو بنتے ہیں۔ یعنی ۳۰ یورو میں پورا ہفتہ گزارنا تھا۔ سونے کی جگہ، بجلی، پانی، گیس اور بس کا ٹکٹ ازیل ہائم والوں کی ذمہ داری تھی۔ مجھے ان ۴۵ سوئس فرانک میں تین وقت کا کھانا کھانا تھا۔ یعنی سات دن کا کھانا یعنی ۳۰ یورو میں ایکس وقت کا کھانا۔ یہ میں جانتا تھا کہ ۴۵ سوئس فرانک بہت کم تھے۔ جو لوگ کم کرنسی ریٹ کے ممالک سے یہاں آئے تھے ان کے لیے یہ بہت بڑی رقم ہو گی لیکن سوئس میں مہنگائی کا عالم دیکھتے ہوئے ۴۵ سوئس فرانک کچھ بھی نہیں تھے۔

گلبدین بولا "کیا سوچ رہے ہو۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔"

ناشتہ کر کے میں نے گلبدین سے کہا "برتن میں دھو دوں گا۔"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں چائے کے خالی کپ اور بسکٹوں والی پلیٹ اُٹھائے ہوئے کچن میں جانے لگا تو گلبدین بولا "یہ بسکٹ فرج میں رکھ دو وہاں کچن میں سب ختم ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں کھانے کی چیز ہے۔"

وہ بولا "فرشتہ صاحب یہ پردیس ہے۔ اپنا ملک نہیں، جتنے پیسے ملتے ہیں ان ہی میں گزارا کرنا ہے۔"

میں نے خاموشی سے بسکٹ فرج میں رکھ دیئے اور کپ کچن میں جا کے دھو دیئے۔ میں کچن سے باہر آیا تو یہاں ایک خوبصورت سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کہنے لگی "میرا نام سیما ہے۔"

میں نے جواباً اپنا تعارف کروایا "میرا نام فرشتہ ہے۔"

کہنے لگی "میں یہاں کام کرتی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"

میں نے کہا "آج ترکی اور برازیل کا سیمی فائنل میچ ہے وہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کہنے لگی "آج صبح ڈش لگ گئی ہے۔ ہم لوگوں نے فائنل تک کے کارڈ کی ادائیگی کر دی ہے۔ تم میچ ازیل ہائم میں ہی دیکھ سکتے ہو۔"

میں بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا "ایک اور بات۔۔۔"

"مجھے بس کا ٹکٹ چاہیے۔ میں ونٹر تھور شہر جانا چاہتا ہوں۔"

کہنے لگی" ہمارے پاس ہر وقت بس ٹکٹ موجود ہوتے ہیں۔ جب تک تم پاس نہیں بناتے، تم یہ ٹکٹ لے سکتے ہو۔ میں ابھی ٹکٹ لاتی ہوں۔" وہ یہ کہہ دفتر سے ٹکٹ لینے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے باہر آئی اور اس کے ہاتھ میں ٹکٹ تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ٹکٹ دیتے ہوئے کہا" یہ ٹکٹ آنے جانے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا" مجھے پتا ہے۔ میں نے اس طرح کا ٹکٹ کل بھی استعمال کیا ہے۔"

میری طرف دیکھ کے کہنے لگی" تم کافی سمجھدار لگتے ہو۔ اگر کچھ اور چاہیے ہو تو بتاؤ۔"

میں نے کہا" یہاں پہ انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے؟"

کہنے لگی" یہاں تو نہیں لیکن ونٹرتھور میں جو بڑی لائبریری ہے، وہاں پہ تم آدھ گھنٹے کے لیے انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو اور وہ بھی مفت۔"

میں نے ٹکٹ لیتے ہوئے کہا" بہت شکریہ۔"

سینا کا چہرہ گول تھا، آنکھیں نہ بہت چھوٹی نہ ہی بہت بڑی اور ان میں نیلے رنگ کے منٹے گھوم رہے تھے۔ گورے رنگ پہ نیلی آنکھیں بہت بھلی لگتی ہیں۔ اس طرح کی آنکھیں مجھے پاکستان کے علاقوں ہنزہ، چترال اور سوات میں دیکھنے کو ملی تھیں۔ وہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ یونانی النسل ہیں حالانکہ ایران میں بھی کئی لوگوں کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ سینا کے بال سنہرے تھے اور قد میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ لمبی تھی۔ لباس اس نے انیتا کے مقابلے میں بہت سادہ پہنا ہوا تھا۔ مجھے یہ کسی سلجھے ہوئے خاندان سے لگتی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیتے ہی سینا سے کہا" میں چلتا ہوں۔"

میں ازیل ہائم سے نکلا۔ بس سٹاپ پہ آیا۔ میں سوچنے لگا۔ جیسے ہی ونٹرتھور پہنچوں گا پہلے لائبریری ڈھونڈوں گا۔ بس آئی اور میں بس میں سوار ہو کے ونٹرتھور پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے جو مارکیٹ گاز ستراز ے تھا وہاں پہ اتر کے میں نے ایک دو لوگوں سے پوچھا کہ بڑی لائبریری کہاں ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ کنٹز میوزیم (Kuntz museum) یعنی آرٹ میوزیم کے ساتھ لائبریری موجود ہے۔ یہاں سے شٹاڈ ہاؤس ستراز ے (stadhaus strasse) پہ چلے جاؤ اور آگے سے میوزیم ستراز ے پہ ہو جانا۔ تمہیں سامنے لائبریری نظر آ جائے گی۔ میں ان کے بتائے ہوئے راستے پہ چلتا چلا گیا، جیسے ہی شٹاڈ ہاؤس ستراز ے ختم ہوا تو میوزیم ستراز ے شروع ہوا۔ ایک کونے پہ کریم رنگ کے کورنتھیئن (corinthians) والی عمارت تھی۔ باہر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا ببلیو تھیکن

سینٹرل (Bibliotheqan central winterthur)۔ یعنی ونٹرتھور مرکزی لائبریری۔ لائبریری کے ساتھ آرٹ میوزیم تھا۔ میں لائبریری کی عمارت دیکھ کے بہت خوش ہوا کیونکہ اس طرح کی عمارتیں سوئس میں دیکھنے کو مجھے کم ہی ملتی تھیں۔ مجھے شروع سے ہی سوئس، اٹلی کے سامنے ماندگا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے سوئس پاکستان سے بھی بہت پیچھے تھا۔ نہ جانے لوگوں کو سوئس میں کیا خوبصورتی نظر آتی تھی۔ اگر سبزہ ہی خوبصورتی کی شرط ہے تو سبزہ بہت سے ملکوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان رقبے کے لحاظ سے سوئس سے سات گنا بڑا ہے، وہاں پہ کئی کئی میل تک سبزہ ہے۔ لائبریری کی عمارت کا نچلا حصہ نہ جانے کس استعمال میں تھا۔ اوپر دوسری منزل پہ لائبریری تھی۔ میں کاؤنٹر پہ گیا۔ وہاں پہ جو اٹینڈنٹ بیٹھی تھی اس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ میں ڈر گیا۔ میں نے انگریزی میں کہا" مجھے انٹرنیٹ استعمال کرنا ہے۔" مجھے اریزو کی لائبریری میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کا اتفاق ہوا تھا اس لیے مجھے پتا تھا کہ لائبریریوں میں انٹرنیٹ کی سہولت مفت فراہم کی جاتی ہے کہنے لگی" لائبریری کارڈ۔"

میں نے کہا" وہ تو نہیں ہے۔" میں نے اس کو ازیل ہائم کا کارڈ نکال کے دکھایا۔ اسے کارڈ کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ اس لائبریری میں شاید مہاجرین میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا اس لیے اس عورت نے مجھے گھور کے اور میرے کارڈ کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ بالآخر میرا کارڈ اپنے پاس رکھ لیا اور کہنے لگی" چار نمبر کیبن میں بیٹھ جاؤ۔ صرف آدھ گھنٹہ بیٹھ سکتے ہو۔"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں جا کے کمپیوٹر پہ بیٹھ گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ گوگل سرچ انجن کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہاٹ میل ٹائپ کیا۔ جیسے ہی ہاٹ میل کا پیج کھلا۔ میں نے اپنی آئی ڈی اور پاس ورڈ ٹائپ کیا۔ میرا میل بوکس کھل گیا۔ اس میں اتنی جنک میل تھی کہ اس کی گنجائش والی جگہ پہ لال لکیر بنی ہوئی تھی۔ میں نے بہت ساری میلز کینسل کیں۔ میں نے رضا کے لیے جلدی سے میل لکھی۔ میرا خیال تھا وہ جہاں بھی ہوگا، اگر اس کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہوئی تو وہ مجھ سے رابطہ قائم کر لے گا۔ رضا کو میسج بھیجنے کے بعد میں نے کچھ دیر گوگل سرچ انجن پہ مختلف چیزیں دیکھیں۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نہایت شرافت سے اٹھا۔ اس عورت سے اپنی ہاؤس وائس لی اور لائبریری سے باہر آ گیا۔ میں نے سوچا چلو آج ایک کام تو اچھا ہوا۔ آخری دفعہ اپنی ای میل میں نے کرائس لنگن کے اس انٹرنیٹ کیفے پہ چیک کی تھی جہاں میں اپنا موبائل فون چھوڑ آیا تھا۔ کافی دیر ونٹرتھور کے بازاروں کے

چکر لگاتا رہا۔ پھر مجھے بھوک لگنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ آج برازیل اور ترکی کا سیمی فائنل بھی ہے۔ اس لیے میں بس پہ بیٹھ کے ازیل ہائم واپس آ گیا۔

میں جب ازیل ہائم پہنچا تو ٹی وی لاؤنج ہر رنگ و نسل کے فٹ بال شائقین سے بھرا ہوا تھا۔ میچ شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ ازیل ہائم والوں نے ہمارے لیے ڈش کی سہولت بروقت فراہم کر دی تھی۔ میچ شروع ہوا تو دونوں ٹیمیں بہت جم کے کھیلیں۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تمام اسلامی ملکوں کے لوگ ترکی کے ساتھ تھے۔ افریقہ اور دوسرے علاقوں کے لوگ برازیل کے حامی تھے۔ برازیل کو یہ میچ جیتنا جتنا آسان لگ رہا تھا اتنا آسان نہیں تھا۔ دونوں ہاف میں کسی وقت بھی نہیں لگتا تھا کہ برازیل جیتے گا۔ میچ کا واحد گول رونالڈو نے کیا اور اس طرح برازیل سیمی فائنل جیت گیا۔ سب کو بہت افسوس تھا لیکن اب فائنل میں برازیل اور جرمنی آمنے سامنے تھے۔ برازیل جیتا تو فائنل کے لیے سب کی ہمدردیاں برازیل کے ساتھ ہو گئیں۔

میں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ گلبدین نے بتایا کہ آج ایک اور بنگالی آیا ہے اور اس نے بدرالدین کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم دونوں بنگالی ہیں اس لیے ہم اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا" جیسے اس کی مرضی۔ یہاں تو لوگ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے۔ ہم کس کس کو روکیں گے۔"

میں ہال میں بیٹھ گیا۔ شیفر اور شنائیڈر جا چکے تھے۔ وہاں ایک لڑکا جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے کچھ افریقن لڑکوں کے ساتھ کوئی افریقی زبان بول رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سوئس شہری کوئی افریقن زبان بولتا ہے۔ میں نے پوچھا" یہ کون سی زبان ہے۔"

کہنے لگا" وولوف" (Woolof)۔

میں نے کہا" یہ کس ملک کی زبان ہے۔"

کہنے لگا" سینیگال میں وولوف بولی جاتی ہے۔ یہ لڑکے سینیگال کے ہیں۔"

میں نے کہا" ان کو تو فرنچ بھی آتی ہو گی۔"

کہنے لگا" ہاں آتی ہو گی لیکن مجھے فرنچ نہیں آتی۔"

میں نے سینیگال کے لڑکے سے فرنچ میں پوچھا" تم فرنچ بولتے ہو۔"

کہنے لگا" بہت کم۔"

میں نے باقی لڑکوں سے پوچھا کہ تم کس ملک کے ہو تو کہنے لگے، ہم میں سے "دومالی" کے ہیں۔ ہم لوگ مانگا (Maninga) بولتے ہیں۔ یہ دو گنی کناکروُ (guinea konakro) کے ہیں۔

میں نے یہ نام اپنی زندگی میں نہیں سنا تھا۔ گنی بساؤ، فرنچ گنی اور پاپوآ نیو گنی کے نام البتہ سن رکھے تھے۔

یہ سب اُبلے ہوئے سفید چاولوں پہ گوشت کی کئی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ڈال کے کھا رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک اور افریقن جو میرے خیال میں نائیجیرین تھا، بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ تجسس کی بنا پر میں نے اسے غور سے دیکھنے لگا۔ لیکن میں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اس کو احساس نہ ہو۔ اُس کی پلیٹ میں اُبلی ہوئی پالک تھی۔ ایک برتن میں کوئی پیلی سی چیز گندھی ہوئی پڑی تھی یا پکائی گئی تھی۔ وہ وہاں سے ایک پیڑا سا اُٹھاتا۔ اس پیڑے کو ہاتھ میں مسلتا رہتا، پھر اس میں سے ایک چھوٹا پیڑا نکالتا۔ اس کو اس اُبلی ہوئی پالک میں ڈبو کے کھا جاتا۔ پھر اس پیڑے کو جو اس کے ہاتھ میں ہوتا اُس کو مسلتا۔ شروع میں تو مجھے بڑی اُلجھن ہوئی پھر میں سوچنے لگا ان کا کھانے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے جب میں شوربے میں روٹی ڈبو ڈبو کے کھاتا ہوں تو دوسروں کو برا لگتا ہو۔ وہ سوئس لڑکا یہاں سے اُٹھ کے چلا گیا۔ جس کے بال گھنگھریالے تھے۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ میں پاکستان میں ٹورسٹ گائیڈ رہا تھا۔ تجسس مجھ میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ سوئس لڑکا جا کے اس چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے کہا "اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔"

کہنے لگا "کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ حتیٰ کہ اس سے سوال بھی کر ڈالا "تم وولوف کیسے جانتے ہو۔"

کہنے لگا "میرا باپ سینیگال میں ایک رفاہی ادارے میں کام کرتا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں، میری امی، میری بہن ہم سب اس گاؤں میں رہتے تھے جہاں پہ میرے ابو کام کرتے تھے۔ ہم سوئس سکول میں جاتے تھے لیکن ہم نے وولوف بھی سیکھ لی۔ میں تو افریقن کھانا بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔ تم تو اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی کرتب دکھا رہا ہو۔"

میں نے کہا "میرا نام فرشتہ ہے۔ میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ میں وہاں ٹورسٹ

گائیڈ تھا۔ اس لیے مجھے تجسس ہو رہا تھا کہ وہ کیا کھا رہا ہے۔ وہ بغیر چمچ کھا رہا تھا، لیکن میرے لیے یہ بات عجیب نہیں تھی کیوں ہم بھی عموماً اسی طرح کھاتے ہیں۔''

وہ بولا ''میرا نام سولیون ہے۔ وہ تائیجرین لڑکا جس چیز کے پیڑے بنا بنا کے کھا رہا تھا وہ سوجی ہے۔ اس کو سیمولینو بھی کہتے ہیں۔ یہ اس کو پانی میں پکاتے ہیں۔ جب یہ تھوڑی سی پک جاتی ہے تو اس کو کسی بھی چیز کے ساتھ کھایا جا سکتا ہے۔''

میں نے اپنا وہی طنزیہ سوال دہرایا جو میں سوئس لوگوں سے اکثر کیا کرتا تھا ''تم نے بتایا کہ تمہارا والد ایک رفاہی ادارے میں کام کرتا تھا۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ یہ سوئس لوگوں کو چیرٹی کا کچھ زیادہ شوق نہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کئی جگہ پر سوس لوگ مختلف پراجیکٹس پہ کام کر رہے ہیں۔''

اس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ کہنے لگا ''میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن زیادہ تر پراجیکٹس یونائیٹڈ نیشنز کی طرف سے ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ کیا طریقہ ہے۔۔۔ پہلے جنگ سے ملک کو تباہ کرو۔ بعد میں ان لٹے ہوئے لوگوں کے لیے چندہ اکٹھا کرو۔ لوگوں کے پاس جو بچی کھچی رقم ہے وہ بھی چیرٹی کے بہانے لے لو۔''

وہ کہنے لگا ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

مطلب یہ کہ پہلے میڈیا کے ذریعے ملک کو بدنام کیا جاتا ہے۔ پھر وہاں امریکہ اپنی فوجیں بھیجتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی فرانس، جرمنی، اٹلی اور انگلینڈ بھی اپنی فوجیں بھیجتے ہیں۔ جب وہ پوری طرح ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ پھر اس ملک کو بنانے کے لیے چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چیرٹی سنٹر کھل جاتے ہیں۔ وہاں پہ اپنی مرضی کا صدر بنا دیا جاتا ہے۔ وہی ملک جو پہلے برا ہوتا ہے بعد میں اچھا ہو جاتا ہے۔''

سولیون کہنے لگا ''میں چلتا ہوں۔''

میں نے کہا ''میں بھی چلتا ہوں۔''

میں اپنے کمرے میں آیا۔ تولیہ لیا اور نہانے کے لیے اس جگہ آ گیا جہاں سب کے نہانے کی اکٹھی جگہ بنی ہوئی تھی۔ باہر جوتوں کے بہت سے جوڑے پڑے ہوئے تھے۔ جن میں سینڈل اور ہوائی چپل کے جوڑے بھی شامل تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو تین چار جگہوں سے پانی گرنے کی آواز

آ رہی تھی۔ ایک جگہ پلاسٹک کا پردہ بنا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ کپڑے اُتار کے ایک طرف لٹکا دیئے۔ اب میں ننگ دھڑنگ شاور کے نیچے کھڑا تھا۔ آس پاس نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک افریقن نہا رہا تھا دوسری طرف کوئی ایسٹرن یورپین ملک کا باشندہ تھا۔ میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ میں نے سنا تھا کہ یورپین ملکوں میں سکولوں اور کالجوں میں مشترکہ حمام ہوتے ہیں۔ کئی ایک فلموں میں بھی دیکھا تھا لیکن ہمارے ہاں غسل خانہ انتہائی شرم و حیا اور پردے کا مقام ہے۔ میں نے اس نیم اوپن باتھ میں نہانے کے لیے خود کو ذہنی طور پہ تیار کیا اور شاور کھول کے نہانے لگا۔ شاور کے گرتے ہوئے پانی کے شور نے اس سوچ کو ذہن سے محو کر دیا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ ویسے بھی کوئی کام انسان پہلی دفعہ کرے تو اس کے محسوسات انوکھے ہوتے ہیں۔ بعد میں انسان عادی ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ نہا کے نکلا تو میں نے کمر پہ تولیہ باندھا ہوا تھا۔ مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن میں اسی طرح اپنے اس کمرے میں گیا جہاں اٹھارہ بندوں کے سونے کی جگہ تھی۔ کپڑے بدل کے باہر آ گیا۔ یہاں بھی کرائس لنکن کی طرح کسی نہ کسی کو جانا ہوتا اور روز کوئی نہ کوئی نیا بندہ آ جاتا۔ آج ازیل ہائم میں ایک انڈین لڑکا آیا تھا۔ ٹی وی لاونج میں ایک چھوٹے سے قد والے لڑکے کا قبضہ تھا۔ مجھے یہ لڑکا بڑا عجیب سا لگا۔ وہ جارجیا کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک دو افریقن لڑکوں کی خوب ٹھکائی کی تھی۔ اس سے سارے ڈرتے تھے۔ وہ ٹی وی روم میں کوئی فلم دیکھ رہا تھا، جب کہ عربی بولنے والا ایک لڑکا اس سے بحث کر رہا تھا۔ میں نے سوچا اس سے پوچھا جائے کہ مسئلہ کیا ہے۔ میں اندر داخل ہوا۔ میں نے پوچھا ''کیا مسئلہ ہے۔''

اس عربی کو مجھے دیکھ کے کچھ حوصلہ ہوا۔ کہنے لگا ''جب سے میچ ختم ہوا ہے یہ ٹی وی پہ مسلسل فلمیں دیکھے چلا جا رہا ہے۔ جب ایک فلم ختم ہوتی ہے تو دوسری لگا لیتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ تو غلط بات ہے۔ یہاں سب کا برابر کا حق ہے۔''

اس جارجیا کے لڑکے نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور بولا:

''تم کون ہو۔''

میں نے کہا ''میں پاکستانی ہوں۔ یہاں نیا آیا ہوں۔''

جب اس نے پاکستان کا نام سنا تو کہنے لگا ''پاکستانی تو بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''تمہیں کیسے پتا ہے۔''

کہنے لگا" ہمارے ہاں جارجیا میں انڈیا اور پاکستان سے بہت سے لڑکے پڑھنے آتے ہیں۔ وہاں فیس کم ہے اور ویزہ بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔"

میں نے کہا" اس وقت مسئلہ یہ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو ٹی وی دیکھنے نہیں دے رہے۔"

کہنے لگا" میں ریموٹ رکھ دیتا ہوں لیکن تم دیکھنا یہ کون سا چینل لگائے گا؟ یہ سارا دن پورنو گرافک فلمیں دیکھتے رہتے ہیں جب کوئی بھی فلم نہ ہو تو جو لڑکیاں کریڈٹ کارڈ پہ سٹرپنگ کرتی ہیں ان کو دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے فون نمبر لکھتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا" میں بہت معذرت خواہ ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ٹی وی روم سے باہر نکل آیا۔ ٹی وی روم کے پاس استری سٹینڈ تھا وہاں پہ گلبدین کپڑے استری کر رہا تھا۔ جب وہ کپڑے استری کر چکا تو وہ استری واپس دینے گیا۔ راستے میں اسے ایک ساڑھے چھ فٹ کے بنے کٹے بندے نے روک لیا اور اس سے استری مانگنے لگا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اتنا نظر آ رہا تھا کہ گلبدین کی جان نکلی جا رہی ہے۔ میں نے کہا" کیا مسئلہ ہے۔"

کہنے لگا" یہ مجھ سے استری مانگ رہا ہے۔ میں نے اپنی ہاؤس وائس دے کے استری لی ہے۔ یہ اپنی ہاؤس وائس دے کے استری لے لے جب میں واپس کر دوں۔"

میں اس آدمی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ازیل ہائم میں کام کرنے والا بندہ بھی آ گیا۔ کہنے لگا "کیا مسئلہ ہے۔"

میں نے اس کو تفصیل سمجھائی۔ وہ کہنے لگا، یہ ٹھیک کہتا ہے اس نے ٹی وی لاؤنج سے اس جارجیا کے لڑکے کو بلایا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ کا آدمی بھی جارجیا کا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں اسے سمجھایا۔ پھر اسے سمجھ آئی کہ معاملہ کیا ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ ازیل ہائم میں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہاؤس وائس جمع کروا کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جارجیا کا وہ لڑکا مجھے کہنے لگا" اس آدمی نے سات قتل کیے ہیں۔ تمہیں اس سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہیے تھا۔"

میں نے کہا" ہم لوگ اس وقت سوئس میں ہیں، جارجیا میں نہیں۔"

گلبدین ایک طرف کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے گلبدین کو جا کے سنائیں" تم عجیب آدمی

ہو۔ میں تمہارے لیے اس شخص سے لڑ رہا ہوں اور تم دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہو۔ مجھے تو تم افغانی لگتے ہی نہیں ہو۔"

گلبدین چپ ہو کے سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا "میں آج دعوت پہ جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "جاؤ میں نے کب منع کیا ہے۔"

جس اٹینڈنٹ کی آج ڈیوٹی تھی وہ بہت ہی دبلا پتلا تھا۔ اس کا قد بھی لمبا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ سوئس میں، میں ہر وقت بندوں کے چہروں کو دیکھتا رہتا یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ کون جرمن نژاد ہے، کون فرنچ اور کون اتالین! یہ شخص جس کی اس وقت ڈیوٹی تھی مجھے جرمن نژاد لگا۔

یہاں پہ رہنے والے لوگوں کو براعظم کے حساب سے تقسیم کیا گیا تھا۔ افریقن لڑکوں کا علیحدہ گروپ تھا۔ حالانکہ سینیگال، مالی اور گنی کناکری کے لوگ نائیجیریا، انگولا اور کانگو کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس کے علاوہ الجزائر، مراکش اور تیونس کے افریقن عربی جانے جاتے تھے۔ بالکل اسی طرح ہر گروپ کے ذمے کوئی نہ کوئی کام ہوتا۔ کچھ کچن صاف کرتے، کچھ باتھ صاف کرتے، کچھ ہال صاف کرتے، کچھ باہر والا چھوٹا باغیچہ صاف کرتے، کچھ ٹی وی لاؤنج کی صفائی کرتے۔ میرے ذمے اس جرمن نژاد ڈیوٹی افسر نے کچن کی صفائی لگائی۔ میں جب کچن صاف کرنے گیا تو حیران رہ گیا۔ اتنا گندہ کہ وہاں سانس لینی مشکل تھی۔ خیر میں نے کچن صاف کرنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ میں نے کچن صاف کر دیا۔ مجھے کچن صاف کرنے میں دو گھنٹے لگے۔ کچھ لڑکے باتھ صاف کر رہے تھے۔ کچھ دیگر کمروں کی صفائی کر رہے تھے۔ جب سب کا کام مکمل ہو گیا تو ہاؤس ماسٹر نے خود ساری جگہیں جا کر ملاحظہ کیں۔ اس نے کچن کی سب سے زیادہ تعریف کی۔ جب اسے تسلی ہو گئی تو میں اس تہہ خانہ نما ازیل ہائم سے باہر نکلا۔ باہر صوفوں پہ ہمیشہ کسی نہ کسی کا قبضہ رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی ان پر ضرور بیٹھا ہوتا۔ کوئی آ رہا ہوتا اور کوئی جا رہا ہوتا۔

میں بھی باہر اس چھوٹے سے باغیچے میں کافی دیر بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ازیل ہائم کے ایک طرف کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں مکئی کی فصل تیار تھی۔ یہاں سے ازیل ہائم کے لڑکے بھٹے توڑ توڑ کے لاتے۔ کوئی ابال کے کھاتا، کوئی بھون کے کھاتا۔ ازیل ہائم کے سامنے جو سٹور تھا۔ اس کے لوہے کے بڑے بڑے پٹ سرِ شام ہی بند ہو جاتے۔ یہاں ازیل ہائم کے لڑکے فٹ بال

کھیلتے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یہاں کرکٹ کھیلی جائے لیکن کس کے ساتھ کھیلتا؟

مجھے یہاں بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ کافی دیر بعد دور سے گلبدین جھومتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کا کین تھا۔ اب تک میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا "کیسی رہی دعوت۔"

کہنے لگا" بکواس۔ انہوں نے چاول ابال کے رکھ دیئے اس کے بعد قہوہ۔"

میں نے کہا" تم تو افغانی ہو۔ تمہیں تو یہ چیزیں پسند ہونی چاہئیں۔"

کہنے لگا" میں افغانی ضرور ہوں لیکن میں نے ساری زندگی پاکستان میں گزاری ہے۔ مجھے پاکستانی طرز زندگی پسند ہے۔"

وہ بیئر پیتے ہوئے اندر چلا گیا۔ میں نے تھوڑا سا سالن بچایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو بیگا بریڈ (یہ نان کی طرح کی روٹی ہوتی ہے اور تھوڑی لمبی ہوئی ہے۔ اس کو کاٹ کر کباب کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے) پڑی ہوئی تھیں۔ کھائیں پھر چائے پی۔ برتن وغیرہ دھو کے فارغ ہوا تو۔ ہال میں آ کے بیٹھ گیا۔ ٹی وی روم پہ بدستور اس جار جیا کے لڑکے کا قبضہ تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو فلسطینی اور عربی بولنے والے ٹی وی پہ پورنو گرافک فلمیں دیکھ رہے ہوتے۔

ہال میں مالی (افریقہ کا ایک ملک جس کی سرحد سینیگال کے ساتھ ملتی ہے) کا لڑکا محمدو تراوالی اور سینیگال کا لڑکا بوبکر عبدالائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں عربی تلفظ کے مطابق ان کے نام محمد وتر اوالی اور ابوبکر عبداللہ ہونے چاہئیں تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔ کیسٹ پلیئر پہ کوئی گانا چلے ہو رہا تھا۔ گانا بڑا اوردو بھرا تھا۔ میں نے محمدو تراوالی سے فرنچ میں پوچھا کہ یہ کیا چل رہا ہے۔ اس کو ٹوٹی پھوٹی سمجھ آتی تھی۔ کہنے لگا، مجھے نہیں پتا۔ پھر میں اس کے پاس چلا گیا جو یہ کیسٹ سر جھکائے سن رہا تھا اور پوچھا" یہ تم کیا سن رہے ہو۔"

کہنے لگا" میری مذہبی چیز ہے۔"

میں نے کہا" کون سی مذہبی چیز۔"

اس نے مجھے کاغذ پہ لکھی ہوئی کوئی چیز دکھائی۔ میں نے پوچھا" یہ کیا ہے۔"

کہنے لگا" یہ سورت فاتحہ ہے۔"

میں نے کہا" سورت فاتحہ ایسے لکھتے ہیں۔ وہ تو عربی میں ہے۔"

کہنے لگا" تم کہاں کے ہو؟"

میں نے کہا ''میں پاکستانی ہوں۔''

جب اس نے پاکستان کا نام سنا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ کہنے لگا ''میں مسلمان ہوں۔ کوسوا کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے ملک کے مسلمان پاکستان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

میں سمجھا اس لڑکے کا دماغ خراب ہے۔ ساری دنیا مسلمانوں کو اور خاص کر پاکستانیوں کو دہشت گرد کہتی ہے اور یہ کہتا ہے ہم پاکستانیوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

میں نے پوچھا ''اس کی وجہ۔''

کہنے لگا ''ہمیں پاکستان کی وجہ سے بڑا سہارا ملا ہے۔ ایک تو اس زمانے میں جب ہماری نسل کشی کی جا رہی تھی۔ پاکستانی فوج کے حفاظتی دستوں نے اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ہماری بہت زیادہ مدد کی دوسرا پاکستان دنیا کا واحد اسلامی ملک ہے جس کے پاس ایٹم بم ہے۔''

پھر کہنے لگا ''تمھیں عربی آتی ہے۔''

میں نے کہا ''سمجھ نہیں سکتا لیکن پڑھ لیتا ہوں۔''

کہنے لگا ''تم مجھے سورت فاتحہ لکھ کے دے سکتے ہو۔''

میں نے کہا ''ہاں لکھ دیتا ہوں۔'' میں نے سفید کاغذ کے اوپر بسم اللہ لکھی اس کے بعد سورت فاتحہ لکھی۔ اس کو پڑھ کے سنائی۔ وہ میری شکل دیکھنے لگا۔ کہنے لگا ''تمھیں پتا ہے جب ہمارے خطے میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو انہوں نے سارے شیخوں کو مار دیا۔ عربی میں لکھی ہوئی کتابیں جلا دیں۔ کوئی بھی عربی لکھنے، پڑھنے اور بولنے والا نہ بچا۔ ہمیں ہمارے بزرگ کوسوون زبان میں جتنی بھی دینی تعلیم ہمیں دے سکتے تھے دی۔ میں سورت فاتحہ کیسٹ میں سن رہا ہوں۔ مجھے یہ سننا بہت اچھا لگتا ہے۔''

اس کی اسلام سے عقیدت سن کے میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔ میں نے اسے کہا ''تمھیں جو بھی پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔''

میں نے کہا ''سورت فاتحہ مجھے زبانی یاد ہے۔ میں خوش الحان تو نہیں لیکن میں تمھیں سنا سکتا ہوں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تمھیں پسند آئے گی کہ نہیں۔ میں نے سر پہ رومال باندھا اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد اس کو سورت فاتحہ سنائی۔ آخر میں آمین کہا۔

وہ کہنے لگا ''تم اگر کوسوا چلے جاؤ تو تمھیں لوگ شیخ تصور کرنے لگیں گے۔''

میں نے کہا" یہ شیخ کیا ہوتا ہے۔"

کہنے لگا" ہمارے ہاں جو اسلام کے بارے میں جانتا ہے، نماز عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ اس کو شیخ کہتے ہیں۔"

وہ مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے میں کوئی بہت ہی عظیم شخصیت ہوں۔ رات کے بارہ بجے ایک افریقن عورت کی ڈیوٹی تھی۔ وہ شکل وصورت سے تو واجبی تھی لیکن اس کے لباس کی تراش خراش بتاتی تھی کہ پڑھی لکھی ہے، جب وہ دبلا پتلا آدمی کام چھوڑ کے گیا تو وہ آ گئی، آتے ہی سب سے سلام دعا کی۔ اب ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اس لیے بیٹھا تھا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ جب نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔ وہ مجھ سے کہنے لگی" یہاں پر رات کو دس بجے سونے کا حکم ہے اور تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔"

میں نے کہا" میں رات کو دیر سے سونے کا عادی ہوں۔ ویسے بھی گرمیوں میں مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ نہ ہی مجھے صبح کوئی کام ہے۔"

کہنے لگی" کہاں کے ہو۔"

اس سوال کا جواب دے دے کے میں تنگ آ گیا تھا لیکن جواب تو دینا تھا اور اس کے بعد بھی نہ جانے کتنے لوگوں کو جواب دینا تھا۔ میں نے کہا" پاکستانی ہوں۔"

وہ کہنے لگی" میں سوڈان کی رہنے والی ہوں۔ میں دو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ میرا نام خدیجہ ہے۔"

میں نے کہا" میرا نام فرشتہ ہے۔"

کہنے لگی" کب آئے ہو۔"

میں نے کہا" دو دن پہلے آیا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کئی دن ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ ایک نائیجرین لڑکا ایک لمبی سی قمیض پہنے اپنے کمرے سے نکل کے ہال کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ خدیجہ نے دور سے ہی شور کیا" فوراً کچھ پہن کر آؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔"

وہ نائیجرین لڑکا بہت گھبرایا۔ کہنے لگا" مسئلہ کیا ہے۔ میں اسی طرح سوتا ہوں۔"

خدیجہ بولی" تم جس طرح بھی سوتے ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن ازیل ہائم کے بھی کچھ اصول ہیں۔" وہ واپس چلا گیا۔ اب اس نے ٹریک سوٹ کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ وہ جس کام

سے آیا تھا کر کے چلا گیا۔

خدیجہ مجھ سے مخاطب ہوئی "تمھیں پتا ہے یہ اس طرح کیوں کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں پتا۔"

کہنے لگی "مجھے ازیل ہائم میں کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چلا ہے۔ تم جتنے بھی نائجیرین لڑکوں سے ملو گے وہ خود کو بادشاہ کا بیٹا بتائیں گے۔ وہاں پہ چھوٹے چھوٹے محلے، گاؤں یا قصبے کہہ لو۔ ان کا جو سردار ہوتا ہے اس کو یہ بادشاہ کہتے ہیں اور ہر بادشاہ کی دس بارہ بیویاں ہوتی ہیں اس نسبت سے وہاں شہزادہ ہونے کے دعویدار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں، جہاں تک بات تھی پیچھے گھوم کر پہن کے باہر آنے کی۔ تو اس کی وجہ سوئس لڑکیوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اپنے جسم کی نمائش کرتے ہیں۔ سوئس لڑکیاں افریقن لڑکوں کی دیوانی ہیں۔ افریقہ کے زیادہ تر لڑکوں کا یہاں آنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ کسی سوئس لڑکی سے دوستی کر لیں۔ جس میں یہ اکثر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا "سوئس لڑکیاں تعلقات کے لیے سوئس مردوں کو ترجیح کیوں نہیں دیتیں تو وہ بے دھڑک بولی " کیونکہ۔۔۔۔" سوئس مردوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہ ساری تفصیل کیسے جانتی ہوں۔"

کہنے لگی "میں نے سوڈان میں قانون کی ڈگری لی ہے۔ یہاں بھی لوگوں کو قانونی مشورہ دیتی ہوں لیکن اس کی میں فیس لیتی ہوں۔ میرے پاس ایسے کئی کیس آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تمھیں یہاں کے ہیپر مل گئے ہیں۔"

کہنے لگی "ہاں مجھے پہلے انٹرویو کے بعد ہی ہیپر مل گئے تھے۔ میں نے اپنا پاسپورٹ دیا تھا۔ دیگر کاغذات میں سب کچھ اصلی دیا تھا۔ وہ چاہتے تو مجھے واپس بھیج دیتے۔"

مجھے خدیجہ کی باتوں سے لگا جیسے وہ خود کو بہت بڑی چیز سمجھ رہی ہے۔ ہم نے سوڈان اور صومالیہ میں جنگ اور قحط ہی دیکھا تھا۔ جیسے آج کل لوگ پاکستان کے بارے میں سوچتے ہیں کہ شاید وہاں صرف دہشت گردی رہتے ہیں۔ جو بھی پاکستان کا نام سنتا ہے کہتا ہے وہاں پہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔ پاکستان کی پندرہ کروڑ آبادی ہے۔ کچھ علاقوں میں ۹/۱۱ کے بعد حالات یقیناً خراب ہوئے ہیں لیکن سارا ملک تو ایسا نہیں ہے۔ خیر کس کو انسان تفصیل بتاتا پھرے کہ وہاں پہ خوبصورت پہاڑ ہیں۔ وہاں پہ دنیا کا چوتھا بڑا دریا بہتا ہے۔ وہاں پہ دنیا کے بڑے اور لمبے گلیشیرز ہیں۔ وہاں پہ دنیا کا سب

سے اونچا پولو گراؤنڈ ہے۔ وہاں دنیا کا سب سے اونچا درہ ہے۔ وہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ وہاں پہ چاروں موسم پائے جاتے ہیں۔ وہاں پہ برف پوش پہاڑ ہیں، وہاں پہ صحرا ہیں۔ لہلہاتے کھیت ہیں۔ خوبصورت وادیاں ہیں۔

میں پاکستان میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ میں نے ایسی کئی چیزیں دیکھی تھیں جن کو دیکھ کے مجھے اپنے پاکستانی ہونے پہ فخر محسوس ہوا تھا۔ اس طرح کے حالات کیوں ہو گئے تھے میں اس کی تفصیل نہیں جانتا تھا لیکن جب سے سوئس آیا تھا۔ میں اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر پا رہا تھا کہ اچانک ساری دنیا کی تنقید پاکستان کی طرف کیوں ہو گئی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کمی کا ڑے کیا ہوتے ہیں، سوئی سائیڈ بومنگ کیا ہوتی ہے، دہشت گردی کیا ہے، ٹون ٹاورز کس نے گرائے؟ کیا واقعی مسلمان دہشت گرد ہیں۔ کیا ہم لوگ انتہا پسند ہیں، مجھے خدیجہ نے گفتگو کے دوران یہ باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستانی لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ مجھے اس سے گفتگو کر کے بالکل خوشی نہ ہوئی۔ میں اس ہال میں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں اُٹھا، خدیجہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے اس کمرے میں آ گیا جہاں کرائس لنگن سے بھی زیادہ برا حال تھا، گو کہ اس ازیل ہائم میں مہاجرین کی مجموعی تعداد زیادہ نہ تھی لیکن جب آپ کو پتا ہو کہ ایک کمرے میں اٹھارہ بندے سوتے ہیں تو انسان کو عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ میں اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ او ور ہیول کی اس خواب گاہ کے ایشیائی حصے میں میرا بستر بالکل نیچے اور درمیان میں تھا۔ جب کہ میرے آس پاس دونوں بستر خالی تھے۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

جمعے کے دن اریزو میں بہت سے لوگ نماز جمعہ کی ادائیگی کو جاتے ہیں۔ یہاں عربوں کی علیحدہ مسجد ہے اور بنگالیوں کی علیحدہ۔ اس کے علاوہ منہاج القرآن والوں نے بھی ایک سنٹر بنایا ہوا ہے کچھ لوگ وہاں بھی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ مسلمان دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں ان کا مذہب، رسول، قرآن سب ایک ہوتا ہے لیکن مسجد ہر کسی کی علیحدہ ہوتی ہے۔

اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا:

دین بھی ایک ہے، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

مجھے ابھی تک ان مساجد میں جا کر نماز ادا کرنے کی توفیق حاصل نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ ہمارے گھر کئی دفعہ منہاج القرآن والوں اور کئی دفعہ بنگالیوں کے تبلیغی ٹولے تشریف لا چکے تھے۔

میں ناشتے کے بعد لائبریری چلا گیا۔ وہاں کافی دیر تک لکھتا رہا۔ اس کے بعد ویا پیٹر کا چلا گیا۔ وہاں ایک بنگالی کی وڈیو شاپ ہے۔ اس سے پوچھا کوئی نئی فلم آئی ہے؟ اس نے کہا، آج کل دیوداس بڑی چل رہی ہے۔ میں نے کہا اگر ہے تو دے دو۔ وڈیو کیسٹ کا دور ختم ہو چکا تھا اور ڈی وی ڈی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ لیکن یہ ڈی وی ڈی ایک دو دفعہ دیکھنے کے بعد نہ چلتی۔ خیر میں نے دیوداس لی اور گھر آ گیا۔ فلم شروع ہوئی۔ اس کا مرکزی خیال کسی بنگالی ناول نگار کے ناول سے ماخوذ ہے۔ اس

کہانی پہ پہلے بھی فلم بن چکی ہے۔ جس میں دیوداس کا کردار دلیپ کمار نے ادا کیا تھا، جب کہ موجودہ فلم میں دیوداس کا کردار بولی وڈ کے بریڈپٹ شاہ رخ خان نے نبھایا ہے۔ فلم کا ہر کردار فلم میں نگینے کی طرح فٹ نظر آیا۔ مجھے لیلا بھنسالی کی اس فلم میں بہت محنت دکھائی دیتی ہے۔ فلم کا ٹی فلمی تھی خاص طور پر گانے، لباس، سیٹ ڈیزائننگ کمال کی تھی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ فلم دیکھ کے میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگا۔ جب شام کو نیائش آیا تو اسے میں نے بتایا کہ فلم لایا ہوں بہت اچھی ہے۔ کہنے لگا "کون سی فلم لائے ہو۔"

میں نے کہا "دیوداس۔"

وہ کہنے لگا "ماڑا اس میں تو شاہ رخ خان نے کام کیا ہے۔ پٹھان کا بچہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔"

نیائش کو ہفتے اور اتوار کی چھٹی تھی۔ اس لیے وہ کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر فلم دیکھنے لگا۔ میں فلم دیکھ چکا تھا۔ یہ فلم دوبارہ دیکھنے کا سر دست میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں کچن میں آ گیا اور رات کے لیے کھانا بنانے لگا۔

میں جملہ کاموں سے رات آٹھ بجے کے قریب فارغ ہوا۔ نیائش فلم دیکھ چکا تھا۔ اس لیے ہم دونوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران نیائش فلم کی تعریف کرتا رہا۔

کھانے کے دوران ہی ثقلین نازل ہو گیا۔

آتے ہی کہنے لگا "بہت زور سے بھوک لگی ہے۔"

میں نے سنک کے ساتھ الماری سے جہاں ہم برتن دھونے کے بعد سوکھنے کے لیے رکھتے تھے۔ ایک پلیٹ نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ میں نے چکن کری بنائی تھی، جو ہم تینوں کے لیے کافی تھی۔

نیائش بولا "پری پیکر تم تو کہتے تھے کھانا مالک کے طرف سے ہوتا ہے۔"

ثقلین بولا "کھانا کھا لوں پھر بات کروں گا۔ اس وقت میرا دھیان صرف پیٹ پوجا پر ہے بھوک کی وجہ سے مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔"

میں ثقلین کی بات سن کے مسکرایا۔ کھانا ختم ہوا تو ثقلین بولا "اب میری آنکھیں کھلی ہیں اور کچھ نظر آیا ہے۔ نیائش بھائی کل آپ نے جس رنجیدگی سے گلہ کیا تھا۔ میں نے دل میں عہد کر لیا تھا خواہ کچھ بھی ہو، میں آج کا کھانا، آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔ آج کام پر میں نے کھانے کا وقفہ

نہیں کیا۔اپنے حصے کا کام ختم کرتے ہی اپنے ایک کولیگ سے لفٹ لے کے یہاں پہنچ گیا۔"

نیائش بولا" یار بس ویسے ہی دھیان آتا تھا کہ شاید ہماری کوئی بات بری لگ گئی ہو۔"

ثقلین نے وضاحت پیش کی۔ نیائش بھائی آپ کو تو پتا ہے آج کل کام کے حالات کیسے ہیں۔مالک جیسے کہتا ہے کرنا پڑتا ہے۔"

نیائش بولا" یہ بھی عجیب ملک ہے،جن لوگوں کے پاس کام نہیں،ان کو بالکل کام نہیں ملتا اور جن کے پاس کام ہے وہ اوور ٹائم بھی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے امیگریشن بھی کھول دی ہے،جن لاکھوں لوگوں نے امیگریشن اپلائی کر رکھی ہے۔ان کو کام کہاں سے دیں گے۔اس کے علاوہ بہت سے لوگ اب فلسی (یہ ایک طرح کا سپانسر ہوتا ہے اور یہ لوگ کام کا ویزا اپنے ملک کی اٹالین ایمبیسی سے لے کر آتے ہیں) پہ بھی آرہے ہیں۔"

میں بولا" اٹلی کو امیگریشن سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔لوگ ٹیکس دیتے ہیں۔یہ ٹیکس اٹلی کے لوگوں کو تعلیم،صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ پنشن دینے میں مدد کرتا ہے۔"

ثقلین اور نیائش نے میری طرف غور سے دیکھا۔ثقلین بولا" فرشتہ صاحب آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا" میری اپنی اسیسمنٹ ہے،ویسے ثقلین بھائی،آپ مجھے صاحب واحب نہ کہا کریں۔میرے لیے فرشتہ کا نام ہی کافی ہے۔"

ثقلین بولا" ایسا اس وقت ممکن ہو سکے گا۔جب تم بھی مجھے ثقلین بھائی کہنے کی بجائے صرف ثقلین پر اکتفا کرو گے۔"

میں نے کہا" محبتوں میں مشروط ردِ عمل مناسب بات تو نہیں ہوتی لیکن آپ فرما رہے ہیں تو چلو ایسے ہی سہی!"

ثقلین نے فوراً انداز تخاطب بدلتے ہوئے کہا" ہاں تو فرشتہ جی۔۔۔"

" یہ بتاؤ کہ اگلا باب تیار ہے؟"

میں نے کہا" ہاں وہاں میز پہ پڑا ہوا ہے۔" میں نے اپنے اور نیائش کے لیے چائے بنائی۔ ثقلین نے بھی فرمائش کر دی اس طرح میں نے تین کپ چائے کے بنائے۔چائے کے دوران نیائش اور ثقلین" ڈیوواس" کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور میں کچن کی چیزیں سمیٹتا رہا۔

OOO

میں سو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کوئی دور سے بلا رہا ہے۔ پہلے مجھے لگا شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ وہی لڑکی انیتا جس نے بے شمار بالیاں پہنی ہوئی تھیں، میرا نام لے کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو کہنے لگی "تمہیں پتا ہے دن کے دس بج چکے ہیں۔ آج جمعرات ہے۔ سب لوگ ہال میں موجود ہیں۔۔۔ سوائے تمہارے! شنائیڈر نے مجھے تمہیں جگانے کا کہا ہے۔ میں کتنی دیر سے تمہیں جگانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

میں نے کہا "تم چلو میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔"

کہنے لگی "ہاتھ منہ دھونے کا وقت نہیں ہے۔ پہلے میٹنگ میں شامل ہو جاؤ اس کے بعد ہاتھ منہ دھونا یا جو جی میں آئے کرنا۔ جب انسان سو کے اٹھتا ہے تو اس کی حالت عجیب سی ہوتی ہے۔ میں نے انڈرویئر کو تو کراس لنکن میں ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ اب یہاں رات کو سونے کے لیے اپنی اکلوتی جینز اتار دیا کرتا اور نچلے حصے پہ چادر لپیٹ لیا کرتا۔ میں نے انیتا سے کہا: "اگر تم اجازت دو تو میں جینز پہن لوں۔"

کہنے لگی "تم جینز پہن کے آ جاؤ، میں جا رہی ہوں۔"

میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنی جینز اپنی ٹانگوں میں پروئی جو میرے سرہانے پڑی ہوئی تھی۔ اپنے جوتے پہنے جو میرے جوتوں کا بھی کام دیتے تھے اور سلیپرز کا بھی کیونکہ میں نے انڈرویئر کے ساتھ ساتھ جرابوں سے بھی جان چھڑا لی تھی۔ کوریڈور میں کھٹ کھٹ کرتا ہال میں پہنچا۔ میں جیسے ہی ہال میں پہنچا تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی ہال ہے جو میں پچھلے دو دن سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے یہاں اتنے بندے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پھر مجھے یاد آیا۔۔۔ اوہو۔۔۔ آج تو پیسے ملنے ہیں۔ ۴۵ سوئس فرانک۔ ہفتے کا جیب خرچ۔ بہت سے لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں شنائیڈر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے کونے میں شیفر۔

شنائیڈر بولا "سب لوگ آ گئے۔"

انیتا بولی "فرشتہ رہتا تھا وہ بھی آ گیا ہے۔"

شیفر بولا "تو کارروائی شروع کریں۔"

شنائیڈر بولا "آپ سب کو میری شیفر اور رازیل ہائم کے عملے کی طرف سے سلام۔ آج ہم

چیک دیں گے اور جن لوگوں کے پاس ٹرین یا بس کا ٹکٹ نہیں ہے ان کو پاس بھی دیں گے۔

شیفر بولا" ہمیں پتا چلا ہے کہ ازیل ہائم میں رہنے والے لڑکے باہر جا کے چوری چکاری کرتے ہیں۔ ہمیں آس پاس کے لوگوں نے شکایت کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ ڈرگز بھی بیچتے ہیں۔"

شنائیڈر بولا" ہمیں اس بات کی بھی خبر ہے کہ آپ میں سب کچھ لوگ پورا ہفتہ نظر نہیں آتے اور چیک والے دن نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں کام پہ جاتے ہیں۔ اگر ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ آپ میں سے کوئی پناہ گزین کام پہ جاتا ہے تو اس کو نہ صرف چیک ملنا بند ہو جائے گا بلکہ اس کو اس کے ملک واپس بھی بھیجا جا سکتا ہے۔"

شیفر نے اس جارجیا کے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا" تم اپنے ہم وطنوں کو اس ساری بات چیت کا ترجمہ کر کے سنا دو۔" اس نے نہ جانے کون سے زبان میں چند لوگوں کو بتانا شروع کیا۔

پھر شنائیڈر مجھ سے مخاطب ہوا" تم اس افغانی لڑکے کو سمجھا دو۔"

میں نے گلبدین کو بتایا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا" آج یہ پیسے جو دے رہے ہیں۔ اس لیے لیکچر تو دیں گے۔"

شیفر بولا" اگر کسی کو کوئی بات سمجھ نہ آئی ہو تو پوچھ سکتا ہے۔ یا کسی کو کچھ کہنا ہو تو کہہ سکتا ہے۔"

ایک ترک لڑکے نے کہا کہ اس کا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایک نے کہا، پھیپھڑوں کوئی مسئلہ ہے۔ شیفر نے سب کی باتیں نوٹ کر لیں۔

پھر بولا" میں نے سب کے مسائل لکھ لیے ہیں۔ میں متعلقہ ڈاکٹرز سے وقت لے کے تمھیں بتا دوں گا۔"

اس کے بعد شنائیڈر نے سب میں چیک تقسیم کیے۔ مجھے بھی دو سو نؤس فرانک کا چیک ملا۔ یہ چیک عجیب قسم کا تھا جیسے کوئی ٹوکن ہو۔ میں نے شیفر سے پوچھا" بائی داوے۔ کیا یہ کیش ہو جائے گا؟"

وہ ہنسا اور پھر بولا" یہ بھی ایک طرح کا چیک ہے۔ تم بینک جا کے کیشئر کو جب یہ دکھاؤ گے تو وہ تمھیں اس کاغذ کے بدلے پیسے دے گا۔"

میں چیک کو الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔ پھر شنائیڈر بولا" جن لوگوں کے پاس بس پاس نہیں وہ انجا کے پاس جائیں وہ بس پاس کے لیے ٹوکن دے گی۔ وہ ٹوکن تم لوگ سٹیشن پہ جہاں سے ٹرین کا

ٹکٹ ملتا ہے دکھاؤ گے تو وہاں سے تمھیں بس کا مہینے کا پاس مل جائے گا۔''

شیفر بولا'' اگر کسی کو کوئی سوال کرنا ہو تو کر سکتا ہے۔''

جار حیا کا وہ چھوٹے قد والا لڑکا بولا'' تم لوگوں کو کس نے بتایا ہے کہ ازیل ہاءم کے لڑکے چوری کرتے ہیں اور ڈرگز بیچتے ہیں۔''

شنائیڈر بولا'' ہمیں آس پاس کے لوگوں نے بتایا ہے۔''

جارجین بولا'' کیا انھوں نے خود آپ کو بتایا ہے؟''

شیفر بولا'' دراصل انہوں نے پولیس سٹیشن جا کے شکایت کی ہے اور پولیس کا نمائندہ یہاں آیا تھا جس نے ہمیں اطلاع دی ہے۔''

شنائیڈر اور شیفر کا جواب تسلی بخش نہیں تھا۔ میں اٹھ کے انجیا کے پاس گیا اور اس سے بس پاس کا نوٹ کر لیا۔ اتنے میں ایک لمبا تڑنگا آدمی میرے پاس آیا اور مجھے اطالین زبان میں کہنے لگا'' کام کرو گے؟''

میں نے کہا'' کام کیا ہے؟''

کہنے لگا'' میں ایک سوئس ٹھیکیدار کے پاس کام کرتا ہوں۔ اس کو لیبر کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا تھا اگر کوئی کام کرنا چاہے تو اسے لے آنا۔ تمھیں زبان آتی ہے۔ وہ ٹھیکیدار بھی اطالین ہے لیکن وہ تیس سال سے یہاں رہ رہا ہے۔''

میں نے کہا'' تم نے کام نہیں بتایا۔''

کہنے لگا'' سوئس میں جب عمارت بنتی ہے تو اس کی چھتوں میں اور دیواروں میں روئی نما چیز بھری جاتی ہے۔ یہ کام سوئس لوگ نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے کہ اس سے اُن کے پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی سوئس یہ کام کرے تو وہ پندرہ دن کام کرتا ہے اور پندرہ دن بنا کام کے اس کے آجر کو اُسے تنخواہ دینی پڑتی ہے۔ اس لیے مقامی ٹھیکیدار غیر ملکیوں کو ترجیح دیتے ہیں اور خاص کر سیاسی پناہ گزینوں کو۔''

میں نے کہا'' سوری۔۔۔ میں یہاں کام کرنے نہیں آیا بلکہ سیر کرنے آیا ہوں۔''

وہ کہنے لگا'' سوچ لو۔''

پھر بولا'' ویسے میرا نام واز یلے ہے۔ میں مالدویا کا رہنے والا ہوں۔''

میں نے کہا "میرا نام فرشتہ ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔"

کہنے لگا "یہاں مالدویا کے اور بھی لڑکے رہتے ہیں لیکن وہ کام کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بنا کام کے ہی گزارہ چلا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

کہنے لگا "لگتا ہے تم نے ہاؤس ماسٹر کی بات زیادہ توجہ نہیں سنی۔" غالباً اس کا اشارہ ڈرگز کی سپلائی میں ملوث عناصر کی طرف تھا۔

میں نے اس کا اشارہ بھانپتے ہوئے اس سے پوچھا "اس کا مطلب ہے وہ ٹھیک کہہ رہا تھا؟"

وہ بولا "ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سوئس لوگ ڈرگز کا استعمال کرتے ہیں تو لازم بات ہے، بیچنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہ بات تو ہے۔"

اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہ دراز قد اور گورا چٹا آدمی تھا۔

میں سوچنے لگا یہاں لگا یہاں اتنے لوگ موجود تھے آخر اس نے مجھے ہی کام کا کیوں پوچھا؟ میں نے انیتا سے بس کے پاس کا ٹوکن تو لے چکا تھا اس کے علاوہ میں نے اس سے بس کا ٹکٹ لیا کیوں کہ مجھے ونٹرتھور جا کے یہ چیک کیش کروانا تھا اور بس کا پاس بھی بنوانا تھا۔ انیتا نے بہت عجیب سی شکل بنائی اور مجھے بس کا ٹکٹ بھی دے دیا۔ آج ازیل ہائم میں بہت گہما گہمی تھی۔ سب کو پیسے ملے تھے۔ میں بھی خوشی خوشی ازیل ہائم سے نکلا اور بس سٹاپ پہ آیا۔ یہاں پہ مہاجر کیمپ کے کئی لڑکے بس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یہاں گلبدین بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا "ہم دونوں بینک میں اکٹھے جائیں گے۔ راستے میں ہمیشہ کی طرح تین چار سٹاپ آئے۔ جب اندسٹری کا سٹاپ آیا تو مجھے گلبدین کہنے لگا "وہ دور جو بیرکیں نظر آرہی ہیں، میں کل یہاں آیا تھا۔ یہاں ایک ایرانی اور افغانی نے میری دعوت کی تھی۔"

میں نے کہا "تم مجھے بتا چکے ہو۔"

کہنے لگا "لیکن تمہیں جگہ کا نہیں بتایا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں یہ درست ہے۔"

ہمیں قریباً پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔ ہم لوگ بان ہوف پلاتز پر اُتر گئے۔ یہاں سے

مارکیٹ گاز سترازے کے ساتھ ہی پہلی گلی میں بینک تھا۔ ہم دونوں بینک میں داخل ہوئے، جن لوگوں کے پاس ازیل ہائم کا یہ ٹوکن تھا جس کو چیک کا نام دیا گیا تھا۔ ان کی علیحدہ لائن تھی۔ میں بینک کا معائنہ کرنے لگا۔ میں چونکہ اٹلی سے آیا تھا اس لیے میں ہر چیز میں آرٹ کے معیار ڈھونڈتا رہتا۔ اس کے علاوہ مجھے فنون لطیفہ سے بھی لگاؤ تھا۔ بینک کا فرش رنگ برنگ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ فنِ تعمیر کی زبان میں اسے موزائیک (mosaic) ٹائلز کی آرائش کا نام دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ فرش بہت پسند آیا۔

ایک سفید بالوں والا آدمی میرے پاس آیا۔ اس کی مونچھیں بھی سفید تھی۔ عمر زیادہ نہیں تھی بہت بھی ہوئی تو پچاس سال ہوگی۔ اس نے ہاتھ میں اُردو زبان کی کوئی کتاب اُٹھائی ہوئی تھی، مجھے فرش کی طرف مسلسل متوجہ پا کر گویا ہوا "بھائی صاحب کیا دیکھ رہے ہیں، کیا یہاں زمین سے تیل نکل آیا ہے۔"

میں نے اس شخصیت کو جواب دیتے ہوئے کہا "حضرت۔۔۔ جن کاریگروں نے بھی موزائیک ٹائلز سے اس فرش کی چنائی کی ہے انھوں نے یہاں سے تیل نکالنے سے بھی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

گلبدین اس شخصیت سے میرا تعارف کرواتے ہوئے بولا "یہ میرے ساتھ ازیل ہائم میں ہوتے ہیں۔"

وہ کہنے لگا "میں سمجھا کوئی غیر ملکی ہے۔ ویسے میں پاکستان میں ایک وزیر کا مشیر تھا۔ ہماری حکومت مشرف نے ختم کر دی تو میں یہاں چلا آیا۔"

میں نے کہا "آپ ۴۵ سوئس فرانک لینے کے لیے سارا ہفتہ انتظار کرتے ہیں۔"

وہ بڑا شرمندہ ہوا۔ کہنے لگا: "میں ان کے ۴۵ سوئس فرانک پہ لعنت بھیجتا ہوں۔"

میں نے کہا: "تو آج نہ لیجئے گا۔ یہ ٹوکن پھاڑ دیں۔"

گلبدین پاس کھڑا یہ مکالمہ سن رہا تھا نہ جانے کیوں وہ بڑا خوش ہوا، میری باری آگئی اور میں نے کھڑکی کے پیچھے بیٹھے بینک کلرک کو اپنا ٹوکن دیا۔ ان نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں نے اس کی جیب سے پیسے نکال لیے ہوں۔ اس نے ٹوکن ایک طرف رکھا۔ چار نوٹ دس دس فرانک کے دیئے اور ایک پانچ سوئس فرانک کا سکہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔"

میں نے اس کے تیور دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا" اگر تم لوگ ہمیں کام کی اجازت دے دو تو مجھے تمہاری یہ خیرات قبول کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ ویسے بھی ۲۵ سوئس فرانک میں دو وقت کا کھانا بھی پورا نہیں ہوتا۔"

وہ میری بات سن کے جرمن زبان میں بڑبڑاتا رہا۔ میرے پیچھے ایک اور غیر ملکی کھڑا تھا اس لیے میں پیسے لے کر ایک طرف ہوگیا۔ وہ سفید بالوں والا آدمی جو کسی وزیر کا مشیر تھا، واپس جا چکا تھا لیکن گلبدین وہیں کھڑا تھا۔ ہم دونوں بینک سے نکلے تو کہنے لگا" آج میں بہت خوش ہوں۔"

میں نے کہا" کیوں۔"

کہنے لگا" تم نے اس متکبر اور گھمنڈی آدمی کو جس انداز میں جواب دیا ہے اس سے میں حیران رہ گیا ہوں۔ یہ ونٹرتھور اور زیورخ کے درمیان ایک ہائم میں میرے ایک دوست" شاہ صاحب" کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اس کو ایک تو یہ زعم ہے کہ یہ کسی وزیر کا مشیر رہا ہے اور دوسرا اسے اپنے پڑھے لکھے ہونے کا بڑا مان ہے۔ اس کے علاوہ یہ طنز بہت کرتا ہے۔ تم نے اسے ۲۵ سوئس فرانک لینے کے لیے سارا ہفتہ انتظار کرنے کا صحیح کہا۔"

میں نے کہا" گلبدین یہاں جتنے بھی لوگ رہ رہے ہیں سارے وزیروں کے مشیر اور مشیروں کے وزیر ہیں لیکن اگر صرف ایک ہفتہ سوئس انھیں کفالت کے چیک نہ دے تو ان کی جان نکل جائے گی۔"

گلبدین کہنے لگا" تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب اگلی جمعرات کو تم نے میرا ایک کام کرنا ہے۔"

میں نے کہا" وہ کیا۔"

کہنے لگا" مجھے اپنی آنکھ کا چیک اپ کروانا ہے۔ تم شیفر یا شنائیڈر سے کہنا کہ گلبدین کو آنکھ کا چیک کروانا ہے۔"

میں نے کہا" تم نے مجھے آج کیوں نہیں کہا۔"

کہنے لگا" مجھے یاد ہی نہیں رہا۔"

میں نے کہا" تمہیں بیئر پینا یاد رہتا ہے لیکن یہ کام یاد نہیں رہتا۔ خیر چلو ریلوے سٹیشن پہ چلتے ہیں اور بس کا پاس بنواتے ہیں۔" ہم دونوں مارکیٹ گاز سترازے سے باہر نکلے سڑک کے اس پار ریلوے سٹیشن تھا۔ میں کھڑکی پہ جا کے کھڑا ہوگیا۔ کھڑکی کے پیچھے ایک دبلی پتلی لڑکی بیٹھی تھی۔ میں نے

اس کو ٹوکن دیا۔ وہ مجھے بس پاس بنا کے دینے لگی تو گلبدین بولا:

''اگر تم دس فرانک زیادہ دے دو تو یہ تمہیں زیورخ تک کا پاس بنا دے گی۔''

وہ مجھ سے کہنے لگی'' کیا مسئلہ ہے۔''

میں نے کہا'' کوئی مسئلہ نہیں تم مجھے بس پاس بنا کے دو۔''

اس نے ٹوکن پاس رکھ لیا اور مجھے بس پاس بنا دیا۔ اب میرے پاس پیسے بھی تھے اور بس پاس بھی تھا۔ گلبدین کہنے لگا'' اگر تم مجھے اپنے حصے کے پندرہ سوئس فرانک دے دو تو ہم ہفتے بھر کا سامان خورد نوش خرید لے جائیں گے۔''

میں نے کہا'' وہ بنگالی لڑکا بھی اگر مل جائے تو ہمارے پاس ۴۵ سوئس فرانک ہو جائیں گے۔ اس سے کافی سامان آ جائے گا۔''

گلبدین اب مجھے کچھ کچھ جان چکا تھا اس لیے اس نے اس بنگالی لڑکے کے بارے میں منفی رائے دینے سے احتراز کیا۔ بدرالدین فطری اعتبار سے مجھے ایک بھلا آدمی لگا تھا۔ ہم تینوں کا ریفریجریٹر بھی ایک ہی تھا۔ گلبدین کہنے لگا:'' اب کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا'' تم بتاؤ؟''

کہنے لگا'' مجھے تو کام ہے!''

میں نے کہا'' خدا حافظ۔''

میں جانتا تھا کہ اب گلبدین کہاں جانا چاہتا ہے۔ میں نے گلبدین سے جان چھڑائی اور مارکیٹ گاز ستراز سے واپس آ گیا۔ میں نے'' ونڈو شاپنگ'' کی غرض سے آس پاس گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ کبھی ایک دوکان میں گھستا کبھی دوسری دوکان میں۔ اس دوران میں نے ایک ٹیلی فون کیبن ڈھونڈا اور سوچا کہ نیائش کو فون کرنا چاہیے۔

مجھے نیائش کا موبائل نمبر زبانی یاد تھا۔ میں نے پانچ سوئس فرانک کا سکہ سلوٹ میں ڈالا اور نیائش کا نمبر ڈائل کر دیا۔ رنگ جا رہی تھی، پھر کسی نے پرونتو یعنی اٹالین میں ہیلو کہا۔'' میں نے نیائش کی آواز پہچانتے ہوئے کہا'' نیائش بھائی میں بول رہا ہوں، فرشتہ۔''

دوسری طرف سے آواز آئی'' ماژا تم نے اتنے دنوں بعد فون کیا۔ تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے اس لڑکے کو فون کر کے پوچھا تھا کہ وہ کدھر ہے اس کو واپس بلا لو۔ میں تو کہتا ہوں

اب بھی اپنی ضد چھوڑ دو اور واپس آ جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ اٹلی کی امیگریشن کھلنے والی ہے۔"

میں نے کہا" ابھی میرے پاس وقت تھوڑا ہے۔ میں آپ کو نمبر دیتا ہوں وہاں شام کو فون کرنا۔" پھر تفصیل سے بات ہوگی۔"

نیاٹش نے کہا" میں بھی کام پہ ہوں۔ جلدی سے نمبر لکھواؤ۔"

میں نے نمبر لکھوایا اور بتا دیا کہ جب فون کرو تو جو بھی فون اُٹھائے میرا نام لینا مجھے سارے جانتے ہیں۔ نیاٹش کو فون کر کے میں ونٹر تھور کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کیوں نہ مہاجرین کے سنٹر چلوں۔ وہاں پہ کچھ کھا پی بھی لوں گا۔ سنا ہے وہاں جم بھی ہے۔ لائبریری بھی ہے، جرمن زبان سیکھنے کے لیے کمپیوٹر بھی ہے۔ میں بابن ہوف پلاٹز پہ آ گیا۔ یہاں سے ایک راہگیر سے پوچھا کہ مہاجرین کا سنٹر کہاں ہے۔ تو اس نے بتایا کہ یہاں سے آرچ سترازے (arch strasse) پہ چلے جاؤ۔ وہاں لاگر سترازے (lager strasse) پہ مہاجرین سنٹر ہے۔ میں نے سڑک پار کی اور اس کے بتائے ہوئے راستے پہ چلنے لگا۔ ایک طرف ٹیکنیکم سترازے تھا۔ میں نے کونے میں ایک پیزا بنانے والے سے پوچھا۔ اس کے پاس موبائل وین تھی۔ جس کے اندر تنور سا بنا ہوا تھا، جس میں پیزا بنانے کا سارا انتظام تھا۔ اس کی وین پہ اٹلی کا جھنڈا بنا ہوا تھا۔ یہ شخص گورا چٹا تھا اور موٹا بھی۔ اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی اور اس نے کپڑوں کے اُوپر ایک سفید ایپرن باندھ رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں لمبا سا لکڑی کا ڈنڈا اٹھا رکھا تھا جس کے آخری سرے پہ توانا گول سی پلیٹ نصب تھی۔ اس کی گاڑی پہ اٹالین زبان میں لکھا ہوا تھا کہ اس کا پیزا لکڑی پہ پکتا ہے۔ میں نے چونکہ اٹالین میں سوال کیا تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ کے مسکرا دیا۔ کہنے لگا" یہ ساتھ والی سڑک لاگر ہاؤس سترازے ہے۔ کونے میں لاگو ہاؤس ہے۔ میں اس لاگر ہاؤس سترازے پہ چلتا ہوا لاگر ہاؤس پہنچ گیا۔ باہر کئی لوگ کھڑے تھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ داخلی دروازے کے ساتھ ایک ڈیوڑھی سی بنی ہوئی تھی۔ دونوں دیواروں پہ مختلف قسم کے پوسٹرز اور اخبارات کے تراشے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹی سی کیفے بار بنی تھی۔ اندر میزوں پہ چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کمپیوٹر پڑا تھا۔ کمپیوٹر پہ ایک انٹرنیٹ یوزر کوئی سائٹ کھول کے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں شلوار قمیص میں ملبوس ایک آدمی کھڑا تھا جس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔" پاکستانی؟"

میں نے کہا" ہاں پاکستانی ہوں۔"

کہنے لگا" میں کافی دیر سے کھڑا ہوں، مجھے انٹرنیٹ پہ کوئی چیز دیکھنی ہے۔ یہ لڑکا اُٹھ ہی نہیں رہا۔"

ایک طرف باری بنی ہوئی تھی۔ جولڑکی بار پہ کام کر رہی تھی، وہ کسی افریقن ملک کی تھی۔ شاید صومالین تھی۔ میں نے اس سے پوچھا:" انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے کیا کرتا ہوگا؟"

کہنے لگی" انٹرنیٹ کا استعمال بالکل مفت ہے۔ لیکن اس کا" کی بورڈ" خراب ہے۔ بڑی مشکل سے استعمال ہوتا ہے۔"

میں نے اس لڑکے کو، جو نیٹ پہ بیٹھا تھا، کہا" اُٹھو اب ہماری باری ہے۔"

اس کو کچھ سمجھ نہ آئی۔ میں نے کندھے سے پکڑ کے اسے اُٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے غصے کا اظہار کیا۔ کیفے سے ایک بیس پچیس سال کا نوجوان اُٹھا اور کہنے لگا:

"کیا بات ہے؟"

میں نے کہا" یہ لڑکا سیٹ خالی ہی نہیں کر رہا ہے۔ ہمیں بھی کچھ دیکھنا ہے۔"

وہ لڑکا بولا" میں لاگر ہاؤس میں کام کرتا ہوں۔ میں اسے ابھی کہتا ہوں۔"

اس نے اس لڑکے سے اُٹھنے کو کہا۔ وہ اُٹھ گیا۔ اس نے مجھے بہت غصے سے دیکھا۔ اب وہ شلوار قمیص والا لڑکا بیٹھ گیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا" میں نے سنا ہے اٹلی کی امیگریشن کھل گئی ہے۔ آپ کوکوئی سائیٹ بتا ہے جس کو دیکھ کے پتا چل سکے۔"

میں نے کہا" گوگل پہ جا کے سترانیری ان اطالیہ (stranieri in italia) لکھو۔ اس سائیٹ پہ پتا چل جاتا ہے کہ اٹلی میں امیگریشن کے بارے میں کیا نئی تبدیلی آئی ہے۔"

اس نے لکھنے کی بہترین کوشش کی لیکن اس سے نہ لکھا گیا۔ میں نے کہا" میں لکھتا ہوں۔ میں نے گوگل سرچ انجن کھولا۔ اس پہ ستر انیری ان اطالیہ لکھا۔ تھوڑی سی سرچ کے بعد سائیٹ کھل گئی۔ اس نیٹ کی سپیڈ بہت آہستہ تھی۔ وہ کہنے لگا" یہ تو کسی اور زبان میں ہے۔"

میں نے کہا" اٹالین میں لکھا ہوا ہے۔ تم نے درست سنا ہے۔ وہ امیگریشن کھولنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

وہ کہنے لگا" آپ کو اٹالین آتی ہے۔"

میں نے کہا" گزارا کر لیتا ہوں۔"

کہنے لگا" میں سوئس بڑی اُمید کے ساتھ آیا تھا لیکن اب میں کسی بھی صورت اٹلی جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا" کیوں۔"

کہنے لگا" وہاں میلانو میں میرے گاؤں کا ایک لڑکا ہوتا ہے اس کے پاس جاؤں گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ بارڈر کیسے پار کیا جائے۔" میں اس اجنبی سے جانے کیا کہنے والا تھا کہ مصلحت کا خیال آتے ہی چپکا ہو رہا اور اس سے کہا۔

"تم سیٹ پہ بیٹھو۔ میں جم دیکھ کے آتا ہوں۔ اس عمارت کے تہہ خانے میں جم تھا۔ میں سیڑھیاں اُتر کے نیچے گیا۔ نیچے کئی ادھ ننگے لڑکے مختلف قسم کی مشینوں پہ ایکسر سائز میں مصروف تھے۔ کاؤنٹر پہ ایک آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے جا کے پوچھا" یہاں کی ممبر شپ کا کیا طریق کار ہے۔"

کہنے لگا" کوئی طریق کار نہیں۔ تم نے جب بھی آنا ہو۔ اپنی ہاؤس وائس جمع کرواؤ اور ایکسر سائز شروع کر دو۔"

اب مجھے بھوک لگنے لگی تھی۔ گھر جا کے کھانا بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ آج رقم بھی ملی تھی۔ میں نے سوچا عیاشی کرنی چاہیے۔ میں کیفے میں واپس چلا گیا۔ جہاں پہ کمپیوٹر بھی پڑا تھا۔ وہ شلوار قمیص والا لڑکا جا چکا تھا اور وہی لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کو میں نے وہاں سے اُٹھوایا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی سے پوچھا" کیپوچینو اور ایک مفن کتنے کا ہے۔"

کہنے لگی" دونوں چیزیں تین سوئس فرانک کی ملیں گی۔"

میں نے دس سوئس فرانک کا نوٹ نکالا۔ یہ سوئس فرانک بالکل یورو کی طرح تھے فرق صرف اتنا تھا کہ ان پہ فرانک لکھا ہوا تھا۔ نوٹ کی ساخت اور سائز یورو جیسا ہی تھا۔ اس نے تین سوئس فرانک لے لیے اور سات سوئس فرانک واپس کر دیے۔ میں نے کیپوچینو اور مفن ہاتھ میں لیا اور ایک خالی میز پہ آ گیا۔ کیپوچینو میں چار چمچ چینی کے ڈالے اور چینی کو حل کر کے کیپوچینو کی چسکیاں لینے لگا۔ مفن اور کیپوچینو ختم کر کے خالی برتن اس کاؤنٹر والی لڑکی کو دیے۔ اب میں کچھ ٹھیک محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے لاگر سینٹر کا چکر لگایا۔ ایک طرف ٹیبل ٹینس کی ٹیبل پر دو لڑکوں میں زبردست مقابلہ ہو رہا تھا۔ میں انھیں کھیلتے ہوئے دیکھنے لگ گیا۔ میں جس سکول میں پڑھتا تھا وہ سکول سالانہ کھیلوں میں ٹیبل ٹینس میں ہمیشہ پہلے نمبر پہ آتا تھا۔ لیکن مجھے اس کھیل سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس کھیل سے اگر مجھے

کوئی دلچسپی تھی تو بس تھوڑی بہت محض دیکھنے کی حد تک۔ ایک طرف ایک بڑا ہال تھا۔ اس کے اندر بہت کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ وہاں سے مجھے مائیکل انکتا دکھائی دیا۔ میں نے پوچھا ''تم کرائس لنگن سے کب آئے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کہنے لگا ''میں یہاں کام کرتا ہوں۔ گھنٹے کے تین سوئس فرانک ملتے ہیں۔''

میں نے کہا ''رہتے کدھر ہو۔''

کہنے لگا ''اوور بیول۔''

میں نے کہا ''میں تو وہیں رہتا ہوں۔ آج تم نظر ہی نہیں آئے۔ سب لوگ موجود تھے۔''

کہنے لگا ''میرا چیک مجھے شام کو مل جائے گا۔ میں یہاں سے شام کو پانچ بجے فارغ ہوں گا۔''

میں بڑا حیران ہوا کہ ازیل ہائم میں کام کی اجازت نہیں اور اس کو کام کیسے مل گیا۔''

میں نے پوچھا ''تمہیں کام کیسے مل گیا۔ ہمیں تو کام کی اجازت ہی نہیں۔ آج بھی ہاؤس ماسٹر کہہ رہا تھا۔''

کہنے لگا ''یہ بات درست ہے لیکن اگر تم خود ہاؤس ماسٹر سے کہو کہ تم کام کرنا چاہتے ہو تو جہاں کہیں جاب کی ضرورت ہو تو یہ بھیج دیتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اُجرت بہت کم ملتی ہے۔''

میں نے کہا ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بندہ مصروف ہو جاتا، اس کی روٹین بن جاتی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد میں نے مائیکل سے اجازت لیتے ہوئے ازیل ہائم کی راہ لی۔ اب میرے پاس بس پاس تھا۔ جب چاہو، ونٹر تھور آؤ جب چاہو اوور بیول چلے جاؤ۔ بھلے دن میں دس چکر لگاؤ۔ ازیل ہائم پہنچا تو وہاں بدرالدین میرا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا ''چاول بنائے ہیں۔''

میں نے کہا ''بدرالدین تم نے کمال کر دیا۔ بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہاں لاگر ہاؤس میں کیپوچینو پی اور مفن کھایا لیکن پیٹ نہیں بھرا۔''

کہنے لگا ''میں نے تو چیک کیش کروایا اور بینک سے سیدھا میگروس (سپر سٹور) چلا گیا۔ وہاں سے ایک دو دالیں، سبزی اور ایک مرغی کا پیکٹ لایا ہوں۔''

میں نے کہا ''میں نے سوچ رکھا تھا کہ ہم تینوں پندرہ پندرہ سوئس فرانک کسی ایک کو جمع کروائیں گے اور ہفتے کا اکٹھا سامان لائیں گے۔''

بدرالدین بولا ''افغانی آ جائے۔ تو اس سے تم خود ہی بات کر لینا، مجھے تو نہ جانے کیوں وہ

گھور گھور کے دیکھتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اُسے اپنا مسئلہ نہ بناؤ اور نہ اس کی باتوں کا برا منایا کرو۔ وہ دقیانوسی قسم کا بندہ ہے، خواہ مخواہ اُلٹی سیدھی بانکتا رہتا ہے۔"

بدرالدین کہنے لگا "آج ایک اور بنگالی آیا ہے۔" میں نے کہا "ایک بنگالی پہلے بھی تو آیا تھا۔"

وہ کہنے لگا "اب ہم تین ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ مجھے اپنے ساتھ کھانے پہ مجبور کریں گے۔"

میں نے کہا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے تم جس کے ساتھ رہنا چاہو رہ سکتے ہو، کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ میں انفرادی سطح پر بات نہیں کرتا۔ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ من حیث القوم بنگلہ دیشی ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

وہ کہنے لگا "تم بھی تو ہم سے نفرت کرتے ہو۔"

میں نے کہا "ہم نے تو یہی سنا ہے بطور پاکستانی تم نے غداری کی، شیخ مجیب الرحمٰن کے جھانسے میں آکر۔"

وہ بولا "میں سیاست کی بات نہیں کرتا لیکن اس زمانے میں پاک فوج نے ہم پہ بہت ظلم ڈھائے ہیں۔"

میں نے کہا "جب لا اینڈ آرڈر کی بات ہوتی ہے تو اس طرح تو کرنا پڑتا ہے۔"

وہ بولا "میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جسے مس ہینڈل کیا گیا۔"

وہ بولا "پاکستان اس لیے بنا تھا کہ ہمارا مذہب، زبان، لباس، تہذیب اور تمدن ہندوؤں سے مختلف تھا۔"

میں نے کہا "یہ درست ہے۔"

وہ بولا "لیکن ۱۹۷۱ء میں ہمیں پاکستانی ہونے کے باوجود دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا اور ہمیں ہندوؤں سے بھی بدتر قوم قرار دے دیا گیا۔ اس وقت کی ہماری اپنی ہی فوج نے ہم پہ وہ مظالم ڈھائے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "تم لوگوں نے بغاوت جو کی تھی۔"

وہ بولا "اپنے حق کے لیے لڑنا، اپنے معاشی معاشرتی و سیاسی مفادات کے لیے آواز بلند کرنا

بغاوت ہے تو پھر تسلیم کیا جانا چاہیے کہ پاکستان بھی ایک بغاوت کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری بات میں وزن ہے۔"

کہنے لگا "اگر ہم دونوں زیورخ گئے اور کوئی انگریزی کتابوں کی دوکان ہوئی تو تمہیں ایک کتاب خرید کے پیش کروں گا جس میں مشرقی پاکستان کے شہریوں کے طور پر بنگالیوں کی صورت حال درست تناظر میں دیکھنے میں مدد ملے گی۔

میں نے کہا "کتاب کا نام اور لکھنے والے کا نام۔"

کہنے لگا "رائز اینڈ دی فال آف تھرڈ چمپینزی (The Rise and The fall of third chimpanzee۔ یہ جیرڈ ڈائمنڈ Jared Diamond) نے لکھی ہے۔"

میں نے کہا "چلو جب بھی زیورخ گئے، یہ کتاب ضرور تلاش کریں گے کیونکہ میرا نہیں خیال کہ یہ کتاب ونٹرتھور میں ملے گی۔ ویسے انٹرنیٹ پہ ہوسکتا ہے دستیاب ہو جائے۔"

بدرالدین بولا "ویسے میں تنگ نظر نہیں ہوں لیکن جب بھی اس موضوع پہ بات ہو تو مجھے اس زمانے کے وہ سنگین حالات یاد آجاتے ہیں جن سے ہمیں گزرنا پڑا۔"

میں نے کہا "میں چائے پی لوں تو باہر چلتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کے کیا کریں گے۔"

کہنے لگا "ہاں ضرور۔ یہاں ازیل ہائم کے ساتھ ہی بروکن ہاؤس ہے۔ وہاں سے استعمال شدہ چیزیں ملتی ہیں۔ شاید کچھ مل جائے۔ میں نے چائے بنائی اور بدرالدین نے بھی بڑے شوق سے پی۔ چائے پی کے ہم دونوں ازیل ہائم سے باہر نکلے۔ ازیل ہائم کے اس طرف میں کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک سڑک اوپر کو جاتی تھی اور ایک سڑک نیچے۔ جو سڑک اوپر کو جاتی تھی بدرالدین مجھے اس طرف لے گیا۔ ہم لوگ جوں جوں اوپر کی طرف چلتے چلے گئے توں توں ہمیں ایک بہت بڑی عمارت نظر آنی شروع ہوگئی۔ یہ ایک بہت بڑا اسپر سٹور تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں پہ دنیا کی ہر چیز تھی۔ کرسیاں، تصاویر، ٹیپ ریکاڈر، پوسٹ کارڈ، پرانے کپڑے، کتابیں، رسالے، پرانے اخبار۔ ہم دونوں نے اس سٹور کا چکر لگایا۔ میں نے ایک سوئس فرانک کا ایک بیگ لیا جو کندھے پہ لٹکاتے ہیں۔ بدرالدین نے تین سوئس فرانک کی ایک جینز لی۔ ہم اس شاپنگ کے بعد ازیل ہائم واپس آگئے۔ بدرالدین نے اپنی جینز اور میں نے اپنا بیگ ہائم میں رکھا اور بس سٹاپ کی طرف چل دیئے۔ بس پہ بیٹھ کے ہم دونوں ونٹرتھور چلے گئے۔ وہاں کبھی ایک سٹور پہ جاتے کبھی دوسرے پہ۔ میں موبائل فونز کی قیمتیں دیکھتا رہا۔

ایک نوکیا فون مجھے بڑا پسند آیا۔ دو سو سوئس فرانک کا تھا۔ میں نے سوچا اگر آج نمائش کا فون آیا تو اس سے کہوں گا کہ مجھے دو سو یورو بھیج دے تاکہ یہ موبائل سیٹ خرید سکوں۔ ایک سٹور چار منزلہ تھا۔ وہاں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کپڑوں کے بھی سٹالز تھے، پھر بدرالدین نے تجویز دی ''چلو سٹیشن چلتے ہیں۔ وہاں پہ ایک خاص دوکان ہے۔''

میں نے پوچھا ''کس چیز کی؟''

کہنے لگا ''چلو تو سہی۔''

ہم دونوں مارکیٹ گاز ستراز ے سے نکل کے بامن ہوف پلاتز پہ ہو لیئے۔ یہاں ایک نئی عمارت کے ساتھ ایک پرانی عمارت تھی۔ یہیں پہ میں نے وہ اطالین آئس کریم کی ریڑھی والا دیکھا تھا۔ جس سے میں نے راستہ پوچھا تھا۔ میں اور بدرالدین اس نئی عمارت میں داخل ہوئے۔ ایک طرف موم بتیوں کی دوکان تھی۔ یہاں موم بتیوں کی اتنی اقسام تھیں کہ اس سے پہلے میں نے اتنی تعداد میں نوع بہ نوع موم بتیاں نہیں دیکھی تھی۔ ایک طرف سٹیشنری کی دوکان تھی۔ جہاں پہ سٹیشنری سے متعلق چیزیں دستیاب تھیں۔ میں نے بدرالدین سے کہا ''کیا مجھے یہی دکھانے لائے ہو۔''

کہنے لگا ''الیکٹرک سٹیئرز سے اوپر تو چلو۔''

ہم دونوں نے بجلی کی سیڑھیوں پہ قدم رکھا۔ ایک طرف سے لوگ اُتر کے نیچے جا رہے تھے اور ہم لوگ اوپر جا رہے تھے۔ دوسری منزل پہ ایک طرف ریسٹورنٹ تھا۔ پرفیومز کی دوکان تھی۔ ایک کونے میں وہ دوکان تھی جس کے لیے مجھے بدرالدین لے کے آیا تھا۔ اس کے سامنے بڑا سا نیون سائن لگا ہوا تھا جو جل بجھ رہا تھا۔ سیکس شاپ۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ یہاں پہ جو چیزیں برائے نمائش یا برائے فروخت رکھی گئی تھیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بھلا۔ ایک بات اچھی تھی کہ یہاں تصویریں ڈیولپ کرنے کا انتظام موجود تھا۔ میں نے سوچا اگر کہیں کیمرہ ملا تو جو تصاویر بنائیں گے، یہاں سے ڈیولپ کروائی جا سکتی ہیں۔ وہ تصویریں بلاشبہ سوئس کی یادگار ہوں گی۔ ہم دونوں سیکس شاپ میں پہ گھومتے رہے پھر میں نے کہا۔ اب میں اُکتا گیا ہوں، اب واپس اپنے کیمپ چلتے ہیں۔''

تھوڑی سی موج مستی اور تھوڑی ونڈو شاپنگ کر کے ہم دونوں گھر آ گئے۔ محمد وتر اوالی اور بوبکر عبدلائے دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ وہی سفید رنگ کے چاول اور اوپر چھوٹی چھوٹی سی بوٹیاں۔ انہوں نے مجھے بھی آفر کی لیکن میں نے معذرت کر لی، پھر ان کے بہت زیادہ اصرار پر ایک دو نوالے

لیے۔کھانا مزیدار تھا۔بدرالدین کہنے لگا" آج میں مرغی بناؤں گا۔تم کیسے کھاتے ہو۔"

میں نے کہا" ہاتھ سے۔"

وہ بولا" میرا مطلب ہے مرچیں زیادہ کھاتے ہو یا کم۔"

میں نے کہا" درمیانی لیکن آج سالن اگر میں بناؤں تو؟"

کہنے لگا" ٹھیک ہے۔کچن میں پیاز بھی پڑا ہے،ٹماٹر کا ڈبہ ریفریجریٹر میں رکھا ہے۔ مصالحہ جات میں نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں کیونکہ افریقن لڑکے کہتے ہیں کہ انھیں ان کی بو نا گوار گزرتی ہے۔"

میں کچن میں کھانا بنانے میں مصروف ہو گیا۔بدرالدین میری مدد کرتا رہا۔اتنا کھانا بن گیا تھا کہ اگلے دن کا لنچ بھی ہو سکتا تھا۔آٹھ بجے میں نے اور بدرالدین نے روٹی گرم کر کے کھانا کھایا اور گلبدین کے لیے فرج میں رکھ دیا۔پھر ہال میں آ کے ان مستطیل میزوں پہ بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد کچن کے ساتھ والے کمرے سے ایک لڑکا نکلا۔وہ سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔کسی کا فون ہے۔وہ کہہ رہا ہے پاکستانی پاکستانی۔میں نے کہا" تم نے کیا کہا۔"

" میں تمھیں بلانے آیا ہوں۔وہ ہولڈ کیے ہوئے ہے۔"

میں جلدی سے اس کمرے میں گیا۔رسیور ہاتھ میں لے کر کان سے لگایا۔دوسری طرف سے نیائش بول رہا تھا۔کہنے لگا" میں نے دو تین دفعہ فون کیا تھا لیکن کسی اور نے اٹھایا۔"

میں نے کہا" یہاں پچاس بندے رہتے ہیں۔ہر ملک کا بندہ ہے۔سب کو انگریزی سمجھ بھی نہیں آتی۔"

نیائش بولا" ماڑا یہاں کی زندگی کیسی ہے؟"

میں نے کہا" ویسی ہی جیسی مہاجر کیمپ میں کسی پناہ گزین کی ہو سکتی ہے۔"

بولا" کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟"

میں نے کہا" سب سے پہلے مجھے ویسٹرن یونین کے ذریعے دو سو یورو بھیجو۔میں نے موبائل فون لینا ہے۔کل جمعہ ہے۔میں ونٹرتھور جا کے لے لوں گا۔"

نیائش بولا" میں ابھی بھیج دیتا ہوں تم کل لے لینا۔میں تمھیں ابھی کوڈ لکھوا دوں گا۔کیونکہ کل تو میں کام پہ ہوں گا۔پھر ہفتے پہ بات چلی جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ابھی بھیج دو، میرا مطلب ہے بھیج کے کوڈ لکھوا دو۔ میں کل صبح جا کے لے لوں گا۔ تم ونٹر تھور کہیں بھی بھیج دو۔"

نیائش بولا "ابھی میں ایک پاکستانی کے پی سی او پہ کھڑا ہوں۔ میں اس نائیجرین کے پی سی او پہ جاتا ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر لگے گی۔"

فون بند ہو گیا۔ میں ہال میں انتظار کرنے لگا۔ جہاں چار بڑے بڑے مستطیل میز پڑے ہوئے تھے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ایک لڑکا بھاگ کے اندر جانے لگا تو میں نے کہا "میرا فون ہے۔"

وہ وہیں رک گیا۔ میں نے اندر کمرے میں جا کے فون کا رسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف نیائش بول رہا تھا۔ کہنے لگا "کوڈ لکھو۔" وہ کوڈ نمبر بولتا گیا اور میں لکھتا گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دو سو یورو کے دو سو پینتالیس سوئس فرانک بنے ہیں۔ تمہیں جب پیسے مل جائیں تو مجھے فون ضرور کرنا۔ ورنہ میں شام کو فون کر کے پوچھ لوں گا، پھر نیائش مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے کئی دفعہ کہا کہ واپس آ جاؤ۔ امیگریشن کھلنے والی ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ جیسے ہی امیگریشن کھلے گی میں واپس آ جاؤں گا۔ اب نیائش کے پاس میرا نمبر تھا وہ جب چاہتا فون کر سکتا تھا۔

رات کو گلبدین بہت دیر سے آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا اور ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا، میں اس بنگالی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے کہا "تم جا کے سو جاؤ۔ تمہیں نہیں پتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جہاں سوتا تھا وہاں نو بستر لگے ہوئے تھے۔ جگہ چھوٹی تھی۔ اس کے ساتھ مولدویا اور جارجیا کے لڑکے تھے میرے ساتھ بنگالی اور ترکی کے لڑکے تھے۔

آج رات جس شخص کی ڈیوٹی تھی وہ صومالی تھا۔ میں اس سے گپ شپ لگانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ یہ خدیجہ افریقن لڑکوں کے اتنی خلاف کیوں ہے؟"

کہنے لگا "کیونکہ اس کا خاوند سوئس ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو کہہ رہی تھی سوئس مرد ٹھنڈے ہوتے ہیں۔"

عمر بولا "اسی لیے تو کہہ رہی تھی کیونکہ اس کا خاوند ٹھنڈا ہے۔"

میں نے کہا "تم اس کے بارے میں یہ کیسے جانتے ہو کہ اس کا خاوند سوئس ہے۔"

کہنے لگا" کیونکہ جب وہ پہلی دفعہ سوئس آئی تھی تو ہم دونوں ایک ہی مہاجر کیمپ میں رہتے تھے۔"

میں نے کہا" وہ تو بڑی پڑھی لکھی ہے۔ کہتی ہے وکیل ہے۔"

عمر بولا" وہ کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔ قانون جانتی ہے۔ لوگوں کو مشورہ دیتی ہے لیکن اس کے پیسے لیتی ہے۔ پیشہ ور وکیل شاید نہ ہو لیکن قانون جانتی ہے۔"

میں عمر نام کے اس صومالی کے ساتھ باتوں کے دوران دیوار پہ لگا سوئس کا نقشہ بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا" تم اس نقشے میں کیا دیکھ رہے ہو۔"

میں نے کہا" اگر اٹلی امیگریشن کھلی تو میں اٹلی چلا جاؤں گا۔ میں راستہ دیکھ رہا ہوں۔ کون سا بارڈر ایریا ٹھیک رہے گا۔"

وہ کہنے لگا" ایک دفعہ پہلے بھی اٹلی کی امیگریشن کھلی تھی تو مہاجر کیمپوں سے بہت سارے لوگ اٹلی چلے گئے تھے۔ یہاں کا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے تو کیس کا انتظار کرو۔ اگر" بے" مل جائے تو ٹھیک ورنہ اپیلیں کرتے رہو اور آخر میں ڈیپورٹ کر دیے جاؤ۔ پہلے کیس کافی عرصہ چلتا تھا۔ دس سال بعد سوئس پاسپورٹ مل جاتا تھا۔ اب کیس دو تین سال میں ہی اُڑا دیتے ہیں۔ ہاں اگر اس دوران شادی ہو جائے تو پھر پیپر بن جاتے ہیں، وگرنہ اب بہت کم کیس پاس ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا" تم نے پیپر کیسے لیے؟"

کہنے لگا" مجھے بھی دس سال سے زیادہ عرصہ گزرا ہے۔ تب جا کے پہلے بے ملی پھر سوئس پاسپورٹ ملا۔"

میں نے کہا" شادی نہیں کی۔"

کہنے لگا" میرے باپ نے چار شادیاں کی ہیں۔ ابھی تک تو میں یہاں سوئس میں دن رات کام کر کے اس کے پیدا کیے ہوئے بچے پال رہا ہوں۔ میرے چند دوسرے بھائی ہالینڈ، انگلینڈ اور کینیڈا میں ہیں۔ وہ سارے جلدی کامیاب ہو گئے۔ میں ابھی تک گھسٹ رہا ہوں۔ یہاں سوئس میں تفریح بہت مہنگی تفریح مناتے مناتے لگتا ہے، شادی کی عمر نکل گئی ہے۔"

میں نے کہا" کتنی عمر ہے۔"

کہنے لگا" پینتالیس سال۔"

میں نے کہا" کوئی زیادہ تو نہیں۔"

کہنے لگا" اتنی کم بھی نہیں۔ ہمارے ہاں تو لڑکا سولہ سال کی عمر میں پہلی شادی کرتا ہے۔ تیس سال کی عمر میں دوسری شادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ میری عمر میں وہ تیسری شادی کرتا ہے اور آخر عمر میں چوتھی شادی کی خواہش جاگتی ہے۔"

میں نے کہا" وہاں کی لڑکیاں مان جاتی ہے۔"

کہنے لگا" پہلے مان جاتی تھیں لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آگئی ہے۔ ٹی وی، انٹرنیٹ نے دنیا کو بدل دیا ہے۔"

میں نے کہا" صومالیہ میں انٹرنیٹ ہوتا ہے۔ وہاں تو پینے کا صاف پانی نہیں ہوتا۔"

میری اس بات پر عمر بہت ہنسا۔ کہنے لگا" جن کے پاس پیسہ ہے ان کے لیے ہر جگہ سب کچھ ہے۔ جن کے پاس پیسہ نہیں ان کو ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔"

میں نے کہا" میں مذاق کر رہا تھا۔"

کہنے لگا" یہ تم نہیں ساری دنیا یہی کہتی ہے، جیسے پاکستان کے بارے میں آج کل سارے کہتے ہیں کہ پاکستانی دہشت گرد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سارے پاکستانی دہشت گرد نہیں۔"

میں نے کہا" سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی پاکستانی دہشت گرد نہیں۔ مگر انھیں ایسا ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے مجھے نہیں معلوم کہ کیوں؟ سچ کیا ہے؟"

عمر بولا" اس" کیوں" کا جواب تو تلاش کرنا ہی چاہیے کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

میں نے کہا" میں تو اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اب سونا چاہیے کیونکہ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

میں نے عمر کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں سونے چلا گیا جہاں دونوں اطراف میں اٹھارہ بستر لگے ہوئے تھے۔ یعنی اٹھارہ نفوس ایک ہی کمرے میں سونے کے پابند تھے۔

بروز ہفتہ نیائش علی الصبح میلانو چلا گیا۔ مجھے یہی بتا کر گیا کہ اس کا کوئی دوست آیا ہوا ہے۔

میں نے ناشتہ کر کے لائبریری کی راہ لی۔ وہاں دیر تک پڑھنے لکھنے کا مشغلہ رہا۔ میں نے سوچا اگر ثقلین ہوتا تو اس سے گپ شپ رہتی لیکن وہ بھی کام پہ تھا۔ اریزو لائبریری کی ایک بات اچھی تھی کہ یہ دن بھر بند نہیں ہوتی تھی۔ صبح کھلتی اور شام ساڑھے سات بجے تک مسلسل تشنگان علم کے لیے اپنے دروازے رکھتی۔ اس لیے دیر سویر میں مجھے اس بات فکر نہ ہوتی کہ لائبریری بند ہو جانے کا وقت ہو جائے گا۔ ورنہ اریزو میں دوکانیں ٹھیک ایک بجے بند ہو جاتی ہیں۔ دوکاندار پونے ایک بجے ہی دوکانات کی چیزیں سمیٹنی شروع کر دیتے ہیں۔ ٹھیک ایک بجے سارا بازار خالی ہو جاتا ہے۔ لوگ کھانے اور آرام کے وقفے پر چلے جاتے ہیں۔ چار بجے دوکانیں پھر کھلنا شروع ہوتی ہیں۔ بازار کی رونق دوبارہ دوبالا ہو جاتی ہے۔ ٹھیک آٹھ بجے کاروبار بند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ دوکاندار تو دوکانات ساڑھے سات بجے بھی بند کر دیتے ہیں لیکن اریزو لائبریری میں اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ میں جب لکھنے سے اکتا جاتا ہوں تو آدھ گھنٹے کے لیے انٹرنیٹ پہ بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں پہ انٹرنیٹ کا استعمال آدھ گھنٹے کے لیے مفت ہے۔ فوٹو کاپی بھی سستی ہوتی ہے۔ اب میں اس کہانی کے وائنڈ اپ کی طرف آ رہا تھا۔ اس کہانی کے دوران میری ثقلین سے بھی ایک عجب طور کی انسیت پیدا ہو گئی تھی، مجھے نیائش کے طرز عمل میں ایک غیر محسوس سی تبدیلی رو بہ عمل ہوتی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اسے اپنے وہم پر قیاس کر رہا تھا۔ میں دو بجے کے

قریب لائبریری سے نکلا۔ کورسو اطالیہ سے گزرتا ہوا گھر کی طرف آیا۔ ابھی میں روڈ کے ٹریفک سگنل پہ کھڑا اس انتظار میں تھا کہ مجھے ویالے مائیکل انجلو (viale michel angelo) پار کر کے ویا وتوریو وینیتو (via vittorio venetto) پہ جانا تھا۔ کب بتی سبز ہو اور میں سڑک پار کروں۔ کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو ثقلین تھا۔ میں نے کہا "ثقلین تم" اب میں نے ثقلین کے لیے آپ، جناب، صاحب ایسے تعظیمی بلکہ تکلفانہ الفاظ کہنے چھوڑ دیے تھے وہ بھی اب میرے نام کے ساتھ صاحب کا لاحقہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ کہنے لگا "کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ میں تمہاری طرف ہی جا رہا تھا۔ ایک تو تم موبائل فون استعمال نہیں کرتے ورنہ تمہیں فون کر دیتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دور میں موبائل فون استعمال نہ کرنے کی آخر کیا تک ہے۔ تمہارے اس طرزِ عمل کے پس پشت یقیناً کوئی کہانی ہی مخفی ہوگی؟

میں نے کہا "شاید!"

"تجسس رکھنا چاہتے ہو؟"

"رہ جائے تو کیا حرج ہے!" لائٹ ہمارے لیے سبز ہوئی اور گاڑیوں کے لیے سرخ۔ ہم دونوں نے سڑک پار کی۔ ایک اترائی کے بعد چڑھائی سی آئی کیونکہ اوپر سے ٹرین گزرتی ہے۔ اب ہم دونوں ویا وتوریو وینیتو پہ تھے۔ ہم دونوں تیز تیز چل رہے تھے اور باتیں بھی کیے چلے جا رہے تھے۔ بھوک بھی شدت پر تھی اور چائے کی بھی طلب ہو رہی تھی۔ ہم دونوں جب ابالدی پاسقی (ubaldi pasqui) کے پاس پہنچے تو ثقلین کہنے لگا "اگر کوپ سے روسٹ لے آؤں تو؟"

میں نے کہا "نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ویسے بھی بھوک بہت زوروں پر ہے۔"

ثقلین کہنے لگا "تم کوپ کا روسٹڈ چکن کھا لیتے ہو۔"

میں نے کہا "کھانا تو نہیں چاہیے لیکن اب ہم سے اس طرح کا روسٹ بنتا بھی تو نہیں۔"

ثقلین بولا "اگر میں ساتھ اپنے لیے بیئر لے آؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہت سے لوگ پیتے ہیں۔ ویسے بھی بیئر سے روسٹ کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔"

ثقلین بولا "تمہارے لیے بھی لاؤں؟"

میں نے کہا "رہنے دینا، میں نہیں پیوں گا۔"

وہ کہنے لگا "جیسے تمہاری مرضی۔"

ثقلین کوپ سے چکن روسٹ لینے چلا گیا اور میں گھر چلا آیا۔ جلدی سے فرائنگ پین چولہے پہ رکھا۔ اس میں کوکنگ آئل ڈالا۔ ریفریجریٹر سے فروزن فنگر چپس نکالے۔ جتنی دیر میں ثقلین آیا میں فنگر چپس تیار کر چکا تھا۔ تھوڑا سا سلاد تھوڑا سا رائتہ بنایا ایک بڑی بوتل سوفٹ ڈرنک کی رکھ دی۔ ثقلین دو روسٹ لایا تھا۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کے کھایا۔ ثقلین نے تو بیئر کے مزے لوٹے اور میں نے سپرائٹ سے ہی کام چلا لیا۔ اس کے بعد میں نے چائے پی لیکن ثقلین نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا "سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

میں کہا "کیسا تھا چودھواں باب۔"

ثقلین بولا "فرشتہ ایک عجیب سانشہ ہے۔ ہر روز ایک نئی بات، ایک نیا کردار۔ بہت دلچسپ ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جب ختم ہو جائے گا کیا کروں گا۔"

میں نے کہا "تم کہہ رہے تھے اس کو چھپوائیں گے۔"

وہ بولا "ہاں ارادہ تو ہے۔ میں نے ایک دو لوگوں سے بات بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں پورا مسودہ پڑھ کے بتائیں گے۔"

میں نے کہا "اگر اس مسودے کا مرکزی خیال چوری کر لیا گیا تو؟"

وہ بولا "جس طرح تم نے اس مرکزی خیال کو نبھایا ہے کون ایسا ہوگا جو اس طرح نبھا پائے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ بیئر پینے کے بعد ثقلین بہت متاثر کن گفتگو کرنے لگ گیا ہے۔ ایک ثقلین پر ہی موقوف نہیں۔۔۔ میں نے کئی ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے جو نشے کی لوریا ترنگ میں بہت تخلیقی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ کچھ شاعر اور ادیب ایسے بھی ہیں جو تخلیقی عمل کے لیے چرس یا شراب کا سہارا لیتے ہیں۔۔۔ جانے وہ ہوش میں لکھتے ہیں یا نشے کی حالت میں؟

ہم دونوں میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی، شام کو ثقلین کی کوئی اور مصروفیت تھی وہ مجھ سے اگلا باب لے کر چلا گیا۔

○○○

امروز، ناشتے کے بعد میرا ارادہ تھا کہ ونٹر تھور جاؤں اور کہیں سے پتا کروں کہ ویسٹرن یونین

کہاں ہے یا کوئی ایسی دوکان یا بزنس سنٹر جہاں کرنسی کا حوالہ جاتی لین دین کیا جاتا ہو، اور میں وہاں جا کے پیسے لے آؤں۔ ابھی میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ مجھے شیفر بلانے آیا۔ کہنے لگا "جرنلسٹ آئے ہیں۔ وہ ازیل ہائم میں کسی پناہ گزین کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔"

مجھے شیفر، شنائیڈر سے بہتر لگتا تھا کیونکہ اس کا بولنے کا انداز نسبتاً شائستہ تھا۔ کہنے لگا "اس انٹرویو کے لیے میرے خیال میں تم سے بہتر آدمی اس ازیل ہائم میں کوئی نہیں۔ تمہارے علاوہ ایک نائیجیرین لڑکا ہے وہ بھی پڑھا لکھا ہے، اگر تم دستیاب نہ ہوتے تو اُسے زحمت دی جا سکتی تھی۔"

میں نے پوچھا "جرنلسٹ کہاں ہیں؟"

اس نے بتایا "ہمارے آفس میں۔"

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو اندر سے وہ نائیجیرین لڑکا نکل رہا تھا۔ جب کہ وہاں ایک نفس مکھ اور سنہرے بالوں والا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہیں جرمن زبان میں گٹ مارگن (Gut morgan) یعنی گڈ مارننگ کہا۔ وہ بڑا خوش ہوا کہنے لگا "تمہیں جرمن زبان آتی ہے۔"

میں نے کہا "بہت کم۔"

کہنے لگا "میرا نام پیٹر ہے۔ ونٹرتھور سے ایک روزنامہ نکلتا ہے، ڈیر لانڈبوٹے (der landbote) میں اس کے لیے کام کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "میرا نام فرشتہ سبزواری ہے۔ میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

ہم دونوں میں پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔ اس نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ میں نے سوئس کے بارے میں اپنے تجربات سے اُسے آگاہ کیا۔ سوشل کے بارے میں اُسے بتایا کہ مجھے سوشل رقم وصول کرتے ہوئے کتنی شرم آرہی تھی۔ میں نے رات کو سونے کے ناقص انتظامات کے حوالے سے بھی اپنی ناقدانہ رائے کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ انٹرویو کے آخر میں، میں نے اسے اپنی ای میل آئی ڈی دی اور کہا کہ اگر ہو سکے تو جو بھی لکھو مجھے اس کی ایک کاپی میل کر دینا۔ اس نے اپنا کارڈ دیا اور کہنے لگا۔ اس کارڈ پہ میرا فون نمبر بھی ہے اور ای میل آئی ڈی بھی۔ تم نے اگر رابطہ کرنا ہوا تو مجھے خوشی ہوگی۔ وہ انٹرویو کر کے چلا گیا۔ شیفر مجھ سے پوچھنے لگا "کیا بات چیت ہوئی۔" میں نے اُسے بتایا کہ کل جب اخبار چھپے گا تو دیکھ لینا۔ وہ کہنے لگا۔ کہیں ہمارے بارے میں شکایات کے انبار تو نہیں لگا دیے؟ میں نے کہا، تمہیں اگر میری فکری دیانت پر اتنا شک تھا تو بہتر تھا کہ انٹرویو کے لیے اپنے کسی بااعتبار آدمی کو

سامنے کر دیتے۔ اب تو میں سارا کچا چٹھا بتا چکا ہوں۔ وہ ہنس دیا اور کہنے لگا "میں تو مذاق کر رہا تھا"
تم نے جو بھی کہا ہو اس پر مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے شیفر سے اجازت لی
کیونکہ مجھے ونٹر تھور جا کے پیسے لینے تھے۔ پہلے تو یہ پتا کرنا تھا کہ پیسے کہاں سے لینا ہیں۔ میں بنا کسی کو
بتائے بس سٹاپ پہ آیا کیونکہ ازیل ہائم میں بہت سارے ایسے بندے تھے جو چیکو قسم کے تھے۔ آپ
اپنے کام سے جا رہے ہیں اور وہ اپنا مسئلہ لے کے آپ کے ساتھ چپک جائیں گے۔
میں جیسے ہی ونٹر تھور پہنچا۔ میں نے ویسٹرن یونین کا دفتر ڈھونڈ نا شروع کر دیا۔ کسی کو کچھ پتا
ہوتا تو میری راہنمائی کرتا۔ میں سٹڈ ہاؤس ستراز ے پہ چلتا ہوا لائبریری چلا گیا۔ وہاں پہ اپنی ہاؤس
واؤس جمع کروائی۔ تین نمبر سیٹ خالی تھا۔ وہاں پہ جا کے بیٹھ گیا۔ گوگل سرچ انجن کھولا۔ ویسٹرن یونین
ٹائپ کیا، ساتھ ہی ونٹر تھور لکھا۔ ایک ایڈریس ملا۔ یہ جگہ سٹیشن کے بالکل پاس تھی۔ کوئی میل بوکس سینٹر
تھا۔ میں نے کاغذ پہ پتا لکھا اور لائبریری کے کاونٹر پہ جو عورت بیٹھی تھی اس سے اپنی ہاؤس واؤس واپس
لی اور سٹڈ ہاؤس ستراز ے پہ چلتا ہوا ہابن ہوف پلاتز پہ آ گیا۔ یہاں پہ ایک ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر
تھا۔ اس کے سامنے میل بوکس سینٹر تھا۔ دن کے بارہ بجے ہوں گے۔ دھوپ بہت تیز تھی اور گرمی بھی
اپنا آپ دکھا رہی تھی، لیکن اس وقت اگر مجھے کچھ محسوس ہو رہا تھا تو وہ پیاس تھی۔ میں میل بوکس سینٹر
کے اندر داخل ہوا۔ وہاں کاونٹر پہ ایک خاکستری رنگ کی مونچھوں والا آدمی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی
کہنے لگا "جے۔" نہ جانے یہ لفظ بولتے ہوئے بولنے والے کی زبان پر کیوں حاکمانہ سا انداز آ جاتا تھا
اس وقت بھی مجھے اس لفظ میں سے تکبرانہ انداز جھلکتا ہوا محسوس ہوا سو ردِ عمل کے طور پر میں نے دل
میں تنگی سے کہا جے کے بچے میں پیسے لینے آیا ہوں۔ اس نے جرمن میں کچھ کہا لیکن میں سمجھ نہ پایا۔
میں نے اسے انگریزی میں بتایا کہ میرا یہ نام ہے اور میرا نام دو سو پینتالیس فرانک انلی سے فلاں
بندے نے بھیجے ہیں۔ اس نے میری ہاؤس واؤس اُلٹ پلٹ کے دیکھی۔ مجھ سے کوڈ پوچھا۔ میں نے
اسے کوڈ بتایا۔ اس نے ٹرے میں پڑے ہوئے مختلف کاغذات اُلٹ پلٹ کے دیکھے۔ مجھے یہی ڈر تھا
کہ کہیں پیسے دینے سے انکار نہ کر دے، لیکن اس نے اپنی تسلی کرنے کے بعد میرے ہاتھ میں دو سو
پینتالیس سوئس فرانک تھما دیے۔ دو سو کے، دو بیس بیس کے نوٹ تھے اور ایک پانچ سوئس فرانک کا
سکہ تھا۔ میں نے پیسے جیب میں ڈالے اسے "فیلن دانک" یعنی بہت شکریہ کہا۔ سوئس میں "دانکے شن"
کے بجائے "فیلن دانک" کہنے کا رواج تھا۔ ویسے بھی سوئس جرمن مختلف تھی۔ میں میل بوکس سینٹر سے

باہر نکلا۔ یہیں سے ایک روڈ پیچھے کی طرف جاتی تھی۔ میں اس پہ ہولیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے سامنے میگروز سپر سٹور کا پچھلا دروازہ نظر آیا۔ میں سلائیڈنگ ڈور سے اندر داخل ہوا۔ پہلی منزل پہ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ دوسری منزل ملبوسات اور دیگر گھریلو اشیاء کے لیے مخصوص تھی۔ آخری منزل پہ الیکٹرونکس کا سامان برائے فروخت تھا۔ جس میں ٹی وی، ریفریجریٹرز، کمپیوٹرز وغیرہ شامل تھے۔ یہیں پہ ایک سیکشن موبائل فونز کا بھی تھا۔ میں نے دوکان میں رکھے رنگ برنگے موبائل فونز دیکھنے شروع کر دیے۔ مجھے ویسے تو موبائل فون کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن جب میں اٹلی ایک سال رہا تو کچھ عادت سی ہو گئی۔ اب یہاں سوئس میں مجھے اس کی ضرورت تھی۔ ٹیکنالوجی کے اعتبار سے مجھے نوکیا موبائل سسٹم پسند تھا۔ یہاں بھی نوکیا فونز کی کافی ورائٹی موجود تھی۔ میں نے گرے رنگ کا نوکیا فون سیٹ پسند کیا۔ اس میں اورنج کمپنی کا کنکشن اور پانچ سوئس فرانک کا کریڈٹ بھی تھا۔ میں نے کاؤنٹر اٹنڈنٹ سے کہا کہ مجھے یہ فون خریدنا ہے، کیا تم مجھے یہ نکال کے دکھا سکتے ہو۔ اس نے فوراً ہاتھ میں چابی اٹھائی۔ اس الماری کو کھولا۔ کہنے لگا، اگر تم نے اور بھی کوئی موبائل دیکھنا ہو تو میں تمہیں دکھا سکتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں مجھے یہی پسند ہے۔ اس نے کہا کاؤنٹر پہ آ جاؤ۔ میں کاؤنٹر پہ آ گیا۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے سے ایک ڈبہ نکالا، اور کھول کے دکھایا۔ اس میں اسی سٹائل کا موبائل فون چارجر ہیڈ فون اور اورنج کمپنی کا پانچ سوئس فرانک کا کارڈ موجود تھا۔ اس موبائل سیٹ کی قیمت میں چونکہ ایک دن پہلے دیکھ کر گیا تھا اس لیے میں نے بنا پوچھے دو سو سوئس فرانک اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ اس نے رسید بنا کر میرے ہاتھ میں دے دی اور پلاسٹک شاپر میں موبائل فون دے کے مجھے ''فیلن دانک'' کہا۔ میں موبائل فون لیے خوشی خوشی میگروز سٹور سے نکلا۔ میں نے سب سے پہلے فون بوکس ڈھونڈا۔ اب میرے پاس چھوٹے بڑے کئی سکے تھے۔ میں نے تین چار سکے فون بوکس کی اس جگہ ڈالے جہاں سکے ڈالے جاتے تھے۔ نیائش کو فون نمبر ملایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کھانے کے وقفے کے لیے نکلا ہوگا۔ دوسری طرف سے آواز آئی ''پرونتو یعنی ہیلو۔''

میں نے کہا ''نیائش پیسے مل گئے ہیں۔ میں نے موبائل فون بھی لے لیا ہے۔ میرا فون نمبر لکھو۔ شام تک اس کا کنکشن آن ہو جائے گا۔''

میں نے نیائش کو اورنج کے کارڈ سے اپنا نیا فون نمبر لکھوایا۔ اس نے نمبر لکھ کے مجھے دوبارہ سنایا اور پھر کہنے لگا ''تم کال نہ کرنا میں خود ہی کر لیا کروں گا۔ جیسے ہی امیگریشن کھلے گی میں تمہیں بتا

دوں گا۔تم واپس آ جانا۔"

میں نے کہا" ٹھیک ہے۔" فون بوکس میں پیسے ختم ہو گئے اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں چاہتا تو اور سکے ڈال کر بات کر سکتا تھا لیکن مجھے بہت زور سے بھوک لگی ہوئی تھی۔
میں بس پہ بیٹھ کے ازیل ہائم آ گیا، جیسے ہی ازیل ہائم پہنچا سب نے میرے ہاتھ میں شاپر دیکھا تو پوچھنے لگے کہ کیا ہے؟"میں نے کہا ابھی سب کے سامنے آ جائے گا سو، میں نے ڈبے سے موبائل فون سیٹ نکالا۔اس میں اورنج کا سم کارڈ فٹ کیا۔اس کی بیٹری لگائی۔ پھر اس کو چارجنگ پہ لگا دیا۔
بدرالدین کہنے لگا" کچھ کھایا ہے۔"

میں نے کہا" کچھ نہیں۔"

وہ کہنے لگا" رات کا سالن بچا ہوا ہے اور روٹی بھی، کہو تو کھانا لا دوں۔"

میں نے کہا" بدرالدین تمہارا بہت شکریہ۔تم بہت اچھے انسان ہو۔ میں کھانا گرم کر کے کھا لوں۔"

کہنے لگا" آج سے میں تم لوگوں سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔ وہ گلبدین ہے نا اسے میرا آپ لوگوں کے ساتھ ہونا بالکل پسند نہیں۔ ویسے بھی اب ہم تین بنگلہ دیشی ہو گئے ہیں اور ہاں ایک انڈین لڑکا آیا ہے۔گلبدین نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔"

مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے کہا" اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں اور ہاں جب بھی زیورخ گئے تو مجھے وہ کتاب ضرور دکھانا۔"

کہنے لگا" ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھنے سے ہی باہمی معاملات میں بہتری قائم رہتی ہے۔ ہر آدمی کی اپنی پسند و ناپسند اور ترجیحات ہوتی ہیں۔گلبدین کے طرزِ عمل پر آپ کو معافی چاہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خیر مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے فرج سے کھانا نکالا۔ پیٹا بریڈ کو پانی لگا کے فرائنگ پین میں گرم کیا۔جلدی جلدی کھانا کھایا۔ جب تھوڑا پیٹ بھر گیا تو ایسا لگا جیسے ہوش آ گیا ہو۔ کھانے سے فارغ ہوا تو برتن وغیرہ سمیٹ کے رکھ دیے۔

OOO

میں صبح بہت دیر سے اُٹھا۔ ناشتہ کر کے ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔آج تیسری پوزیشن کے

لیے ترکی اور ساؤتھ کوریا کا میچ تھا۔ میری یہی خواہش تھی کہ ترکی جیت جائے۔ آج سن ۲۰۰۲ء جون کی ۲۹ تاریخ تھی۔ ازیل ہائم میں جتنے بھی مسلمان لڑکے تھے وہ ترکی کے ساتھ تھے حتیٰ کہ کوسووا کے دو لڑکے بھی حالانکہ مجھے کوسووا کے لڑکے نے بتایا تھا کہ ترکوں نے ان پہ بہت ظلم کیا تھا، لیکن یہ صدیوں پہلے کی بات تھی۔ ساؤتھ کوریا کی ٹیم عمدہ تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ترکی سے جیت جاتی۔ میچ شروع ہوا۔ دونوں ٹیموں نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا، لیکن ترکی یہ میچ دو کے مقابلے میں تین گول سے جیت گیا۔ اسی طرح پہلی دفعہ ایک مسلمان ٹیم فٹ بال کے ورلڈکپ میں تیسرے نمبر پہ آئی۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

میچ دیکھنے کے دوران میری ملاقات اس انڈین لڑکے سے بھی ہوگئی جو ہمارا نیا جوزی وار بنا تھا۔ اس کا نام بلبیر سنگھ تھا۔ قد لمبا، رنگ گندمی، سر پہ کالے گھنے بال۔ اس نے کیس نہیں رکھے ہوئے تھے اس لیے، اس کے سر پہ سکھوں والی روایتی پگڑی بھی نہیں تھی۔ مجھے کہنے لگا" جب میچ ختم ہو جائے تو ونٹرتھور چلیں گے۔"

میں نے کہا" مجھے بھی جانا ہے، کیونکہ میں نے ایک دو چیزیں لینی ہیں۔"

میں نے موبائل فون چارجنگ پہ لگایا ہوا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے وہ ہائم کے کسٹوڈین کو دے دیا۔ آج سولیون کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے موبائل فون جا کے کمرے میں رکھ دیا۔ ہم دونوں بس شاپ پہ آئے۔ بس کا انتظار کرنے لگے۔ باہر عجیب سماں تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف کوئی جشن برپا ہے۔ ہر طرف ترکی کی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ مجھے آج پتا چلا کہ ونٹرتھور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ترک کتنی کثرت سے رہتے ہیں۔ ہم دونوں ونٹرتھور پہنچے تو سٹیشن پہ بھی نوجوان لڑکے ترکی کے جھنڈے لیے کھڑے تھے۔ خیر میں اور بلبیر ان لوگوں کے جوش وخروش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مارکیٹ گاز ستراڑے پہ آ گئے۔ میں جب سے سوئس آیا تھا میں نے انڈرویئر پہننا چھوڑ ہی دیا تھا۔ چھوڑ کیا دیا تھا پاس تھا ہی نہیں۔ جو انڈرویئر میں پہن کے آیا تھا، بدبودار ہونے کی بنا پر کرائس لنگن میں پھینک دیا تھا۔ میں اور بلبیر میگروز سٹور میں داخل ہوئے۔ میں چونکہ ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا اس لیے مجھے اس سٹور کے بارے میں پتا تھا۔ میں نے اپنے لیے تین انڈرویئر لیے۔ بلبیر نے دو ٹی شرٹس لیں۔ جرابیں لیں۔ جب ہم خرید وفروخت سے فارغ ہو گئے تو میں نے بلبیر کو تجویز پیش کرتے ہوئے کہا" کہیں اور چلتے ہیں۔۔۔ کوئی مصروفیت یا

کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے؟"

کہنے لگا "مسئلہ کیسا۔۔۔ میرے کون سا بچے رو رہے ہیں چلو۔ ابھی چلتے ہیں۔" میری بلیر سے یہ پہلی ملاقات تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہوں۔ میں بلیر کو مختلف راستوں سے گھماتا ہوا لاگر سترازے پہ لے آیا۔ یہاں لاگر ہاؤس پہ میرا ارادہ تھا۔ کیپوچینو پئیں گے، خریداری کریں گے کیونکہ یہاں چیزیں مارکیٹ سے مقابلتاً بہت سستی تھیں، جیسے ہی ہم لاگر ہاؤس میں داخل ہوئے، مجھے ایسے لگا جیسے اکثر لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ نوٹس بورڈ پہ نظر پڑی تو وہاں اخبار کی کٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس میں میری اور اس نائیجیرین لڑکے کی تصویر چھپی تھی اور جرمن زبان میں کوئی مضمون لکھا ہوا تھا۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ پیٹر جو انٹرویو کر کے گیا تھا وہ چھپ گیا ہے۔ بلیر کہنے لگا "یار تم تو چھا گئے ہو۔"

میں نے کہا "مہاراج یہ سب آپ کے ساتھ کی کرپا ہے۔"

ہم دونوں لاگر ہاؤس کی کافی شاپ میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پہ آج کوئی اور لڑکی تھی لیکن تھی کسی افریقی ملک کی۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔ اس طرح کے گھنگھریالے بال میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ خیر میں نے اس کو دو کیپوچینو کا کہا اور ساتھ دو مفن بھی۔ اس نے چند لمحوں میں کافی مشین سے دو کیپوچینو بنا دیں۔ اس کے بعد دودھ کی جھاگ بنا کے اس کے اوپر ڈال دی۔

میں نے کہا "لو جی بلیر صاحب کیپوچینو تیار ہو گئی۔"

بلیر کہنے لگا "یار یہ تو جشن ہو گیا۔ پہلا اور آخری۔"

میں نے پوچھا "آخری کیوں؟"

وہ بولا "وہ اس لیے کہ میں کل سے کام پہ جا رہا ہوں، پھر کہاں وقت ملے گا تمہارے ساتھ ایسی موج مستی کا۔"

میں نے کہا "لیکن ہمیں تو کام کی اجازت ہی نہیں۔"

کہنے لگا "اجازت تو نہیں لیکن مجھے بلا اجازت کام مل گیا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ زیورخ میں میرے دو چاچے رہتے ہیں۔ انہوں نے میرے لیے وہاں لانگ سترازے پہ کسی اور سردار کی دوکان پہ کام ڈھونڈ لیا ہے۔ گھر کی بات ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کام کے اوقات کار کیا ہیں۔"

کہنے لگا "صبح ناشتہ کر کے چلا جایا کروں گا۔ رات کو دیر سے آیا کروں گا۔ ویسے تو میں چاچے کے گھر بھی سو سکتا ہوں لیکن ازیل ہائم والے کنٹرول کرتے ہیں، جب تک پکی کراس نہیں مل جاتی تب تک یہیں رہوں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں آتے ہی کام مل گیا۔"

کہنے لگا "اگر تم نے کرنا ہے تو بتاؤ۔ میں اپنے چاچے سے بات کروں گا۔ کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ دے گا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میرا ابھی یہاں چھٹیاں منانے کو من کرتا ہے۔"

بلبیر بولا "جیسی تمہاری مرضی۔"

کپوچینو ختم ہوئی تو میں نے کہا "اب کیا ارادہ ہے۔"

کہنے لگا "یہاں ونٹر تھور میں کوپ نہیں۔"

میں نے کہا "یہاں تو میگروز سٹور ہے۔ کوپ تو کہیں بھی نہیں دیکھا۔"

وہ بولا "کوپ سے کھانے پینے کی چیزیں سستی ملتی ہیں لیکن تم تو وہاں کا گوشت نہیں کھاؤ گے۔ زیورخ میں حلال گوشت ملتا ہے۔ یہاں کا مجھے پتا نہیں۔"

میں نے کہا "گوشت کی میری لیے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے میں دال سبزی زیادہ شوق سے کھاتا ہوں۔"

کہنے لگا "چلو کسی سے پوچھو کہ کوپ کہاں ہے۔ اگر ہے تو وہاں سے کچھ پکانے کے لیے لے چلتے ہیں۔"

میں نے کافی شاپ سے ہی ایک افریقن سے پوچھا تو کہنے لگا، ایک تو سٹیشن کے نیچے ہے اور دوسرا سٹیشن کی پچھلی طرف ہے۔ گوشت وغیرہ اسی سے ملتا ہے۔

میں نے بلبیر کو بتایا کہ سٹیشن کی پچھلی طرف کوپ ہے۔ تو وہ کہنے لگا چلو وہاں چلتے ہیں۔ ہم دونوں ونٹر تھور ریلوے سٹیشن کے سب وے سے گزر کے سٹیشن کی دوسری طرف چلے گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد ہمیں ایک چار منزلہ جدید طرز کی عمارت نظر آئی۔ اس کے باہر جرمن زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ریوالونگ ڈور سے اندر داخل ہوئے۔ گراؤنڈ فلور پہ کوپ تھا۔ میں تو اتنا نہیں جانتا تھا لیکن بلبیر نے میری معلومات میں اضافہ کیا کہ یہاں چیزوں کی قیمت میگروز سے کم ہے۔

ہم نے ایک سوئس فرانک کی خریداری کی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے تھیلے تھے۔ ہم دونوں بڑی مشکل سے بس سٹاپ تک پہنچے۔ بس آئی تو اس میں سوار ہو گئے۔ بس میں ہمیں گلبدین بھی مل گیا۔ وہ روزانہ کہیں چلا جاتا تھا۔ اس نے ہمارے ہاتھ میں تھیلے دیکھے تو حیران ہو کر کہنے لگا" تم لوگ خریداری کر کے آئے ہو۔"

میں نے کہا" تم تو بڑے ذہین ہو۔ تمہیں ایک دم کیسے پتا چل گیا۔"

وہ کہنے لگا" تمہارے ہاتھ میں تھیلے جو اٹھائے ہوئے ہیں۔"

بلبیر دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا" تم نے اس بنگالی کو کیا کہا ہے۔ وہ علیحدہ ہو گیا ہے۔"

کہنے لگا" ہاؤس ماسٹر کے کہنے پر اسے علیحدہ کیا گیا۔ شنائیڈر کہہ رہا تھا تین بنگالی ہیں تو ایک طرف ہو جائیں اور اس انڈین کو تم اپنے ساتھ ملا لو۔ میں نے ہاں کر دی۔"

میں نے کہا" خیر جو بھی ہوا اچھا ہوا۔ ہم ایک سوئس فرانک کا سامان لائے ہیں۔ تمہارے حصے میں سات سوئس فرانک آئے ہیں۔ تم ازیل ہائم جا کے ہمیں دے دینا۔"

کہنے لگا" میں کل زیورخ جا کے مصالحے لے آؤں گا۔"

بلبیر کہنے لگا" خان صاحب جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے ایک بات پوچھوں آپ لانگ ستراز ے پہ کیا کر رہے ہوتے ہیں۔"

گلبدین کا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ کہنے لگا" وہ میں ویسے ہی ایک دن گیا تھا۔"

بلبیر بولا" میں نے آپ کو کئی دفعہ وہاں دیکھا ہے۔"

میں نے کہا" یہ لانگ ستراز ے کہاں ہے۔"

بلبیر بولا" یہ زیورخ کی مشہور گلی ہے۔ یہاں پہ جوا خانے ہیں۔ سیکس شاپس ہیں، مہ ہیں۔ ہیرا منڈی کے جملہ لوازمات ہیں۔"

گلبدین کو چپ لگ گئی۔ اوور ہیول آیا تو ہم نے دو تھیلے گلبدین کو پکڑائے۔ وہ سر جھکائے ہمارے ساتھ ازیل ہائم کی طرف چل دیا۔ ازیل ہائم کے باہر دو افراد کھڑے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی گلبدین کو دیکھا تو کہنے لگے" آج تو بڑی شاپنگ کی ہے، ہمارے یار نے۔۔۔" وہ مسکرا کے کہنے لگا "جی شاہ جی۔"

اس نے تھیلے اس طرح سے ہمیں پکڑائے جیسے یہ سامان اُسی کا ہو اور کہنے لگا" یہ میرے مہمان ہیں۔ دوسری ازیل ہائم سے آئے ہیں۔ میں نے ان کو دعوت دی تھی۔"

بلبیر بولا" ان سے پوچھو کہ کھانا کھائیں گے یا چائے پئیں گے۔"

میں نے آگے جا کے ان دونوں سے ہاتھ ملایا۔ شاہ صاحب کے سر پہ بال بالکل نہیں تھے۔ صرف ایک جھالری تھی۔ انھوں نے ہلکی ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا" شاہ جی ویسے تو کھانے کا وقت ہے لیکن آپ لوگوں کا کیا دل چاہ رہا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا" کھانا ہم کھا کے آئے ہیں اور کسی چیز کی طلب نہیں۔"

میں اور بلبیر اندر چلے گئے۔ گلبدین ازیل ہائم کے باہر ہی اپنے مہمانوں کے پاس رک گیا۔ میں نے اندر جا کے بلبیر سے کہا" یہ گلبدین بھی عجیب آدمی ہے۔ دوستوں کو دعوت پہ بلا لیتا ہے اور خود غائب ہو جاتا ہے۔"

بلبیر بولا" عجیب آدمی نہیں احمق آدمی کہیے۔"

میں نے کہا" تم نے اسے لانگ سٹراڑے پہ دیکھا ہے۔ تم وہاں کیا کر رہے تھے۔"

وہ بولا" پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے وہاں دیکھا ہی نہیں۔ میں نے ویسے ہی شرارتاً یہ بات کی تھی اور رہی یہ بات کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ میں کل کام پہ جاؤں گا۔ میں جس دوکان پہ کام کرنے جا رہا ہوں وہ لانگ سٹراڑے پہ ہی ہے۔ میں خود وہاں کئی دفعہ گیا ہوں۔ میں سیاسی پناہ کی درخواست دینے سے پہلے کئی مہینے اپنے چچا کے گھر زیورخ رہا ہوں۔"

میں نے کہا" خیر اب کیا کریں۔ کھانے میں کچھ ہلکا پھلکا بناتے ہیں۔ مہمانوں کو بھی پیش کرتے ہیں اور خود بھی کھاتے ہیں۔"

بلبیر بولا" میں پکوڑے بناتا ہوں تب تک تم چائے بنا لو۔"

میں نے کہا" بہت اچھا خیال ہے۔"

ہم دونوں کچن میں چلے گئے۔ بلبیر نے بہت سا بیسن گوندھ کر مصالحہ بنایا اور فرائنگ پین میں پکوڑے تلنے لگا۔ اس نے پلیٹ میں اخبار رکھا اور پکوڑے تل تل کے اس پلیٹ میں رکھتا گیا۔ میں نے چائے بنائی۔ جب سارا کچھ تیار ہو گیا تو فریج سے کیچپ اور میونیز نکالی۔ پھر میں گلبدین اور اس کے مہمانوں کو بلانے چلا گیا۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ شاہ صاحب بولے" اس کی کیا ضرورت تھی؟"

خیر وہ تینوں ازیل ہائم میں داخل ہوئے۔ میز پہ پلیٹیں، کوک، پلاسٹک کے گلاس، پکوڑے، چائے دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔"

گفتگو کے دوران پتا چلا کہ دوسرا بندہ انڈین ہے۔ اس کا نام کرپال سنگھ ہے۔ وہ کہنے لگا "میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنے اچھے پکوڑے نہیں کھائے۔"

میں نے کہا" آپ کے سردار جی نے بنائے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کون کس شہر سے ہے۔ بلبیر تو بٹالا کا تھا اور کرپال سنگھ کا تعلق جس جگہ سے تھا۔ اس جگہ کا نام بڑا عجیب سا تھا۔ نواں شہر۔ لیکن دونوں چندی گڑھ کے آس پاس کے تھے۔ کرپال سنگھ بولا" اب آپ دونوں نے ہمارے ہاں آنا ہے۔ میں جلیبیاں بنانا جانتا ہوں، چائے کے ساتھ پیش کروں گا۔"

میں نے کہا" گلبدین کو جلیبیوں کی دعوت کا نہیں کہو گے۔"

وہ کہنے لگا" یہ تو کئی دفعہ کھا چکا ہے۔ یہ تو ہر ہفتے ہمارا مہمان ہوتا ہے۔"

میں نے گلبدین کی طرف دیکھا۔ یہ دوسرا انکشاف تھا۔ پہلے لانگ سترازے کا پتا اب کرپال نے یہ نئی بات بتائی تھی۔ میں نے گلبدین کی طرف دیکھا اور کہا" اس کا مطلب ہے گلبدین تم دوسروں کے مہمان اکثر بنتے رہتے ہو۔ اس دن تم بس سے اُتر گئے تھے۔ وہ اندسٹری بس سٹاپ سے جو ازیل ہائم نظر آتی ہے۔ وہاں کسی کے ہاں دعوت پہ گئے تھے۔"

شاہ صاحب اور کرپال دونوں نے بہت زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے کہا" کیا میں نے کوئی نادر بات کہہ دی ہے۔"

شاہ صاحب بولے" یہ مان نہ مان میں تیرا مہمان ایسی دعوتیں اُڑاتا ہی رہتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ اس طرح پاکستانیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے افغانیوں کا نام بدنام ہو گا۔"

گلبدین کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں اُبھرا جس سے محسوس ہو کہ اس نے اپنے بارے میں شاہ صاحب کے ریمارکس کو سنجیدگی سے لیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب بولے" اب ہمیں چلنا چاہیے کیونکہ ونٹر تھور سے جو آخری ٹرین جاتی ہے وہ ہماری ازیل ہائم بھی رکتی ہے اگر وہ نکل گئی تو آپ کے پاس سونا پڑے گا۔ ہمارا ہاؤس ماسٹر بھی شور کرے گا۔"

وہ دونوں اُٹھے۔ گلبدین بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ اس بیچارے کے حوالے سے اُوپر تلے عجیب وغریب انکشافات منظر عام پر آئے تھے۔ وہ کہنے لگا ''میں انہیں ونٹرتھور چھوڑ کے آتا ہوں۔''

میں نے کہا اُسے یاد دلایا ''اپنی دوائی بھی لیتے آنا۔''

گلبدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں تو ازیل ہائم کے ہال میں بیٹھ گیا لیکن بلیر اپنے کمرے میں جا کے سو گیا۔ میں نے تھوڑی دیر ٹی وی دیکھا۔ پھر ہاؤس ماسٹر سے اپنا موبائل فون لیا۔ اب تک چارج ہو چکا تھا۔ ویسے تو اس کو چوبیس گھنٹے تک چارجنگ پہ لگانا چاہیے تھا لیکن میں نے اس کو آن کر دیا۔ جیسے ہی آن کیا، تین چار میسجز اُوپر تلے موصول ہوئے۔ میں نے میسجز پڑھے لیکن کچھ نہ سمجھا۔ میں ہاؤس ماسٹر کو دکھائے تو کہنے لگا۔ میسجز اورنج کمپنی کی طرف سے ہیں۔۔۔ تمہارا اورنج کارڈ ایکٹیویٹ ہو گیا ہے۔ اب تم اس پہ کالز سن سکتے ہو اور کر بھی سکتے ہو۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سب سے پہلے نیائش کو اس فون سے میسج کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا فون آ گیا۔ لیکن آواز کٹ کٹ کے آ رہی تھی۔ میں ازیل ہائم سے باہر نکل گیا تا کہ سگنلز میں رکاوٹ نہ رہے، لیکن بات نہ بن سکی۔

OOO

جیسا کہ ۳۰ جون ۲۰۰۲ کو برازیل اور جرمنی کے مابین فٹ بال ورلڈ کپ کا فائنل طے تھا۔ ازیل ہائم میں جتنے بھی لوگ تھے سب برازیل کے حامی تھے لیکن سوئس عوام جرمنی کے حامی تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ورلڈ کپ یورپ میں ہی رہے حالانکہ سوئس لوگ بالعموم جرمنوں کو اتنا پسند نہیں کرتے لیکن ورلڈ کپ کی وجہ سے وقتی طور پہ ان کی جذباتی ترجیحات بدل گئی تھیں۔ سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو ایک مخصوص چینل چلنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلیر تو صبح ناشتہ کر کے کام پہ چلا گیا تھا۔ گلبدین کو فٹ بال سے کوئی لگاؤ نہیں تھا حالانکہ افغانی فٹ بال پسند کرتے ہیں۔ وہ ناشتہ کر کے روز کہیں چلا جایا کرتا اپنے معمول کے مطابق آج بھی وہ چلا گیا تھا۔ ہم لوگ سارا دن ٹی وی پہ مختلف نشریات دیکھتے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی اسی طرح چلتے پھرتے کھایا۔ جب میچ شروع ہوا تو ایسا لگتا تھا جیسے ازیل ہائم میں کوئی بھی موجود نہیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج جہاں ہر وقت ریموٹ کنٹرول پہ لڑائی جھگڑا رہتا تھا آج امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ گورے، کالے، پیلے، گندمی ہر رنگ ونسل کے لوگ اس میچ کو دیکھ رہے تھے۔ پورے میچ میں برازیل کا پلڑا بھاری رہا۔ جرمنی کے کھلاڑیوں کے کھیل سے ایسے لگتا تھا جیسے وہ ذہنی طور پہ ہارے ہوئے ہیں۔ جب برازیل نے پہلا گول کیا تو جرمنی

نے گول برابر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی۔ برازیل نے دوسرا گول کیا تو جرمنی کے حوصلے بالکل پست ہو گئے۔ جب میچ ختم ہوا تو ایسا لگتا تھا جیسے جرمنی میچ نہ ہارا ہو بلکہ ساؤتھ امریکہ نے پورے یورپ کو شکست دے دی ہو۔ حالانکہ برازیل کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی چار دفعہ ورلڈ کپ جیت چکا تھا۔

میچ ختم ہوا تو ازیل ہائم میں کھانے پینے کا دور چلنے لگا کیونکہ میچ کے دوران کچن کی طرف کم ہی لوگوں نے رخ کیا تھا۔ میں نے ایک کپ چائے بنائی کیونکہ نگلبدین موجود تھا نہ ہی ہلمیر۔ چائے پی کے میں ازیل ہائم سے نکلا۔ بس پہ بیٹھ کے ونٹر تھور نکل گیا۔ مارکیٹ گازستراز ے پہ بہت رونق تھی۔ ریستورانوں کے باہر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ جگہوں پہ برازیل کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ میں نے مارکیٹ گازستراز ے پہ چلنا شروع کر دیا۔ شروع میں ریستوران تھے اس کے بعد مختلف قسم کی دوکانیں شروع ہو گئیں۔ چلتے چلتے میری نظر ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی پہ پڑی۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس نے رنگ برنگے پھولوں کے پرنٹ والا فراک نما اپر پہنا ہوا تھا۔ یہ فراک نما اپر اس کے گھٹنوں سے اُوپر تک ہی جسم ڈھانپنے کی ذمہ داری سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی خوبصورت اور سڈول پنڈلیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو مجھے وہ صورت کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ میں ذہن پہ زور دینے لگا کہ میں نے اس کو کہاں دیکھا ہے؟ اس نے جب مجھے دیکھا تو مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔ کہنے لگی" اگر میں غلط نہیں ہوں تو تم وہی ہو نا جس کا" دیرلائمبوتے" میں کل انٹرویو آیا تھا؟"

میں نے کہا" ہاں میں وہی ہوں اور تم کرائس لنگن میں بطور نرس ڈیوٹی کر رہی ہو نا!"

کہنے لگی" ہاں، مجھے یاد ہے ابھی چند دن پہلے تو تم وہاں سے آئے ہو۔ میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہارا انٹرویو بہت اچھا تھا۔ تم نے جن مسائل کے بارے میں ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً موجود ہیں۔"

میں نے کہا" تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

کہنے لگی" میں یہاں رہتی ہوں۔ کام کے لیے روز کرائس لنگن جانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا" ایک بات پوچھوں؟"

کہنے لگی" پوچھو!"

میں نے کہا" میں تقریباً دس یا گیارہ دن کرائس لنگن ازیل ہائم رہا ہوں۔ میں ہمیشہ یہی

سوچتا تھا کہ جہاں ہم رہ رہے ہیں یہ ریڈ کراس کا کوئی سنٹر ہے۔ کیا یہ درست ہے۔"

کہنے لگی" تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ یہ جگہ ریڈ کراس والوں نے دوسری جنگِ عظیم میں بنائی تھی۔ پہلے ریڈ کراس والوں کے پاس تھی بعد میں ازیل ہائم والوں کے استعمال میں آ گئی۔ تعداد کے لحاظ سے، پہلے یہاں اتنے لوگ نہیں ہوتے تھے، جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو گارنیگے ہوٹل کو بھی مہاجرین کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔"

میں نے کہا" ایک اور بات۔"

کہنے لگی" کہو۔"

میں نے کہا" میں اپنا موبائل فون ہائن ہوف سٹراز ے پہ ایک انٹرنیٹ کیفے پر بھول آیا ہوں۔ تم وہاں روز جاتی ہو۔ اگر تمہارا اس نیٹ کیفے کے سامنے سے گزر ہو تو اس آدمی سے پوچھنا کہ وہ موبائل کہاں ہے۔ اگر اس نے وہ موبائل فون ابھی پھینکا نہیں ہے تو پلیز مجھے بھیج دینا۔ ترسیل کا خرچہ میں دے دوں گا۔ موبائل اتنا قیمتی نہیں لیکن اس میں کچھ ضروری نمبر محفوظ ہیں۔"

کہنے لگی" تمہارے لیے میں ضرور وہاں جاؤں گی۔ اگر اس کے پاس موبائل فون ہوا تو اس سے لے کر تمہیں پارسل کر دوں گی۔ پیسوں کی تم فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا" ایک آخری بات۔"

کہنے لگی" کہو۔"

میں نے کہا" اگر تمہیں برا نہ لگے تو میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پسند کرو گی؟"

کہنے لگی" میں ضرور پیتی لیکن اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔ میری بیٹی اور میرا خاوند، وہ دونوں سٹیشن پہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا" تم سے مل کے بہت اچھا لگا۔ تم مجھے اس لباس میں بہت اچھی لگیں۔ میں سوچ رہا تھا یہ خوبصورت سی لڑکی کون ہے۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مسکرا کے آگے چل دی۔

میں کبھی ایک گلی میں جاتا کبھی دوسری میں۔ ایک گلی میں ایک خوبصورت چرچ تھا۔ اس کے باہر لکھا ہوا تھا" سنٹ کرسٹے" یعنی سنی چرچ۔ اس کے اندر داخل ہوا۔ میں چونکہ اٹلی سے آیا تھا۔ وہاں پہ مصوری اور فریسکوز کے اتنے اچھے اچھے نمونے دیکھ چکا تھا اس لیے مجھے یہ چرچ آرائش کے

حوالہ سے زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ میں چرچ سے باہر آیا۔ ایک طرف ایک جدید طرز کا کیفے دکھائی دیا۔ میں اس کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پہ بیٹھ گیا۔ میں نے کیپوچینو آرڈر کی۔ ایک دبلا پتلا سا لڑکا جس نے جینز اور سفید شرٹ کے پہناوے پر کالے رنگ کا ایپرن باندھا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے سے اٹھا کے کیپوچینو میرے سامنے رکھی۔ ساتھ ہی بل بھی۔ میں نے اس کے جانے کا انتظار کیا۔ جب وہ چلا گیا تو بل اٹھا کے دیکھا۔ پانچ سوئس فرانک۔ یعنی ساڑھے تین یورو کی کیپوچینو۔ اتنی مہنگی۔ وہاں اٹلی میں بہت بھی مہنگی ہو تو دو یورو کی لیکن عام کیفے شاپس پہ ایک یا ڈیڑھ یورو کی تھی۔ ساڑھے تین یورو تو بہت زیادہ تھے اور میری تو کمائی بھی ہفتے میں پینتالیس سوئس فرانک یعنی تیس یورو تھی۔ خیر میں اپنی مرضی سے یہاں بیٹھا تھا اس لیے کیپوچینو پی اور بل ادا کر کے یہاں سے اٹھ گیا۔ لیکن آئندہ سے تو یہ کر لی کہ یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ ویسے کیفے شاپ تھی بڑی سٹائلش۔ اس کا نام بھی مختلف تھا" کیفے ساتز۔" میں نے کیفے شاپ کے مالک سے اس کا مطلب بھی پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا جب کافی ختم ہو جاتی ہے تو اس کو جو تھوڑا سا حصہ پیالی میں رہ جاتا ہے اس کو جرمن زبان میں ساتز کہتے ہیں۔ میں نے سوچا یہ کیفے ساتز کی بھی اچھی رہی۔ یہاں سے اٹھا تو ازیل ہائم کی راہ لی۔ ایک بات اچھی ہوئی کیتھرین سے ملاقات ہو گئی۔ کیتھرین اس لباس میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہاں کرائس لنگن میں نرس کے لباس میں اور طرح لگ رہی تھی۔ میں اوور ہیول پہنچا تو ازیل ہائم کے باہر گلبدین، شاہ صاحب اور کرپال سنگھ ڈرنکس پی رہے تھے۔ شاہ صاحب کے ہاتھ میں تو سیون اپ کا ٹن تھا لیکن کرپال سنگھ اور گلبدین بیئر چڑھا رہے تھے۔ میں نے کہا" گلبدین کیا نئی تازی ہے؟ کچھ کھانے کو بنایا ہے؟"

کہنے لگا" ابھی زیورخ سے آیا ہوں۔ وہاں سے مصالحے، سبز مرچیں اور ہرا دھنیا لایا ہوں۔"

میں نے کہا" کچھ بناؤ۔ بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔"

کہنے لگا" دال بناتا ہوں۔ سبز مرچیں اور ہرا دھنیا میں اسی لیے لایا ہوں۔"

میں نے کہا" میری فریج میں مرغی کا گوشت اور مٹن بھی پڑا ہوا ہے۔" کہنے لگا" میں صرف حلال گوشت کھاتا ہوں۔" گویا دوسرے لفظوں میں اس نے مجھے حرام گوشت کھانے والا قرار دے دیا تھا۔ جس پر مجھے غصہ آ گیا لیکن غصہ دباتے ہوئے۔

میں نے اس سے پوچھا" بیئر بھی حلال پیتے ہو؟" جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

شاہ صاحب کہنے لگے" فرشتہ صاحب چھوڑیں اس کو یہ بتائیں کہ آپ کہاں سے آ رہے

ہیں؟"

میں نے کہا "میں ونٹر تھور گیا تھا۔ وہاں سے ایک کیفے سے کیپوچینو پی، لیکن ادائیگی کرتے ہوئے ہوش اُڑ گئے۔ پانچ سوئس فرانک کی ایک کیپوچینو۔"

وہ بولے "آپ کو کس نے کہا تھا کے کیپوچینو پئیں۔ یہاں تو ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے۔ اتنی مہنگائی ہے کہ خدا کی پناہ۔

میں نے کہا "میرا دل چاہ رہا تھا۔ اس کیفے پہ بیٹھ گیا۔"

کرپال سنگھ بولا "آپ ہمارے ہاں جلیبیاں کھانے کب آ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "جب گلبدین آپ کے ہاں لے آیا۔"

ہم لوگ گپ شپ کرتے رہے، گلبدین دال بنانے چلا گیا۔ اس نے بہت جلدی دال بنا لی۔ میں نے آٹا گوندھا۔ کرپال سنگھ کہنے لگا "روٹیاں میں بناؤں گا۔"

میں نے کہا "یہاں کسی پہ کوئی پابندی نہیں۔"

اس طرح کرپال نے آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائے اور ان سے اتنی اچھی چپاتیاں بنائیں کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں مرد کے ہاتھ کی پکی اس طرح کی چپاتیاں نہیں دیکھی تھیں۔ ہر چپاتی اتنی پھولتی جیسے اس میں کسی نے ہوا بھر دی ہو۔

میں نے کہا "سردار جی میں نے ایسی چپاتی پہلی دفعہ دیکھی ہے۔ آپ نے ایسی چپاتی بنانی کس سے سیکھی ہے۔"

وہ بولا "اپنی ماں سے! آج کل کی عورتیں تو نری کھوتیاں ہیں۔ ان کو چپاتی بنانے کا کیا پتہ؟! اصل چپاتی تو اس کو کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "بالکل صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔"

ہم سب نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔

کرپال بولا "اب آپ نے ہمارے ہاں "دعوت جلیبی" پہ ضرور آنا ہے۔ ہم دو دفعہ آپ کے ساتھ کھانا کھا چکے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی بازو تو نہیں چڑھانا ہوتا لیکن میں آپ کے ہاتھ کی بنی جلیبیاں کھانے ضرور آؤں گا۔ آپ چپاتی اتنی اچھی بناتے ہیں۔۔۔ جلیبیاں تو اس سے بھی زیادہ مزیدار بناتے

ہوں گے۔"

شاہ صاحب بولے "ہم لوگ چلتے ہیں۔ ورنہ ہماری جلیبی بن جائے گی۔ آج اتوار ہے۔ آج بسیں بھی کم ہیں اور ٹرینیں بھی۔"

میں نے کہا "میں آپ کو نہیں روکتا۔"

کرپال سنگھ اور شاہ صاحب چلے گئے لیکن کرپال سنگھ کی بنائی ہوئی چپاتی مجھے نہ بھولی۔

ooo

کرائس لنکن چھوڑے ہوئے مجھے چند دن ہوئے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے عرصہ گزر گیا ہے۔ سوموار کی صبح لائبریری چلا گیا۔ وہاں آدھے گھنٹے کے لیے نیٹ پہ بیٹھا۔ وہاں کا عملہ مجھے پہچاننے لگا تھا کیونکہ انہوں نے اخبار میں میرا انٹرویو پڑھ لیا تھا۔ میں نے جیب سے پیٹر کا کارڈ نکالا۔ اس کو میل بھیجی کہ تمہارا کیا ہوا انٹرویو بہت اچھا تھا۔ اب لوگ مجھے جاننے لگے ہیں۔ نیچے اپنا نیا موبائل نمبر بھی لکھ دیا۔ میرے دادا جی کہا کرتے تھے کہ فیڈ بیک بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ اگر کوئی آپ کے لیے کچھ کرے تو اس سے رابطہ رکھا کریں۔ اگر رابطہ نہ بھی رکھ سکیں تو کم از کم اس شخص کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ میں نے وہی کیا تھا۔ پیٹر کا شکریہ ادا کیا جانا ضروری تھا۔ میں چونکہ سارا دن ازیل ہائم میں بور ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا لائبریری کا کارڈ بنوا لیتا ہوں۔ یہاں سے کتابیں لے جایا کروں گا۔ پڑھ کے واپس کر دیا کروں۔ میں نیٹ سے اُٹھا اور لائبریرین سے کہا کہ میرا کارڈ بنا دے۔ وہ کہنے لگی "اس باؤس وائس پہ ہم کارڈ نہیں بنا سکتے۔"

میں نے کہا "میں لائبریری کی کتب چوری تھوڑی کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ دوسرے تیسرے روز پڑھ کے واپس کر دیا کروں گا۔"

وہ کہنے لگی "یہ لائبریری کا اصول ہے اور یہ اصول میں نے نہیں بنایا۔ ہاں تم چاہو تو کوئی بھی کتاب یہاں پہ پڑھ سکتے ہو۔"

مجھے بہت غصہ آیا کہ ایک کتاب کے لیے بھی مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اسی غصے میں، میں لائبریری سے باہر نکل آیا۔ جب میں سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو میری نظر ایک جانی پہچانی شخصیت پہ پڑی۔ میں اسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ رضا بیگ ان چند دنوں میں کتنا بدل گیا تھا۔ میں نے کہا "آغا جی مجھے پہچانا؟"

وہ کہنے لگا" فرشتہ تم، کہاں ہوتے ہو۔"

میں نے کہا" یہاں اوور ہیول میں اور آپ؟"

کہنے لگا" میں تم سے پہلے ایک ازیل ہائم ہے وہاں آیا ہوں۔ وہاں بس بھی رکتی ہے۔ تم نے نام سنا ہوگا، انڈ سٹری۔"

میں نے کہا" ہاں وہاں گلبدین جاتا رہتا ہے۔ اس کے کوئی افغانی دوست وہاں ہوتے ہیں۔"

رضا بولا" اچھا تو وہ کارٹون تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ خود کو افغان بتاتا ہے۔ ہمارے پاس جب بھی آتا ہے کہتا ہے مجھے افغانی کھانا پسند ہے، ایرانی کھانا پسند ہے۔ ہم لوگ جو اپنے لیے بناتے ہیں اسے بھی کھلا دیتے ہیں۔ خیر چھوڑو اس کو تم اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟"

میں نے کہا" ٹھیک گزر رہی ہے۔ میں نے آپ کو ای میل کی تھی لیکن آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

رضا بولا" میرا ای میل اکاؤنٹ کسی نے ہیک کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے نیا اکاؤنٹ بنانا پڑا۔"

میں نے کہا" لیکن میل تو چلی گئی تھی۔"

وہ بولا" ہاں چند دن تو چلے گا پھر بلاک ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا" آپ نے اخبار نہیں دیکھا اس میں میرا انٹرویو آیا ہے۔۔۔"

رضا بولا" کوئی بتا رہا تھا لیکن میں نے اخبار نہیں دیکھا۔ کم از کم فوٹو تو بندہ دیکھ ہی سکتا ہے اگر زبان سمجھ نہ بھی آتی ہو۔"

میں نے کہا" رضا یہاں کا ماحول مجھے بہت ناگوار سا لگتا ہے۔ ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

" بھاگ کے کہاں جاؤ گے؟"

" میرا دل کرتا ہے اٹلی چلا جاؤں۔ وہاں کی امیگریشن کھلنے والی ہے۔"

" ہاں میں نے بھی سنا ہے۔"

" آپ بھی جائیں گے؟"

" نہیں میں تو یہیں رہوں گا۔ اگر کیس پاس ہو گیا تو اپنے بیوی بچوں کو بھی یہیں بلا لوں گا۔"

''ابھی کیا پروگرام ہے؟''

''ابھی تو لائبریری میں بیٹھ کر کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں۔ پھر گھر واپس جاؤں گا۔''

''آپ یہاں بھی پڑھائی کر رہے ہیں۔''

''ہاں میں یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ایک سال پڑھوں گا تو میری ڈگری یہاں پہ بھی چل سکے گی۔''

''ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم کوئی جنگل میں تو نہیں رہ رہے۔ میں انجینئر ہوں ساری زندگی پڑھائی کی ہے۔''

''یہ بات تو درست ہے۔''

''مجھے ابھی آپ سے متعلق مزید کچھ پہلوؤں پر گفتگو کرنی ہے، وہاں کرائس لنکن میں صحیح طور پر بات ہی نہ ہو سکی۔ میں روز دعا کرتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔ آپ میری ای میل پڑھ لیں لیکن خدا نے ہم دونوں کو ملانا تھا۔ اس لیے ملاقات ہو گئی۔''

''اچھا ایسا کرو تم نیچے باغ میں میرا انتظار کرو۔ میں اپنا کام کر کے ابھی آتا ہوں۔''

میں نے کہا'' یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ ہمارا لائبریری کارڈ نہیں بناتے۔ ہم یہاں سے کتاب نہیں لے جا سکتے۔''

رضا بولا'' یہ تو زیادہ اچھا ہے۔ اس طرح ہم لوگ لائبریری ضرور آتے ہیں۔ ویسے بھی پڑھنے کا مزہ لائبریری میں ہی آتا ہے۔''

میں نے کہا'' خیر میں نیچے باغ میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔''

میں لائبریری سے باہر آیا۔ لائبریری کے بالکل پاس ایک باغ تھا۔ اس میں بچوں کے لیے جھولے لگے ہوئے تھے۔ یہاں برگد کے بڑے بڑے درخت تھے۔ میں ان کی چھاؤں میں نصب لکڑی کے ایک بینچ پہ بیٹھ گیا۔ آج جولائی کی پہلی تاریخ تھی۔ سوئس لوگوں کے لیے بہت گرمی تھی۔ کئی دنوں سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ دن کے بارہ بجے ہوں گے۔ دھوپ میں کچھ زیادہ ہی تمازت تھی۔ فضا میں کچھ گھٹن بھی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا لگا جیسے میرا گلا خشک ہو گیا ہے۔ مجھے پیاس لگنے لگی۔ میں باغ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دوکان پہ گیا۔ وہاں سے منرل واٹر کی چھوٹی بوتل لی۔ گلے کو تر کیا

اور پھر آ کر برگد کی چھاؤں میں پڑے ہوئے لکڑی کے بنچ پہ لیٹ گیا اور آسمان پہ تیرتے ہوئے روئی کے گالوں جیسے سفید بادلوں کا نظارہ کرنے لگا۔ بدھ مت میں ایک فرقے کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد پاکباز لوگوں کی رُوحیں سفید بادلوں میں منقلب ہو کے نیلگوں افلاک پر اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔۔۔ مجھے لگا جیسے سفید بادلوں کی صورت میں پاکباز افراد کی ارواح مجھے اپنے ساتھ رُوحانی رابطہ استوار کرنے کی دعوت دے رہی ہوں۔

ooo

O

ستمبر کی ۲۹ تاریخ تھی۔ ۲۰۰۲ء میں گرمی نے اپنا پورا زور دکھایا تھا اور اس سال سردی بھی ایک دم شروع ہوگئی۔ اتوار کی چھٹی تھی لیکن معلوم نہیں کہاں سے ٹھنڈی ہوائیں چلی آ رہی تھیں ایسا لگتا تھا ازیزو کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر گیا ہے۔ جس گھر میں، میں اور نیائش رہائش پذیر تھے، اس میں سردیوں کے دن بڑے سخت گزرتے تھے۔ میں سوئس جانے سے پہلے یہاں سال بھر رہ کر گیا تھا۔ سردیوں کی آمد یوں لگتی جیسے کوئی سزا ہو کیونکہ اس گھر میں نمی اتنی زیادہ تھی کہ اگر سارا دن بھی ہیٹر استعمال کرو تو گھر گرم نہ ہوتا۔ ہم زیادہ تر گرم کپڑے پہن کے بستر میں ہی گھسے رہتے۔ آج تو کمال ہوگیا، عام طور پر اکتوبر کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں سردی شروع ہوتی اور نومبر کا مہینہ ٹھیک ہی گزرتا۔ میں نے جرابیں اور ایک ہلکا سا سویٹر پہن لیا۔ نیائش میلانو گیا ہوا تھا اور ثقلین کو شاید شام کو آنا تھا۔ باہر دھوپ تھی لیکن ٹھنڈی ہوا ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے جسم کو چیر کے نکل جائے گی۔ میں نے کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند کر دیے لیکن پھر بھی نہ جانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا مسلسل اندر چلی آ رہی تھی۔ پورا گھر برف کی طرح یخ ہوگیا تھا۔ دیواروں کو ہاتھ لگاؤ تو ایسے لگتا جیسے برف کی سل کو ہاتھ لگا دیا ہو۔ اٹلی میں چونکہ گھروں کے فرش ماربل کے ہوتے ہیں اس لیے جیسے ہی سردی جوبن پر آتی ہے، ماربل کے فرش برف کے تختے بن جاتے ہیں۔ اٹلی میں فرش پہ قالین بچھانے کا رواج عام نہیں ہے، قالین ویسے بھی حفظانِ صحت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ جس گھر میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک

قالین بچھا ہو یعنی وال ٹو وال کارپٹ ہو وہاں طرح طرح کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ خاص کر گرم ملکوں میں قالین سخت نقصان دہ ہوتا ہے لیکن لوگ بنا سوچے سمجھے نہ تو گھر موسم کے مطابق بناتے ہیں نہ ہی گھر کی آرائش اور زیبائش میں اس چیز کا خیال رکھتے ہیں۔

آج اریزو میں سان دوناتو (san donato) ہسپتال کے پاس گراؤنڈ میں ثقلین رُفعین کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ وہاں کئی ٹیمیں اکٹھی تھیں۔ یہاں اردگرد قصبوں میں مقیم بہت سے پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشی اس میں حصہ لے رہے تھے۔ ثقلین نے مجھے بتایا تھا کہ آج وہ سید حاوہیں جائے گا۔ جی تو میرا بھی چاہ رہا تھا لیکن سردی اتنی تھی کہ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو ٹی وی آن کر کے کمبل میں گھس گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو کمبل میں محفوظ کیا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ میں اُٹھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن دوبارہ گھنٹی بجی اور کسی کی آواز بھی آئی "فرشتہ صاحب۔"

اب مجھے اُٹھنا پڑا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بھاگ کے دوبارہ آ کے کمبل میں گھس گیا۔ میں نے سوچا جو بھی ہوگا وہ اندر آ جائے گا۔ دروازے میں آ کے کوئی کھڑا ہوا، اور اُونچی آواز میں کہا "السلام علیکم فرشتہ صاحب۔"

میں نے مُڑ کے دیکھا تو ثقلین کھڑا تھا۔ میں نے کہا "کیا مسئلہ ہے۔ آج بہت سردی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"فرشتہ تم بھی عجیب آدمی ہو، تم خود ہی تو کہا کرتے ہو کہ۔۔۔ 'خاں صاحبان' کے ٹو مارکہ سگریٹ کی ڈبی نہیں لیتے کیونکہ اس پہ برف پوش پہاڑ بنا ہوا ہوتا ہے اور انہیں پہاڑ دیکھ کے ہی سردی لگ جاتی ہے۔ آج خود ہی "خاں صاحب" بنے کمبل میں ڈبکے بیٹھے ہو۔۔۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ ہوائیں سائبیریا سے آ رہی ہیں۔ ایک دو دن بعد موسم معمول پہ آ جائے گا۔ چلو کپڑے پہنو، آج کرکٹ کا میچ ہے۔ اور تم حاملہ عورتوں کی طرح کمبل میں گھسے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "ثقلین تم بہت تیز ہو گئے ہو۔ ہمارا اسلحہ ہمی پہ استعمال کیے دیے رہے ہو! خیر تم بیٹھو، میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔"

میں نے جلدی سے کپڑے بدلے اور ثقلین کے ساتھ ہولیا۔ نیچے کسی کی گاڑی کھڑی تھی۔ ثقلین نے میرا تعارف کروایا۔ "یہ فرشتہ صاحب ہیں۔" اس آدمی نے جو ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا تھا اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا، "مجھے تسلیم کہتے ہیں۔"

میں نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا" کیوں کہتے ہیں؟"

ثقلین بولا" تسلیم صاحب برامت مانئے گا فرشتہ صاحب کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔۔۔جگت کرنے کی! آپ کو راستے میں بتایا تو تھا۔"

تسلیم بولا" او جی کوئی بات نہیں، میں خود بھی بڑا شگفتہ مزاج ہوں۔" تسلیم نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہم چند لمحوں میں سان دوناتو (san donato) ہسپتال کے پاس گراؤنڈ میں تھے۔ جس کو ان دنوں کرکٹ گراؤنڈ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ کپ ٹینس بال سے کھیلا جا رہا تھا اس لیے کسی قسم کے پیڈز کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم لوگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے جا کے بیٹھ گئے۔ وہاں اور بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پندرہ پندرہ اوورز کے میچ تھے۔ ایک میچ ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ایک بندہ کمنٹری کر رہا تھا اور ایک لڑکا امپائرنگ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ پورے گراؤنڈ میں اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ تسلیم کوئی کاروبار کرتا تھا لیکن کیا، ابھی میں جان نہیں سکا تھا۔ میچ کے دوران وقفے میں اس نے چند خاص احباب کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا اور خوش قسمتی سے ان چند خاص احباب میں میں بھی تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے تسلیم نے ڈونر کباب منگوا رکھے تھے۔ لنچ بریک کے بعد کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ شام کو ٹورنامنٹ ختم ہوا۔ اریزو کی ٹیم نے کپ جیتا، ایسا لگتا تھا جیسے سارا کچھ پہلے سے طے کیا گیا تھا۔

ٹورنامنٹ سے فارغ ہوئے تو تسلیم ہمیں گھر چھوڑنے آیا۔ ثقلین میرے ساتھ ہی آ گیا۔ آج ثقلین نے چائے کی فرمائش کی۔ چائے پی کے اس نے اجازت چاہی۔ میں نے رُکنے پر اصرار نہیں کیا اور وہ اگلا باب لے کر چلا گیا۔

OOO

مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کوئی جھنجوڑ رہا ہے۔ میں ہڑ بڑا کے اٹھا۔ میرے سامنے رضا کھڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے باغ میں لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی تھی۔

رضا بولا" چلو چلیں۔"

میں نے کہا" کہاں؟"

کہنے لگا" کچھ کھاتے ہیں بھوک لگ رہی ہے۔"

میں نے کہا" یہاں تو کھانے پینے کی چیزیں بہت مہنگی ہیں۔"

وہ بولا" میں کب کہہ رہا ہوں کہ میکڈونلڈ چلتے ہیں۔ میرے ساتھ ازیل ہائم چلو۔"

میں نے کہا" چلو۔" ہم دونوں سنڈ ہاؤس سترازے پہ چلتے چلتے بامن ہوف پلاٹز آ گئے۔ یہاں سے اوورنیول جانے والی بس اندستری سے ہو کر جاتی تھی بلکہ وہاں اس کا سٹاپ تھا۔ ہم دونوں بس میں سوار ہو گئے۔ چند لمحوں میں اندستری سٹاپ آ گیا۔ ہم دونوں بس سے اتر کے سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ سڑک کے ایک کونے میں ازیل ہائم کا بورڈ لگا ہوا تھا رضا کی ازیل ہائم ہماری ازیل ہائم سے بالکل مختلف تھی۔ یہ ایک کھلی جگہ پہ عارضی طور پہ بنائی گئی تھی۔ جیسے کسی نے بڑے بڑے کنٹینز کہیں سے لا کر رکھ دیے ہوں۔ لکڑی کی ایک لمبی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں طرف کھلی جگہ تھی۔ مختلف ملکوں کے لوگ باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف پلاسٹک کی تار لگی ہوئی تھی۔ اس پہ رنگ برنگے کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے ہوئے تھے۔

رضا کہنے لگا" کیا دیکھ رہے ہو۔"

میں نے کہا" یہ عمارت دیکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے لکڑی کے بکسے بنے ہوئے ہیں۔ جب چاہو اٹھا کے دوسری جگہ رکھ دو۔"

رضا بولا" پہلی دفعہ مجھے بھی عجیب لگا تھا، لیکن چند دنوں میں، میں اس جگہ کا عادی ہو گیا ہوں۔"

میں نے کہا" ایک کمرے میں کتنے بندے ہوتے ہیں۔"

کہنے لگا" ایک کمرے میں چار افراد ہوتے ہیں۔ کمرے کے دونوں اطراف اوپر نیچے بستر لگے ہوئے ہیں۔ بلکہ تم خود چل کے دیکھ لو۔"

ہم دونوں ازیل ہائم میں داخل ہوئے۔ راہ داری کے دونوں طرف ہسپتال کی طرح کمرے تھے۔ کمروں کے پچھلی طرف کھڑکیاں تھیں۔ ایک کونے میں مشترکہ کچن اور دوسرے کونے میں مشترکہ باتھ بنے ہوئے تھے۔ یہ ازیل ہائم ہمارے ازیل ہائم سے کافی بہتر تھی۔

میں نے رضا سے پوچھا" تمہیں بھی ۵۰ سوئس فرانک ملتے ہیں ہفتے بعد۔"

کہنے لگا" نہیں ہمیں تو مہینے بعد چار سو، سوئس فرانک ملتے ہیں۔ ایک دو لڑکے تو کچھ بچا کے اپنے ملک بھی بھیجتے ہیں۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ اتنی تھوڑی سی رقم سے یہ پیسے بچا بھی لیتے ہیں۔

رضا بولا" تم کمرے میں بیٹھنا پسند کرو گے یا باہر دھوپ میں۔"

میں نے کہا" اگر کچھ کھانے کا انتظام کرنا ہے تو کھانا کچن میں ہی تیار کر کے وہیں کھالیں گے۔اس کے بعد دھوپ میں بیٹھ جائیں گے۔"

رضا کہنے لگا" بہت اچھا خیال ہے۔"

رضا نے چاول اور گوشت ملا کے کوئی چیز بنائی۔کھانا پھیکا تھا لیکن بھوک بیدار تھی اس لیے میں نے بڑے شوق سے کھایا۔کھانے کے بعد اس نے قہوہ پیش کیا۔قہوہ کی پیالیاں لے کر ہم باہر بالکونی میں چھتریوں کے نیچے آن بیٹھے۔

میں نے کہا" رضا، پاکستان اور ایران کی سرحد ملتی ہے۔کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے کبھی بھی ایران جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

رضا بولا" میں تو پاکستان کئی دفعہ گیا ہوں۔وہاں کوئٹہ میں میرا ایک دوست رہتا ہے،اس کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔"

" کیسے دن گزر رہے ہیں یہاں۔"

" ٹھیک گزر رہے ہیں۔ایک انٹرویو تو وہاں کرائس لنکن میں ہوا تھا اب دوسرا انٹرویو ہونا ہے۔اس کے بعد پتا چلے گا کہ کیا ہوگا۔ابھی تو انتظار کر رہا ہوں۔تم سناؤ تم شب و روز کیسے گزارتے ہو۔"

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

" تم نے تو شاعری شروع کر دی۔"

" اس لیے کہ زندگی نے آج کل ایسے اشعار کی تفسیر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

وقت ہے کہ گزرتا ہی نہیں،اگر یہ کام کی اجازت دے دیتے تو شاید اچھا وقت کٹ جاتا لیکن یہاں تو وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔صبح ہوتی ہے تو ناشتے کے بعد ونٹر تھور کا رُخ کرتا ہوں۔لائبریری چلا جاتا ہوں،لاگر ہاؤس چلا جاتا ہوں،مارکیٹ گاز سترازے پہ چکر لگاتا رہتا ہوں بس آج کل اسی دائرے میں گھومتے رہنا مقدر ہو گیا ہے۔۔۔اور تم۔"

" میں بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔زیادہ وقت لائبریری میں کتابوں میں محو رہتا ہوں۔یہاں ایک دو ایرانی ہیں اُن سے ایرانی سیاست پہ بات ہوتی ہے۔کبھی کبھی مسلمانوں کی بدحالی زیرِ بحث آجاتی ہے۔اس وقت تو پوری دنیا مسلمانوں پہ تنقید کر رہی ہے۔بالکل ایسے جیسے ہٹلر یہودیوں

کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے پچاس لاکھ سے بھی زیادہ یہودیوں کو مارا ہے۔"

"لیکن مسلمانوں کے ساتھ تو ایسا نہیں ہے۔"

"مسلمانوں کو اتنا بدنام کر دیا گیا ہے کہ یہ سزا ان کے لیے موت سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔"

"اس میں مسلمانوں کی اپنی بھی غلطی ہے۔"

"اتنی مسلمانوں کی غلطی نہیں جتنی ویڈیو کریسی کا کیا دھرا ہے۔ آج کے دور میں میڈیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ جب چاہیں، جس وقت چاہیں، جو چاہیں ٹی وی چینل کے ذریعے دکھا سکتے ہیں اور دکھاتے ہیں۔"

"رضا آپ بتا رہے تھے کہ آپ میٹریل انجینئر ہو۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ کوئی عمارت کیسے گر سکتی ہے؟"

"بالکل جانتا ہوں۔"

درحقیقت میرے ذہن میں نائن الیون کا خیال کلبلا رہا تھا۔ ۹/۱۱ پچھلے کچھ عرصہ سے گفتگو کے لیے بین الاقوامی سطح پر مرغوب ترین موضوع قرار پا گیا تھا۔ میں نے سوچا اس بارے میں رضا کی رائے لی جائے۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ رضا کی رائے کسی نہ کسی حد تک ایرانی قوم کی نمائندہ ہو گی سو میں نے بلا جھجک سوال داغ دیا۔

"رضا میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ٹون ٹاور کیسے گرے ہیں۔ آپ کے خیال میں جہازوں کے ٹکرانے سے گرے ہیں۔"

"جہاں تک میرا علم ہے۔ میں نے جتنا بھی پڑھا ہے۔ میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی رہا ہوں۔ اخبارات میں مضامین بھی لکھتا رہا ہوں۔ میرے علم کے مطابق یہ جہازوں کے ٹکرانے سے نہیں گرے۔"

"تو پھر اصل کہانی کیا ہے۔"

"اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں یہ پتا ہونا چاہیے کہ کوئی عمارت کیسے تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں کیا میٹریل استعمال کیا گیا۔ کتنی بلندی پہ جا کے کسی میٹریل پہ ہوائی دباؤ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کا میلٹنگ پوائنٹ کیا ہے، اس کا فریزنگ پوائنٹ کیا ہے۔ کتنے درجہ حرارت پہ اس کا میٹریل سکڑتا ہے

اور کتنے درجہ حرارت پہ وہ پگھلتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

"ہاں ہے تو۔ جو کمپنیاں۔ سکائی سکریپرز بناتی ہیں۔ وہ ان تمام چیزوں کو ذہن میں رکھ کے عمارت کی بنیاد رکھتی ہیں۔ جیسے دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں ان کے پاس پیسہ تو ہے لیکن وہ سکائی سکریپرز تعمیر نہیں کرتے کیونکہ ان ملکوں کی جغرافیائی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ وہاں اونچی عمارات موسمی آفات کا مقابلہ کر سکیں۔ ان میں سے ایک ملک اٹلی بھی ہے۔ وہاں زمین کے نیچے بے شمار آتش فشاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ٹوِن ٹاورز بنانے سے پہلے اس پہ پوری تحقیق کی گئی ہو گی۔"

"بالکل۔ ٹوِن ٹاورز میں جو میٹریل استعمال کیا گیا اس میں ایلومنیم، سٹیل، سیمنٹ اور شیشہ شامل ہے۔"

"اس کا آرکیٹیکٹ کون تھا۔"

"۱۱۰ منزلہ جڑواں عمارت ایک جاپانی نژاد امریکن آرکیٹیکٹ مینورو یاماساکی (Menorama Yamasaki) نے ڈیزائن کی۔ اس کے علاوہ ایمری روتھ (Emery Roth) نے بھی اس کے مددگار کی خدمات سرانجام دیں۔ اس عمارت کو بنانے کے لیے ٹیوب فریم کا استعمال کیا گیا جو فضلر خان ایک بنگالی نژاد امریکی نے متعارف کروایا تھا۔"

"تم میٹریل کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ اسی وجہ سے تو میں نے ایران چھوڑا ہے۔ پہلے سٹیل کے بارے میں بتاتا ہوں۔ سٹیل ایک الوئے ہے۔ الوئے دو چیزوں سے مل کے بنتا ہے۔ اس میں آئرن اور کاربن پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میگنیز، کرومیئم، وینیڈیم اور ٹنگسٹن بھی اس کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہ ۱۳۷۵ ڈگری سینٹی گریڈ پہ میلٹ ہو جاتا یعنی پگھل جاتا ہے۔ یہ عمارتیں بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایلومنیم، یہ دھات کی وہ قسم ہے جو دنیا میں آٹھ فیصد پائی جاتی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کو کئی اشکال میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس سے جہاز بنتے ہیں، عمارتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا میلٹنگ پوائنٹ ۶۶۰،۳۲ ڈگری سینٹی گریڈ ہے اور اس کا بوائلنگ پوائنٹ ۲۵۱۹ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔

ان دو چیزوں کا استعمال ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کثرت سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ جو تیسری چیز استعمال ہوئی ہے وہ ہے شیشہ۔ سیمنٹ اور ریت تو کسی بھی عمارت کو بنانے کے بنیادی اجزا ہیں۔''

''ان ساری باتوں کا نائن الیون سے کیا تعلق ہے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تا کہ میں نے اسی وجہ سے ایران چھوڑا۔ وہاں ایران کی حکومت نے ایک کمیشن بٹھایا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے گرنے کی اصل وجہ دریافت کی جائے۔ میں نے اپنی تحقیق شروع کر دی۔ میں نے بہت سے حقائق اکٹھے کیے اور رپورٹ تیار کر کے کمیشن کے پاس لے گیا۔ اس دن کے بعد میرا جینا حرام ہو گیا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے ایران چھوڑنا پڑا۔''

''آپ کی رپورٹ میں ایسا کیا تھا۔''

''یہی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں ایک میٹریل انجینئر ہوں۔ میں نے اس عمارت کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔ کس نے تعمیر کی، کس کو ٹھیکہ ملا۔ اس کی اونچائی کتنی ہے، اس کی تعمیر کب شروع ہوئی۔ ان سارے سوالوں کا جواب مجھے گوگل سرچ انجن سے مل گیا۔ میں چونکہ میٹریل انجینئر ہوں اس لیے مجھے اس کے بنانے کے بارے میں فوراً سمجھ آ گیا۔''

''آپ کے خیال میں اس بلڈنگ کے گرنے کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس میں واقعی مسلمان ملوث ہیں؟''

''فرشتہ تمہارے اندر خامی یہ ہے کہ تم ایک ساتھ کئی سوال کر دیتے ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اس واقعے سے مذاہب کو نکال دو کیونکہ اس بلڈنگ میں ہر ملک، رنگ و نسل اور مذہب کے لوگ کام کرتے تھے۔ تم یہ سوچو ان کے گرنے سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو ہوا۔ یہ عمارتیں کب گریں۔''

''گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء منگل کے دن۔''

''تمہیں وقت یاد ہے۔''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔''

''میں بتاتا ہوں۔ نارتھ ٹاور کے ساتھ بقول ایف بی آئی کے، پہلا جہاز جو کہ ہم نے دیکھا بھی صبح ۸:۴۵ پہ ٹکرایا۔ دوسرا جہاز ۹:۰۳ پہ ٹکرایا۔ ایف بی آئی والوں کا کہنا ہے کہ جہازوں کے ٹکرانے سے ان عمارتوں میں آگ لگ گئی اور یہ عمارتیں گر گئیں اور تین ہزار امریکنوں کی جانیں ضائع ہو گئیں۔

نارتھ ٹاور میں جو آگ لگی وہ کم خطرناک تھی بہ نسبت ساؤتھ ٹاور کے۔ ساؤتھ ٹاور یعنی ۱۱۰ منزلہ عمارت کو گرنے میں چھپن منٹ لگے جب کہ نارتھ ٹاور کو گرنے میں ایک گھنٹہ اور چوالیس منٹ لگے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہ دونوں عمارتیں عموداً زمین بوس ہوئی ہیں۔ ان کا کوئی بھی حصہ آس پاس نہیں گرا۔ تم نے کئی دفعہ فلموں میں دیکھا ہوگا جب کسی عمارت کو گرا کے نئی عمارت بنانی ہو تو اس کے نیچے ایک ایکسپلوسف میٹریل (آتش گیر مادہ) رکھا جاتا ہے کہ وہ عمارت جہاں ہے وہیں دھڑام سے نیچے آ جائے۔ یہ عمارتیں بھی ایسے ہی نیچے آئیں۔ جہازوں کے ٹکرانے سے یا آگ لگنے سے بہت بھی تباہ ہوتیں تو چھ یا سات منزلیں تباہ ہوتیں۔ پوری عمارت نہیں۔ تم اگر ان عمارتوں سے جہاز ٹکرانے کی ویڈیو دیکھو تو تمہیں ایسے لگے گا جیسے کوئی چیز ٹکرائی ہے اور اس کے بعد اس قدر دھواں پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ عمارتیں کب دھڑام سے نیچے آئیں۔''

''تو اس کا مطلب ہے جہازوں کے ٹکرانے سے اس کا میٹریل میلٹ نہیں ہوا۔''

''میں نے پہلے میٹریل کے بارے اسی لیے تمہیں تفصیل سے بتایا تھا کہ سٹیل اور ایلومنیم کا میلٹنگ پوائنٹ کیا ہوتا ہے۔ جہازوں کے ٹکرانے سے اتنا زیادہ درجہ حرارت پیدا نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن تین ہزار شہری مر گئے ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔''

''اس کی وجہ ان عمارتوں سے گرنے والا شیشہ بھی ہے۔ لیکن جب یہ واقعہ پیش آیا ایک عجیب سی بھگدڑ مچ گئی۔ بے شمار لوگ اس ناگہانی آفت کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی کو سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے۔ بے شمار لوگ اس وجہ سے حادثات کا شکار ہوئے۔''

''اس وقت جارج ڈبلیو بش کیا کر رہا تھا۔''

''وہ کسی تقریب میں تھا۔ اسے جب بتایا گیا کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے تو، وہ اپنے مشیروں سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو انہوں نے کہا کہ یہ الزام القاعدہ کے سر منڈھنا ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور مزے کی بات کہ القاعدہ نے جرم قبول بھی کر لیا۔''

''تو حادثے میں ہلاک ہونے والوں کا کیسے پتا چلا۔''

''معلوم نہیں اس بات کا علم ہے کہ نہیں کہ یورپ میں کام کرنے والے لوگ دو طرح ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ایک اگر کام کے دوران بیمار ہو جائیں تو ان کو ٹیکس آفس جب تک وہ بیمار رہتے ہیں تنخواہ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا ٹیکس کام کے دوران حادثے کے لیے کٹتا ہے۔ حادثے کی

صورت میں یا ہلاک ہونے کی صورت میں ایک معقول رقم اس کے لواحقین کو ادا کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یورپ میں جس گھر میں آپ رہتے ہیں یا کام کرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کے لیے لوگ پرائیویٹ کمپنیوں کو ٹھیکہ دیتے ہیں۔ وہ اس کام کے لیے کرایہ دار سے یا اگر آپ مالک مکان ہیں تو آپ سے بہت تھوڑی سی رقم ہر مہینے وصول کرتے ہیں۔ اس میں عمارت یا گھر کی مرمت کے علاوہ وہ اس کے انشورنس بھی کرواتے ہیں۔ اگر وہ عمارت گر جائے، اس کا کوئی پائپ ٹوٹ جائے تو انشورنس کمپنی آپ کا نقصان پورا کرتی ہے۔ امریکہ میں تھوڑا مختلف نظام رائج ہے۔ وہاں اگر آپ کام کرتے ہیں تو آپ کو میڈیکل کے لیے اور بیماری کے لیے پرائیویٹ طور پہ انشورنس کروانی پڑتی ہے۔ انشورنس کمپنی آپ کے میڈیل کے بل ادا کرتی ہے اگر کام ختم ہو جائے تو آپ کو کچھ رقم ملتی رہتی ہے۔ عمارتوں کے لیے یورپ کی طرح کا رواج ہے۔ سکائی سکریپرز کی تو تین طرح انشورنس ہوتی ہے۔ اس میں وہ آگ، زلزلہ، سیلاب اور دیگر ناگہانی آفات کا شکار ہونے والوں کی مدد کرتے ہیں۔ اگر ٹون ٹاور گرے ہیں تو اس کے انوسٹرز کو کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ انشورنس کمپنی نے ایک ایک پائی چکائی ہے اور اس سے اس طرح کی عمارتیں دوبارہ کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو وہ جانی ہے۔ اس عمارت میں روز لاکھوں لوگ آتے جاتے تھے۔ جتنے بھی لوگ وہاں کام کرنے جاتے اگر وہ ایک کانٹریکٹ کے تحت کام کرتے تھے تو ان کو اس حادثے میں ہلاک ہونے کے انشورنس کمپنی نے پیسے دیئے ہوں گے۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم نے یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں۔"

"میں نے انجینئرنگ کی ڈگری ایران سے حاصل کی اس کے بعد میں فرانس پڑھنے چلا گیا۔ وہاں دو سال رہا۔ پڑھائی کے دوران مجھے چار گھنٹے کام کی بھی اجازت تھی۔ وہاں کے رہن سہن کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا۔ اس کے علاوہ ایک سال میں نے نیویارک میں گزارا۔"

"تو ساری دنیا مسلمانوں کے خلاف کیوں ہے؟"

"دنیا مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ جن مسلمان ملکوں میں تیل نکلتا ہے وہ ان کے تیل کی اس دولت پر تصرف چاہتی ہے۔ دنیا کے نظام کو حکومتوں کے صدور نہیں چلاتے بلکہ ایجنسیاں چلاتی ہیں، ہر ملک کے اندر مختلف سیاسی لابیز ہوتی ہیں۔ انٹرنیشنل پالیٹکس شطرنج کی بساط کی طرح ہے۔ پرائم منسٹر، بادشاہ، صدر یہ لوگ تو شطرنج کے مہرے ہوتے ہیں۔ ان کو چلانے والا کوئی اور ہوتا ہے۔ تم

امریکہ جا کے کسی سے کہو بش کیسا انسان ہے تو تمہیں نوے فیصد لوگ اسے برا کہتے نظر آئیں گے لیکن جب الیکشن ہوتے ہیں وہی شخص جیت جاتا ہے جسے پبلک بُرا کہتی ہے۔"

"تمہارے خیال میں ٹوِن ٹاورز کے گرنے سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو ہوا۔"

"سب سے زیادہ فائدہ امریکہ کو ہوا۔ یہاں پہ تھوڑی سی سیاسی بصیرت کی ضرورت ہے۔ تمہیں شاید یہ نہیں پتا کہ اسامہ بن لادن پہلے امریکن سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کو انہوں نے روسیوں کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ سعودی عرب کے پیسے سے اور امریکی اسلحے سے مجاہدین کی مدد کرتا رہا اور مجاہدین روسی فوجیوں کے خلاف "جہاد" کرتے رہے۔ آخر کار افغانستان سے روسی فوجوں کا انخلاء ہو گیا۔ اس وقت مجاہدین کا خیال تھا کہ امریکہ یہ بنجر اور ویران ملک انہیں دے کے چلا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ امریکن جہاں بھی اپنا مہرہ بھیجتے ہیں ہمیشہ اس کو ختم کرنے کے لیے ایک مہرہ علیحدہ سے تیار رکھتے ہیں۔ اُسامہ بن لادن کو غیر موثر کرنے کے لیے ایک تو انہوں نے میڈیا کے ذریعے بہت زیادہ منفی پروپیگنڈہ کیا اس کے علاوہ انہوں نے حامد کرزئی کو تیار کیا ہوا تھا۔ جیسے ہی ٹوِن ٹاورز گرے۔ اس سے ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی سات اکتوبر کو افغانستان میں امریکی فوجیں داخل ہو گئیں۔ دسمبر میں جرمنی میں حامد کرزئی نے آزاد افغانستان کے صدر کا حلف اُٹھا لیا۔ حامد کرزئی کو سی آئی اے نے سٹینڈ بائی رکھا ہوا تھا۔ یہ ساری کڑیاں آپس میں ملائی جائیں تو ساری کہانی کھل کے سامنے آجاتی ہے۔"

"رضا میں آج تک یہی گمان کرتا رہا کہ مسلمان شاید واقعی دہشت گرد ہیں اور مغربی میڈیا شاید سچ کہتا ہے کہ انہوں نے معصوم انسانوں کی جان لی ہے، لیکن میں ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا تھا فلسطین میں روز کتنے ہی بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان شہید ہو جاتے ہیں، کشمیر میں کتنے سالوں سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ ان کے بارے میں کبھی کسی کو خیال نہیں آیا۔"

"اگر آج کشمیر میں تیل نکل آئے، ہیروں کی کانیں دریافت ہو جائیں یا وہاں سے یورینیم، پلوٹونیم کے ذخائر دریافت ہو جائیں تو وہاں اگلے ہی دن امریکی فوجیں پہنچ جائیں گی۔"

میں نے رضا سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے موبائل پہ وقت دیکھا تو بہت دیر ہو چلی تھی۔ میں نے رضا سے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ ذرا ہاؤس ماسٹر کو شکل دکھا دوں۔ ویسے تو وہ اس وقت نہیں ہوگا لیکن کسی نہ کسی کی ڈیوٹی ضرور ہوتی ہے۔"

رضا نے پوچھا "تم روز لائبریری آتے ہو؟"

میں نے کہا" ہاں! اپنی ٹی وی دیکھنے ضرور آتا ہوں۔ اس کے بعد سوچتا ہوں تھوڑی دیر کے لیے جم جایا کروں۔ جرمن زبان سیکھنے کا بھی سوچ رہا ہوں۔"

رضا بولا" جرمن زبان کی کلاسسز تو اگست کے آخر میں شروع ہونگی۔ آج کل سکول بند ہیں۔ میں بھی زبان سیکھنی شروع کروں گا کیونکہ یہاں جرمن زبان سیکھے بغیر گزارا نہیں۔"

میں نے کہا" ہاں جن کنٹونوں میں جرمن بولی جاتی ہے وہاں تو بغیر جرمن کے آپ گونگے ہیں۔"

رضا بولا" کل اگر لائبریری آئے تو مجھ سے ضرور ملاقات کرنا۔ اگر کبھی بوریت ہو تو ہماری ہائم میں آ جایا کرو۔ راستے میں ہی ہے۔"

میں نے کہا" رضا میری ابھی تسلی نہیں ہوئی۔ جس موضوع پہ ہم گفتگو کر رہے تھے وہ ابھی جاری ہے۔ میں ضرور آیا کروں گا۔ ویسے تم میرا موبائل نمبر لے لو۔" رضا کو میں نے اپنا موبائل نمبر لکھ کے دیا۔ وہ مجھے بس سٹاپ تک چھوڑنے آیا۔

میں جب ازیل ہائم پہنچا تو وہاں گلبدین میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا" فرشتہ تم نے میرے ساتھ جانا ہے۔"

میں نے کہا" کہاں؟"

کہنے لگا" کرپال سنگھ نے بلایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا فرشتہ صاحب کو ضرور لانا۔" آج وہ خاص طور پہ تمہارے لیے جلیبیاں بنا رہا ہے۔"

میں نے کہا" جانا کہاں ہوگا؟"

وہ بولا" پہلے ونٹرتھور تو چلو۔ وہاں سے جو لوکل ٹرین زیورخ جاتی ہے وہ ان کی ازیل ہائم پہ رکتی ہے۔"

میں نے کہا" لیکن میرے پاس تو ٹکٹ ہی نہیں۔"

وہ بولا" یہی ٹکٹ چل جائے گا۔ اگر ٹکٹ چیکر نے کچھ کہا بھی تو تم یہ ظاہر کرنا کہ تمہیں زبان نہیں آتی اس طرح وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ اگر پھر بھی تنگ کرے تو اسے ہاؤس وائس دکھا دینا۔ پھر وہ تم سے کچھ نہیں پوچھے گا۔"

میں دل میں سوچنے لگا" گلبدین بظاہر جتنا بیوقوف نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ میں ابھی ابھی

بس پہ بیٹھ کے اوور یول آیا تھا اور مجھے ہائم پہنچتے ہی گلبدین ونٹرتھور لے آیا۔ شام کے چھ بجے ہوں گے۔ ہم دونوں ونٹرتھور ریلوے سٹیشن پہ زیورخ جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دو ٹرینیں سٹیشن پہ آ کے رکیں لیکن گلبدین نے کہا یہ وہاں نہیں رکیں گی۔ اس لیے ہم ان میں سے کسی ٹرین پہ نہ بیٹھے۔ پھر مطلوبہ ٹرین آئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ یہ ٹرین تمام چھوٹے بڑے سٹیشنوں پہ رکنے والی ''پسنجر ٹرین'' تھی۔ اسے اس حوالے سے لوکل ٹرین بھی کہا جا سکتا تھا۔ دوسرا اسٹاپ ہمارا تھا۔ ریلوے سٹیشن کا نام میں نہ پڑھ سکا۔ کسی چھوٹے سے قصبے کا عجیب ویران سا ریلوے سٹیشن تھا۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن کے سب وے سے سڑک پہ نکل آئے۔ سڑک کے اس پار ایک بوسیدہ سی عمارت نظر آئی۔ اس کے باغ میں بچوں کے جھولے لگے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے سامنے، باہر کی طرف تار لگی ہوئی تھی جس پر کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکائے گئے تھے۔ ایک دو بچے جھولوں پہ کھیل رہے تھے۔ مجھے گلبدین کہنے لگا'' شاہ صاحب بھی یہیں ہوتے ہیں اور وہ پاکستانی بھی یہیں ہوتا ہے جس کو تم نے بینک میں کھری کھری سنائی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے کمرے میں ایک بنگالی اور کرپال سنگھ رہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا'' تفصیل سے آگاہ کرنے کا بہت شکریہ۔''

ہم دونوں ازیل ہائم میں داخل ہوئے۔ یہ جگہ ہماری ازیل ہائم سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں داخلی دروازے پہ ایک چھوٹا سا کمرہ بنا تھا۔ اندر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا۔ گلبدین نے اسے جاؤ یٹس کہا اور آگے کو چل دیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کے ہم پہلے فلور پہ آ گئے۔ راستے میں دیوار کے ساتھ ایک ٹیلی فون لگا ہوا تھا اور اس کا رسیور شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی شاہ صاحب نے ہاتھ کے اشارے ہمیں اوپر جانے کا کہا۔ ہم دونوں کوریڈور میں داخل ہوئے۔ اس کوریڈور کے دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ مجھے گلبدین نے بتایا کہ نچلے فلور پہ وہ لوگ رہتے ہیں جو میاں بیوی ہیں اور جن کے بچے ہیں اور اوپر وہ لوگ رہتے ہیں جو یہاں اکیلے آئے ہیں۔ ہم کوریڈور کے اختتام پہ پہنچے تو وہاں سیڑھیاں تھیں۔ پرانی اور بوسیدہ لکڑی کی ریلنگ اپنی رنگت سے بتا رہی تھی کہ یہ عمارت بہت زیادہ استعمال ہو چکی ہے۔ ہم دونوں دوسری منزل پہ پہنچے تو یہاں بھی دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ تیسرا کمرہ شاہ صاحب کا تھا، جہاں کرپال سنگھ، ایک بنگالی اور وہ شخص رہتا تھا جس نے بینک کے اندر فرش پر گری ہوئی موزائیک ٹائلیں دیکھتے ہوئے طنزاً کہا تھا کہ کیا یہاں سے تیل نکل آیا ہے؟ ہم دونوں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے میں موجود

لوگوں میں سے بنگالی نے ہمارا بڑے تپاک سے استقبال کیا، لیکن تیل نکلنے کا طنز کرنے والے شخص نے زیادہ گرمجوشی نہ دکھائی۔ میں نے سب کو سلام دعا کی۔ میں نے پوچھا" وہ کرپال سنگھ کدھر ہے۔ ہم لوگ جلیبیاں کھانے آئے ہیں۔"

بنگالی بولا" تم لوگ نیچے چلو۔ وہاں کھانا تیار ہے۔"

میں نے کہا" ابھی تو سات بھی نہیں بجے۔"

وہ بولا" پہلے کھانا کھائیں گے۔ سردار جی نے سرسوں کا ساگ بنایا ہے اور ساتھ مکئی کی روٹی بنائی ہے۔ مکھن وغیرہ بھی لگایا ہے۔ اس نے کہا تھا مہمان جیسے ہی آئیں انہیں نیچے لے آنا۔"

میں نے کہا" تو چلیں۔"

ہم لوگ ازیل ہائم کی پچھلی طرف چکر نما سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر گئے۔ اس ازیل ہائم کا کچن تہہ خانے میں تھا۔ ہم لوگ تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ یہاں بے شمار ریفریجریٹر پڑے ہوئے تھے اور درمیان میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی سے چلنے والے چولہے لگے ہوئے تھے۔ ہر چولہے پہ پکانے کے لیے چار چار برنر لگے ہوئے تھے۔ ایک چولہے پہ کرپال سنگھ کچھ تیار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا" جی آیاں نوں۔ تم نے بہت کرپا کی کہ چلے آئے ورنہ گلبدین مجھے کہہ رہا تھا شاید تم نہ آؤ۔"

میں نے کہا" سردار جی جلیبیاں اگر آپ کو سوئٹزرلینڈ میں ملیں تو اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی۔ اس پہ مجھے جب پتا چلا کہ آپ نے سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی بنائی ہے تو میری بھوک چمک اٹھی۔"

" چلیں کھانا تیار ہے۔"

کچن کے ایک کونے میں لکڑی کے لمبے لمبے کرائس لنکن بنچز کی طرز پر بنچز لگے ہوئے تھے اور ان کے درمیان میزیں لگی ہوئی تھیں۔ سرسوں کا ساگ، اس کے ساتھ مکھن کا پیڑا، لال مرچوں کے پیلے پیلے بیج بھی اوپر نظر آ رہے تھے۔ مکئی کی روٹی پہ بھی مکھن لگا ہوا تھا۔ میں نے پہلا نوالہ لیا تو بہت زیادہ مرچیں لگیں لیکن سرسوں کا ساگ اتنا مزیدار تھا کہ کھاتا چلا گیا۔ مکئی کی روٹی بھی بہت مزیدار تھی۔

کرپال سنگھ بولا" ابھی جلیبیاں بھی بنائی ہیں۔ معدے میں ان کے لیے بھی جگہ رکھ چھوڑنا۔"

میں نے کہا" سردار جی آپ حکم کریں گے تو معدہ اور لے آؤں گا۔" گلبدین اور اس بنگالی

نے کھانے کے دوران کوئی بات نہ کی جبکہ شاہ صاحب جو فون ختم کر کے آچکے تھے اور وہ شخص جس نے مجھ سے تیل والی بات کی تھی وہ کچھ نہ کچھ اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔

جب کھانا کھا چکے تو اس ہنگہ بندھو نے برتن سمیٹ دیئے۔ میں نے کرپال سے کہا ''سردار جی کھانا بہت مزیدار تھا۔ میں نے اس طرح کا ساگ اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا۔''

کرپال سنگھ بولا ''تمہیں جلیبیاں بھی پسند آئیں گی۔''

مجھے ایک بات کا تجسس تھا کہ یہ کرپال سنگھ جلیبیاں کیسے بنائے گا۔ اس نے سامان پہلے سے تیار کیا ہوا تھا۔ ایک کڑاہی نما برتن میں تیل گرم تھا۔ ایک بڑی سی دیگچی میں اس نے شیرہ تیار کیا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک پلاسٹک کی بوتل پڑی تھی۔ ایک دیگچی میں کوئی محلول سا پڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ محلول اس پلاسٹک کی بوتل میں بھرا جس کے سرے پہ ایک نلکی سی لگی ہوئی تھی۔

اس نے گرم تیل میں اس بوتل کو اوپر کر کے دبانا شروع کر دیا۔ تیل میں گول گول دائروں کے چھلے بننے لگے۔ جب یہ چھلے تھوڑے براؤن ہونے لگتے تو کرپال سنگھ چمٹے سے پکڑ کے ان کو اس شیرے میں ڈبو دیتا۔ پھر دو تین دفعہ ان کو اندر باہر کر کے ایک پلیٹ میں دھرے ٹشو پیپر کے اُوپر رکھتا جاتا۔ وہ بولا ''فرشتہ جی گرم گرم کھاتے جاؤ۔ ٹھنڈی ہو گئیں تو مزہ نہیں آئے گا۔''

میں نے گرما گرم جلیبی کا ایک چھلا سا اٹھایا۔ چھلا جیسے ہی منہ میں رکھا میرا منہ جل گیا۔ میں نے چھلا واپس رکھ دیا لیکن باقی لوگ کھاتے رہے۔ وہ شاید گرم جلیبیاں کھانے کے عادی تھے۔ تھوڑے توقف کے بعد میں نے وہی چھلا اُٹھایا اور کھا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں پنڈی کے مشہور حلوائی گرانو کی جلیبیاں سوئس میں کھا رہا ہوں۔ میں نے کرپال سے کہا ''سردار جی آپ نے گرانو کی یاد تازہ کر دی۔ ہمارے پنڈی میں مری روڈ پہ ایک جلیبیوں والا ہے۔ پوری پنڈی میں اس کی جلیبیاں مشہور ہیں۔ ویسے تو جلیبیاں مالٹئی رنگ کی ہوتی ہیں لیکن وہ بنا رنگ کے بناتا ہے۔ بالکل ایسی جیسی آپ نے بنائی ہیں۔''

کرپال بولا ''تم پنڈی کے ہو۔''

میں نے کہا ''ہاں۔''

کرپال بولا ''میرا دادا جی باغ سرداراں میں جما تھا۔ میں ایک دفعہ پاکستان گیا تھا بیساکھی کے میلے پر ہم لوگ حسن ابدال گئے تھے پنجہ صاحب یاترا کرنے تو ہم لوگوں نے چند دن

پنڈی بھی بسیرا کیا تھا۔ میں نے اپنے سوتیلے دادا جی کا گھر بھی دیکھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اب وہاں کوئی اور رہتا ہے۔ اتنے مکان بن گئے ہیں کہ وہ جگہ پہچانی ہی نہیں جاتی۔"

میں نے کہا" سردار جی پنڈی شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی، جب سے اسلام آباد دارالحکومت بنا ہے۔ پنڈی میں پورے پاکستان سے لوگ آ کر آباد ہو گئے ہیں، کیونکہ اسلام آباد میں گھر بہت مہنگے ہیں۔"

کرپال پنڈی یاترا کی یادیں بھی تازہ کرتا رہا۔ جلیبیاں بھی بناتا رہا۔ ہمیں نہیں پتا کہ ہم لوگ کتنی جلیبیاں کھا گئے۔ جلیبیاں کھا کے ہم لوگ گپ شپ لگاتے رہے۔ ساڑھے نو بجے گلبدین بولا" اب ہمیں چلنا چاہیے کیونکہ اب دو ہی ٹرینیں ونٹرتھور جائیں گی۔ اس کے بعد بس بھی پکڑنی ہے۔"

میں نے کہا" گلبدین تم نے زندگی میں پہلی دفعہ کوئی بات مناسب وقت پر کی ہے۔"

ہمیں رکنے کے لیے نہ کہا گیا کیونکہ ازیل ہائم کے قانون بڑے سخت تھے۔ کسی مہمان نے رات رکنا ہوتو، جس کے ہاں رُکنا ہوتا اس کو جوابدہی کرنی پڑتی۔ بہت زیادہ انکوائری ہوتی۔ ہماری ازیل ہائم کا بھی یہی اصول تھا۔

OOO

میں ونٹرتھور لائبریری میں اپنی میل دیکھ رہا تھا۔ میں میل دیکھ کے حیران ہو گیا۔ پیٹر کی میل تھی۔ اس میں اس کا فون نمبر لکھا ہوا تھا اور یہ پیغام تھا کہ وہ میرا ایک انٹرویو مزید کرنا چاہتا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرے ای میل کا اس نے نہ صرف جواب دیا بلکہ وہ میرا مزید انٹرویو بھی کرنا چاہتا ہے۔ میرا ایک انٹرویو تو وہ کر چکا تھا۔ میں نے میل کے جواب میں لکھ دیا جب بھی وہ انٹرویو کرنا چاہے مجھے بتا دے کیونکہ ہم لوگ فارغ ہی ہوتے ہیں۔ نیچے میں نے اپنا موبائل نمبر بھی لکھ دیا کیونکہ مجھے یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ میں نے اس کو اپنا فون نمبر دیا تھا یا نہیں۔ پیٹر کا فون نمبر اس کے کارڈ پہ بھی لکھا ہوا تھا۔ مجھے رضا سے بھی ملنا تھا لیکن آج وہ نہیں آیا تھا۔ میں نے موبائل کو جیب سے نکال کے کئی دفعہ دیکھا کہ شاید کسی کا فون آیا ہو لیکن میں نے ابھی اپنا نمبر کسی کو دیا ہی نہیں تھا تو کوئی کال کہاں سے آتی؟

مجھے لگا جیسے میں بھی باؤلا ہوتا جا رہا ہوں۔

لائبریری سے نکل کے میں لاگر ہاؤس چلا گیا۔ وہاں پہ جم میں تھوڑا وقت گزارا۔ جم سے باہر نکلا تو میرا موبائل فون بجنے لگا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ:

کس کو میری یاد نے تڑپا دیا؟

کس کی کال آئی ہے نیلی فون پر؟

میں نے انگریزی انداز میں ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے جواب آیا کہ میں پیٹر بول رہا ہوں۔ میں نے ابھی تمہاری میل دیکھی ہے۔ کل تم کیا کر رہے ہو۔''

میں نے کہا'' میں نے کیا کرنا ہوتا ہے، میں فارغ ہوں۔''

اس نے جواب دیا'' میں تمہارا ذاتی حوالے سے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔''

میں نے کہا'' سنڈ کر ٹے یٹنی سٹی چرچ کے پچھلی طرف ایک کیفے ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ تمہیں پتا ہوگا، کیفے ساتز کا۔''

وہ بولا'' ٹھیک ہے کل ساڑھے گیارہ بجے وہاں ملتے ہیں۔''

میں نے کہا'' ٹھیک ہے۔''

فون بند ہوگیا۔ میں نے فون جیب میں رکھا۔ اور بس سٹاپ پہ آ گیا کیونکہ مجھے ازیل ہائم جانا تھا۔ میں پیٹر کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ میرا انٹرویو کس حوالے سے کرے گا۔ کیا سوال کرے گا۔ کیا مجھ سے مذہبی حوالے سے بھی سوال کرے گا؟ ہوسکتا ہے گیارہ ستمبر کے بارے میں بھی پوچھے!ہوسکتا ہے پاکستان کے بارے میں بھی پوچھے مگر میں پاکستان کی موجودہ سیاست کے بارے میں تو زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ پیٹر اگر رضا کا انٹرویو کرتا تو اسے بہت زیادہ معلومات ملتیں۔ بس آئی اور میں اس میں سوار ہوگیا۔ بس جب ٹیکنیکم سٹراز ے پہ رکی تو وہاں سے رضا بھی بس میں سوار ہوا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا'' آغائی آج آپ لائبریری میں نہیں نظر آئے؟''

وہ کہنے لگا'' میں آج ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ میری کمر میں درد تھا۔ انہوں نے ایکسرے کیا ہے۔ دیکھتے سکیننگ (scanning) میں کیا رزلٹ ملتا ہے؟''

میں نے کہا'' آغائی میرے ساتھ چلو۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔''

ہمارا بس کا پاس ونٹرتھور اور اس کے آس پاس علاقوں کے لیے چلتا تھا لیکن ایک خاص زون کے بعد پیسے دینے پڑتے تھے۔ بس اندسٹری بھی رکی لیکن رضا بس سے نہ اُترا۔ جب میں نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا تو اس نے جواب نہیں دیا تھا میں سمجھا شاید اتر جائے گا لیکن وہ میرے ساتھ ہی جا رہا تھا۔ بس جب اوور بیول رکی تو میں نے رضا سے کہا'' آغائی ہمارا اسٹاپ آ گیا ہے۔''

وہ کہنے لگا'' یہ تو ایک ویرانہ ہے۔ آس پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

میں نے کہا" آغائی بس سٹاپ کے ساتھ پٹرول پمپ ہے۔ اس کے ساتھ چھوٹی سی دوکان ہے۔ ہر طرف شاہراہیں ہیں۔ ہم دونوں سڑک پار کر کے اس طرف جائیں گے۔"

رضا بولا" میرا مطلب ہے آس پاس کوئی عمارت نہیں۔"

میں نے کہا" آگے چل کے آپ کو مزید بہتر منظر نظر آئے گا۔"

ہم دونوں نے سڑک پار کی۔ یہاں سوئس میں ایک چیز بہت اچھی تھی کہ آپ نے جیسے ہی سڑک پار کرنے کا ارادہ کیا ہے اور قدم زیبرا کراسنگ پہ رکھا تو گاڑیاں دور سے ہی اپنی سپیڈ آہستہ کر لیتی ہیں جبکہ اٹلی میں جب آپ زیبرا کراسنگ کے اوپر پیر رکھتے ہیں تو آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کا یہی دل چاہتا ہے کہ وہ آپ کے دوسرا قدم اُٹھانے سے پہلے ہی آپ کے پاس سے گزر چلے ہوں۔ کئی دفعہ تو وہ آپ کے قدموں کے پاس آ کے بریک لگاتے ہیں اور گاڑی کے ٹائروں کی ایک لمبی رگڑ چیں کی آواز سناتی ہے۔ اٹالین لوگوں کا زیبرا کراسنگ پہ گاڑی روکنے کو بالکل دل نہیں چاہتا لیکن وہ گاڑی اس لیے روکنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ لائسنس چھن جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ اگر انہیں یہ ڈر نہ ہو تو وہ پیدل افراد کو کچلنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں مگن ازیل ہائم کی طرف جا رہے تھے۔ رضا میرے ساتھ ساتھ تھا وہ آس پاس کے مناظر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف ای بی بی کا دفتر تھا۔ دوسری طرف مکئی کے کھیت تھے، جیسے ہی ہم ازیل ہائم پہنچے دیکھا کہ بہت سارے افریقن لڑکے باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ازیل ہائم میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ میں نے رضا کو اپنے ساتھ اندر جانے کو کہا۔ وہ کہنے لگا" یہ کیسی جگہ ہے۔ ایسا لگتا ہے انسان قبر کے اندر جا رہا ہے۔"

میں نے کہا" آغائی کیا کریں ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔"

وہ بولا" ہاں یہ تو ہے۔ چلو تین چار مہینے انتظار کرو۔ جب پکی کرائس مل جائے گی تو کام کی بھی اجازت ہو گی۔ جب کام کرنے لگے تو اپنی مرضی کی جگہ پہ رہنا۔"

میں نے کہا" یہاں تو ایک ایک دن سالوں کی طرح گزرتا ہے آپ کہتے ہیں کہ تین چار مہینے۔"

میں جیسے ہی اندر داخل ہوا تو سیما نے مجھے راستے میں روک لیا۔ کہنے لگی" تمہارا پارسل آیا ہے۔"

میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا" مجھے کس نے پارسل بھیج دیا۔"

کہنے لگی" کراس لنکن سے آیا ہے۔"

اس نے میرے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک پھولا ہوا لفافہ تھما دیا۔

رضا بولا" حیرت ہے کراس لنکن سے پارسل آیا ہے۔"

میں نے کہا" بات تو حیرت ہی کی ہے۔"

پھر ایک دم خیال آیا کہ مجھے کیتھرین ملی تھی۔ ہو سکتا ہے بہ کمال مہربانی اس نے میرا پرانا موبائل انٹرنیٹ کیفے سے حاصل کر کے بھجوایا ہو۔۔۔ میں نے پارسل کھولا تو بڑا حیران ہوا۔ اس میں واقعتاً میرا پرانا موبائل فون ہی تھا جو میں باہن ہوف سٹراز ے پہ واقع انٹرنیٹ کیفے پہ چھوڑ آیا تھا۔ میں اس سوئس آدمی کی ایمانداری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، پھر میں نے رضا کو ساری کہانی شروع سے آخر تک سنائی کہ کس طرح میں انٹرنیٹ کیفے پہ اپنا موبائل چھوڑ کے ازیل ہائم ڈھونڈنے نکلا تھا۔ اس سے میں نے کہا تھا میں موبائل بعد میں لے جاؤں گا۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ میں کراس لنکن سے ونٹرتھور بازار میں کراس لنکن والی نرس ملی میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا موبائل فون وہاں سے لے کر مجھے بھجوا دے۔۔۔ اس موبائل فون کی دستیابی سے مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس آدمی نے میرا موبائل ذمہ داری اور حفاظت سے اپنے پاس رکھا اور کیتھرین نے مجھے پارسل بھی کر دیا۔ اب میرے پاس دو موبائل فون تھے۔

رضا بولا" یہ تو پرانا ماڈل ہے۔"

میں نے کہا" اس میں میری پرانی سم ہے اور بہت ضروری نمبرز بھی۔"

رضا بولا" موبائل کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کھانے میں کیا ہے۔"

میں نے کہا" آغائی ہم کھانے میں مرچ زیادہ استعمال کرتے ہیں کیا آپ سپائسی کھانا کھا لیں گے؟"

وہ بولا" کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کانٹینینٹل کھانے بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔"

میں نے فرج کھول کے دیکھا۔ فرج میں سالن بھی محفوظ تھا اور چپاتیاں بھی میں نے دونوں چیزوں کو گرم کیا۔ ساتھ پیپسی رکھی، دہی رکھا۔ منرل واٹر رکھا۔ رضا کھانے کے دوران بولا" تمہیں سوئس آئے ہوئے تھوڑے دن ہوئے ہیں لیکن تم نے یہاں اچھی سلام دعا پیدا کر لی ہے۔"

میں نے کہا" رضا میں پاکستان میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ میرا کام ہی باتیں کرنا تھا۔ لوگوں کو

پاکستان کی تاریخ سے آگاہ کرتا تھا، بدھ ازم اور ہندوازم سے متعلق آثارِ قدیمہ سے متعارف کرواتا تھا۔ اس لیے اجنبی لوگوں سے گھلنے ملنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اب کل ایک بیچ میں میرا انٹرویو ہے۔ ونٹرتھور سے ایک اخبار نکلتا ہے" ڈیر لانڈبوتے۔" جس میں میرا پہلے بھی انٹرویو چھپ چکا ہے۔ وہی صحافی میرا دوبارہ انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔"

رضا بولا" وہ کوئی بھی سوال کرے تو بہت سوچ سمجھ کے جواب دینا! اگر گیارہ ستمبر کے بارے میں سوال کرے تو زیادہ حقیقت پسند بننے کی کوشش مت کرنا۔ یہ یورپین صحافی بندے کے منہ میں اپنی مرضی کی بات ڈال کر اُگلوانے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا" آغائی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اپنی معلومات کے لیے آپ سے اس موضوع پہ گفتگو کرتا ہوں۔ مجھے بھی پتا ہے کہ ایک سیاسی پناہ گزین کا سچ اس کے لیے کیا مسائل پیدا کر سکتا ہے۔"

میں نے تجویز پیش کی" آغائی باہر چل کے گپ شپ لگاتے ہیں، اگر آپ کا قہوہ پینے کا موڈ ہو تو میں قہوہ بنا کے لاتا ہوں یا چائے چلے گی؟"

رضا نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا" میں تو چائے پیوں گا لیکن میٹھا کم ہونا چاہیے۔"

میں نے جلدی سے چائے بنائی اور ہم دونوں چائے کے کپ لے کے باہر آ گئے۔ ازیل ہائم کی پچھلی طرف دھوپ نہیں اُترتی تھی۔ یہاں پہ اتنا سبزہ تھا کہ گرمی کے باوجود جب بھی ہلکی سی ہوا چلتی، جسم کو خنکی کا احساس ہوتا۔ میں نے کہا" آغائی اُس دن بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ہم لوگ گیارہ ستمبر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔"

رضا فکرمندی سے بولا" یہاں کوئی خفیہ کیمرہ یا کسی قسم کا خفیہ مائیک تو نہیں لگایا گیا ہوگا؟ ایک بات کا دھیان کیا کرو جب اس طرح کے کسی حساس موضوع پہ بات کرو تو بہت احتیاط کیا کرو کیونکہ ان دنوں اس موضوع پہ بات کرنا بہت خطرناک ہے۔ خاص کر جب بندے نے سیاسی پناہ کی درخواست بھی دے رکھی ہو۔۔۔ اور ہاں ازیل ہائم کے عملے سے اس موضوع پہ بات کرنے کی حماقت کبھی مت کرنا۔"

میں نے کہا" اتنی عقل تو خیر ہے مجھ میں!"

رضا بولا" تم نے کبھی ٹمپلر نائٹس (Templar Knights) کے بارے میں سنا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

وہ بولا "میں نے ٹون ٹاورز کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت گرائے گئے تھے۔ اس واقعے کو وجہ بناتے ہوئے افغانستان میں امریکی فوجیں داخل کی گئی تھیں۔ ایک ایسے ملک میں امریکی فوجوں کا بھیجا جانا جہاں پہ جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہوں، اور ان بارودی سرنگوں کی وجہ سے جہاں کئی سال تک فصلیں کاشت کیے جانے کا امکان نہ ہو۔۔۔ وہاں پہ فوجیں بھیجنے کے لیے یہ سارا ڈرامہ رچانے کا آخر مقصد کیا ہے؟"

میں نے کہا "لیکن آغا ئی آپ نے یہ نہیں بتایا کہ سوا تا روا اور میکلر ٹائمنس کا اس سارے قصے سے کیا تعلق ہے۔ بقول امریکیوں کے، امریکی فوجیں تو طالبان کا قلع قمع کرنے آئی تھیں۔"

رضا جوابا ابھی کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔

O

سوموار کو شام چھ بجے ہی ثقلین نازل ہو گیا۔ اس نے آتے ہی ایک مایوس کن خبر سنائی کہ جس فیکٹری میں وہ کام کرتا ہے وہ بند ہو رہی ہے۔ مالک نے جو قبل ازیں بزنس ایگریمنٹس سائن کیے ان ایگریمنٹس سے متعلق کام کی تکمیل کے بعد فیکٹری بند کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

نیائش بولا "ماڑا فکر نہ کرو، میں جہاں کام کرتا ہوں۔ وہاں تمہاری بات بھی کروں گا۔ ویسے میں نے فرشتہ کی بھی بات کی ہوئی ہے۔"

ثقلین بولا "نیائش بھائی، مجھے چھوڑیے، پہلے فرشتہ صاحب کو جاب دلوانے کی کوشش کریں۔"

نیائش بولا "اس کا جب جاب کا موڈ ہو گا تو جاب مل جائے گی۔ اس نے اریزو میں پہلے بھی جاب کی ہے۔"

ثقلین بولا "میں آپ لوگوں کو صرف یہی بتانے آیا تھا۔ میں اب چلتا ہوں۔"

ہم دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ نہ رکا۔ نہ چائے پی نہ ہی کھانا کھایا۔ بس اگلا باب لے کر چلا گیا۔

OOO

رضا نے جیسے ہی فون پہ بات ختم کی تو میں نے کہا "آغا جی آپ کچھ فرمانے کو تھے؟"

وہ بولا "ہاں، میں بات کر رہا تھا ٹیمپلر نائٹس (Templer Knights) کی اور

سوانارولا (Savanarola) کی۔ کولمبس کی دریافت جسے امریکہ کہا جاتا ہے یہ اس کے معرض وجود میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ امریکہ گو اس وقت دریافت نہیں ہوا تھا مگر اس دور میں سامراجی کردار یورپی ممالک سرانجام دے رہے تھے۔

یہ تاریخ کے اس دور کی بات ہے جب تقریباً آدھی دنیا خلافت عثمانیہ کے زیر تسلط تھی۔ یورپین ملکوں نے عربوں کی دولت پہ قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا۔ اس زمانے میں کسی بھی قوم کو کسی دوسرے ملک کے خلاف جنگ کے لیے تیار کرنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ مذہب کو بنیاد بنا کر انسان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا آج بھی سب سے آسان سمجھا جاتا ہے۔ ان دنوں عرب ممالک تہذیب و تمدن میں اپنے عروج پہ تھے۔ ٹیمپلر نائٹس کا وجود ۱۱۲۹ء میں عمل میں آیا۔ اس کی بنیاد یورپ کے عیسائیوں کی مدد کے لیے رکھی گئی تھی۔ پھر ان کے منشور میں مسلمانوں سے بیت المقدس کو بھی آزاد کروانا شامل تھا۔

پہلی صلیبی جنگ میں جب بیت المقدس پر قبضہ ہو گیا تو بہت سارے عیسائی جو اپنی مذہبی رسومات کے لیے یروشلم گئے ہوئے تھے ان میں سے کئی زندہ واپس نہ آئے۔ واپسی پہ فرانس کے Hugues de Payens اور Godfrey de Saint-Omer نے یروشلم کے بادشاہ Baldwin II of Jerusalem سے درخواست کی کہ جو لوگ یروشلم زیارتوں کے لیے آتے ہیں ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ہم یہاں ایک دفتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں نے ٹیمپل آف ماؤنٹ میں ٹیمپلر نائٹس کا پہلا دفتر بنایا۔ انہوں اپنا نشان گھوڑا اور امتیاز غربت رکھا۔ یہ سفید کپڑے پہنتے تھے اور اس پہ لال رنگ کا صلیب کا نشان بنا ہوا ہوتا تھا۔ تم انہیں اس دور کے نصرانی جہادی کہہ سکتے ہو۔ یہ لوگوں کو عیسائیت کی سربلندی کے لیے جنگ کی تبلیغ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس جنگ میں تم لوگوں نے اپنی جان دے دی تو تم شہید کہلاؤ گے اور اگلے جہان میں تمھیں جنت ملے گی اور بچ گئے تو غازی۔ یعنی یہ لوگوں کو جنت کا سرٹیفکیٹ بانٹتے تھے۔ ان کے منشور میں غریب رہنا لازمی تھا لیکن یہ قانون زیادہ عرصہ نہ چلا۔ لوگ جوق در جوق ان کے ساتھ شامل ہونے لگے، پھر آہستہ آہستہ یہ مالی طور پہ مستحکم ہونے لگے۔ بہت سے صاحب ثروت لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی زمینیں اور جائیدادیں ان کے نام کر دیں اگرچہ غریب ہونا ان کے منشور میں شامل تھا لیکن یہ خود مالی لحاظ سے غریب نہ رہے۔ لوگ ان کے ساتھ اس لیے شامل ہوتے کیونکہ ان کا پروپیگنڈہ

بہت زبردست تھا یعنی مسلمانوں کے قبضے سے اپنا مقدس شہر آزاد کروانا ہے۔ یہ لوگ جب جنگ کے لیے نکلتے تو یورپ کے سارے شہروں میں ان کے گھڑ سوار پھرتے اور نعرے لگاتے:

ہم دین بچانے نکلے ہیں

آؤ ہمارا ساتھ دو

جس کی جتنی توفیق ہوتی وہ ان گھڑ سواروں کی اپنی حیثیت کے مطابق مدد کرتا۔ جنگ کے ساتھ ساتھ انہوں نے معاشی طور پہ خود کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۱۵۰ء میں ہنڈی کے نظام کا آغاز کیا۔ یعنی کسی کو انگلینڈ میں رقم کی ضرورت ہے اور وہ اپنے بندے کو اٹلی یا فرانس پیغام بھیجتا۔ وہ ان لوگوں کی مہر دکھا کے رقم وصول کر لیا کرتا۔ یہ اس دور کا لیٹر آف کریڈٹ تھا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں پہلے بینک سسٹم کا آغاز انہوں نے کیا۔''

''لیکن آغا جی یہ اگر اتنے مضبوط تھے تو انہوں نے پوری دنیا پہ قبضہ کیوں نہیں کر لیا؟''

''ان کا منشور تھا بیت المقدس کو آزاد کروانا لیکن یہ دوسرے کاموں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ پیسے کے لالچ میں پڑ گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں بیت مقدس پہ قبضہ کر لیا لیکن صلیبی جنگوں کے دوران ۱۲۲۹ء میں عیسائیوں نے یروشلم دوبارہ فتح کر لیا اور اس میں ٹیمپلر نائٹس نے ان کی خاطر خواہ مدد کی۔ عیسائیوں کو یہ فتح زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوئی خوارزمی ترکوں نے ۱۲۴۴ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ عیسائیوں کا یہ مقدس شہر ۱۹۱۷ء تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا اس کے بعد خلافت عثمانیہ کو شکست دے انگریزوں نے یہ مقدس شہر اپنے قبضے میں کر لیا۔''

''ان کا زوال؟''

میں اسی طرح آ رہا ہوں۔ جب ان کا ہیڈ کوارٹر بیت المقدس سے ختم ہوا تو انہوں نے مشرق وسطیٰ کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہیڈ کوارٹرز منتقل کر لیے لیکن انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ میں ان کے قدم مضبوط تھے۔ انہوں نے یورپین ملکوں کے بادشاہوں کو قرض دینا شروع کر دیا۔ فرانس کے بادشاہ نے انگلینڈ سے جنگ کرنے کے لیے ان سے بہت زیادہ قرضہ لیا۔ اس کے علاوہ روم کا پوپ بھی ان سے بہت تنگ تھا۔ ان دونوں نے مل کے ان کے قرض نہ چکانے کے لیے ایک ترکیب سوچی اور وہ اس میں کامیاب رہے کیونکہ ٹیمپلر نائٹس اپنی نیک نامی کھو رہے تھے۔ یہ بے شمار معاشرتی برائیوں کا شکار ہو گئے تھے گو کہ یہ مالی اور عسکری لحاظ سے بہت

زیادہ طاقتور تھے لیکن برائیوں نے ان کو کمزور کر دیا۔ اس طرح ۱۳ اکتوبر جمعے کے دن ۱۳۰۷ء میں فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم نے جہاں جہاں بھی ٹیمپلر نائینس کے سرکردہ اراکین تھے ان کو حراست میں لینے کا حکم نامہ جاری کیا۔ اس کے بعد ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس طرح فرانس کا بادشاہ ان کے قرض سے بھی آزاد ہو گیا اور اس نے اپنے ہی تیار کردہ جہادی بھی ختم کر دیئے لیکن اس کے لیے اسے پوپ کی پشت پناہی حاصل تھی یعنی اس نے یہ کام اکیلے نہیں کیا۔ اس لیے آج تک یورپ میں تیرہ کا ہندسہ منحوس تصور کیا جاتا ہے، یورپ میں کسی بھی ہوٹل میں تیرہ نمبر کا کمرہ نہیں ہوتا۔''

''کہیں تم ٹیمپلر نائینس اور طالبان میں مماثلت کا نظریہ تو پیش نہیں کرنا چاہتے؟''

''میں تمہیں پہلے سوانا رولا کے بارے میں بتاؤں گا اس کے بعد گفتگو آگے بڑھے گی۔''

''ٹھیک ہے آغا جی۔''

''اس کا نام جیرولامو سوانارولا (Giralomo Savonarola) تھا۔ یہ ۲۱ ستمبر ۱۴۵۲ء میں اٹلی کے شہر فیرارا (Ferara) میں پیدا ہوا۔ سوانا رولا جس شہر میں پیدا ہوا، ان دنوں اٹلی کا یہ صوبہ ایمیلیا رومانیا (Emilia Romagnia) ایک آزاد ریاست تھی۔ سوانا رولا کا تعلق ایک امیر اور بارسوخ خاندان سے تھا۔ اس نے بچپن میں بائبل کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اس نے ارسطو اور تھامس ایکویناس (Thomsas Aquinos) کو پڑھا۔ بعد میں سوانا رولا نے فیرارا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں اس نے فنون لطیفہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ بیس سال کی عمر میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کا نام تھا ڈی رووینا منڈی (di rovena mundi) یعنی دنیا کا زوال۔ جب اس نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا ڈی رووینا ایکلیسیا (di rovena eclesia) یعنی چرچ کا زوال تو رومن چرچ نے اس پر کیس کر دیا۔

آخرکار سوانا رولا اپنے خیالات کی وجہ سے عیسائیوں کے مذہبی سلسلے ڈومینیکن (dominican) میں شامل ہو گیا۔ ان دنوں فرانچسکن (franceescan)، آگسٹینین (augustinian) اور ڈومینیکین (dominnican) سلسلے تھے اس سلسلے میں منسلک ہونے کے بعد سوانا رولا بلونیا (Bolonia) کی مونیسٹری آف دومینیکو (monestary of domenico) میں داخل ہو گیا۔ اس نے چار سال تک مذہب کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہاں سے اس کو سانتا ماریا دل آنجلی (Santa Maria del Angeli) بھیج دیا گیا اس کے بعد اسے مزید تبلیغ کے لیے فلورنس بھیج دیا

گیا۔ سوانا رولا فلورنس میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد بلونیا واپس چلا گیا، جب سوانا رولا دوسری بار فلورنس آیا تو پھر اسے تھوڑی سی شہرت ملی۔ ان دنوں فرانس اور اٹلی کی جنگ شروع ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک متعدی بیماری بھی پھیل گئی۔ ان دو باتوں کی وجہ سے اس وقت فلورنس کے بادشاہ میڈشی (Medici) کی حکومت پہ گرفت کمزور ہوگئی۔ اس دوران سوانا رولا نے شہرت حاصل کرنی شروع کردی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ جب سوانا رولا لوگوں کو لیکچر دے رہا ہوتا تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ فلورنس میں اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے پیغمبر سمجھنے لگے۔ اس کے پیروکاروں میں فلورنس کا بادشاہ لورینزو دی میڈشی (Lorenzo di Medici) بھی شامل تھا۔

۱۴۹۴ء میں فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے فلورنس کے بادشاہ کو شکست دی اور اس طرح سوانا رولا فلورنس کا مذہبی اور سیاسی لیڈر بن کے اُبھرا۔ اس نے سب سے پہلے ہم جنس پرستی پہ پابندی لگائی جو کہ ان دنوں فلورنس میں عام تھی۔ میلان کے ڈیوک اور پوپ نے اس کی مخالفت کی لیکن اس نے ان کی بات پہ کان نہ دھرے۔ ۱۴۹۷ء میں اس نے پیاتزا دلا سینیوریا (Piatzza della Signoria) میں ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ تیار کیا اور اس الاؤ میں فلورنس شہر کی بہت ہی تاریخی اور بیش قیمت اشیاء جلا دیں۔ جس میں مصوری کے نادر نمونے، قدیم و بیش قیمت زیورات، ہیرے جواہرات اور بائبل کے باتصویر نسخے شامل تھے۔ اس کے علاوہ اٹلی کے مشہور پینٹر ساندرو بوتیچیلی (Sandro Botticelli) نے خود اپنی تصاویر اس آگ میں جلا دیں کیونکہ اس پہ بھی سوانا رولا کا خوف طاری ہوگیا تھا۔ اس سارے منظر کو اٹلی کے مشہور پینٹر مائیکل انجلو (michel angelo) نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کے خلاف کوئی بولے۔ سوانا رولا نے بارہ سے چودہ سال کے بچوں کو تربیت دینی شروع کی اور یہ چھوٹے چھوٹے بچے لوگوں کے گھروں میں جاتے اور ان سے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی درخواست کرتے اور انکار کی صورت میں انہیں سوانا رولا کی دشمنی مول لینی پڑتی۔ اسے فرانس کے بادشاہ کی آشیر باد حاصل تھی کیونکہ فرانس کا بادشاہ جب بھی اٹلی پہ حملہ آور ہوتا اُسے کوئی روکنے والا نہ تھا سوائے میڈشی بادشاہوں کے اس طرح فرانس کے بادشاہ نے میڈشی بادشاہوں کے مسئلہ کا حل سوانا رولا کے ذریعے تلاش کیا اور اس کی سرپرستی کی۔

سوانا رولا جب اپنے قدم مضبوطی سے جما چکا تو اس کے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ اب

اُسے پاپائے روم کے ادارے کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس نے اپنی تقاریر میں یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ میں خدا سے بات کرتا ہوں، دوسرے لفظوں میں اس نے خود کو پیغمبر کہنا شروع کر دیا۔ فرانس کے بادشاہ کا مقصد پورا ہو چکا تھا اب اس کے لیے سوا نارولا جیسے جنونی کو ہٹانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فلورنس کے شہری بھی اس سے تنگ آ چکے تھے۔ اس کو فرانچسکن آرڈر کے لوگوں نے زندہ آگ میں کودنے کا چیلنج بھی کر دیا۔ انہوں نے کہا اگر تم واقعی ہی خدا سے بات کرتے ہو اور خدا کے پیغمبر ہو تو وہ تمہیں بچالے گا، اس طرح جس طرح حضرت ابراہیم کو خدا نے جلتی ہوئی آگ میں زندہ رکھا تھا۔ سوا نارولا نے انکار کر دیا، پھر لوگوں نے اس کی تعلیمات پہ عمل کرنا چھوڑ دیا۔ آخر کار، Pope Alexander VI کے کہنے پر سوا نارولا کو پکڑ لیا گیا اور ۲۳ مئی ۱۴۹۸ء میں جیرولا موسوا نارولا اور اس کے دو بہترین ساتھیوں Fra Domenico da Pescia اور Fra Silvestro کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان کو بری طرح مارا پیٹا گیا۔ ان تینوں کو اسی پیئزا ڈیلا سینیوریہ (Piazza della Signoraia) لایا گیا جہاں اس نے سونا چاندی، ہیرے جواہرات، نوادرات، کتابیں، تصاویر والی بانجلہ جلائی تھیں۔ اُسے وہاں لا کر باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد فلورنس کے شہریوں کے سامنے ان تینوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ یہ منظر نہ صرف شہریوں نے دیکھا بلکہ اس دور کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے بھی دیکھا۔ جس میں اس دور کا مشہور ماہر سیاسیات نکولو میکاولی (Nicolo Machiavelli) بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ جاکوبو ناردی (Giacomo Bonardi) اور لوکا لاندوچی (Luca Landucci) بھی وہاں موجود تھے۔ لوکا لاندوچی نے تو یہاں تک لکھا کہ جو شخص مجھے جلانا چاہتا تھا وہ خود آج شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور اسے بچانے والا کوئی نہیں۔ جب یہ تینوں جل کے راکھ ہو گئے تو ان کی راکھ فلورنس شہر سے گزرنے والے دریا آرنو (arno) میں ڈال دی گئی۔"

"اب ان کی مماثلت کے بارے میں بتائیں کچھ کچھ مجھے ان کی تاریخ سے اشارات مل گئے ہیں لیکن میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں یہ تو پتا ہوگا کہ روسی فوجیں افغانستان میں کب داخل ہوئیں۔"

"۱۹۷۷ء میں۔"

"لیکن تمہیں یہ نہیں پتا ہوگا کہ روسی فوجوں کو افغانستان میں آنے کی دعوت کس نے دی تھی۔"

"ظاہر ہے انہوں نے خود حملہ کیا تھا۔"

''نہیں، افغانستان کے چند سیاسی رہنماؤں نے خود روس کو دعوت دی تھی کہ ہمیں اقتدار میں لانے کے لیے ہماری مدد کریں۔ انہوں نے اپنی مدد بھیج دی۔ حفیظ اللہ امین تو ان کے اشارے پہ چلتا رہا لیکن اس نے اندر ہی اندر امریکہ سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے۔ اس طرح روسی فوجیں ۱۹۷۷ء میں افغانستان میں داخل ہوئیں۔ حالانکہ آندرے گرومیکو (Andre Gromico) نے اس بات کی مخالفت کی تھی۔ اس دوران امریکہ اپنے مہرے تمام ملکوں میں بٹھا چکا تھا۔ پاکستان میں ضیاء الحق، ایران میں آیۃ اللہ خمینی، سعودی عرب میں شاہ خالد۔ اب اس کوان مہروں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا تھا۔ جیسے فرانس کے بادشاہ نے ٹمپلر نائینس کی پشت پناہی کی۔ سوانا رولا کی پشت پناہی کی۔ ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جب مقصد پورا ہو گیا تو ان کو ختم کرنے لیے سب لوگوں کو ساتھ ملا کے ان کو ختم کر دیا۔ خس کم جہاں پاک ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک مجاہدین روسیوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ روسیوں نے پورے ملک میں اتنی بارودی سرنگیں بچھائیں کہ وہاں آئندہ کئی دہائیوں تک فصلیں نہیں آئیں گی۔ اس پہ امریکہ کے فوجیوں کی بمباری۔ وہ کیا کہتے ہیں آگے کھڈا پیچھے کھائی۔ ہائے دہائی ہائے دہائی۔ ایک ملک جس نے پچیس سال جنگ میں گزار دیئے۔ اس عرصے میں ایک نسل جوان ہو جاتی ہے۔ جب روسی چلے گئے تو امریکہ سوچنے لگا ان جہادیوں کا کیا کریں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہیں کس طرح تیار کیا گیا تھا۔ ان کو ختم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ چاہیے تھی۔ یہ ٹمپلر نائینس اور سوانا رولا کا دور تو ہے نہیں کہ ایک ہی دن میں فیصلہ کیا اور قصہ تمام۔۔۔ چونکہ آج کے عوام الناس کی سطح شعور ماضی سے کہیں زیادہ بلند ہو چکی ہے۔ اس کے لیے انھیں عوام الناس کی حمایت جیتنے کے لیے بہت مضبوط پروپیگنڈا مشینری چاہیے تھی جس کا استعمال کیا گیا۔ تم نے وڈیو کریسی کا نام سنا ہوگا۔''

میں نے کہا ''ہاں کچھ اس طرح کی بات سنی تو ہے۔''

''انسانی ذہن پہ audio visual کا بہت جلد اور گہرا اثر ہوتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر نے جب بہت سی جگہوں پہ نئے نئے محاذ کھول لیے تو اس کے لیے اس صورتِ حال سے نمٹنا مشکل ہو گیا۔ اس نے کچھ جگہوں پہ یہ حربی حکمتِ عملی اپنائی کہ جنگ کے میدانوں میں گاڑیوں کے ٹائروں کے بہت زیادہ نشان چھوڑ دیتا۔ جب مخالف افواج وہاں پہنچتیں تو وہ ٹائروں کے نشان دیکھ کر سوچتیں کہ ہٹلر کے فوجی دستوں کی تعداد ان کی توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی کسی حد

تک کامیاب رہی۔ اس طرح اس نے مختلف محاذوں پر اپنی نفری کی کمی کو کامیابی سے کیموفلاج کرلیا۔ اس نے جنگ عظیم شروع کرنے سے پہلے بہت ساری جنگوں کے بارے میں پڑھا۔ اسے جنگ بدر کے بارے میں پڑھ کے بڑی حیرت ہوئی کہ تین سو تیرہ صحابہ نے ہزاروں کی تعداد والے لشکر کو شکست فاش دی۔ اس میں کمک اور تازہ دم فوج کا ذکر تھا۔ اس نے اس کلیئے پہ عمل کیا لیکن پوری دنیا کو فتح کرنے کا جنون اس کو لے ڈوبا۔ خیر تو بات ہو رہی تھی وڈیو ریکی کی۔ ہم کئی دفعہ فلم دیکھتے ہیں اور حقائق جانے بنا ہی اس پہ یقین کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ جیسے ہی ٹی وی پہ کوئی چیز دیکھتے ہیں اس کا مطلب ہم وہی لیتے ہیں جو ہمیں دکھایا جاتا ہے۔ لوگوں نے جیسے ہی ٹوِن ٹاورز کے ساتھ جہازوں کو ٹکراتے ہوئے دیکھا لوگ بہت حیران ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی سلائیڈ چلا دی کہ اس میں مسلم انتہا پسندوں کا ہاتھ ہے۔ پوری دنیا ایک ہی دن میں دنیا کے تمام مسلمانوں کے خلاف ہوگئی۔ جیسے فرانس کے بادشاہ نے ۱۳ اکتوبر کو سب کو خط لکھ دیا اور جہاں جہاں بھی ٹیمپلر نائٹس کے سرکردہ رکن تھے ان کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور بعد میں کچھ کو زندہ جلا دیا بعض کو ساری زندگی قید خانوں میں گزارنی پڑی۔ تم خود سوچو اگر پاکستانی میں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آئے تو تم لوگوں کا پہلا شبہ کس پہ ہوگا۔''

میں نے کہا ''ظاہر ہے انڈیا پہ اور ان کا شک ہم پہ۔''

''حالانکہ ایک مسلمان کو بنا تحقیق کے کسی بات پہ یقین نہیں کرنا چاہیے۔''

''یہ درست ہے۔''

''میں تمہیں فلموں کے حوالے دیتا ہوں۔ تم نے بن حر فلم کا نام تو سنا ہوگا شاید دیکھی بھی ہو۔''

''نام بہت سنا ہے کئی دفعہ دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا لیکن پوری نہ دیکھ سکا۔''

''میں نے دیکھی ہے اور کئی دفعہ دیکھی ہے۔ اس کے ڈائریکٹر نے اس فلم کے لیے ایک چیلنج رکھا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ کوئی بھی شخص اگر اس فلم میں کسی غلطی یا نقص کی نشاندہی کرے گا تو میں اسے بھاری رقم انعام میں دوں گا۔ بہت سے لوگوں نے بہت بے سروپا نقص نکالے جو اس نے رد کر دیے۔ آخر کار ایک شخص نے اسے حیران کر دیا۔ اس فلم میں پرانا دور دکھایا گیا اور اس فلم کی شوٹنگ اٹلی کے شہر روم میں کی گئی اس کے بہت سارے سین کلوسیم میں بھی فلمائے گئے۔ اس دور میں گاڑیاں تو ہوتی نہیں تھی۔ فلم ساز شوٹنگ کے دوران گاڑیاں بھی استعمال کرتا تھا کئی قسم کی ٹرالیاں بھی استعمال کرتا

تھا جو کیمرے اور سامان کو اِدھر اُدھر لانے لیجانے میں کام آتی تھیں۔ جس شخص نے انعام جیتا اس نے یہی نقص بتایا کہ کلوسیم کے محیط میں ٹائروں کے نشان دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی لاکھوں لوگوں نے یہ فلم دیکھی اس میں جو پرانا دور دکھایا گیا اس کو وہی سمجھا لیکن کسی کو گاڑیوں کے ٹائر نظر نہ آئے۔"

"واہ لوگ فلم اتنے غور سے دیکھتے ہیں۔"

"تم نے "ٹائی ٹینک" دیکھی ہے۔"

"ہاں کئی بار دیکھی ہے۔"

"اس میں کیا غلطی ہے۔"

"کوئی نہیں۔"

"اس فلم میں فلم کا ہیرو جیک پینٹر دکھایا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں فرانس کے مشہور پینٹر پال سیزان (Paul Cezane) کی پینٹنگ ہوتی ہے۔ تمہیں پتا ہے جب ٹائی ٹینک غرق ہوا تھا تو اس وقت تک پال سیزان نے وہ پینٹنگ نہیں بنائی تھی جو اس کے ہاتھ میں دکھائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے وہ پینٹنگ اس جہاز کے ڈوبنے کے چند سال بعد بنائی تھی۔ یعنی ہم فلم کے ذریعے لوگوں کو غلط معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کا اعتماد جیت لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دنیا کے سارے ٹی وی پوری دنیا کو وہی دکھاتے رہے جو وہ دکھانا چاہتے تھے لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس معاملے کی تحقیق کرنی چاہیے۔ آیا ایسا ممکن بھی ہے کہ اس طرح کوئی جہاز ٹکرائے اور کوئی مضبوط ترین عمارت یوں منہدم ہو جائے۔ اس لیے جب امریکی فوجی افغانستان میں داخل ہوئے تو ایک دن وہ طالبان کے مظالم دکھاتے اور پوری دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ ہم ان درندوں کا خاتمہ کرنے آئے ہیں اور دوسرے دن وہ اسی جگہ فٹ بال کا میچ دکھاتے کہ دیکھو ہم نے آ کے لوگوں کو تحفظ فراہم کیا ہے اب یہ سکون سے فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔"

"اس میں تو ہماری غلطی ہے کہ ہم اس طرح کی وڈیو پہ یقین کر لیتے ہیں۔"

"ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہندکو کہاوت ہے "جس نے کہار داخیں اس نے کھلے وی سیاخیں" یعنی جس کے گھر دانے (اناج) اس کے کملے بھی سیانے۔"

"ویسے آپ کے خیال میں ہم لوگ دہشت گرد نہیں تو کون ہے دہشت گرد؟"

''اس وقت دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد امریکہ خود ہے۔ وہ ایک ویڈیو دکھا کے پوری دنیا کو کہتا ہے کہ چلو میرے ساتھ ان کو ختم کرتے ہیں۔ جہاں کھانے کو نہیں، جن کے پاس ہتھیار نہیں، پہننے کو کپڑے نہیں ان پہ جدید اسلحے سے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ انگلینڈ، جرمنی، فرانس اور اٹلی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ فرانس یورپ کا ایک واحد ملک ہے جس نے کئی دفعہ امریکہ کا ساتھ دینے سے انکار کیا ہے ورنہ کوئی بھی انکار کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے میڈیا کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔''

''کوئی بھی راسخ العقیدہ مسلمان، عیسائی، یہودی حتیٰ کہ کوئی بھی انسان دہشت گرد نہیں ہوسکتا۔ اب قرآن کی ہی مثال لے لو، جس کی تعلیم ہے کہ جس نے ایک انسان کی جان لی اس نے ساری انسانیت کی جان لی۔''

''لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ٹیمپلر نائینس اور سواتا رولا کا گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء سے کیا تعلق ہے؟''

رضا ذرا ناراضگی سے بولا ''میں سمجھا تھا کہ پاکستانی تھوڑے ذہین ہوتے ہیں لیکن تم اس معاملے میں بالکل کورے ہو۔ جو لوگ پالیسیاں بناتے ہیں۔ جنگی حکمت عملیاں تیار کرتے ہیں وہ تاریخ کا بہت گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پرانے دور میں انسانوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا آسان تھا لیکن آج کل بہت مشکل ہے۔ اس لیے جنگی حکمت عملی کے ماہر قدیم ماخذات علمی کو مدنظر رکھتے ہیں اور اگر انھیں قابل عمل پائیں تو ان کو زیر عمل بھی لاتے ہیں، جیسے سواتا رولا چھوٹی عمر کے بچوں سے کام لیتا تھا کیونکہ یہ عمر تصور و خیال کی عمر ہوتی ہے۔ ٹیمپلر نائینس نے مذہبی جنونیت کو استعمال کیا۔ ہمارے ہاں جہاد کے نظریے کی اپنی مرضی کے مطابق تشریح کر کے لوگوں کو استعمال کیا گیا۔''

میں نے کہا ''میں کچھ کچھ سمجھا ہوں لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔''

رضا بولا ''ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ایک اور جگہ جانا ہے اور ہاں ایک بات یاد رکھنا کل انٹرویو کے دوران بہت سوچ سمجھ کے بولنا۔''

میں نے کہا ''آپ فکر نہ کریں۔ ویسے رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا!''

رضا نے مجھ سے اجازت لی اور چلا گیا۔ میرے دماغ میں کھد بد ہونے لگی کہ نائن الیون

کی اصل کہانی کیا ہے۔ میں ابھی تک مخمصے میں پھنسا ہوا تھا۔

OOO

میں صبح اُٹھا ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو میں نے اپنی فرنچ کٹ داڑھی میں ایک سفید بال دیکھا۔ میں سوچنے لگا میری عمر ابھی تیس سال ہے اور میری داڑھی سفید ہو چلی ہے۔ میں نے شیو کی اور موچنے سے وہ سفید بال نکال دیا۔ اب میں بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔

میں ٹھیک وقت پہ کیفے ساتر پہنچ گیا۔ وہاں پیٹر پہلے سے موجود تھا۔ اس کا فوٹو گرافر بھی ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہیں جرمن میں سلام کیا اور ہاتھ بھی ملایا۔ ہم دونوں کیفے ساتر کے باہر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پیٹر نے مجھ سے پوچھا "کیا پیو گے۔"

میں نے کہا "میں تو کیپوچینو پیوں گا اور تم لوگ۔"

وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے: "ہم بھی کیپوچینو پئیں گے۔"

پھر پیٹر بولا "تم ساتھ کچھ کھاؤ گے؟"

میں نے کہا "نہیں میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔" اس کے بعد فوٹو گرافر نے میری تین چار تصاویر بنائیں۔ پھر انٹرویو شروع ہوا۔ اس نے میز پہ ٹیپ ریکارڈر بھی رکھ دیا اور کاغذ قلم بھی نکال لیا۔ وہ مجھ سے انگریزی میں سوال کرتا جاتا اور میں اس کو جواب دیتا جاتا۔ اس نے ازیل ہائم کے بارے میں سوال کیے۔ اس کے بعد پاکستانی سیاست پہ بات کی۔ اس نے ۱۱ ستمبر کے بارے میں بھی پوچھا لیکن میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ میں س بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں علم و ادب سے تعلق رکھتا ہوں۔ بین الاقوامی سیاست کے بارے میں میرا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس نے مجھ سے میرا پسندیدہ پینٹر پوچھا۔ میں نے بتا دیا کہ مجھے ونسنٹ وین گوگ (Vincent Gogh) پسند ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی بیسیوں سوال کیے ہوں گے۔ اس دوران کیپوچینو آ گئی۔ ہم لوگوں نے جب کیپوچینو ختم کی تو پیٹر کہنے لگا پیسے میں دوں گا۔ میں نے دل میں سوچا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ پیٹر نے مجھے بتایا کہ میں جو بھی لکھوں گا تمہیں ای میل کر دوں گا۔ انگریزی میں بھی اور جرمن میں بھی۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے لیکن یہ کب چھپے گا۔ اس نے کہا کل یا پرسوں کے اخبار میں۔ بعد ازاں اس نے مجھ سے اجازت لی۔ میں خوش خوش دمنز تصور کی گلیوں میں پھرتا رہا۔ نہ جم جانے کو دل چاہ رہا تھا نہ ہی لائبریری، اس لیے ازیل ہائم واپس آ گیا۔ جیسے ہی ازیل ہائم پہنچا تو انتیا کو شور کرتے

ہوئے دیکھا۔ اس کے شور شرابے نے مجھے اپنے نشانے پر لیا تو میں نے کہا" کیا بات ہے آرام سے بات کرو۔"

کہنے لگی" میں تمہیں کافی دیر سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ تم جب تک اس ازیل بائم میں رہو گے تمہارا ڈاکٹر اسی علاقے کا ہوگا۔ کچھ بھی ہو تمہیں علاج کے لیے اسی کے پاس جانا ہوگا۔"

میں نے کہا" تو اس میں چلانے کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ بولی" کیونکہ میں سب کو بتا چکی ہوں۔ تمہیں بتا کے میرا کام ختم ہو جائے گا اور میں گھر چلی جاؤں گی۔ شیفرا اور شنائیڈر جب کوئی کام سوچتے ہیں تو اس کے بارے میں مجھ سے جواب طلبی بھی کرتے ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا۔ اس میں ڈاکٹر کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور اس کے کلینک کا نقشہ بھی بنا ہوا تھا۔ کون سی بس جاتی تھی وہ بھی لکھا ہوا تھا۔

میں نے کہا" مجھے کوئی بیماری نہیں بس میری کمر میں درد رہتا ہے کیا میں کل اسے چیک کروا سکتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی" کل جو بھی ڈیوٹی پہ ہو اس سے کہنا تمہارے لیے اپوئنٹمنٹ لے لے۔"

میں نے کہا" ٹھیک ہے۔"

میرے پیچھے گلبدین کھڑا تھا کہنے لگا" میرا کاغذ بھی دیکھ لو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا معاملہ ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور انیتا سے کہا" اس کا بھی مسئلہ حل کر دو۔"

انیتا کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگی" میں کتنی دیر سے اس کے ساتھ مغز ماری کر رہی ہوں لیکن اس کو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ ونٹر تھور شہر میں بڑا ہسپتال ہے۔ وہاں اس کی آنکھوں کا چیک اپ ہے۔"

میں نے کہا" انیتا اب تم جا سکتی ہو۔"

اس نے زور سے پیر پٹخا اور چلی گئی۔

میں نے گلبدین کو سمجھایا کہ اس طرح تمہاری آنکھ کا چیک اپ ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔ کہنے لگا" اس کا مطلب ہے میرا آپریشن ہوگا۔ میری آنکھ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا" آپریشن بعد کی بات ہے، پہلے وہ معائنہ کریں گے اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔"

گلبدین بہت خوش تھا۔ کہنے لگا" میں زیورخ سے تمہارے لیے کھانا لایا ہوں۔ فریج میں پڑا ہوا ہے۔ گرم کر کے کھالو۔"

میں نے کہا" اور تم۔"

وہ بولا" میں بیئر پیؤں گا بہت گرمی ہے۔"

میں نے کہا" جیسے تمہاری مرضی۔"

میں نے فریج سے کھانا نکالا۔ ایلومنیم کی چھوٹی چھوٹی دو پلیٹوں میں کچھ کھانے کو پڑا ہوا تھا۔ میں نے مائیکروویو میں گرم کیا۔ ساتھ تین چپا بریڈ گرم کیں۔ ایک پلیٹ میں مرغی کا سالن تھا اور دوسری میں دال تھی۔ میں کھانا کھاتے ہوئے گلبدین کو دعائیں دینے لگا کہ میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ ہی منفی انداز میں سوچتا ہوں۔ بیچارہ زیورخ سے میرے لیے کھانا لایا ہے۔ ایسا تردد کسی معمولی شناسا کے لیے کون کرتا ہے، جب میں کھانا کھا چکا تو گلبدین بولا" جب میں ہسپتال جاؤں گا تو میرے ساتھ جانا۔"

میں نے کہا" کل تو میں خود ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔"

وہ کہنے لگا" اور مجھے پرسوں جانا ہے۔"

میں نے کہا" ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔"

کھانا کھا کے میں اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اٹھارہ بستر اوپر نیچے لگے ہوئے تھے۔ میں صبح دیر تک باہر گھومتا پھرتا رہا تھا۔ اس لیے تھکن محسوس ہو رہی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ میں جیسے ہی لیٹا، مجھے کسی انگریزی گانے کی آواز سنائی دی۔ آواز بہت اُونچی تھی۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ شاکیرہ (Shakira) کا گانا لگا ہوا ہے۔ جس میں اس کو ڈانس کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور پیچھے گھوڑے بھاگ رہے ہیں۔ when ever, when ever میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہال میں آ گیا۔ وہاں ایک بنگالی جسے آئے ہوئے ابھی چند دن ہوئے تھے اس گانے پہ عجیب وغریب ڈانس کر رہا تھا اور حاضرین اسے دیکھ دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ میں بھی اس کا ڈانس دیکھ کے محظوظ ہونے لگا۔ پھر وہ بنگالی آیا جو میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا اس نے ٹیپ ریکارڈر بند

کر دیا اور اسے بنگلہ زبان میں کہا کہ تم اپنا ناچ بند کرو۔ ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ دونوں میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔

○○○

صبح سب کو خیرات ملی تھی۔ جمعرات کو ازیل ہائم کے ہال میں ایسے ایسے چہرے دیکھنے کو ملتے جو آپ کو پورا ہفتہ نظر نہ آتے۔ ان میں سے کئی ایک تو کام پہ جاتے تھے اور ان کو ان پینتالیس سوئس فرانک کی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن حاضری ضروری تھی اس لیے جمعرات کو کام پہ جاتے اور حاضری ضرور لگاتے۔ شیفر اور شنائیڈر نے اسی طرح لیکچر دیا۔ چوری سے منع کیا، ڈرگز بیچنے سے منع کیا۔ آس پاس کے لوگوں کی شکایت کا ذکر کیا۔ اس کے بعد جس جس کو جو جو زبان آتی تھی دوسروں کو بیان کرنے کا کہا۔ سارے مراحل سے گزرنے کے بعد سب کو پینتالیس سوئس فرانک کا ٹوکن دیا گیا جو مارکیٹ گاز ستراز ے میں پائے جانے والے بینک سے کیش ہوتا تھا۔ اس کے بعد محفل حسب معمول برخاست کر دی گئی۔

میں نے شیفر سے کہا "آج میری ڈاکٹر کے پاس اپائنٹمنٹ ہے۔ تم کچھ بتا سکتے ہو کہ اس وقت وہ ہو گا کہ نہیں۔" یہ کہہ کے میں نے اس کے ہاتھ میں وہ خاکی لفافہ تھما دیا جو مجھے انیتا نے دیا تھا۔

اس نے اس سے کاغذ نکال کے پڑھا۔ ڈاکٹر کا نام پڑھا۔ اس کے بعد اس کو فون کیا۔ فون پہ میری اپائنٹمنٹ لی۔ مجھے کہنے لگا "ڈاکٹر موجود ہے۔ ابھی گیارہ بجے ہیں وہ ایک بجے تک بیٹھتا ہے۔ تم ابھی چلے جاؤ۔ میں نے اس کو تمہارا نام لکھوا دیا ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ باہر نکلنے لگا تو گلبدین نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا "میرے ساتھ بھی جانا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے کل ونٹر تھور کے بڑے ہسپتال جانا ہے۔"

وہ کہنے لگا "اگر آج ہسپتال دیکھ آتے تو؟"

میں تھوڑا سا چڑ گیا اور تلخی سے بولا "ہسپتال کل کو کہیں گم ہو جائے گا کیا؟" یہ کہہ کے میں چل دیا۔ سیدھا بس سٹاپ پہ پہنچا۔ بس میں سوار ہوا اور بس ڈرائیور کو نقشہ دکھایا جہاں مجھے اترنا تھا۔ اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا فکر نہ کرو جب تمہارا سٹاپ آئے گا تو میں تمہیں بتا دوں گا۔ اندستری کے سٹاپ پہ رکی۔ ڈرئیوار نے آواز لگائی اور میں اتر گیا۔ میں نے نقشہ راستے میں گزرتے ہوئے ایک

شخص کو دکھایا تو کہنے لگا۔ سڑک کے اس طرف چلتے چلے جاؤ۔ آخر میں ایک ریسٹورنٹ آئے گا۔ اس ریسٹورنٹ کے ساتھ ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ میں جہاں اُترا تھا وہاں ایک طرف تو رضا کی ازیل ہائم سامنے نظر آ رہی تھی اور مجھے دوسری طرف جانا تھا۔ میں اس سڑک پہ ہولیا جس طرف ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ سڑک کے آخری سرے پہ ایک ریسٹورنٹ تھا۔ اس میں کچھ کرسیاں باہر رکھی ہوئی تھیں اور کچھ اندر کمرے میں۔ میں ریسٹورنٹ کی باہر لگی ہوئی کرسیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ڈاکٹر کے کلینک کے پاس پہنچ گیا۔ ساختی اعتبار سے یہ ایک گھر تھا جس کو کلینک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو ایک طرف ویٹنگ روم تھا۔ جہاں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہاں تین چار رسالے پڑے ہوئے تھے۔ میں ان رنگ برنگے رسائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک سفید کوٹ والی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ کہنے لگی: "تم میں سبزواری فرشتہ کون ہے۔" یورپین ملکوں میں خاندان کا نام پہلے بلاتے ہیں اس لیے جب مجھے کوئی سبزواری کہہ کے بلاتا تو مجھے اکثر ایسے لگتا جیسے کسی اور کو بلایا جا رہا ہے کیونکہ میرے کان سبزواری سننے کے عادی نہیں تھے بلکہ فرشتہ سننے کی عادت تھی اور میں اپنے اسی نام کی سماعت کا عادی تھا۔ خیر میں نے اسے کہا "میں ہوں سبزواری فرشتہ۔"

کہنے لگی "تمہارا تیسرا نمبر ہے۔" پھر اپنے ساتھ ایک مریضہ کو لے کر چلی گئی۔ میں ویٹنگ روم میں بنی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کھڑکی سے دور دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کلینک کے ساتھ یا بہت قریب بچوں کا کوئی سکول تھا۔ میں بیوقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے جرمن زبان نہیں آتی تھی اس لیے یہاں بیٹھی ہوئی واحد عورت سے میں کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ چپ بیٹھا رہا۔ کبھی رسالہ دیکھتا، کبھی کھڑکی سے باہر دیکھتا۔ آخرکار وہ سفید کوٹ والی لڑکی آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں چھوڑ کے چلی گئی۔ میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کو انگریزی میں ہیلو کہا۔ اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ مجھے بیٹھنے کو کہا۔

پھر بولا "تمہارا نام سبزواری فرشتہ ہے اور تم پاکستان کے رہنے والے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔"

کہنے لگا "میرا نام ہوبرنگر ہے۔"

میں نے کمرے کا معائنہ کیا۔ کمرے کی دیواروں پہ اتنا کچھ لگا ہوا تھا جن کو بیان کرنے لگیں تو بہت سے صفحات کالے ہو جائیں۔ اس کی میز پہ ایک چیز کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھوں گا۔

میڈیکل انسٹرومنٹس کے علاوہ ایک کونے میں پتھر کا ایک چھوٹا سا مجسمہ پڑا ہوا تھا۔ مہاتما گوتم بدھ۔ میں اس کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر بوہر مجھ سے مخاطب ہوا" کیسے آنا ہوا؟"

میں نے کہا" ویسے تو مجھے کوئی بیماری نہیں لیکن ازیل ہائم والوں نے مجھے کہا ہے کہ تم میرے ڈاکٹر ہو۔ میں جب بھی بیمار ہوں مجھے تمہارے پاس آنا ہے۔ ہاں ایک مسئلہ ہے۔ میں جب سے سوئس آیا ہوں مجھے قبض کی شکایت ہے اور میری کمر میں بھی درد رہتا ہے۔"

اس نے سٹیتھوسکوپ اُٹھائی اور اس کی گول سی چیز میرے سینے پہ رکھی اس کے بعد میری کمر کی طرف رکھی۔ مجھے لمبی لمبی سانسیں لینے کو کہا۔ پھر اس نے میرے ناخن دیکھے، دانت دیکھے، آنکھوں کے پپوٹوں کو کھول کے دیکھا۔ پھر کہنے لگا منہ کھولو۔ جب میں نے منہ کھولا تو ایک لکڑی کی چھوٹی سی پٹی میرے تالو پہ رکھ کے اندر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا" تم کھاتے کیا ہو۔"

میں نے کہا" کھانا کھاتا ہوں۔"

" تم لوگ مصالحے وغیرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہو۔ اس کے علاوہ سبزیاں اور پھل کم کھاتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری باڈی میں کیلشیم کی کمی کی علامات پائی جارہی ہیں۔ تمہارے ناخنوں پہ سفید لائنیں ہیں اور تمہارے دانت بھی اس چیز کو ظاہر کرتے ہیں کہ تم میں کیلشیم کی کمی ہے۔ تم مرچیں کم کرو، پھل اور سبزیاں زیادہ کھایا کرو اس کے علاوہ بہت زیادہ پانی پیا کرو۔"

میں نے کہا" وہ ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں مصالحے بہت زیادہ استعمال کرتا ہوں؟"

کہنے لگا" میں پاکستان میں آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کے تحت گلگت اور ہنزہ میں کام کرتا رہا ہوں۔ یہ بدھا کا مجسمہ جسے تم غور سے دیکھ رہے تھے میں نے سوات سے ایک لڑکے سے لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا بارش ہوئی تو زمین سے نکلا ہے۔ مجھے پتا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن مجھے پسند آیا اور میں نے لے لیا۔ ویسے پاکستان سوئس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ وہاں کے پہاڑ دنیا کے سب سے خوبصورت پہاڑ ہیں۔"

میں بہت حیران ہوا۔ میں جب سے پاکستان سے نکلا تھا لوگوں سے یہی سنتا آیا تھا کہ پاکستانی دہشت گرد ہوتے ہیں، انتہا پسند ہوتے ہیں، وہاں پہ غربت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ پہلا یا شاید دوسرا شخص تھا جو میرے ملک کی تعریف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا" تمہیں اردو بھی آتی ہوگی۔"

کہنے لگا "مجھے شنا اور بروشسکی آتی ہے لیکن بہت تھوڑی۔"

میری حیرت میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ ان زبانوں کے نام پاکستان میں کوئی نہیں جانتا لیکن اس سوئس ڈاکٹر کو ان زبانوں کے نہ صرف نام یاد تھے بلکہ اس کو تھوڑی بہت بولنی بھی آتی تھیں۔ مجھے اس لیے پتا تھا کہ یہ وہاں کی مقامی زبانیں ہیں کیونکہ میں ٹورسٹ گائیڈ تھا ورنہ مجھے بھی ان زبانوں کے بارے میں کچھ علم نہ ہوتا۔ وہ کہنے لگا "اب تم نرس کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا مساج کرے گی۔ اگر کمر کا درد ٹھیک نہ ہوا تو تمہارا ایکسرے ہوگا یا سی ٹی سکیننگ ہوگی۔"

میں نے کہا "بہت شکریہ ڈاکٹر یوہر نگر۔"

وہ مجھے دیکھ کے مسکرا دیا اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ویٹنگ روم میں انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہی نرس جو مجھے پہلے بلانے آئی تھی اس نے مجھے ایک اور کمرے میں بھیج دیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں پہ میڈیکل سائنس سے متعلق سازو سامان پڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں خاص قسم کا بستر لگا تھا جس پہ سفید چادر بچھی تھی۔ میرے سامنے کالے کپڑوں میں ایک موٹی تازی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ کالے کپڑوں کی وجہ سے زیادہ گورا لگ رہا تھا۔ اس کے بازوؤں پہ رنگ برنگے ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا حلیہ عجیب سا لگا۔ اس نے مجھے اشارے سے لیٹنے کو کہا۔ میں نے جوتے اتارے اور بستر پہ لیٹ گیا۔ پھر اس نے مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا کہ ٹی شرٹ اتار دو اور جینز کو بھی تھوڑا نیچے کر دو تا کہ مجھے مساج کرنے میں آسانی ہو۔ میں نے اس کی ہدایت پہ عمل کیا۔ اس نے میری کمر پہ کوئی کریم لگائی اور مساج کرنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے کہنے لگی۔ ٹی شرٹ پہن لو۔ اگلے ہفتے پھر آنا۔ میں نے دل میں سوچا بیٹھے بٹھائے یہ کہاں مصیبت مول لے بیٹھا ہوں۔ میں نے اگلے ہفتے کی اپائنٹمنٹ جیب میں رکھی اور کلینک سے نکل آیا۔ میں جیسے ہی کلینک سے نکلا میرے موبائل سے ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے موبائل نکال کے دیکھا تو کسی کا ایس ایم ایس (شارٹ میسج سروس) تھا۔ میں نے میسج کھولا، پڑھا، پیٹر کا میسج تھا اس نے لکھا تھا کہ میں نے تمہارا انٹرویو تمہیں میل کر دیا ہے تم اسے پڑھ کے اوکے کرو گے تو کل کے اخبار میں چھپ جائے گا۔ میں نے سوچا یہاں سے سیدھا لائبریری جانا چاہیے۔ اندسٹری کے سٹاپ پہ پہنچا اور بس پہ بیٹھ کے لائبریری پہنچ گیا۔ لائبریری میں وقفہ ہونے والا تھا اس لیے لائبریری میں کام کرنے والی اٹینڈنٹ نے مجھے انٹرنیٹ پہ بیٹھنے کا ٹوکن نہ دیا۔ میں بہت سٹپٹایا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ جیب میں پیسے بھی نہیں

تھے کیونکہ میں نے بینک سے خیرات کی رقم ابھی نہیں لی تھی۔ میں لائبریری سے سیدھا بینک گیا۔ بینک بند ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں نے ٹوکن دے کے پیسے وصول کیے۔ وہی پینتالیس سوئس فرانک۔ چار دس دس کے نوٹ اور ایک پانچ سوئس فرانک کا سکہ جو بہت بھاری تھا۔ بینک سے نکلا تو سٹیشن کی طرف چل دیا۔ سٹیشن کے ساتھ ٹورسٹ انفارمیشن سینٹر تھا۔ میں نے سوچا ان سے پوچھتا ہوں کہ کوئی انٹرنیٹ سینٹر بتائیں۔ کاؤنٹر پہ ایک نوجوان اور ایک خوبرو حسینہ کھڑی تھی۔ میں نے جیسے ہی انگریزی میں پوچھا وہ بڑی خوش ہوئی۔ لگتا تھا نئی بھرتی ہوئی ہے۔ اس لیے بہت مسکرا کے پوچھا کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ کہنے لگی، وہاں کونے میں کمپیوٹر پڑا ہے۔ تم جتنی دیر چاہو استعمال کر سکتے ہو۔ لیکن اگر کوئی اور آ گیا تو تمہیں چھوڑنا پڑے گا کیونکہ یہ سیاحوں کی انفارمیشن کے لیے ہے۔"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں کونے میں پڑے ہوئے کمپیوٹر کی طرف لپکا۔ ہاٹ میل کھول کے اپنی میل دیکھی۔ اس میں پیٹر کی میل بھی تھی۔ میں نے جلدی سے پڑھی اور اس کو جواب میں او کے کر دیا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے میرے انٹرویو کا انگریزی ورژن مجھے بھیجا تھا اگر جرمن ہوتا تو مجھے کچھ سمجھ نہ آتی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اس لڑکی سے کہا "کیا میں ایک پرنٹ آؤٹ لے سکتا ہوں۔ یہ کمپیوٹر پرنٹر کے ساتھ کنکٹڈ ہے؟"

اس نے مسکرا کے جواب دیا "اگر زیادہ صفحے نہیں تو پرنٹ کی کمانڈ دے دو یہ کنکٹڈ ہے۔"

میں نے پرنٹ کی کمانڈ دی، ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر میں کوئی نہیں تھا صرف یہ خوبصورت لڑکی تھی میرے خیال میں عملے کے باقی لوگ کھانا کھانے گئے ہوئے تھے۔ کمرے میں پرنٹر کی آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس نے دو صفحے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ پھر پوچھنے لگی "یہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "کل کے اخبار ویر لانڈ بوتے میں دیکھ لینا۔"

میں لاگ آؤٹ (log out) ہوا اور اس لڑکی کا شکریہ ادا کر کے ٹورسٹ انفارمیشن سینٹر سے باہر نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں کچھ کھا لوں۔ بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے آج ہی کہا تھا کہ پھل استعمال کیا کرو۔ میں مارکیٹ گاز سٹراز ے پہ چلنے لگا۔ راستے میں میگروس سٹور تھا۔ یہاں سے سب کچھ ملتا تھا۔ میں نے سوچا یہاں سے سیب لیتا ہوں۔ پلاسٹک کی ٹرے میں چھ سیب تھے۔ کاؤنٹر پہ پیسے ادا کیے اور میگروس سے باہر آ گیا۔ میگروس کی پچھلی طرف بینچ لگے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھ

کے سیب کھانے لگا۔ ایک سیب کھایا دوسرا کھایا جب تیسرا کھانے لگا تو دانتوں میں درد شروع ہو گیا اور پیاس بھی لگنے لگی۔ میں نے پینے کے لیے کچھ نہیں خریدا تھا۔ میگروز میں دوبارہ جانا مناسب نہ سمجھا اور مارکیٹ گاز سٹراز ے پہ چلنا شروع کر دیا۔ سڑک پار کر کے میں دوسری طرف ہو لیا۔ اس جگہ کا نام گرابن (graben) تھا۔ یہاں مجھے ایک سٹور نظر آیا۔ اس نام کا سٹور اریزو میں بھی تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ اس کو ہاتھ میں پکڑا ہوا تھیلا دکھایا، کاؤنٹر پہ جو لڑکی کھڑی تھی اس کی عمر اٹھارہ سال سے بھی کم ہو گی۔ اس نے گردن گھما کے اشارہ کیا کہ کوئی بات نہیں۔ تم نے جو لینا ہے لے لو۔ میں نے جوس کی ایک بڑی بوتل لی اور اس کے پیسے ادا کیے پھر حسب عادت اس سے پوچھا "اتنی چھوٹی سی عمر میں جاب؟ مجھے تو تم سکول گرل لگتی ہو۔"

کہنے لگی "مجھے انگریزی نہیں آتی۔ میں جرمن بول سکتی ہوں یا اٹالین۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ خیر میں نے اٹالین میں پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا، میں پڑھتی ہوں۔ میری ماں کھانا کھانے گئی ہے اس لیے وہ مجھے یہاں کھڑا کر گئی ہے۔"

ابھی ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ اس کی ماں آ گئی۔ وہ لڑکی جتنی خوبصورت تھی اس کی ماں اتنی ہی بھدی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اس سے اٹالین میں پوچھا "تم یہ سٹور اکیلے چلاتی ہو۔"

کہنے لگی "نہیں میں اور میرا خاوند دونوں مل کے چلاتے ہیں۔ اس وقت وہ سامان لینے گیا ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "تم لوگ اٹلی کے کس شہر سے ہو؟"

کہنے لگی "تم اٹلی کے بارے میں جانتے ہو؟"

میں نے کہا "میں اریزو سے آیا ہوں۔ پہلے وہاں رہتا تھا اب یہاں آ گیا ہوں۔"

وہ کہنے لگی "تم بڑی اچھی اٹالین بولتے ہو۔ ویسے ہم لوگ سسلی کے ہیں۔ ہم لوگ یہاں کافی عرصے سے آباد ہیں۔"

میں نے اٹالین میں اری ودیرچی (arrivederci) یعنی پھر ملیں گے کہا اور دوکان سے باہر نکل آیا۔ میرا دل تھا کہ سید حا از یل ہائم جاؤں اور شام کو نبادھو کے رضا سے ملنے جاؤں اور اس کو اپنے انٹرویو کا پرنٹ آؤٹ دکھاؤں۔ ابھی اس سے کافی باتیں کرنی تھیں۔ میں نے گیارہ ستمبر کے بارے میں کافی کچھ پوچھنا تھا۔ میں یہاں سے سید حا از یل ہائم پہنچا۔ دو سیب کھائے تھے اور تیسرا ابھی

طرح تھیلے میں رکھ دیا تھا۔ جوس آدھا پی چکا تھا۔ جیسے ہی ازیل ہائم پہنچا تو پیٹ میں گڑبڑ شروع ہوئی۔ میں سیدھا باتھ روم میں اپنی حاجت رفع کرنے گیا۔ ڈاکٹر بوہرنگر نے ٹھیک کہا تھا کہ ہم لوگ پانی نہیں پیتے اور پھل نہیں کھاتے۔ میں جو کام پندرہ بیس منٹ میں کرتا تھا وہ ایک منٹ سے کم کے عرصے میں تکمیل پا گیا۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے عہد کیا کہ میں اب پابندی سے پھل کھایا کروں گا اور پانی پیا کروں گا۔

میں ہاتھ دھو کے ہال میں آ کر بیٹھ گیا۔ باقی کے سیب بھی ختم کیے۔ جوس کا ڈبہ بھی خالی کیا۔ پلاسٹک کی خالی ٹرے اور جوس کا خالی ڈبہ بن کی نذر کیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ شام کو رضا کے پاس بھی جانا ہے، میرے موبائل فون پہ میسج کا بیپ بجنے لگا۔ میں نے میسج پڑھا تو بڑا حیران ہوا۔ میسج رضا کا تھا۔ اس نے مجھے مطلع کیا تھا کہ وہ دو دن کے لیے کہیں جا رہا ہے۔ اتوار کو واپس آئے گا۔

OOO

جمعے کے دن ناشتے سے فارغ ہوا تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اخبار، ویرلانڈ بوتے دیکھا۔ شیفر کی عادت شنائیڈر کے مقابلے میں اچھی تھی۔ میں نے اس سے دوستانہ انداز میں پوچھا ''تمہارے پاس اخبار ہے، ویرلانڈ بوتے۔''

کہنے لگا ''اندر کمرے میں پڑا ہے لیکن تم کیا کرو گے، تمہیں جرمن زبان آتی ہے۔''

میں نے کہا ''تصویریں دیکھوں گا۔ کئی دنوں سے اچھی تصویریں نہیں دیکھیں۔''

وہ مسکرا دیا اور کمرے سے ونٹرتھور کا سب سے اہم اخبار ویرلانڈ بوتے اٹھا لایا۔ میں اخبار لے کے ہال کے ان چار مستطیل میزوں میں سے ایک پہ اخبار پھیلا کے بیٹھ گیا۔ سبھی صفحات دیکھ ڈالے، ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ لیکن مجھے اپنا انٹرویو کہیں نہ ملا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ پیٹر نے تو کہا تھا کہ جمعے کو چھپے گا۔ ایسا تو نہیں کہ اس نے مجھ سے مذاق کیا ہو۔ میں نے چند لوگوں کو بتا بھی دیا تھا۔ خیر میں نے اخبار تہہ کر کے شیفر کو واپس کر دیا۔ وہ کہنے لگا'' کیوں تصویریں پسند نہیں آئیں؟''

میں نے بھی جوابی طور پر مزاحاً کہا'' سوئس لڑکیاں اتنی خوبصورت نہیں ہوتیں!''

میرا مزاج تھوڑا سا بگڑا ہوا تھا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ گلبدین نازل ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آیا۔ آج تو گلبدین کا ونٹرتھور کے بڑے ہسپتال میں چیک اپ ہے۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ مجھے شیفر کہنے لگا'' تو تم اس کے ساتھ جا رہے ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے گلبدین نے بتایا ہے کہ

تمہاری اس کے ڈاکٹر سے بات بھی ہو گئی ہے۔''

میں جانتا تھا کہ گلبدین بڑے بڑے جھوٹ بولتا ہے اس لیے میں نے شیفر سے کہا'' ہاں میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ میں نے گلبدین سے کہا'' جلدی سے تیار ہو جاؤ تا کہ وقت پہ ہسپتال پہنچ جائیں۔''

وہ میری ٹون سے پہچان گیا تھا کہ میں ناخوش ہوں۔ اس نے مسکرا کے میری طرف دیکھا جیسے مجھے راضی کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر میں تیار ہو کے آ گیا۔ بالکل کارٹون لگ رہا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے ساری زندگی پتلون نہیں پہنی لیکن یہاں آ کے اسے مجبوراً پتلون پہننی پڑ گئی تھی۔ میں نے کہا ''چلیں۔''

کہنے لگا'' چلو۔''

ہم دونوں ہسپتال پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ایک اور پاکستانی کھڑا ہے۔ گلبدین نے میرا اس سے تعارف کروایا۔ اور کہنے لگا'' اس سے میں نے کہا تھا کہ ترجمان کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس لیے تم بھی ہسپتال آ جاتا۔''

مجھے گلبدین پہ نہایت غصہ آیا۔ مجھ سے اجازت کے بغیر اس نے اپنی منشاء سے مجھے کسی اور کے لیے بھی ترجمان مقرر کر دیا تھا۔ گلبدین کی آنکھوں کا معائنہ ہوا۔ آئی سپیشلسٹ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی، جو کچھ گلبدین مجھے بتاتا گیا میں ڈاکٹر کو بتاتا گیا۔ سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا'' اس کی آنکھ میں میزائل کے ٹکڑے نہیں لگے بلکہ شیشے کے بہت باریک ذرے چلے گئے ہیں۔ اگر چند دن اور دیر ہو جاتی تو اس کی اس آنکھ کی بینائی چلی جاتی۔'' اس کو ہم داخل کر رہے ہیں اور اس کا آج ہی آپریشن ہوگا۔''

میں نے گلبدین کو یہ تو بتا دیا کہ اس کی آنکھ کا آج ہی آپریشن ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کا جھوٹ پکڑا جا چکا ہے۔

جب میں نے آپریشن کا بتایا تو گلبدین رو پڑا اور کہنے لگا'' میں کئی دنوں سے تم سے جھوٹ بول رہا تھا کہ میں افغانی ہوں حقیقت یہ ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور مانسہرہ کا رہنے والا ہوں۔ میں گاڑیوں کا مکینک ہوں۔ میرا بڑا بھائی زیورخ میں رہتا ہے۔ اور میں جو تمہیں بتاتا رہا ہوں کہ میری آنکھ میں میزائل کے ذرے چلے گئے ہیں، بالکل جھوٹ ہے۔ حادثہ گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے کے باعث

پیش آیا۔ میں ایک دفعہ گاڑی کا دروازہ ٹھیک کر رہا تھا کہ گاڑی کا شیشہ ٹوٹ کے میرے منہ پہ آ لگا۔ اس کے بعد میری اس آنکھ میں درد رہنے لگا۔" وہ جو کہا جاتا ہے کہ جھوٹے آدمی کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔۔۔ کچھ ایسی ہی صورت حال بن گئی تھی۔۔۔ سچ بات تو یہ تھی کہ گلبدین نے مجھ سے آنکھ میں میزائل کے ذرے چلے جانے کی بات کبھی نہیں کی تھی۔۔۔ البتہ اس نے مجھے جو کہانی سنائی تھی اس میں شیشہ ٹوٹ کے منہ پر لگنے کی بجائے۔ ریڈ ایٹر کا پنکھا منہ پر لگنے کی بات کی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ اور لوگوں کو اس نے میزائل کی کہانی گھڑ کے سنائی ہو اور یہ گمان کر لیا ہو کہ مجھے بھی اس نے یہی بات بتائی ہے مجھے اس وقت اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔۔۔

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے موبائل فون لیا اور کسی کا نمبر ملایا۔ جیسے ہی دوسری طرف سے آواز آئی ہری پور ہزارہ کی زبان میں بات چیت کرنے لگا۔ پھر موبائل مجھے پکڑا دیا۔ میں نے رسیونگ پیس پر ہاتھ رکھ کے پوچھا "کون ہے۔"

کہنے لگا "میرا بڑا بھائی۔"

میں نے سلام دعا کی، پھر گلبدین کے بارے میں بتایا۔ وہ کہنے لگا میں شام تک دنتر تصور پہنچ جاؤں گا۔

گلبدین کی شکل سے لگتا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہے۔ میرا دل بھی اس کے بارے میں بہت حد تک صاف ہو گیا۔

O

آج صبح ثقلین کو نیاٹش کی فیکٹری جانا تھا۔ میں ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو لائبریری چلا گیا۔ لائبریری سے میں دن کے دو بجے واپس آ گیا۔ ہمارے گھر کے نیچے "ولا جو گا تو لینو" (Villaggio gattolino) کا جو بس سٹاپ تھا وہاں لوگوں کے انتظار کے لیے بنے ہوئے شیڈ کے ایک بینچ پہ ثقلین بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کو کام مل گیا ہے۔ میں نے دور سے ہی کہا "ثقلین یہاں کیا آتی جاتی گاڑیاں گن رہے ہو؟" وہ میری حس مزاح سے واقف تھا۔ پہلے مسکرایا اور پھر بولا "اچھی خبر ہے۔ کام مل گیا ہے لیکن نیاٹش کا مالک کہتا ہے کنٹریکٹ نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "کنٹریکٹ نہ سہی، کام تو ملے گا، بس کام ہونا چاہیے۔"

ہم دونوں ساتھ ہو لیے۔ گھر کا دروازہ کھولا۔ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے۔ ثقلین بولا "آج میں گیارہ بجے نیاٹش کی فیکٹری گیا تھا۔ اس کے مالک نے میری زرائی بی اور میرا کام دیکھتے ہی کہنے لگا۔ تم موبائل استعمال ہی نہیں کرتے اور موبائل استعمال نہ کرنے کی وجہ بھی نہیں بتاتے! تم نے کہا تھا کہ مسودے میں اس کا ذکر آئے گا لیکن ابھی تک تو اس کا کوئی ذکر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "تھوڑا سا صبر اور، اب تو ویسے بھی کہانی اپنے اختتام کی طرف جا رہی ہے۔"

وہ بولا "کمال ہے چار سو صفحے کے بعد بھی ابھی کہانی اختتام کی طرف جا رہی ہے۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتاب پانچ چھ صد صفحات پر مشتمل ہو گی۔"

میں نے کہا ''چھوڑو کتاب کو اور اس کے صفحات کو یہ بتاؤ کھانا کھایا ہے۔''

کہنے لگا ''نہیں۔''

میں نے جلدی سے پیاز، ٹماٹر اور انڈے بنائے۔ دونوں نے مل کے روٹیاں بنائیں۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور اس کے بعد ہم دونوں انڈین فلم ''کبھی خوشی کبھی غم'' دیکھنے لگے۔ یہ فلم میں پہلے بھی کئی دفعہ دیکھ چکا تھا اور مجھے یہ احساس ہر بار فلم دیکھنے کے دوران ہی ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ فلم مجھے ہر دفعہ دیکھ کے اچھی لگی تھی۔ اس کے گانے بھی اچھے تھے۔ جب فلم ختم ہوئی تو ثقلین اگلا باب لے کر چلا گیا اور میں شام کے کھانے کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

OOO

ہفتے کے روز میں اوور ڈیول کی ازیل ہائم میں ناشتہ کر رہا تھا، سامنے سے شیفر آتا دکھائی دیا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ میں نے پوچھا ''کیا معاملہ ہے۔۔۔ بڑے مسکرا رہے ہو!''

کہنے لگا ''خود ہی دیکھ لو۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لیا اور دیکھنے لگا۔ اس میں میری فوٹو تھی اور کئی جگہ میری گفتگو کے حوالے سے سرخیاں جمائی گئی تھیں۔ گویا، میرا انٹرویو چھپ گیا تھا۔ میں نے شیفر سے پوچھا ''اس میں کیا لکھا ہے۔''

کہنے لگا ''ظاہر ہے جو تم نے کہا ہوگا۔۔۔ ویسے تمہارے بارے میں بہت اچھا لکھا ہے۔ ہم لوگ یہاں کے رہنے والے ہیں لیکن اخبار نویسوں نے ہمارا انٹرویو لینے کی کبھی زحمت نہیں کی لیکن تمہیں یہاں آئے ہوئے دس دن بھی نہیں ہوئے اور جب اخبار اُٹھاؤ۔۔۔ تمہاری تصویر سامنے دکھائی دیتی ہے۔''

مجھے انٹرویو دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے اسی وقت پیٹر کو ایس ایم ایس کیا اور تمام تفصیل لکھی۔ اس کے جواب میں اس نے لکھا کہ تم نے میل کا جواب دیر سے دیا اس لیے منگل کے بجائے انٹرویو ہفتے کو چھپا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ہفتے کا دیرالانڈ بوتے سب نے باری باری دیکھا۔ شیفر کہنے لگا ''میں ایک کاپی اور لاؤں گا اور اس انٹرویو کا تراشہ یہاں نوٹس بورڈ پہ لگاؤں گا۔''

میں نے کہا ''شیفر کیا تمہیں میرا انٹرویو چھپنے کی خوشی ہوئی ہے۔

کہنے لگا" بہت۔"

مجھے ونٹر تھور ہسپتال جانا تھا کیونکہ گلبدین کی آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اس کا بھائی، شاہ صاحب اور کرپال سنگھ اس کے پاس تھے۔ وہاں رکنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ ہسپتال کے آس پاس ہی رہتے۔ میں نے رضا سے بھی ملنا تھا لیکن اس نے کل آنا تھا۔ میں جلدی سے تیار ہوا اور بس سٹاپ پہ آ گیا۔ ہفتے اور اتوار کو بسیں سڑکوں پر کم ہوتی تھیں۔ اس لیے مجھے بس سٹاپ پہ آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ بس اپنے ٹھیک وقت پہ آئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ آج میں دلی طور پہ بہت خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کا سرور محسوس کر رہا تھا۔ بس جب سٹیشن کے سامنے رکی تو میں بس سے اتر گیا۔ وہاں سے میں سٹڈ ہاؤس ستراز ے پہ آ گیا۔ چند قدم پہ ہسپتال تھا۔ میں نے کاؤنٹر سے پوچھا کہ گلبدین قاضی مریض کا کمرہ کون سا ہے۔ کاؤنٹر پہ بیٹھی ہوئی لڑکی نے گائیڈ کیا کہ دوسری منزل پہ ہے لیکن وہاں جا کے دھیان رہے کہ تیمارداری زیادہ گفتگو مریض کی بحالی صحت پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ میں لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے ہوتا ہوا دوسری منزل پہ پہنچا۔ دوسرا کمرہ گلبدین کا تھا۔ میں جیسے ہی دروازے سے اندر داخل ہوا، ایک شخص اُٹھ کے میرے گلے لگ گیا۔ میں نے کہا" آپ کون۔"

وہ بولا" میں گلبدین کا بھائی ہوں۔ یہ جب بھی زیورخ آتا ہے آپ کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس کے چیک اپ کے لیے اس کی بہت مدد کی ہے۔ میں زیورخ ہوتا ہوں۔ کام سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔"

میں نے کہا" کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا اور ویسے بھی ہم لوگ فارغ ہوتے ہیں کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ اگر ہم کسی اور کے کام آ جائیں تو کون سا ہماری جان چلی جاتی ہے۔"

مجھے اس لڑکی کی بات یاد آئی کہ وہاں زیادہ گفتگو سے پرہیز کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد میں کچھ نہ بولا۔ گلبدین ایک معصوم بچے کی طرح سو رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

آج کا دن تو گرم ترین تھا ہی لیکن۔۔۔ شام کو بھی بہت گرمی تھی۔ میں اور رضا اس کی ازیل ہائم کے باہر ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں مختلف موضوعات پہ بات کرتے رہے پھر میں نے اسے کہا" اس دن دہشت گردی پہ بات ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو برا نہ لگے۔ اس موضوع پہ مزید روشنی ڈالیں۔"

وہ بولا" میں تمہیں اتنا کچھ بتا چکا ہوں، ابھی تک تمہاری تسلی نہیں ہوئی۔ ویسے مجھے خوشی

ہے کہ تم نے اپنے انٹرویو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔"

میں نے کہا" رضا بھائی میں خوب جانتا ہوں کہ ہر بات ہر کسی سے کیے جانے کے لیے نہیں ہوتی۔" پھر میں نے اس سے سوال کیا۔

"آپ کو جرمن زبان آتی ہے۔"

"مجھے تو نہیں آتی لیکن میرے ہاؤس ماسٹر نے مجھے تمہارے اس انٹرویو کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ تم تاریخ اور مصوری میں زیادہ دلچسپی لیتے ہو۔"

میں نے کہا" میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ تعلیم مکمل کر کے تاریخ ہی تو پڑھی ہے یا بدھ ازم اور ہندو ازم کی بابت جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"

"میں تمہیں اس وقت ایک فرنچ جرنلسٹ کے بارے میں بتاتا ہوں جس نے نائن الیون کے موضوع پہ کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے Thierry Meyssan (تھیری میساں) اس کتاب کا نام ہے L'Effroyable imposture۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ میں نے یہ کتاب فرنچ میں بھی پڑھی ہے اور انگریزی میں بھی۔ انگریزی میں اس کا عنوان ہے 9/11: The Big Lie یعنی گیارہ ستمبر، دروغ عظیم۔ اب آتے ہیں کتاب کی طرف۔ اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ تھیری میساں نے 11 ستمبر کے واقعے کو امریکہ کی جنگی حکمت عملی کا نام دیا ہے۔ جس کی بنیاد پر اُسے افغانستان اور عراق پر حملہ کرنا تھا۔"

میں نے کہا" یہ بات ٹھیک ہے کہ امریکی فوجیں افغانستان میں ہیں لیکن انہوں نے عراق پہ تو حملہ نہیں کیا۔"

"لیکن اس کے تجزیے کے مطابق وہاں بھی جائیں گے۔ خیر پہلے حصے میں اس نے اس بات کو بیان کیا کہ اس سارے ڈرامے کا پلاٹ امریکی خفیہ ایجنسیوں نے تیار کیا۔ دوسرے حصے کو امریکہ میں جمہوریت کی موت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق امریکہ کا افغانستان جانا ۱۱ ستمبر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا پلان وہ برٹش پرائم منسٹر ٹونی بلیئر سے مل کے پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ۱۱ ستمبر کا ڈرامہ رچا کے امریکہ نے پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے اور بڑی چالبازی سے اپنی مرضی کے مطابق ایک غیر ملک میں ملٹری ایکشن کرنے کا اخلاقی جواز حاصل کیا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ دنیا کے کسی ملک نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی۔ وہ کہتا ہے یہ جدید دور کی صلیبی جنگ ہے۔ تیسرے

حصے میں اس نے لکھا ہے کہ اُسامہ بن لادن امریکہ کا تیار کردہ "جہادی" ہے اور وہ امریکہ سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا اور کرتا ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق اسامہ بن لادن اور بش فیملی کے مابین کاروبار میں شراکت داری ہے اور اس شراکت داری میں عالمی سطح پر تیل، ہتھیاروں اور ادویات کی ترسیل شامل ہے۔ دونوں فیملیز کی اس مشترکہ کمپنیز کا نام ہے کارلائیل گروپ (Carlye Group)۔ اس کتاب کی نہ صرف فرانس میں فرنچ اخبار نویسوں نے مخالفت کی بلکہ امریکہ نے بھی اس امر کو ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کتاب میں پیش کیا گیا مواد سچ ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا صحافی جس نے اس بارے میں تحقیق کی وہ ہے جرمن اخبار نویس Mathias Brochers (میتھیاس بروکرز)۔ یہ جرمن اخبار Die Tageszeitung کا ایڈیٹر ہے۔ اس نے بھی اس بات کی نفی کی ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعے میں مسلمانوں کا ہاتھ ہے نہ ہی وہ یہ الزام درست قرار دینے کو تیار ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ اس نے تو ۱۳ ستمبر کو ہی ایک آن لائن اخبار (Telepolis 1) میں لکھ دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف کوئی گہری سازش ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی مہم جاری رکھی اور اس بارے میں لکھتا رہا کہ گیارہ ستمبر کے واقعے میں نہ اُسامہ بن لادن کا ہاتھ ہے نہ ہی اس میں القاعدہ کا کوئی عمل دخل ہے لیکن اس طرح کے حالات تخلیق کر کے لوگوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکہ ورلڈ پاور کے طور پر جس جس نوع کے جنگی اقدامات کر رہا ہے وہ اس میں حق بجانب ہے۔ اس سلسلے میں اس نے جرمن زبان میں دو کتابیں لکھیں ایک کا انگریزی میں نام Conspiracies, Conspiracy Theories and the Secets of 9/11 اور اسی سلسلے کی دوسری کتاب جس کا عنوان ہے Facs, Forgeries and the Suppressed Evdence of 9/11۔

اس سلسلے میں تیسرا نام ایک جرمن سیاسی لیڈر، مصنف، اور وکیل Andreas von Bulow (آندریاس فون بیلو) کا ہے جو مختلف حکومتوں میں شامل رہا ہے۔ آج کل وہ اس موضوع پر کتاب لکھ رہا ہے جس کا نام ہے:

The CIA and September 11(Die CIA und der 11. September

اس نے گیارہ ستمبر کے واقعے کے بارے میں جرمنی کے خبارات کو انٹرویو دیتے ہوئے

اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ اس واقعے سے القاعدہ کا تعلق ہے یا اس میں اسامہ بن لادن شامل ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ یہ کہانی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ بیک وقت ۱۹ ایسے اعلیٰ تربیت یافتہ مسلمان پائلٹ ڈھونڈنا جو مذہبی نقطۂ نظر سے جان دے دینے پر آمادہ ہوں، اور ایک گھنٹے کے مختصر وقت میں ان کا ایک نہیں چار جہاز ہائی جیک کرنا وہ بھی چھوٹے نہیں بلکہ بڑے جہاز بظاہر غیر ممکن دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کے واقعے کے لیے بغیر سرکاری مدد کے کبھی بھی عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ اس کے مطابق اگر اس کیس کے یہی حقائق سامنے لائے جائیں تو امریکہ کے کئی سرکردہ حکومتی اراکین کو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑے۔ امریکی حکومت نے پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے اور اس حادثے کے تمام ثبوت اور حقائق مٹا دیے ہیں۔"

میں رضا کی شکل دیکھنے لگا۔ میں کیا ساری دنیا کے مسلمان اس بات کو جانے انجانے میں مان چکے ہیں جب کہ جرمن اور فرنچ اہلِ تحقیق کیسے کیسے ثبوت لے کر سامنے آئے ہیں کہ امریکہ کی سازش کھل کے سامنے آ گئی ہے۔ میں یہ سب جان کر واقعی حیران ہوا۔ میں نے رضا کو کئی دفعہ کہتے ہوئے سنا کہ کوئی Conspiracy theory ہے جس کے بارے میں سب نے لکھا ہے میں اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ رضا مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کے کہنے لگا "کس سوچ میں غرق ہو گئے؟"

میں نے کہا "میں کونسپیریسی تھیوری کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

وہ بولا "میں تمہیں اس بارے میں بھی بتاتا ہوں۔ اس کتاب کا نام ہے 9/11 conspiracy theories یعنی گیارہ ستمبر اور نظریاتِ سازش بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جو بنیادی نکات واضح کیے گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک ایک کر کے بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو اس طرف آتے ہیں کہ چار بڑے جہاز ہائی جیک کیے گئے۔ ان میں دو تو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹون ٹاورز سے ٹکرائے جس کی وجہ سے یہ عمارتیں منہدم ہوئیں۔ ان ہائی جیکرز نے تیسرا جہاز پینٹاگون پر گرایا اور چوتھا جہاز پینسلوینیا (Pennsilvenia) کے علاقے شیکرز ول (Shakersville) کے کھیتوں میں گرایا۔ اور امریکی حکومت نے اس بارے میں رپورٹس پیش کی ہیں کہ ہمیں اس واقعے سے پہلے وارننگز ملتی رہی ہیں۔

جیسے ہی جہاز ان عمارتوں سے ٹکرائے مختلف قسم کے مفروضے تخلیق کیے گئے۔ جس میں القاعدہ، اسامہ ابن لادن اور موساد کا ذکر سننے میں آیا۔ پہلے یہ خبر مشہور کی گئی کہ اس واقعے میں کوئی بھی یہودی جاں بحق نہیں ہوا جبکہ انشورنس کمپنی کے کوائف کے مطابق اس حادثے میں چار سو یہودی بھی مارے گئے۔

اس کے علاوہ Steven E.Jones جو ماہر فزکس ہے اور Richard Gage جو مشہور آرکیٹیکٹ ہے ان کے بیان کے مطابق جہازوں کے ٹکرانے سے کسی بھی عمارت کا اس طرح منہدم ہونا ناممکن ہے جیسے کہ لوگوں کو دکھایا گیا۔ اس کے لیے ان عمارتوں کے نیچے یقیناً ایسا مادہ رکھا گیا ہوگا جس کے بلاسٹ ہونے پر یہ دھڑام سے نیچے آ گئیں۔

سٹیو جونز نے ایک پاپولر سائنس میگزین میں لکھا کہ ان عمارتوں کو تباہ کرنے کے لیے غالباً تھرمائٹ (Thermite) یا نیو تھرمائٹ (Neothermite) نام کا مادہ استعمال کیا گیا کیونکہ ان عمارتوں کی راکھ کی تحقیق کرنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ امریکہ کے ادارے نسٹ (نیشنل انسٹیٹیوٹ آف سٹینڈرڈز اینڈ ٹیکنالوجی) "National institute of Standards and Technolgy" نے کونسپیریسی تھیوری کو ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ان عمارتوں کی راکھ کی تحقیق ہی نہیں کی گئی۔ جیسے ہی یہ عمارتیں تباہ ہوئیں ان کے بارے میں امریکہ اور دنیا کے دیگر اخبارات میں کہانیاں چھپنے لگیں کہ یہ عمارتیں، تعمیرات میں استعمال ہونے والے سٹیل اور المونیم کے پگھلنے سے گری ہیں۔ میں نے تمھیں پہلے اسی لیے بتایا تھا کہ سٹیل اور المونیم کا میلٹنگ اور بوئیلنگ پوائنٹ کیا ہے۔ یہ کتنے درجہ حرارت پہ پگھلتا ہے، جب اس طرح کی کہانیوں کے بارے میں سائنسدانوں نے تفصیل لکھنی شروع کی تو امریکہ کے ادارے نیسٹ نے اپنا بیان بدل دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ عمارتوں میں استعمال ہونے والا سٹیل گرمی کی وجہ سے کمزور پڑ گیا تھا اور اس لیے یہ عمارتیں گر گئیں۔ تحقیقات نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ سٹیل کے گرم ہونے سے اگر عمارتیں گری بھی ہیں تو ان عمارتوں کا دس فیصد حصہ گرنا چاہیے تھا کیونکہ سٹیل کا درجہ حرارت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا ہے نہ کہ بڑھتا ہے۔

فرانس کے ایک اخبار نویس Thierry Meyssan اور ایک محقق Dylan Avery ان دونوں کا خیال ہے کہ جو جہاز پنٹاگون پہ گرایا گیا وہ جہاز نہیں بلکہ ریموٹ کنٹرول سے چلایا جانے

والا میزائل تھا۔ ان کے خیال کے مطابق پنٹا گون میں جو سوراخ دکھائے گئے ہیں وہ بہت چھوٹے ہیں۔ تھیوری میسن کا کہنا ہے کہ بوئنگ ۷۵۷ کی چوڑائی ۱۲۵ فٹ ہوتی ہے اور لمبائی ۵۵ا فٹ جبکہ پنٹا گون میں ہونے والے سوراخ کی چوڑائی ۶۰ فٹ ہے۔ اس کے علاوہ کونسپیریسی تھیوری والوں نے یہ اہم سوال بھی اُٹھایا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے چار جہاز اُڑیں اور وہ چار مختلف مقامات پہ گریں اور کسی ایک کا بھی بلیک بوکس نہ ملے۔ اس صورت حال میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر بلیک بوکس ملے تو انہیں غائب کر دیا گیا یا ان عمارتوں کو گرانے کے لیے جہاز استعمال کیے ہی نہیں گئے۔

اب آتے ہیں ہائی جیکرز کی طرف۔ جیسے ہی یہ واقعہ پیش آیا، برٹش نیوز چینل بی بی سی نے مشتبہ ۱۹ ہائی جیکرز کے نام اور کوائف ٹی وی پہ دکھا دیے، لیکن چند دنوں کی تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آ گئی کہ ان میں سے کئی ہائی جیکرز زندہ ہیں۔ یعنی خودکش حملے کے بعد مر جانا اور بعد میں ان کا زندہ پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ بی بی سی اور دیگر ٹی وی چینلز پر دکھائی جانے والی "سٹوری" "من گھڑت تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی سامنے آئی کہ ان مشتبہ ۱۹ افراد جن کے نام ایف بی آئی اور بی بی سی نے پوری دنیا کو دکھائے میں سے سولہ کے پاس یا ویزہ نہیں تھا، یا ان کے پاسپورٹس کا کوئی مسئلہ تھا۔ اگر کسی ڈرامے کے ۱۹ کردار ہوں اور سولہ کرداروں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو تو تین بندے ڈرامہ کیسے پیش کریں گے۔

اس حادثے کے فوراً بعد تمام ثبوت بڑی خوبصورتی کے ساتھ مٹا دیے گئے جب کہ ایف بی آئی کا کہنا ہے کہ ہمیں چار بلیک بوکس ملے جن میں سے دو بری طرح تباہ ہو چکے تھے اور دو ٹھیک تھے۔ اس حادثے کے فوراً بعد مختلف انٹرویوز، آڈیو اور ویڈیو ٹیپس کے ذریعے پوری دنیا کو دکھایا گیا کہ اُسامہ بن لادن نے اس بات کو مان لیا ہے کہ اس دہشت گردی میں اس کا ہاتھ ہے۔ پہلے اُسامہ بن لادن نے اس واقعے سے لاتعلقی کا اظہار کیا لیکن بعد میں اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ وڈیو ٹیپ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے ریلیز کی اور دنیا کے کئی اسلامی ممالک نے اس ٹیپ کی صداقت پہ شک کیا۔ میں نے اس لیے وڈیو کریسی کے اثرات کے بارے میں بتایا تھا کہ کس طرح کوئی بھی چیز جب ہم ٹی وی یا فلم میں دیکھتے ہیں تو اس کا ہمارے دماغ پہ کیسا اثر پڑتا ہے۔ ہم بنا ثبوت کے اس کے خلاف یا اس کے حق میں اپنے ردِعمل کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

پھر ایک یہ فلسفہ بھی زیرِ بحث رہا کہ اس حادثے کے لیے جہازوں کا استعمال کیا ہی نہیں

گیا۔ اگر جہازوں کا استعمال نہیں کیا گیا تو بلیک باکسز کا پایا جانا اور ان کا غائب کیا جانا یا ان کی صداقت پہ یقین کرنا یہ کہنا کہ ایک بلیک باکس کی کچھ ریکارڈنگ مجبوری کے تحت لوگوں کے سامنے لانی پڑی، یہ ساری باتیں جھوٹی ہیں۔"

میں نے بیچ میں ٹوکا "لیکن یہ جہازوں کے نہ ہونے کا تصور بھی تو کسی نے پیش کیا ہوگا۔"

رضا بولا "بش کے لیبر ڈیپارٹمنٹ کے دو اہلکاروں Nico Haupt اور Morgan Reynolds کا خیال ہے کہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ان جڑواں عمارتوں کو گرانے کے لیے جہازوں کا استعمال ہوا ہی نہیں کیونکہ جہاز بنانے کے لیے ایلومینیم کا استعمال ہوتا ہے اور ان عمارتوں میں سٹیل کا استعمال کثرت سے کیا گیا تھا اس لیے جہازوں کا ان کے اندر داخل ہونا اور سوراخ کر دینا اور ان کو تباہ کر دینا ناممکن ہے۔ رینالڈز کا کہنا ہے نہ ہی جہاز تھے نہ ہی ہائی جیکرز تھے۔ ایک اور ماہر Daivd Shayler کا خیال ہے کہ ان عمارتوں کو گرانے کے لیے جہاز نما میزائل استعمال کیے گئے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر آپ ان عمارتوں کے گرنے کی فوٹیج دو تین بار دیکھیں اور اس کو سلوموشن کر کے دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ کار نما میزائل ان عمارتوں کی طرف جا رہے ہیں اور یہ میزائل ان عمارتوں سے ٹکرائے ہیں۔ اس طرح کے نظریات کا اظہار کرنے والوں کو بری طرح ڈرایا دھمکایا گیا اور انٹرنیٹ سے اس طرح کی تمام سائیٹس غائب کر دی گئیں۔"

"لیکن ان عمارتوں کو گرا کے، اپنے ہی لوگوں کو ہلاک کر کے، الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کے امریکہ کو کیا فائدہ ہوا۔"

رضا بولا "میں اس بارے میں تمہیں شاید پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ پرانے زمانے میں لوگ کسی ملک پہ حملہ کرتے تھے تو اس کے لیے کوئی خاص وجہ نہیں چاہیے ہوتی تھی۔ محمد بن قاسم کو ہندوستان اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے بادشاہ نے عربوں کا جہاز لوٹ لیا تھا اور تاجروں کو قید کر لیا تھا۔ یہ وجہ کافی تھی سپین پہ حملہ کرنے کے لیے موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو اس لیے بھیجا تھا کیونکہ اس کو کاؤنٹ جولین نے خود خط لکھا تھا کہ حالات سازگار ہیں تم کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہو۔ سکندر اعظم نے جب ہندوستان پہ حملہ کیا تو اس کو ٹیکسلا کے راجہ امبھی نے دعوت دی تھی کیونکہ وہ جہلم کے حکمران راجہ پورس سے بہت تنگ تھا۔ صلیبی جنگوں کے لیے عیسائیوں نے قبلہ اول کو سامنے رکھ کے اپنے عوام کو بیوقوف بنایا اور یروشلم پہ حملہ کر دیا۔ آج کے دور میں ہم اگر کسی ملک پہ حملہ کرتے ہیں تو پہلے اس کے

لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اگر پراپیگنڈہ کامیاب ہو گیا تو وہاں جا کے فائدہ کیا ہو گا جو حملے کی اصل وجہ ہوتی ہے۔ جن ملکوں میں تیل نکلتا ہے امریکہ کو وہاں داخل ہونے اور ان ممالک میں اپنی کٹھ پتلی حکومتیں قائم کرنے کے لیے اخلاقی جواز درکار تھا۔ افغانستان پہ حملہ ہو چکا۔ اس کے بعد ان کا پروگرام عراق پہ حملہ کرنے کا ہے اور اگر موقع ملا تو ایران پہ بھی حملہ کریں گے۔ اب وہاں جانے کے لیے دھڑلے سے وہ پوری دنیا کو کہتے ہیں کہ ہم وہاں جا رہے ہیں۔ ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے قبل اگر افغانستان میں فوجی مداخلت کا فیصلہ کیا جاتا تو نہ صرف امریکی عوام بلکہ پوری دُنیا اس اقدام کی مخالفت کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے ہی ملک میں شہر کے بیچوں بیچ یہ عمارتیں گرادیں۔ اس کے لیے وہ کئی سالوں سے پلاننگ کررہے تھے۔ ٹون ٹاورز گرائے جانے کے فوراً بعد میڈیا کے ذریعے یہ پروپیگنڈہ کروایا گیا کہ اس میں طالبان اور القاعدہ کا ہاتھ ہے، یہ سب کچھ اسامہ بن لادن نے کروایا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ اتنا زبردست کیا گیا کہ دنیا کے کئی اسلامی ملک بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اب امریکن فوجیں افغانستان میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کا اگلا ٹارگٹ عراق ہو گا اس کے بعد ایران۔ سعودی عرب کے شیوخ کا تیل تو امریکی نکال ہی رہے ہیں اب یہ عراقیوں اور ایرانیوں کا تیل بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ تیل کی ضرورت ہر کسی کو ہے۔ اگر ہمارا تیل نکل گیا تو ہم کیا کریں گے؟''

میری ہنسی نکل گئی اُردو محاورے کے مطابق تیل نکل جانا کچومر نکل جانے کے مترادف ہے۔ سو میں نے کہا۔۔۔ ''واقعی آغائی رضا اگر آپ لوگوں کا تیل نکل گیا تو آپ کیا کریں گے۔''

''خیر یہ تو بعد کی بات ہے لیکن کئی دفعہ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق نہیں ہوتا کئی دفعہ ترکیب الٹی بھی ہو جاتی ہے۔ جب سے ان عمارتوں کا واقعہ پیش آیا ہے امریکی معیشت خطرے میں ہے۔ وہاں کی سٹاک ایکسچینج خسارے میں جارہی ہے۔ نہ صرف امریکی بلکہ دُنیا بھر کی معیشت بری طرح مجروح ہوئی ہے۔''

''لیکن آغائی تیل حاصل کرنے کے اور بھی تو طریقے ہیں۔ یہ طریقہ اپنانا ضروری کیوں سمجھا گیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ جیسے سعودی عرب امریکہ کی طے کردہ قیمت کے مطابق تیل بیچتا ہے اور وہ بھی خام حالت میں۔ بعد میں وہ اس کو مختلف کاموں میں لاتے اور دوسروں کو اپنی قیمت پر بیچتے

ہیں۔ وہ عربوں کا تیل خریدتے ہیں۔ امریکہ جہاز اور اسلحہ بناتا ہے۔ تیل تو بک گیا۔ اسلحہ کون خریدے۔ اس کے لیے جنگ کی ضرورت ہے۔ جنگ کس سے کریں۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم تو ہوگئی۔ کہاں جائیں، کیا بہانہ کریں۔ امن کے لیے یونائیٹڈ نیشن تو بنا دی لیکن امن ہوا تو اسلحہ اپنے گوداموں میں پڑا پڑا خراب ہو جائے گا۔ اتنی بڑی انوسٹمنٹ کباڑی کے ہاتھ لوہے کے بھاؤ بکے گی۔ اب کوئی ایسا بہانہ تراشیں جس سے سب کا فائدہ ہو۔ کسی ملک پہ حملہ کریں۔ اور ملک بھی ایسا ہونا چاہیے جہاں کچھ نکلتا ہو۔ اگر تیل ہو تو بہت اچھا ہے۔ نہیں تو ہیروں کی کانیں ہونی چاہیے یا سونا نکلے۔ جیسے ہی ملک پہ حملہ ہوا اس ملک کو جدید اسلحے سے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ جب مکمل قبضہ ہو گیا تو اس راکھ کے ڈھیر کو تعمیر بھی کرتا ہے۔ اپنی مرضی کا کٹھ پتلی حکمران بھی بٹھاتا ہے۔ جو نہ معدنی دولت نکالنے سے منع کرے نہ ہی ان کے معاملات میں دخل در معقولات کرے۔ اس کے بعد ملک کی تعمیر کے لیے ٹھیکے بھی امریکن اور برٹش کمپنیوں کو ملتے ہیں۔ سرمایہ امریکہ کا، آرکیٹیکٹ فرانس یا جرمنی کے، فورمین اٹلی اور یونان کے اور آخر میں پاکستانی، انڈین اور بنگالی مزدوری کے لیے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک طرف مسلمانوں کی مخالفت، مسلمان دہشت گرد اور دوسری طرف مزدوری کے لیے بھی یہی لوگ۔ پھر کبھی کبھی ان کو نماز کی اجازت دے دی۔ عید وغیرہ پہ کوئی تعریف کر دی یا تحفہ دے دیا تو یہ غریب مزدور خوش ہو جاتے ہیں کہ یہ غیر ملکی گورے تو بہت لبرل لوگ ہیں۔ ہمارے انتہا پسندوں نے خواہ مخواہ ان کے ملک میں جا کے ان کی دو بڑی عمارتیں تباہ کر دی ہیں۔"

"آغا جی اس واقعے کے مابعد اثرات پر کچھ روشنی ڈالیے۔"

"اس واقعے کے فوراً بعد یہ ہوا کہ ہوائی کمپنیوں کا کاروبار خسارے میں چلا گیا اس لیے اس پروپیگنڈے کو کم کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد جہاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں نفرت کی لہر دوڑ گئی وہاں مغربی دُنیا کا اسلام کے حوالے سے تجسس بھی بیدار ہو گیا اور انھوں نے مذہب اسلام کی بابت پڑھنا شروع کر دیا۔ مذہب اسلام کے بارے میں اخبارات میں چھپنے لگا۔ اب پوری دنیا کو پتا چل گیا ہے رمضان کیا ہوتا ہے، مسلمان حج کیوں کرتے ہیں۔ زکوۃ کیوں دیتے ہیں۔ ان کے کتنے فرقے ہیں۔ کچھ لوگ اب جہاں تنقید کرتے ہیں، وہاں تعریف کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں۔ بہت سے غیر ملکیوں نے تو اسلام قبول بھی کر لیا ہے بلکہ امریکہ میں تو اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔"

''آغائی آپ کی گفتگو کے بعد مجھے یوں لگنے لگا ہے کہ مسلمان دہشت گرد نہیں بلکہ اصل دہشت گرد امریکی ہیں۔ امریکی سے میری مراد عام امریکی نہیں بلکہ امریکی اسٹیبلشمنٹ ہے۔''

''آپ نے بالکل درست فرمایا۔۔۔ میری رائے میں بھی یہ الزام سب امریکیوں کو نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ کیونکہ امریکی شہریوں کی اکثریت بہت معصوم ہے۔ یہ تو ان کے پالیسی میکرز کا کام ہے۔ ان کی سیاسی لابیوں کا کام ہے۔ امریکہ کا کمال یہ ہے کہ آرنلڈ شوازنیگر امریکہ باڈی بلڈنگ کے لیے آیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ کیلیفورنیا کا گورنر بن گیا حالانکہ وہ آسٹرین تھا جبکہ پاکستان یا ایران میں ایسا ناممکن ہے۔ امریکہ ایک ملٹی کلچرل ملک ہے۔ یہاں ہر ملک، نسل، مذہب اور قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ دو سو سال پہلے یہاں ہسپانویوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان باہم خانہ جنگی ہوتی رہی۔ پھر ہسپانوی ایک طرف چلے گئے، فرانسیسی ایک طرف اور امریکہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ پھر ہر رنگ و نسل کے لوگ یہاں آنے لگے۔ ان میں ایرانی، انڈین، پاکستانی، چینی، افریقی، عرب غرض ہر طرح کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک تارکین وطن کو بہت کچھ پیش کرتا ہے۔ کام، آسائشیں، جس کے اندر کچھ کرنے کی دھن ہے اسے سب کچھ دیتا ہے۔''

''اب جو حالات چل رہے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ کیا رُخ اختیار کریں گے اور آگے چل کے کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے کچھ عرصہ یہی ریکارڈ بجتا رہے گا کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ پھر خبر آئے گی کہ طالبان کا خاتمہ ہو گیا۔ دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر ہالی ووڈ والے طالبان اور اُسامہ بن لادن پہ فلمیں بنائیں گے۔ اس کو ہر فلم میں ولن دکھائیں گے۔ جس طرح ہٹلر کو آج تک ولن دکھایا جا رہا ہے۔ یا امریکہ آج تک ویت نام میں ہاری ہوئی جنگ پہ فلمیں بنا رہا ہے۔ پھر افغانستان پہ فلمیں بنیں گی، عراق پہ فلمیں بنیں گی۔ امریکی خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے خوب پیسہ لگائیں گے۔ چند ایک فلموں کو آسکر ایوارڈ بھی دے دیں گے اور اس موضوع پہ کتابیں لکھنے والوں کو نوبل پرائز دلوائیں گے اور ان کی اچھی پبلسٹی کر کے ان کو بیسٹ سیلر بنوائیں گے۔ تم اگر کسی کتابوں کی دوکان پہ جاؤ تو تمہیں کئی افغانی، ایرانی اور عراقی لوگوں کی کتابیں ملیں گی جنھوں نے کسی صحافی کی مدد سے کتاب لکھی ہوگی۔ اس میں وہاں کے نظام کے بارے میں تنقید ہوگی اور امریکہ یا یورپین ملک جو بھی کرتے ہیں اس کی تعریف ہوگی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ آج بھی یورپین ہندوستانیوں کو بین بجا کر سانپ پکڑنے والے سپیرے ہی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہاں کا کوئی سنگر نصرت فتح علی خان ہے اور اب پاکستان دہشت گردی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔''

''اس میں میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔''

''میڈیا تو اس دور کا سب سے بڑا ہتھیار بن گیا ہے۔ پہلے ہر ملک کا ایک مخصوص ٹی وی سٹیشن ہوا کرتا تھا۔ اب پرائیویٹ چینلز کی وجہ سے ہر ملک میں دسیوں بلکہ سینکڑوں ٹی وی چینل ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں دنیا کے حالات پہ بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔ حل کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ ان پروگراموں کے اینکر یا جو بھی پروگرام کنڈکٹ کرتے ہیں بھاری رقم وصول کرتے ہیں۔''

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کو پروگرام سے پہلے بریفنگ ملتی ہو کہ صرف بحث ومباحثہ ہی کرنا ہے اس کا حل نہیں بتانا۔''

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ اب ایک طرف یورپین اور امریکن ٹی وی دنیا کو بتا رہا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور دوسری طرف الجزیرہ ٹی وی نئی نئی آڈیو اور ویڈیو ٹیپس لانچ کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان نہیں ٹی وی چینل آپس میں محاذ آرائی کر رہے ہیں۔''

''ایسے ٹی وی چینلز کو میڈیا وار میں اپنے ہتھیار کے طور پر کام میں لانے کے لیے ان کی مالی سرپرستی بھی کی جاتی ہو گی؟''

''یقیناً کی جاتی ہے اور ان پر پیسہ وہی لٹاتے ہیں جو اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کافی حد تک کامیاب ہو بھی جاتے ہیں بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہو چکے ہیں۔''

''آغائی بطور مسلمان ہم کو کیا کرنا چاہیے۔''

''ہمیں پڑھنا چاہیے، تحقیق کرنی چاہیے بجائے اس کہ ہم لوگ فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کریں۔''

''آغائی جب تک آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں خود کو بہت عالم فاضل سمجھتا تھا تاریخ کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد یہی سمجھتا تھا کہ میں علامہ بن گیا ہوں لیکن آپ سے مل کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا حالانکہ میں نے فرنچ زبان سیکھی، انگریزی زبان سیکھی، اطالین زبان

سیکھی لیکن حصولِ علم میں بہت پیچھے رہا۔"

"فرشتہ علم حاصل کرنا اور بات ہے زبانیں سیکھنا اور بات ہے میرے نکتہ نظر سے ہر زبان علم کی ایک الگ دُنیا کا دروا کرتی ہے اب یہ زبان سیکھنے والے پر ہے کہ وہ اس زبان کے ذریعے اس زبان کے علمی ذخیرے سے کتنا استفادہ کرتا ہے۔ سرسری حوالے سے بھی دیکھا جائے تو میری رائے میں تم بہت سے لوگوں سے بہتر ہو کیونکہ تم تین یورپین زبانیں جانتے ہو۔"

"یہ بات تو میرے دادا جی بھی کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک شخص اگر ایک سے زیادہ زبانیں جانتا ہوں تو وہ جتنی بھی زبانیں جانتا ہے وہ اتنے ہی انسانوں کی علمی طاقت کا مالک ہو جاتا ہے۔"

"تمہارے دادا جی صاحب علم آدمی تھے۔"

"میرے اندر علم کی شمع جلانے والے وہی تھے۔ میرے اندر یہ جو تجسس کی بھرمار ہے وہ میرے دادا جی کی وجہ سے ہی ہے۔"

"اور تمہارے والد صاحب۔"

"میرے والد صاحب پاکستان کے بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ اتنے بڑے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔"

"اور تم اس طرح کی زندگی کیوں گزار رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں اسی طرح خوش ہوں۔"

رضا نے کہا" مجھے اُمید ہے کہ آج کی گفتگو نے نائن الیون کے حوالے سے تمہارے بہت سے شبہات دور کر دیے ہوں گے۔" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا" آغا ئی، آپ کا بہت شکریہ کہ آپ کی وساطت سے اب میں یہ جان گیا ہوں کہ مسلمان دہشت گرد نہیں۔ ان کا گیارہ ستمبر کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے جب سے ٹی وی پہ دیکھا تھا مجھے اپنا آپ برا لگنے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں خود ورلڈ ٹریڈ سنٹر گرائے جانے کا مجرم ہوں لیکن اگر میں یہاں نہ آتا، آپ سے نہ ملتا تو مجھ پہ یہ زاویۂ نظر کبھی بھی آشکار نہ ہوتا۔"

جس از یل ہائم میں رضا رہتا تھا وہاں کا ہاؤس ماسٹر آیا اور کہنے لگا" تم دونوں کو یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے اندر چلے جاؤ۔"

رضا بولا" مہمان آیا ہے۔"

اس کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ ایسا ٹوٹا کہ پھر بات چیت آگے نہ بڑھ سکی۔ میں نے رضا سے اجازت لی اور وہاں سے پیدل ہی ازیل ہائم واپس چلا آیا۔

○○○

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ میرا انٹرویو چھپنے کی دیر تھی۔ مجھے کئی لوگوں کے خط اور پوسٹ کارڈ موصول ہونے لگے۔ ان میں سے ایک پوسٹ کارڈ تو کیتھرین کا تھا۔ ایک کارڈ کسی ایرون شاٹس مین (Ervin Shatzman) کا تھا۔ ایک کارڈ ونٹرتھور میوزیم کی ڈائریکٹر کا تھا۔ کیتھرین نے میری مداحی میں کافی کچھ لکھا تھا۔

ایرون شاٹسمین نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ اس نے اپنا فون نمبر بھی لکھا تھا۔ میوزیم کی ڈائریکٹر نے مجھے میوزیم دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں جہاں بھی جاتا لوگ مجھے پہچان جاتے۔ لائبریرین اب مجھے گھور گھور کے نہ دیکھا کرتی۔ جم میں ایک نوجوان لڑکا کام کرتا تھا اس نے مجھے اپنا لائبریری کارڈ دے دیا تھا کہ مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے میں جب چاہوں لائبریری سے کتاب یا فلم لے سکتا ہوں۔ ونٹرتھور میں ایک دوکان تھی اس کے پاس دنیا کے ہر ملک کی چائے کی پتی تھی۔ میں اس سے پتی لینے گیا تو اس نے مجھ سے پیسے لینے سے انکار کرتے ہوئے پتی ہدیہ کر دی۔ میں بازار سے گزرتا تو کئی لوگ مجھے پہچان جاتے تھے۔ اور تو اور جب میں ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر جاتا تو وہاں کا ڈائریکٹر میرے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے پیش آتا۔ شیفر کا رویہ تو میرے ساتھ پہلے ہی اچھا تھا لیکن اب شنائیڈر بھی مجھ سے ٹھیک طریقے سے پیش آنے لگا۔ میں جمعرات کو جب سوشل لینے گیا (جسے میں خیرات یا بھیک سمجھتا تھا اور یہ بات میں انٹرویو میں بھی کہی تھی۔) تو بینک کا کلرک مجھے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں میں پہلا شخص تھا جس نے اس رقم کو بھیک کا نام دیا تھا۔

اب گلبدین ازیل ہائم واپس آ گیا تھا اور میری رضا سے کئی دنوں سے ملاقات بھی نہیں ہو پائی تھی۔ وہ کئی دفعہ زیورخ چلا جایا کرتا اور وہاں کئی کئی دن رہ کر آتا۔ میں ہفتے کے روز میوزیم چلا گیا۔ وہاں کی ڈائریکٹر مجھے دروازے پہ ملنے آئی۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کروایا۔ میں نے کہا۔ مجھے تمہارا کارڈ مل گیا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ پھر اس نے مجھے پورا میوزیم دکھایا اور کہنے لگی یہاں ایک میوزیم ہے اس کا نام ہے ولا فلورا (villa flora)۔ وہاں پہ ہالینڈ کے پینٹر وین گوگ (van gagh) کی تصاویر نمائش کے لیے لائی جا رہی ہیں۔ تم نے اپنے انٹرویو میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس

لیے میں تمہیں دو ٹکٹ گفٹ کرتی ہوں۔ تم جب چاہو، وہ نمائش دیکھنے جا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے اگلے ہفتے اس کی تصاویر کی نمائش شروع ہو جائے گی۔

ونٹرتھور کا میوزیم مجھے قصباتی سا لگا۔ میں پاکستان میں ٹیکسلا میوزیم، لاہور میوزیم، پشاور میوزیم دیکھ چکا تھا اس کے علاوہ چارسدہ اور سوات کے میوزیم بھی دیکھ چکا تھا جہاں بدھ تہذیب کے نادر نمونے محفوظ تھے۔ خیر میوزیم دیکھنے کے بعد میں اس خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کی طرف سے پیش کردہ ولافلورا (villa flora) کے دو ٹکٹ بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیے۔ میری خواہش تھی کہ ایروِن شانسمین سے بھی مل لوں کیونکہ اس نے اپنے کارڈ میں پاکستان کا ذکر بھی کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیر کر چکا ہے اور اس نے ان کی بہت تعریف کی تھی۔ میں میوزیم سے واپس آیا تو شیفر سے کہا کہ میں ایروِن شانسمین سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے بس کا نمبر بتایا، سٹاپ کا بتایا اور اس کے بعد کمپیوٹر سے اس کے گھر کے راستے کا پرنٹ آؤٹ نکال کے لے آیا۔ میں نے سوچا آج شام کو اس سے مل ہی لینا چاہیے۔ اس نے کارڈ پہ اپنا موبائل نمبر لکھا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا موبائل نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے جرمن انداز میں ہیلو کی آواز آئی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو کہنے لگا آج شام کو میں گھر پہ ہی ہوں۔ میں آج کل ایک پراجیکٹ پہ کام کر رہا ہوں۔ تم آسکتے ہو۔ تمہارے ازیل ہائم سے اُوپر کی طرف ایک راستہ ہے۔ وہ سیدھا میرے گھر کی طرف آتا ہے۔"

میں نے کہا" میں بس کے ذریعے آؤں گا۔"

وہ کہنے لگا" بس سے اُتر کے ریل کی پٹڑی کے ساتھ چلنا شروع کر دینا۔ تمہیں میرا گھر دور سے ہی نظر آ جائے گا۔ میرا گھر نئے وزٹرز کو اکثر عجیب وغریب دکھائی دیتا ہے۔"

میں نے کہا" ٹھیک ہے شام کو ملاقات ہوتی ہے۔" میں نے یہ کہہ کے فون بند کر دیا۔

شام کو میں شیفر کی بتائی ہوئی بس پہ بیٹھ کے شانسمین کے گھر روانہ ہو گیا۔ بس سے اتر کے میں نے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ شانسمین کا گھر کون سا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ کونے میں جو رنگ برنگا مکان ہے، اُسی کا ہے۔ یہ مکان ایک پرانی عمارت پہ مشتمل تھا۔ اس کے صحن میں بہت سے لکڑی کے مجسمے پڑے ہوئے تھے۔ سامنے لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں دروازے کو اندر کی طرف دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک کونے میں ایک شخص لکڑی کے مجسمے کی نوک پلک سنوار رہا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا کہ میں

ازمیل ہائم سے آیا ہوں۔ میرا نام فرشتہ سبزواری ہے۔ میں سمجھا یہ ایرون شانسمین ہے جس نے مجھے بلایا ہے لیکن وہ کہنے لگا "میں نے پہچانا نہیں۔"

میں نے پوچھا" کیا تم ایرون شانس مین نہیں ہو؟"

وہ کہنے لگا" اوہ خوب یاد دلایا تم ایرون شانسمین کے ملاقاتی ہو۔ وہ اندر کمرے میں ہے۔ میں اسے ابھی بلاتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے کام کرتے ہیں۔ آج کل ہمیں ایک ریسٹورنٹ کے لیے لکڑی کے سٹول بنانے کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے۔" وہ یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ ایک عجیب وغریب ہیئت وحلیئے کا شخص وارد ہوا۔ دبلا پتلا، داڑھی بڑھی ہوئی اور اتنی بڑھی ہوئی کہ اس کی شباہت لٹکتی ہوئی دکھائی دی۔ شانسمین نے اپنی لمبی داڑھی کے بالوں کو بل دے کے اس کے آخری سرے میں بڑے بڑے منکے پروئے ہوئے تھے۔ سر سامنے سے گنجا تھا لیکن دونوں اطراف کے بالوں کو بڑھا کے ان کی چٹیاں کی ہوئی تھیں۔ یہ شخص کہہ سکتا تھا کہ وہ گنجا بھی ہے اور اس نے لمبے لمبے بال بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جینز کے اوپر ایک لمبا سا عجیب وغریب چغا پہنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی شرٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے آتے ہی جرمن انداز کی انگریزی میں مجھے ہیلو کہا۔ میں خوش ہوا چلو استقبال تو اچھا ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں بہت ساری انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ میں نے کہا" تو آپ ہیں ایرون شانسمین۔

کہنے لگا" آپ کیا ہوتا ہے تم کہو۔ میں نے تمہارا انٹرویو پڑھا بہت خوشی ہوئی اور زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ تم پاکستانی ہو۔"

میں نے کہا" ڈر نہیں لگا، یا غصہ نہیں آیا کہ ایک دہشت گرد کا انٹرویو پڑھا ہے۔"

کہنے لگا" چھوڑو ان باتوں کو کیا پیو گے۔ وسکی، وائن یا کوئی اور چیز۔"

میں نے کہا" میں شراب نہیں پیتا۔"

تو کہنے لگا" میں تمہارے لیے ملک شیک بنا کے لاتا ہوں۔ بلکہ ایسا کرو اندر ہی آجاؤ۔ باہر بہت دھوپ ہے۔"

میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس کا دوست باہر لکڑی کے مجسمے کے ساتھ ہی کام کرتا رہا۔ میں گھر کے اندر داخل ہوا۔ گھر کیا تھا عجائب گھر تھا۔ اس نے مجھے گھر کی سیر کروانی شروع کی۔ کہنے لگا" اس مکان میں تم جو بھی چیز دیکھ رہے ہو، میں نے خود بنائی ہے صرف اس کا ڈھانچہ میں نے

سوئس حکومت سے خریدا ہے۔ یہ ایک پرانا مکان تھا۔ اس علاقے کے میئر کا خیال تھا یہاں کے تمام پرانے مکان گرا دیئے جائیں۔ میں نے چند لوگوں سے مل ملا کے یہ مکان خرید لیا۔ اس کا ہاتھ میں نے خود سجایا ہے۔" اس گھر کی ہر چیز عجیب و غریب تھی۔ کہیں سے سیڑھیاں اُوپر کہیں سے نیچے جا رہی تھیں، پھر اس نے مجھے اپنا سٹوڈیو دکھایا۔ جہاں وہ کسی پینٹنگ پہ کام کر رہا تھا۔ کہنے لگا "ویسے تو میں سوئس میں ایک مجسمہ ساز کی حیثیت سے جانا جاتا ہوں لیکن میں کبھی کبھی مصوری بھی کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے بنائے مجسمے نظر نہیں آ رہے؟"

اس نے جواباً میری طرف حیرانی سے دیکھا تو میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "دراصل میں گمان کرتا ہوں کہ مجسمہ صرف سنگ مرمر یا پتھر کا ہوتا ہے۔۔۔ اس لیے میں نے یہ سوال کیا تھا۔"

وہ کہنے لگا "میں لکڑی کے مجسمے بناتا ہوں۔ ہم لوگ اٹالین یا گریکس کی طرح نہیں ہیں۔"

کہنے لگا "آؤ تمہیں کچھ تصاویر دکھاؤں۔ اس نے، البم کھولی تو مجھے گائیڈنگ کا دور یاد آ گیا۔ ان تصاویر میں چترال، گلگت، ہنزہ، کافرستان، پشاور، ٹیکسلا اور تخت بائی کی تصاویر تھیں۔ تصاویر میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ یہ سارے ایک ٹرک میں سوار تھے۔ شاسمین مجھے بتانے لگا "یہ تصاویر ۱۹۷۷ء کی ہیں۔ ہم لوگ ٹرک کے ذریعے انڈیا، پاکستان اور افغانستان کی سیر کرنے گئے تھے۔ پاکستان بہت خوبصورت ملک ہے۔ وہاں کے پہاڑ، جھیلیں اور وادیاں بہت خوبصورت ہیں۔ سب سے بڑھ کے وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی۔"

میں نے کہا "اور وہاں کی دہشت گردی؟"

کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب پروپیگنڈہ ہے۔ میں تو اسامہ بن لادن کا بہت بڑا فین ہوں۔ اس نے مجھے اسامہ بن لادن کا بہت بڑا پوسٹر دکھایا۔ کہنے لگا "شکر ہے کسی نے امریکہ کو بھی آنکھیں دکھائی ہیں۔"

میں نے اس کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ کیونکہ رضا نے مجھے اس حوالے سے ہوشیار کر رکھا تھا کہ یہاں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نہ نکل جائے جس کا بعد میں خمیازہ بھگتنا پڑے۔ اس دوران میں اس نے مجھے ملک شیک پلایا۔ ہم دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ پھر میں نے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ اگر تمہیں کسی وقت موقع ملے تو ازیل بائم آنا اکٹھے کھانا

کھائیں گے۔"

کہنے لگا "کھانا چھوڑو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اگر تم مجھے پاکستانی چائے پلاؤ گے تو؟"

میں نے کہا "چلو ابھی چلتے ہیں۔"

اس نے ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل لی اور میرے ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا "میرے گھر کے پاس ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ یہاں سے سیدھا راستہ تمہارے ہائم کی طرف نکلتا ہے۔"

ہم دونوں اس کے گھر سے نکلے۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ گھنے اور سرسبز درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ راستے میں کئی ادھ جلی لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں لوگ یہاں پکنک مناتے آتے ہوں گے۔ ہم دونوں پندرہ منٹ چلتے رہے اور مختلف موضوعات پہ باتیں کرتے رہے۔ اس نے گفتگو کے دوران مجھ پر بالکل ظاہر نہ کیا کہ میں ایک ایسے ملک سے آیا ہوں جو پوری دنیا میں دہشت گردی کے لیے بدنام کر دیا گیا ہے۔ ایک اونچی سی پگڈنڈی آئی۔ شانسمین بولا "وہ نیچے دیکھو۔۔۔ازیل ہائم۔"

میں نے درختوں کے جھنڈ سے نیچے دیکھا تو ازیل ہائم کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں اس پگڈنڈی سے نیچے اترے اور ازیل ہائم کے باہر بنے ہوئے چھوٹے سے باغیچے کے پاس پہنچ گئے۔ ہم دونوں جیسے ہی ازیل ہائم کے اندر داخل ہوئے تو شیفر میرے ساتھ ایرون شانسمین کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ عام طور پہ شیفر جلدی چلا جاتا تھا لیکن آج اسے ازیل ہائم میں کوئی کام تھا اس لیے وہ ابھی وہیں تھا۔ میں نے ایرون کو کرسی پیش کی اور خود چائے بنانے چلا گیا۔ ازیل ہائم میں ہمیشہ کی طرح چہل پہل تھی۔ میرے اور شیفر کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کون آیا ہے۔ جب میں چائے بنا کے باہر آیا تو شیفر اور ایرون باتیں کر رہے تھے۔ شیفر کہنے لگا "تم جانتے ہو یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "ہاں یہ یہاں کا مشہور مجسمہ ساز ہے۔"

شیفر بولا "یہ صرف ونٹر تھور کا ہی نہیں بلکہ پورے ملک کا مشہور ترین مجسمہ ساز ہے۔"

میں نے کہا "ہاں میں نے اس کے بنائے ہوئے مجسمے دیکھے ہیں۔ میں ابھی اس کے سٹوڈیو سے ہی آ رہا ہوں۔"

چائے کے دوران ایرون نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ پاکستان کی سیاحت کے دوران کتنی

چائے پیتے تھے۔ پھر مجھے بتانے لگا کہ وہ پہلے بہت غریب تھا۔ اس نے کسی فائن آرٹ سکول سے کسی قسم کی کوئی ڈگری نہیں لی۔ سارا کام خود سیکھا۔ اس نے بتایا "میں نے سائیکالوجی میں تعلیم حاصل کی لیکن مجھے مجسمے بنانے کا شوق تھا۔ یہاں یہ لکڑی بکثرت مل جاتی ہے اس لیے میں نے لکڑی کے مجسمے بنانے شروع کر دیئے۔ میں ونٹرتھور کے علاقے گراہن میں چھوٹے سے ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میرے بنائے ہوئے مجسمے بکنے لگے۔"

میں نے کہا "اور اب۔"

وہ کہنے لگا "اور اب مجھے ایک کمپنی کے اشتہار کے لیے ہزاروں سوئس فرانک تک مل جاتے ہیں۔ جتنی دفعہ ایڈ چلتی ہے یا اخبار میں چھپتی ہے۔ یہ رقم ملٹی پلائی ہوتی رہتی ہے۔"

میں نے پوچھا "تم نے شادی نہیں کی۔"

کہنے لگا "شادی کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ دودھ پینے کے لیے کیا ضروری ہے کہ گائے صحن میں باندھ لی جائے آخر چھوڑ تم نے انٹرویو میں کہا تھا کہ تم سیاحت کے شوقین ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کب میرے ساتھ سوئس کی سیاحت پر نکل سکتے ہو۔ میرے پاس اپنا کیراوان ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔"

میں نے کہا "میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے چائے ختم کی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا "اب میں چلتا ہوں۔ میرا کارڈ تمہارے پاس ہے۔ جب دل چاہے مجھے فون کر کے آ جانا۔ مجھے جانا ہوگا کیونکہ ہمیں ایک پراجیکٹ ملا ہوا ہے۔ میں صبح سے اس پر کام کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ چائے بھی پی لوں گا اور تھوڑی تازہ ہوا بھی لے لوں گا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں نہیں روکوں گا۔" میں اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس نے اپنی سائیکل لی اور اسی جنگل میں گم ہو گیا جس میں سے ہوتے ہوئے ہم دونوں آئے تھے۔

OOO

ازیل ہائم میں ایک اور بھی سلسلہ چلا ہوا تھا۔ یہاں ایک دو لڑکے مل کے تھوڑے پیسے ڈال کے زیورخ تک کا پاس بنا لیتے اور کسی کو زیورخ جانا ہوتا تو اس سے پیسے لے کر پاس اسے دے دیتے کیونکہ ہر روز تو زیورخ کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس بنگالی جس نے شاکیرہ کے گانے پہ ڈانس کیا تھا، نے

بھی زیورخ کے لیے پاس بنوایا ہوا تھا۔۔۔ وہ اس پاس کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھے اس بارے میں سینیگال کے لڑکے محمد وترا اوانی نے آگاہی دی تھی۔ خیر اتوار کے دن میرا زیورخ جانے کا پروگرام بنا۔ میں نے اس سے پاس مانگا تو اس نے مجھے بنا حیل وحجت پاس دے دیا کیونکہ میں نے اس کا موبائل فون ایکٹیویٹ کروایا تھا۔ اس کو کسی نے نئے ماڈل کا موبائل بیچا تھا جو غلط پن نمبر کی وجہ سے بلاک ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ میرا ممنون تھا۔ میں نے اس سے پاس لیا اور بس سٹاپ پہ آ گیا۔ اتوار کو سڑکوں پر بسیں کم ہوتی ہیں۔ اس لیے میں نے آدھا گھنٹہ بس سٹاپ پہ انتظار کیا۔ مقررہ وقت پہ بس آئی اور میں ونٹرتھور پہنچا۔ سوئس میں ایک بات اچھی ہے کہ بسیں اور ٹرینیں وقت پر آتی ہیں اور دوسری اچھی بات یہ تھی کہ ویک اینڈ پہ بڑے شہروں کے لیے زیادہ ٹرینیں ہوتی ہیں۔ میں زیورخ جانے والی ٹرین پہ بیٹھا۔ ٹرین میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ گرمی بہت زیادہ تھی اس لیے بہت سے لوگ زیورخ کی مشہور جھیل بیلاریو پر جا رہے تھے۔ میں نے زیورخ کا ریلوے سٹیشن دیکھا تھا۔ اس کے بعد کرائس لنگن سے واپسی پہ یہاں رکا تھا اس کے بعد تیسری بار اب زیورخ جا رہا تھا۔ ایک سٹاپ کے بعد مجھے ٹرین میں جگہ مل گئی۔ میں ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین کب زیورخ پہنچی مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا۔ میرا ٹکٹ ٹرام، بس اور ٹرین سب کے لیے ویلڈ تھا۔ میں آج تک ٹرام میں نہیں بیٹھا تھا اس لیے میں نے سوچا میں بیلاریو ٹرام پہ بیٹھ کے جاؤں گا کیونکہ میں نے کئی شخصیتوں کو ووڈیوز میں ٹرام میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا اور ہاپن ہوف سترازے کی ٹرام پہ بیٹھ گیا۔ اس کے تین ڈبے تھے۔ اندر جا بجا کھڑکیاں تھی۔ ریل کی پٹڑی کی طرح لوہے کی پٹڑیاں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور اوپر کسی بجلی کے تار کے ساتھ اس کا کنکشن تھا۔ میں ٹرام میں جیسے ہی سوار ہوا فلمی انداز میں محسوس کرنے لگا پوری ٹرام میں، میں ہی سب کا مرکزِ نگاہ ہوں جیسے میرا سٹاپ آیا اور میں اُتر گیا۔ میں نے ٹرام سے اتر کے سڑک پار کی اور پل پہ چلنے لگا۔ سامنے بہت بڑی جھیل تھی۔ اس کا نام بیلاریو ہے اور اسے زیورخ جھیل بھی کہا جاتا ہے۔ جھیل کے ساتھ ایک راستہ بنا ہوا تھا، جس پر جا بجا کھانے پینے کی چیزوں کے ٹھیلے لگے ہوئے تھے۔ میں کافی دیر اس راستے پر چلتا رہا۔ جیسے جیسے چلتا گیا مجھے بنا کپڑوں کے لوگ نظر آتے گئے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، لڑکیاں۔ ہر عمر کے لوگ تھے۔ کسی نے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اجتماعی برہنگی کا ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ارد گرد نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ میں واحد شخص ہوں جو ملبوس کار ہین بار ہے۔ سو ایسے میں مجھے اپنا آپ عجیب سا

نکلنے لگا یا یوں کہہ لیں کہ مجھے اپنے ستر پوش ہونے پہ شرم محسوس ہونے لگی۔ اس لیے میں یہاں سے واپس چلا آیا۔

میں گھر سے سینڈوچ بنا کے لایا تھا۔ ساتھ کوک کا ایک ٹن تھا، پانی کی بڑی بوتل تھی، میں پورا ٹورسٹ بن کے آیا تھا۔ میں نے بیگ سے سینڈوچ نکالا اور کھانے لگا۔ سامنے ایک افریقن لڑکا مکئی کے بھٹے بیچ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور دیکھ کے حیران رہ گیا کہ میرے سامنے یادو نے چکوچان کھڑا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔

میں نے کہا "یہ سب کیا ہے، میرے دوست؟"

کہنے لگا "میری ازیل ہائم یہاں زیورخ میں ہی ہے۔ سوشل سے گزارا نہیں ہوتا اور سارا دن بور ہوتا رہتا ہوں اس لیے یہاں مکئی کے بھٹے بیچتا ہوں۔ اچھے پیسے بن جاتے ہیں۔ یہاں پہ پولیس بھی اتنی رخنہ انداز نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "تم نے موبائل مینوفیکچرنگ کی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس لیے خدا نے ہمیں وہ بات مکمل کیے جانے کے لیے دوبارہ ملا دیا ہے۔"

اس نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کچھ کھایا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی ابھی دو سینڈوچ ختم کیے ہیں اور کوک کا ایک ٹن پیا ہے۔ پیٹ بھر گیا ہے لیکن مکئی کے بھٹے دیکھے تو سوچا ایک لے لوں مجھے کیا پتا تھا یہاں یادو نے چکوچان ہوگا۔"

وہ بڑا حیران ہوا کہ مجھے اس کا نام یاد تھا۔ وہ ساتھ ساتھ باتیں کرتا رہا اور مکئی کے بھٹے بھی بیچتا رہا۔ میں نے اسے رضا کے بارے میں اور کچھ کچھ اس سے کی ہوئی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

گفتگو کے دوران اس نے مجھے بتایا کہ موبائل فون میں دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ سلیکان اور ڈائمنڈ۔ یہ دونوں چیزیں سیرالیون میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی موبائل کمپنیاں سیرالیون میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے مختلف عسکری گروہوں کی سرپرستی کرتے ہوئے ان کی عسکری سرگرمیوں کے لیے سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ نتیجتاً سیرالیون خانہ جنگی جیسی صورت حال کا شکار ہو چکا ہے۔ ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے اور کرنسی کی قیمت گر چکی ہے۔ یہی کمپنیاں اس صورت حال کو کیش کرواتے ہوئے سستے داموں سیرالیون سے سلیکان اور ڈائمنڈ لیتی ہیں۔ اس نے مجھے مزید بتایا کہ وہ موبائل فون اسی لیے استعمال نہیں کرتا کیونکہ اسے ایسا لگتا ہے جیسے

موبائل فون سے سیرالیون کے بے گناہ اور معصوم انسانوں کا خون رس رہا ہو۔

میں شام چار بجے تک جادو نے چکوچان کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر ہم ایک ٹھیلے سے کیپو چینو پینے چلے گئے۔ کیپو چینو پینے کے بعد میں اسے دوبارہ ای میل ایڈریس اور موبائل نمبر دیا اور اس سے اجازت لی۔ ٹرین کے سفر کے دوران میں سارے راستے سوچتا رہا کہ موبائل فون سے خون کیسے رستا ہے؟ جیسے ہی ازیل ہائم پہنچا میں نے سب سے پہلے ہاؤس ماسٹر سے پیچ کس لیا۔ ہال میں پڑے ہوئے مستطیل میزوں میں سے ایک پہ بیٹھ کے موبائل فون کھولا۔ اس میں سے مجھے بھی یادو نے چکوچان کی طرح انسانوں کا خون رستا دکھائی دیا۔ انسانوں کی سسکیاں سنائی دیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے اپنا پرانا موبائل سیٹ اسی وقت زمین پہ پٹخ دیا کیونکہ اس وقت وہی میرے ہاتھ میں تھا۔ ازیل ہائم میں نوکیا فون کے پلاسٹک کے ٹکڑے بکھر گئے۔ یہ وہی فون تھا جو میں کرائس لنکن انٹرنیٹ کیفے پہ چھوڑ آیا تھا اور کیتھرین نے مجھے پارسل کے ذریعے بھیجا تھا۔ اپنا دوسرا موبائل میں نے بلیر سنگھ کو گفٹ کر دیا۔

O

ثقلین کو نیائش کی فیکٹری میں کام مل گیا تھا۔ اس نے نیا نیا کام شروع کیا تھا اس لیے وہ بدھ جمعرات کو ہمارے گھر نہ آیا۔ جمعے کی شام اس نے قدم رنجہ فرمایا اور مختصر وقت میں مختصراً گزشتہ دو دن کی روئیداد سنا ڈالی۔ اس کے ساتھ ساتھ نیائش نے یہ خبر بھی سنائی کہ اب پری پیکر ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ نیائش کہنے لگا" یہ سوموار کی شام ہمارے ہاں آ جائے گا۔"

میں نے کہا" یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں سو جایا کروں گا۔ ثقلین اور تم کمرے میں سو جایا کرنا۔"

ثقلین بولا" میں ڈرائنگ روم میں سو جایا کروں گا۔"

میں نے کہا" پہلے تم آ جاؤ پھر فیصلہ کریں گے۔"

کھانا وغیرہ کھا کے ثقلین نے اجازت طلب کی کیونکہ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ کام سے سیدھا ہمارے ہاں چلا آیا تھا۔ میں نے خاموشی سے اسے اگلا باب دیا تو کہنے لگا" آخر موبائل فون استعمال نہ کرنے کا اپنا راز افشا کر ہی دیا تم نے۔۔۔ لیکن ایک تمہارے موبائل فون استعمال نہ کرنے سے موبائل کمپنیاں بند تو نہیں ہو جائیں گی۔"

میں نے کہا" کم از کم میرے دل کو تسلی تو ہوتی ہے کہ میں اس صورتِ حال میں اپنی حد تک اپنا کردار بطریق احسن ادا کر رہا ہوں۔"

''ہائی واوے فرشتہ صاحب، آپ جیسے منطقی انسان کا جذبات کی رو میں بہہ کر فون سیٹ توڑ ڈالنا، اور سیل فون کا استعمال ترک کر دینا میری سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ یا وو نے چکو چان جیسے کسی اجنبی شخص کی باتوں پر بغیر تحقیق کیے آپ نے ایسے احتجاجی اقدام کا فیصلہ کیوں کر لیا ذرا اس کی وضاحت فرما دیجیے۔۔۔''

میں نے کہا۔۔۔ ''ایک وضاحت تو میں پیش کر ہی چکا ہوں کہ سیرالیون کے عوام کی نظری حمایت کرتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ احتجاجاً کیا اور اس کی دوسری وضاحت جو شاید میں بیان نہیں کر سکا وہ یہ ہے کہ موبائل فون نے مجھ سے میری سب سے قیمتی متاع یعنی میری تنہائی چھین لی تھی۔''

OOO

اب میں موبائل فون کے بغیر تھا، جب سے چکو چان نے مجھے یہ بتایا تھا کہ موبائل فون سے اس کے ہم وطن مظلوم انسانوں کا خون رستا ہے مجھے اس کے استعمال سے نفرت ہو گئی تھی۔ سوئس لوگ ویسے بھی اطالویوں کی بہ نسبت موبائل فون بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ اب میرا رابطہ سب کے ساتھ ای میل کے ذریعے تھا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ میری رضا سے ملاقات نہ ہوئی۔ اس دوران ونٹرتھور کے بڑے ہسپتال میں میری ریڑھ کی ہڈی کا ایکسرے ہوا جو ڈاکٹر بوہر گر نے دیکھ کے بتایا تھا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے کہا تمہاری کمر کا درد مسکولر پین ہے نہ کہ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے اوور ہیول آئے ہوئے پورا مہینہ نہیں ہوا تھا لیکن میری فرنچ کٹ قریباً آدھی سفید ہو چکی تھی اس لیے میں نے بازار سے بلیچ لے کے ساری ہی سفید کر لی تھی۔ سٹیشن کے پاس ایک دوکان سے کان بھی چھدوا لیا تھا۔ میں ایک ہی طرح کی زندگی گزارتے اُکتا گیا تھا اس لیے میں نے اس طرح کا حلیہ بنا لیا۔ اس دوران میں مسلسل رضا کی ازیل ہائم جا کے اس کے بارے میں پوچھتا۔ ای میل دیکھتا شاید اس نے میل کی ہو۔ ابھی اس نے چند ایشوز پر اور بھی بات کرنی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کمی کازے (Kamikaze) کیا ہوتے ہیں، سوسائیڈ بومنگ (Suicide bombing) کیا ہوتی ہے۔ میں خود بھی گوگل سرچ انجن پہ دیکھ سکتا تھا لیکن رضا کی تحقیق بہت زیادہ تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں ازیل ہائم کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دور سے سفید بالوں والا ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ اس کی مونچھیں بھی سفید تھیں۔ جب وہ پاس آیا تو مجھے یقین ہی نہ ہوا کہ یہ رضا تیتلی ہے۔ آتے ہی کہنے لگا: ''تمہارے موبائل کو کیا ہوا۔ میں کئی دنوں سے کوشش کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا" پہلے کچھ کھاتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔"

رضا کا رنگ گندمی تھا اور چہرے کی رنگت کے ساتھ سفید بال بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اب اس کے بال زیادہ واس لیے نمایاں ہو گئے تھے کیونکہ میں اس سے کافی دنوں بعد مل رہا تھا اور اس نے بال بھی نہیں کٹوائے تھے اور فیس پر مونچھوں کا اضافہ نیا تھا۔ میں نے رضا کو کرسی پیش کی اور خود ازیل ہائم کے کچن میں کھانے پینے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ میں نے کچھ پکوڑے بنائے ،فنگر چپس کا اہتمام کیا، کیچپ اور میونیز نکالی۔ اپنے لیے چائے بنائی اور رضا کے لیے کوک کی بوتل۔ یہ سارا سازوسامان میں نے ٹرے میں رکھا اور باہر آ گیا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہاں دھوپ نہیں آ رہی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

رضا کہنے لگا" تم تو بہت کچھ لے آئے ہو۔"

میں نے کہا" اتنے دنوں بعد نظر آئے ہو۔ ساتھ ساتھ کھاتے بھی ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔"

رضا بولا" اب بتاؤ، میرے لیکچر کا کوئی اثر ہوا، یا اب بھی تم مسلمانوں کو وحشت گرد تسلیم کرتے ہو۔"

"نہیں اب تو میں بڑی شان سے چلتا ہوں۔ لیکن کمی کازے، اور خودکش بمباروں کے بارے میں اب بھی سوچتا ہوں تو جسم میں ایک عجیب طرح کی کپکپی محسوس ہوتی ہے۔"

رضا بولا" چھوڑو ان باتوں کو تم یہ بتاؤ اتنے دن کیا کرتے رہے؟"

میں نے کہا" میں کسی نہ کسی کام میں خود کو مصروف رکھتا ہوں۔ لائبریری جاتا، جم جاتا، ونٹرتھور کی سیر کرتا، نئے نئے لوگوں سے تعلقات بناتا، کبھی زیورخ چلے جاتا۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ اٹلی چلا جاؤں، سنا ہے وہاں کی امیگریشن کھل رہی ہے، لیکن ذرا یہ تو بتا ئیں آغائی کہ آپ غائب کہاں ہو گئے تھے؟"

رضا بولا" میں ایک مہینے سے زیورخ میں تھا۔ شاید پھر چلا جاؤں۔ میں جب واپس آیا تو ہاؤس ماسٹر نے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم کئی دفعہ میرا پوچھنے آئے ہو۔ میں ویسے ہی آیا تھا۔ اتفاق سے تم باہر ہی مل گئے۔"

میں نے کہا" آغائی ابھی کچھ تشنگی باقی ہے۔ میرا دل مطمئن نہیں۔ میں یہی سوچتا ہوں کہ انسانی دماغ میں اپنے جسم پہ بم باندھ کے دھماکہ کرنے کا خیال کہاں سے آتا ہے۔ ان کو کمی کازے کیوں

کہتے ہیں۔ خود بھی مر جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی مار دیتے ہیں۔ یہ کام انسان نے کب شروع کیا۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالتے ہو۔ اتفاق کی بات ہے میری تحقیق بھی ان تمام موضوعات پہ محیط ہے اور اسی وجہ سے مجھے ایران چھوڑنا پڑا۔ میں نے سیاسی پناہ کے لیے جو انٹرویو دیا ہے اس کی بنیاد بھی اسی چیز پر ہے اس لیے مجھے یہ سب یاد ہے۔ سب سے پہلے کمی کازے کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

"کمی کازے" یہ جاپانی کا لفظ ہے۔ کمی کا مطلب ہے خدا اور کازے کا لفظی مطلب ہے خدائی ہوا یا غیبی ہوا یا غیبی مدد۔ ہوا کچھ اس طرح کہ منگولین فوجوں نے دو دفعہ جاپان پہ حملہ کیا ایک دفعہ ۱۲۷۴ء اور دوسری دفعہ ۱۲۸۱ء میں۔ اسے تم محض اتفاق سمجھ لو یا غیبی امداد سمجھ لو کہ دونوں دفعہ ایسا خطرناک طوفان آیا کہ منگولین فوجیں بکھر گئیں اور وہ جاپان کو فتح نہ کر سکیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی شاہی نیوی نے اس عمل کا آغاز کیا لیکن اس وقت ان کو کمی کازے کے نام سے نہیں جانا جاتا تھا۔ ان کو شنپو کہا جاتا تھا۔ اس کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ جاپانی پائلٹ جب اتحادی فوجوں کے ٹھکانوں پہ حملہ کرتے تو اپنا جہاز گرا کے خود بھی مرنے والوں میں شامل ہو جاتے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے لیے اس جنگی حکمت عملی پہ کام کرنے والا Rear Admiral Masafumi Arima تھا۔ اس نے اس کام کے لیے بہت سارے نوجوانوں کو ٹریننگ دینی شروع کی۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ کم عمر اور ناتجربہ کار نوجوانوں کو لیا جائے اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے۔ جاپان کے لوگوں کا شروع سے یہ ایمان تھا کہ ہماری زندگی بادشاہ کی امانت ہے اور بادشاہ کے لیے جان دینا عین عبادت ہے۔ اس لیے کئی صدیوں سے لوگ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر جان دیتے آئے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں لوگوں کے اس جذباتی لگاؤ کو اسی طرح استعمال کیا گیا جیسے پرانے وقتوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جاپان میں زیادہ تر لوگ شنتو ازم کے پیروکار ہیں۔ شنتو ازم کی تعلیمات کے مطابق بادشاہ کے لیے جان دینے سے انہیں مذہب میں اونچا مقام ملتا ہے اس لیے لوگ خوشی سے کمی کازے کی ٹریننگ لیتے، جو بمبار دشمنوں کے ٹھکانوں پہ جہاز گرا کے خود کو بھی مارتا اور ان کے ٹھکانے کو تباہ کرتا اس کے یاد میں Yasukuni میں ایک قبر بنائی جاتی اور جاپان کے اس مقام پہ وہاں کے بادشاہ سلامت سال میں دو دفعہ قدم رنجہ فرمایا کرتے۔ اس لیے بادشاہ سلامت کے لیے مرنا اور مرنے کے بعد یاسوکونی میں دفن ہونا ان کے مقدس مانا جاتا تھا۔"

''اس کا مطلب ہے کسی مذہب سے متعلق چیز کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا اور بعد میں مذہب کو بدنام کرنا۔ اس کے ماننے والوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند کا نام دینا ہم لوگوں کا کام ہے۔''

''بالکل جیسے اسلام میں جہاد کا تصور ہے۔ جو لوگ آپ کو استعمال کرتے ہیں وہ پہلے آپ کی کمزوری کو ڈھونڈتے ہیں۔ کہاں سے ان کی زندگی میں داخل ہو کے ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب کام نکل جائے تو وہی کمزوری جس کو استعمال میں لا کے انہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کیا تھا اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں یہی طاقت ہمارے خلاف استعمال نہ ہو جائے۔

جب جاپانی نیوی اور ائیر فورس نے ایسے نوجوانوں کو بھرتی کرنا شروع کیا تو ان کو شہد کی مکھیوں کا نام دیا کیونکہ شہد کی مکھی کا جب ڈنک نکل جاتا ہے تو وہ خود بھی مر جاتی ہے۔ ان کو بھرتی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ یہ نوجوان زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ اس کے بعد ان کی ٹریننگ کی جاتی۔ انہیں شنٹوازم کے بارے میں مزید تعلیم دی جاتی۔ انہیں بادشاہ سلامت کے لیے مرنا ثواب کا کام بتایا جاتا۔ مخالف فوج پر حملہ کرنے کے لیے یہ لوگ خوشی خوشی جایا کرتے جیسے مرتے ہی جنت میں چلے جائیں گے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ جاپان کے جہاز بھی کم ہو گئے اور جاپان کے پاس پائیلٹس کی بھی کمی واقع ہو گئی۔ کئی ایک نوجوان جو حملہ کیے بغیر ہی واپس آ گئے، انہیں گولی مار دی گئی۔ ان کی دونوں صورتوں میں موت ہوتی۔ یہ جب بھرتی ہوتے تو موت کے پروانے پہ دستخط کیا کرتے گو کہ باقاعدہ طور پہ ایسا نہ کرتے لیکن بھرتی ہونے کا مطلب یہی ہوتا۔ ان کی ٹریننگ بہت سخت ہوتی اور ٹریننگ کے دوران ان کے ذہن میں موت کا تصور ہی تبدیل کر دیا جاتا۔

''تو اس کا مطلب ہے خودکش حملوں کا آغاز جاپان سے ہوا۔''

''نہیں جاپان سے نہیں بلکہ انسان شروع سے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے۔ حسن بن صباح اپنے فوجیوں کو حشیش کا عادی بنا کے بڑے بڑے لوگوں کو قتل کروایا کرتا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے دور میں یونانی، سربین، البانین خاندانوں سے کرسچن اور یہودی خاندانوں سے چھوٹی عمر کے بچے چھین لیے جاتے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق ٹریننگ دی جاتی۔ جوان ہونے کے بعد انہیں خصوصی ذمہ داریاں دی جاتیں۔ فوج میں ''ینی چری'' کے نام سے ان کا الگ دستہ ہوتا جسے دیگر فوجی دستوں پر فوقیت ہوتی۔ یورپ میں کاتھیولک مان، یہودیوں کے بچوں کو ان کے ماں باپ سے چھین

کے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا کرتے۔ تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں تک دیگر خودکش حملہ آوروں کی بات ہے تو تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

سترھویں صدی میں جب ڈچ حملہ آور تائیوان پہ حملہ کے دوران گن پاؤڈر کے ساتھ خود کو تباہ کرتے تو ساتھ مخالف فوج کے کثیر لوگ بھی مرجاتے۔ چینی فوجیوں کو ان کی یہ جنگی حکمت عملی بالکل سمجھ نہ آئی اور وہ تائیوان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بلجیم میں جب انقلاب آیا تو ڈچ لیفٹیننٹ Lieutenant Jan van Speijk نے اپنے شپ کو اینٹ ورپن (Antwerpan) کی بندرگاہ پہ خود ہی ڈبو دیا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اسے قید نہ کرلیا جائے۔ پروشین فوجی Karl Klinke نے جنگ ڈے بول کے دوران ڈنمارک کے قلعے میں سوراخ کرنے کے لیے، خودکش بننے کی صورت اپنائی۔

روس کے زار Tsar Alexander II of Russia کو ایک خودکش نے ہینڈ گرنیڈ سے مار دیا تھا۔ جب نیہی لسٹ نے اس کی گاڑی پہ خودکش حملہ کیا تو وہ بری طرح زخمی ہوا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ۱۹۴۳ء میں Rudolf Christoph Freitherr von Gersdorff نے خودکش حملے کے ذریعے اڈولف ہٹلر کو مارنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ جنگ برلن کے دوران جرمن فوجیوں نے روسی فوجوں کو روکنے کے لیے کئی خودکش حملے کیے اور ستر ہ پل تباہ کیے لیکن ان کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔"

"اس کا مطلب ہے خودکش حملوں کی کہانی بہت پرانی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ یہ طرز مرگ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔"

"ابھی تو میں جدید دنیا کے خودکش حملہ آوروں کے بارے میں بتاؤں گا۔ جدید دور میں ۱۹۸۰ء میں لبنانی خانہ جنگی میں خودکش حملوں کے طریقے کو استعمال کیا گیا اس کے بعد سری لنکا میں تامل ٹائیگرز نے بھی اس حربے کو استعمال کیا۔ دنیا میں خودکش حملوں میں سب سے زیادہ تعداد میں حملے تامل ٹائیگرز نے کیے۔ اس کے علاوہ فلسطین کے حریت پسند مسلمانوں نے بھی اس کو اسرائیلیوں کے خلاف جنگی حربے کے طور پہ آزمایا۔

جہاد کے لیے قرآن کی سورۃ توبہ میں ذکر آیا ہے۔ لیکن جہاد کی تشریح مفسرین اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں۔ اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک آیت جنگ کے لیے

ہے تو بے شمار آیتیں امن اور انسانوں کا خون نہ بہانے کے لیے ہیں۔ اسلام میں تو جنگ کے دوران ہری بھری فصلوں کو بھی تباہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو تحفظ دینے کا حکم ہے جبکہ آج کے جدید حملہ آور ممالک جن میں روس اور امریکہ پیش پیش ہیں، ان کا کسی ملک میں داخل ہونے اور حملہ کرنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے خود بچوں کو یتیم کرتے ہیں، عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں اور خود ہی دنیا کو دکھانے کے لیے ان یتیم بچوں اور بے گھر عورتوں کے لیے چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے خیراتی ادارے وجود میں لاتے ہیں۔

''لیکن آغائی۔۔۔ امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پہ جو ایٹم بم گرائے تھے کیا وہ دہشت گردی نہیں تھی۔''

''بالکل تھی اور ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد امریکہ ہے۔ اس کے بعد انگلینڈ، چین، پرتگال، فرانس وغیرہ کے نام آتے ہیں اور فرشتہ تمہیں یہ جان کے حیرت ہونی چاہیے کہ بڑے پیمانے پہ انسانوں کے قتل میں پاکستان آٹھویں نمبر پہ ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تم نے جیرڈ ڈائمنڈ (Jared Diamond) کا نام سنا ہے۔''

''ہاں سنا ہے۔ ازیل ہائم میں ایک بنگالی اس کا ذکر کر رہا تھا۔''

''اس نے ایک کتاب لکھی ہے The Rise and Fall of the Third Chimpanzee اس میں اس نے کئی حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ اس میں اس نے ان ملکوں کی فہرست شامل کی ہے جس میں انسانوں کو نسل کشی کے حوالے سے بڑے پیمانے پہ قتل کیا گیا ہے۔ اس کو انگریزی میں جینوسائیڈ کہتے ہیں۔ اس کتاب میں پاکستان پہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اس نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں تقریباً تیس لاکھ بنگالیوں کا قتل عام کیا۔ ان کو قتل کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کو اپنے تابع رکھا جائے۔''

میں یہ سن کے کانپ گیا۔ مجھے اپنے پاکستانی ہونے پہ فخر تھا لیکن اب میرا افتخار مجھ سے اپنا جواز طلب کر رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کتاب کے حقائق مصدقہ تھے یا نہیں یہ المناک بات تھی کہ انسانوں کو اتنی بڑی تعداد میں اس لیے قتل کر دیا جائے کہ وہ آپ کی غلامی قبول نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کا سانحہ یاد آ گیا۔ محمد علی جناح نے جو چودہ نکات پیش کیے تھے ان کا

کیا ہوا۔ اقبال کے نظریۂ پاکستان کا کیا ہوا۔ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پہ بنایا تھا۔ نظریۂ پاکستان کی بنیادی اکائی ہی یہی تھی۔ ہم کسی دوسرے کو کیا تنقید کا نشانہ بنائیں گے۔ ہم تو خود گنہگار ہیں۔ فیض نے ٹھیک کہا ہے۔ ''خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد۔''

ساری زندگی بھی بارش ہوتی رہے تو یہ دھبے نہ دھلیں گے۔

رضا بولا ''کیا سوچ رہے ہو۔''

''بطور پاکستانی اس المیے کے سرزد ہونے پہ دُکھ محسوس کر رہا ہوں۔''

''فرشتہ صاحب ایک تو ضروری نہیں کہ جو بات کسی مغربی صحافی نے لکھ دی ہے وہ سو فی صد سچ ہی ہو سچ پڑھنے کے لیے آپ کو خود اپنی تحقیق پر بھروسہ کرنا ہوگا اور اگر یہ سچ بھی ہو تو ظاہر ہے اس میں کسی عام پاکستانی کا کوئی قصور نہیں یہ الزام تو پالیسی سازوں کو دیا جائے یا سیاسی بازیگروں کو جن کی سیاسی چالبازیوں کی بنا پر ایسے سانحے رُونما ہوتے ہیں، لیکن اس نتیجے پہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اتنے لوگوں کا خون بہانے کے بعد بھی استحصالی قوتیں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوئیں۔ خیر بات ہو رہی تھی دنیا کے سب سے بڑے دہشت گردوں کی جو دوسروں کی طرف انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ دوسروں کے مذاہب کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔''

''آپ امریکہ کے بارے میں بتانے لگے تھے۔''

''میں کیا بتاؤں گا تمہیں پتا ہے بلکہ ساری دنیا کو پتا ہے کہ امریکہ نے جاپان پہ دو ایٹم بم گرائے۔ ایک ہیروشیما پر اور دوسرا ناگاساکی پر۔ امریکی یہ کہتے ہیں کہ خودکش بمبار چھپ کے حملہ کرتا ہے اس لیے حق بجانب ہیں، لیکن انہوں نے یہ کام دھوم دھڑلے سے اور علی الاعلان کیا تھا۔ ساری دنیا کو بتا کے دونوں بم پھینکے تھے۔ آج بھی ان کا یہی وطیرہ ہے جس ملک میں چاہیں جدید اسلحے کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں۔ امریکہ جاپان پہ ایٹم بم پھینکنے سے پہلے چھ مہینے تک جاپان کے مختلف شہروں پہ بمباری کرتا رہا لیکن اس بمباری میں انہوں نے ایٹم بم استعمال نہیں کیے۔ امریکہ کے صدر نے جاپان کو ایٹمی حملے کی دھمکی کے ساتھ ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا مگر جاپان کے بادشاہ نے دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر جنگ جاری رکھی۔ امریکہ کے صدر ہنری ٹرومین نے ریڈیو پہ اعلان کیا کہ اگر جاپان نے ہتھیار نہ پھینکے تو امریکہ اس پہ ایٹم بموں کی بارش کر دے گا۔ جب ٹرومین نے یہ اعلان کیا تو اس کو کینیڈا اور انگلینڈ کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔

ایٹم بم گرانے سے پہلے یہ اتحادی باہم طے کرتے رہے کہ کون سے شہر پہ بم گرایا جائے کیونکہ ہوائی حملوں میں امریکن آدھا جاپان تباہ کر چکے تھے۔ آخرکار ہیروشیما اور ناگاساکی پہ بم گرائے جانے کا فیصلہ ہوا۔ جو بم ہیروشیما پہ گرایا گیا اس کا نام تھا ''لٹل بوائے''۔ ہیروشیما پہ صبح آٹھ بج کے پندرہ منٹ پہ قیامت نازل کی گئی اور کتنی عجیب بات ہے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ چند منٹ کے فرق سے صبح آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پہ میزائل یا جہاز سے حملہ کیا گیا۔ یہ ایٹم بم جس کا نام لٹل بوائے اور وزن ساٹھ کلو تھا۔ اس میں یورینیم کا استعمال کیا گیا تھا۔ اسے گرانے میں پینتالیس سیکنڈ لگے۔ اس کے گرانے والوں کے نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔ ان پہ فلمیں بنی ہیں۔ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کا ریکارڈ موجود ہے لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ حملہ کرنے والوں کے نام، پتے اور دوسرے کوائف جو پیش کیے گئے ان میں سے بیشتر غلط ثابت ہوئے حتیٰ کہ خودکش حملہ آور قرار دیے جانے والوں میں سے کئی زندہ نکلے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر جس کے گرانے کا الزام پوری دنیا مسلمان دہشت گردوں پر تھوپتی ہے اس کے سانحے میں تین ہزار یا شاید اس سے کچھ زیادہ لوگ موت کا شکار ہوئے جب کہ اس کے مقابلے میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر کیے گئے ایٹمی حملوں میں دو لاکھ چھیالیس ہزار لوگوں نے اپنی جانیں دیں اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے اور آج تک ہیروشیما اور ناگاساکی میں معذور بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں خون کی کمی ہوتی ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوتے ہیں اور اکثر ذہنی طور پہ مفلوج ہوتے ہیں۔

دوسرا بم، اس کا نام فیٹ مین تھا۔ یہ ناگاساکی پہ گرایا گیا تھا۔ اس بم کو بنانے کے لیے پلوٹونیم استعمال ہوا، اور اس کے گرنے میں بھی محض پینتالیس سیکنڈ لگے جس سے سارا ناگاساکی شہر تباہ ہو گیا۔

جاپان ان دو ناگہانی قیامتوں سے گھبرا گیا کیونکہ امریکہ نے کہا تھا کہ اگر انہوں نے اب بھی ہتھیار نہ پھینکے تو امریکہ ایٹم بموں کی بارش کر دے گا۔ اس لیے جاپان نے ہتھیار پھینک دیے اور غیر معینہ مدت تک کسی قسم کے ہتھیار اور فوج نہ بنانے کے معاہدے پہ دستخط کر دیے۔۔۔''

''اس کا مطلب ہے امریکہ سب سے بڑا دہشت گرد ہوا۔''

''ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔''

''کیا باقی ہے۔''

''ابھی تمہیں عصر حاضر کے اطالوی دہشت گردوں کا بتانا ہے۔ اس کے بعد جیرڈ ڈائمنڈ

نے دُنیا کے جن بڑے بڑے جینو سائیڈ کا ذکر کیا ہے اس میں امریکہ، فرانس، چین اور انگلستان نے کیا کیا مظالم ڈھائے ہیں۔ ان کا ذکر ہوگا اس کے بعد تم فیصلہ کرنا کہ کون دہشت گرد ہے۔''

''کیا اطالوی بھی اس دہشت گردی کے ملزم رہے ہیں؟''

''ہاں ان کو میں سرخوں کا نام دیتا ہوں۔ اطالوی زبان میں ان کو بریگاتے روسے Brigate Rosse یعنی ریڈ بریگیڈیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بریگاتے روسے کا آغاز ٹرینٹو (Trento) یونیورسٹی میں پڑھنے والے ایک طالب علم Reato Curcio, نے اپنی معشوق Margherita (Mara) Cagol اور اپنے دوست Alberto Franceschini کے ساتھ مل کے ۱۹۷۰ء میں کیا۔ یہ مارکسسٹ لیننسٹ دہشت گرد گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فیکٹریوں پہ حملہ کرتے، بینک لوٹتے اور بڑی بڑی سیاسی شخصیات کو اغوا کرتے۔ اٹلی کا پرائم منسٹر آلڈو مورو (Aldo Moro) بھی ان کے اغوا شدگان میں شامل ہے۔ جس کو انہوں نے اغوا کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ جب اس کے بانی اور گروپ کے دوسرے اراکین کو حراست میں لے لیا گیا تو انہوں پولیس سٹیشنوں پہ حملے کرنے شروع کر دیئے بعد ازاں انہوں بہت سارے ججوں کو بھی اغوا کرلیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایک ٹریڈ یونین کا صدر بھی ان کے ہاتھ قتل ہوا۔

یہ دہشت گرد ٹرینوں اور بسوں میں بم رکھ دیتے تھے، ریلوے سٹیشنوں پہ بم رکھتے تھے، باغوں اور سیر گاہوں میں بم رکھتے تھے۔

اسی دوران اٹلی میں ایک تنظیم وجود میں آئی اس کا نام تھا NAR یعنی نیوکلری آرماتی ریوولوشنری ۲ راگست کو بلونیا (Bolognia) ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں ان کے گروپ کا ایک دہشت گرد سوٹ کیس میں ٹائم بم چھوڑ کے چلا گیا۔ اس وقت بلونیا ریلوے سٹیشن پہ ٹرین کھڑی تھی۔ جب بم پھٹا تو اس حادثے میں پچاسی لوگ ہلاک اور دو سو کے قریب زخمی ہوئے۔ اس بارے میں بعض محقق یہ بھی کہتے ہیں کہ اطالوی حکومت کی خفیہ ایجنسی کے کسی اہلکار نے حکومتی منشاء پر یہ کام کیا تھا کیونکہ اس کے بعد انہیں ''بریگاتے روسے'' کے خلاف سخت سے سخت کاروائی کرنے کا موقع مل گیا۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اگر اس کام میں حکومت کا ہاتھ تھا تو ان کا فائدہ بھی ہوا کیونکہ اس کے بعد ''بریگاتے روسے'' اور اس طرح کی دوسری تنظیموں کے ممبران فرانس اور سوئس بھاگ گئے۔ کچھ نے خودکشی کرلی اور کچھ نے ایسی سرگرمیوں سے توبہ کرلی۔''

''اس کا مطلب ہے بسوں میں بم رکھنا، ٹرینوں میں بم رکھنا، عمارتوں اور پلوں کا اُڑانا ایشیائی انتہا پسندوں نے انھی سے سیکھا ہے۔''

''بالکل انھی لوگوں نے اس نوع کے انتہا پسندوں کی خود تربیت کی ہے۔ جب یہ لوگ اپنے مقصد کے لیے افغان مجاہدین کو ٹریننگ دے رہے تھے۔ تو کیا انھیں اس طرز تخریب کی تعلیم نہیں دے رہے تھے؟ افغانستان اور پاکستان کے مذہب پسند نوجوانوں کو کیا پتا کہ دہشت گردی کیا ہوتی ہے۔ تم تاریخ اُٹھا کے دیکھو پاکستان، افغانستان میں ۱۹۷۰ تک ان تخریبی سرگرمیوں کا تصور ہی نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے بات مذہب کی نہیں، اپنے مقاصد حاصل کرنے کی ہے۔''

''ہاں کچھ بھی ہو کہیں نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے، کبھی تیل ہتھیانے اور ہتھیار بیچنے کے لیے ایسا ہوتا ہے۔ کبھی اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایسا ہوتا ہے۔''

''آپ نے جیرڈ ڈائمنڈ کا ذکر کیا ہے۔ کیا اس نے اور ملکوں کا بھی ذکر کیا ہے یا صرف پاکستان اور امریکہ کے بارے میں ہی لکھا ہے۔''

''میں تمھیں اس کی تفصیل بتاتا ہوں۔ جب سے دنیا بنی ہے انسان شروع سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں ہے اور یہ انسانی فطرت کے عین مطابق بھی ہے۔ بڑے بڑے سماجی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ مذہب بہت بعد میں وجود میں آیا لیکن انسان نے تہذیب کے ارتقا کی بہت سی منزلیں پہلے سے طے کر لی تھیں۔ مذہبی حوالے سے اکثر فلسفیوں کا خیال ہے کہ انسان نے پہلے خدا کو بنایا۔ پھر خدا سے اس کائنات کو تخلیق کروایا، جب کائنات بن گئی اور انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو پھر خدا سے پیغمبروں کو مبعوث کروایا گیا اور پھر مذہب رائج کیے جانے کی باری آئی۔''

''رضا، اس طرح کے خیالات سے تو انسان کافر ہو جاتا ہے۔''

''اگر مذہبی بنیاد پر سوچیں گے تو ایسا ہی خیال آئے گا بات مذہب کو ایک طرف رکھ کر سوچنے کی ہے، یوں بھی۔ میں اپنی بات نہیں کر رہا بلکہ ان سماجی سائنسدانوں، فلسفیوں اور دانشوروں کی بات کر رہا ہوں جو کہتے ہیں کہ خدا نے پیغمبروں کو تخلیق کرنے کے لیے انسان کے مہذب ہونے کا انتظار کیا لیکن انسان پھر بھی مہذب نہ ہوا بلکہ انسان نے مذہب کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر چیز کا استعمال مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی بجائے اس کے، کہ انسان مذاہب کو انسانیت کی معراج پانے کے لیے استعمال میں لاتا انسان نے اسے ایک دوسرے

کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور ایک دوسرے کو واجب القتل قرار دیتے ہوئے قتل و غارت کا جواز پانے کے لیے استعمال کیا۔ آریاؤں نے ہندوستان پہ حملہ کیا تو ان کا مذہب ہندو مت تھا۔ انہوں نے ہندوستان پہ قبضہ کرنے کے لیے دراوڑوں کا بے دریغ خون بہایا۔ مہاراجہ اشوکا نے کالنگا میں اتنے انسانوں کا خون بہایا کہ اسے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔ پھر اس نے بدھ مت کو بطور مذہب اپنا لیا۔ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ سفید جنوں نے پوری دنیا کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمان جب معاشی اور سیاسی طور پہ اپنے قدم جما چکے تو انہوں نے آس پاس کے ملکوں پہ حیلے بہانوں سے قبضہ کر لیا۔ جب کوئی ملک کسی ملک پہ حملہ کرتا ہے تو انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتا ہے۔ چنگیز خان نے کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کر دیے اور وہ اپنی زندگی میں کوئی جنگ نہ ہارا۔ طاقت، دولت، اقتدار حاصل کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ سائنسدان اس کو انسان کے اندر پائی جانے والی حیوانی جبلت کا نام دیتے ہیں۔ تم نے سنا ہوگا اینیمل انسٹنکٹ (animal instinct)

اب آتے ہیں نئے دور کی طرف۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا قتل عام امریکہ میں ریڈ انڈینز کا ہوا۔ امریکن گورے تقریباً ڈھائی سو سال تک ریڈ انڈینز کے خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ جیرڈ ڈائمنڈ کے تجزیے کے مطابق انہوں نے ۱۶۴۰ء سے لے کر ۱۸۹۰ء تک تقریباً دس لاکھ ریڈ انڈینز کا خون بہایا۔ ہسپانوی باشندوں نے امریکہ اور ساؤتھ امریکہ میں بیس لاکھ سے زیادہ انسان قتل کیے۔ آسٹریلینز نے دس لاکھ تسمانین لوگوں کا قتل عام کیا۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے بعض مصنفین کے مطابق ساٹھ لاکھ سے زیادہ یہودیوں کا قتل عام کیا۔ روسیوں نے اپنے پچاس لاکھ سے بھی زیادہ سیاسی مخالفین کا قتل کیا۔ ترکوں نے دس لاکھ سے زیادہ آرمینین کو تہہ تیغ کیا۔ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کا تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ دس لاکھ سے زیادہ کمبوڈینز (Cambodians) کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان سارے بڑے جینوسائیڈز میں انسان نے کبھی مذہب کو بنیاد بنایا، کبھی کسی سیاسی نظریے کو جواز بنایا لیکن اس ساری جنگ و جدل و قتل و غارت گری کا اصل مقصد جو بعد میں تاریخ نے اپنے شواہد سے عیاں کیا، توسیع پسندی اور ہوس اقتدار کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ مذہب ایک ایسا جھانسہ ہے جس کی بنیاد پر بعض شاطر لوگ معصوم انسانوں کو بڑی آسانی سے فریب کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد جہالت کا نمبر آتا ہے، غربت کا نمبر آتا ہے۔ پاکستان کو ہی لے لو۔ اسلام کے نام پر بنایا گیا۔ ایک الگ مسلم ملک پانے کے لیے

ہندو مسلم فسادات میں چھ لاکھ مسلمانوں نے اپنی جانیں دیں، لیکن جب مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے معاشی وسیاسی حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کی تو دوقومی نظریہ یا مذہبی ایکتا کے نظریات کہیں بہت پیچھے رہ گئے۔۔۔اور کہا جاتا ہے کہ بڑے پیمانے پر بنگالیوں کا قتل عام کیا گیا۔جس وقت ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل نیازی نے بھارتی افواج کے سامنے سرنڈر کیا۔اس وقت کی بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا" آج ہم نے دوقومی نظریہ بحر ہند میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غرق کر دیا ہے۔"

مسز اندرا گاندھی کے بیان کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ دوقومی نظریے کو بعض قوتوں کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کے لیے استعمال میں لایا گیا اگر دوقومی نظریے میں صداقت ہوتی تو بنگالی پاکستان سے آزادی کے لیے کبھی آواز بلند نہ کرتے اور نہ پاکستانی افواج کو ان پر تسلط قائم رکھنے کے لیے استعمال میں لائے جانے کی نوبت آتی۔

میں نے کہا" بالکل درست ہے۔لیکن آغا ئی ابھی جو آپ نے حقائق بتائے ہیں۔ انسانوں کے قتل عام کے جو گوشوارے بتائے ہیں ان میں مختصر سر فہرست ہے۔"

"تمہیں تم امریکہ اور ساؤتھ امریکہ میں قتل عام کا نوٹس کرو جو وہاں کے مقامی لوگوں کا ہوا۔ یہ کل ملا کے ایک کروڑ سے بھی زیادہ بنتا ہے۔اب میں تمہیں ایک آخری بات بتاتا ہوں۔دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ کے بارے میں۔اس کے بعد میں چلا جاؤں گا کیونکہ بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"چلیں آخری بات بھی بتا ہی دیں۔"

"امریکہ ڈھائی سو سال تک ریڈ انڈینز کا قتل عام کرتا رہا۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بہت کم ہو گئی۔جب ان کے صرف ایک خاندان کے چند افراد سلامت رہ گئے تو ان کو میوزیم میں کھڑا کر دیا گیا۔آہستہ آہستہ یہ لوگ بھی مرتے گئے حتیٰ کہ اس خاندان کی آخری اکائی یعنی میاں بیوی اور ایک بچہ تیس سال تک میوزیم میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔غور کیجیے۔۔۔پوری دنیا کو تہذیب کا پاٹھ پڑھانے والے امریکہ نے ریڈ انڈینز کو میوزیم میں کھڑا کر کے اپنی بربریت اور سفاکی کا کیسا عبرت انگیز ثبوت دیا یہ اُسی کا کارنامہ ہے۔"

"یہ تو بتاؤ رضا کہ ریڈ انڈینز خاندان کی آخری اکائی کا کیا انجام ہوا۔۔۔کیا وہ خاندان ابھی ابھی میوزیم کی کفالت میں ہے؟ ریڈ انڈینز کے اس آخری خاندان کی آخری عورت کچھ عرصہ قبل فوت ہو گئی اس کے بعد آخری مرد بھی چل بسا اب اس پوری نسل میں سے آخری بچہ بچا ہے۔۔۔اس

میوزیم کے کیوریٹر نے اس بچے کی نگہداشت اپنے ذمے لی ہوئی ہے۔"

"اب وہ بچہ کہاں ہے۔"

"سنا ہے وہ پڑھ لکھ کے جج بن گیا تھا اور اب اس نے امریکن حکومت پر مقدمہ کر دیا ہے۔"

"بہت خوب۔"

"کیا اب بھی تم سمجھتے ہو کہ ہم کو جو دہشت گرد ہونے کا الزام دیا جاتا ہے اس میں امریکی حق بجانب ہیں؟"

"آغائی رضا اب میں فکری طور پر بالکل مطمئن ہو گیا ہوں۔"

"مجھے خوشی ہے اس بات کی کہ میری تحقیق کسی کے تو کام آئی۔ کوئی تو میری بات سے متفق ہوا۔ میں نے کہا ایک بات بتائیں آغائی۔۔۔ کتابوں کے علاوہ کونسا ایسا میڈیم یا میڈیا ہے کہ ہمارے اس نوع کے سوالات کے جوابات پانے کی طرف راہنمائی کر سکتا ہے۔۔۔ جہاں تک ٹی وی میڈیا کی بات ہے اس پر تو میرا یقین بالکل نہیں رہا۔۔۔ "فرشتہ جی اگر علمی اور جذباتی دونوں سطحوں پر انسان کو اپنے حواس بحال رکھنا آتا ہو تو کسی بھی میڈیم کا جھوٹ اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے پتہ چل رہا ہوتا ہے کہ میڈیا کتنا سچ اور کتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ ویسے میری رائے میں تم موضوعاتی حوالے سے بننے والی فلموں کو زیادہ توجہ سے دیکھا کرو، کیونکہ میری نظر میں حقائق کے ادراک کے لیے فلم بہت اچھا ذریعہ ہے۔ کچھ فلمیں فلم بینوں کی علمی سطح پر باقاعدہ تربیت کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہیں۔ کچھ فلموں میں پہلے سے بتا دیا جاتا ہے کہ کون سا کام کیسے کرنا ہے۔ کچھ فلموں میں تشبیہ کے طور منظر نگاری ایسی ہوتی ہے کہ جو فلم بینوں سے حسِ لطیف استعمال کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ تمہارے دیکھنے کے لیے میں جن چند فلموں کی سفارش کروں گا ان میں سے ایک ہے پیس میکر (Peacemaker) میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ کے عمل سے لوگ کیسے دہشت زدہ ہوتے ہیں۔ جیکال (Jackal) میں ایسے طریقے بتائے گئے ہیں جن سے آپ سیکھ سکتے ہیں کہ کون سا مقصد کیسے حاصل کرنا ہے، اگر تم نے فلم کروسیڈز (The Crusades) دیکھی ہے تو اس کے آغاز میں ایک بہت بڑی صلیب دکھائی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے سے سورج کو نکلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ منظر کچھ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ صلیب لال رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ فلم ڈائریکٹر کا ایک استعارہ ہے۔ یعنی صلیبی جنگوں میں صلیب کو سامنے رکھ کے انسانوں کا خون بہایا گیا ہے۔ گینگز آف نیو یارک (The

(Ganges of Newyork) میں امریکہ کو بربریت کی طرف سے تہذیب کی طرف آتا دکھایا گیا لیکن اس میں ان لوگوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن لوگوں نے اس ملک کو تعمیر کیا۔ اس طرح کی بیشمار فلمیں ہیں جو کافی اچھی بنی ہیں اور دیکھے جانے کے قابل ہیں۔"

"میں نے کروسیڈز دیکھی ہے۔ اس میں صلیب کے پیچھے سے سورج کو نکلتے دکھایا گیا لیکن میں نے اس کے بارے میں علامتی نقطۂ نگاہ سے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

"فلم ڈائریکٹر بہت ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ قدرتی مناظر، کہانی، ڈائیلاگ اور ایکٹنگ کے ذریعے بہت سی باتوں کا علامتی، استعاراتی اور تشبیہی انداز میں اظہار کر جاتے ہیں جو سمجھنے والے کو ایک خاص لطف آگہی سے ہمکنار کرتی ہیں۔

"آغائی اب میں فلم بہت غور سے دیکھا کروں گا۔"

فلم غور سے ہی دیکھے جانے کی چیز ہوتی ہے۔۔۔ میں اب چلتا ہوں بہت دیر ہوگئی ہے۔ چائے بہت اچھی تھی، ساتھ پکوڑوں اور چپس کا بھی بہت مزہ آیا۔"

شکریہ ادا کرتے ہوئے رضا نے روانگی کے لیے قدم بڑھا دیئے اور میں اسے ازیل ہائم سے باہر سڑک تک چھوڑنے گیا۔

OOO

مجھے یہاں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چلے تھے۔ رضا سے میری آخری ملاقات وہی تھی جب ہم دونوں نے لمبی بیٹھک کی تھی۔ اس کی گفتگو نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ گلبدین کو دوسری کرائس میں بھیج دیا گیا تھا۔ ازیل ہائم میں کئی نئے لوگ آگئے تھے۔ ان نئے لوگوں میں ایک لڑکا شباہت اور جسامت کے اعتبار سے بالکل پاکستان کے سابقہ اور معزول وزیراعظم نواز شریف کی طرح کا تھا۔ گوراچٹا، گول چہرے والا اور سر سے گنجا اور سر کے کناروں پہ بال تھے۔ یہ مالدیویا (Moldovia) کا رہنے والا تھا۔ وہ مجھ بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن اسے کوئی ایسی زبان جو ہم دونوں کے لیے اشتراک فہم کا باعث ہو نہیں آتی تھی۔ وہ اکثر دفعہ میرے پاس بیٹھ جایا کرتا۔ اس کو کسی نے بتایا تھا کہ سوئس میں لڑکی پٹانے کے لیے ایسی زبان آنی چاہیے جو وہ آسانی سے سمجھ سکتی ہو۔ ازیل ہائم میں نائیجیریا کے جتنے بھی لڑکے تھے ان سب نے لڑکیاں پٹالی تھیں۔ انہی نائیجیرین لڑکوں میں سے ایک نے سبینا سے بھی دوستی کرلی تھی۔ سبینا ماں بننے والی تھی اور ازیل ہائم میں کسی کو نہیں پتا تھا کہ اس کے

ہونے والے بچے کا باپ کون ہے۔ نہ ہی یہ بات جاننے کی کسی کو خواہش تھی یہاں یہ بات بہت اچھی تھی کہ ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

اگست کے آغاز میں اٹلی نے امیگریشن کھول دی تھی اور مجھے ہر دوسرے دن نیائش کا فون آتا کہ کسی بھی طریقے سے اٹلی واپس آجاؤ۔ میں ہر دفعہ اسے یہی کہتا کہ میں جلد آجاؤں گا۔ میرا یہی خیال تھا کہ تین مہینے گزارنے کے بعد مجھے دوسری کرائس بھیج دیا جائے گا اور ہو سکتا ہے اس دوران انٹرویو ہو جائے اور میری سیاسی پناہ کی درخواست منظور ہو جائے اور مجھے کام کی اجازت مل جائے، اس صورت میں، میں علیحدہ گھر لے سکتا تھا۔ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکتا تھا۔ اب گرمی کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ہمیں اسی طرح ہر جمعرات کو خیرات جسے سوئس لوگ سوشل کہتے ہیں، ملتی۔ میری شدید خواہش تھی کہ مجھے کام کی اجازت مل جائے اور کوئی نہ کوئی کام کر لوں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شنائیڈر کا رویہ میرے ساتھ عجیب سا ہو گیا اور شیفر کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اگست کے مہینے میں جمعرات کے دن ہم تمام لوگ ان چار مستطیل میزوں کے ارد گرد کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح کبھی شیفر بولتا اور کبھی شنائیڈر۔ پھر شنائیڈر نے ایک بڑی عجیب و غریب بات کی۔ کہنے لگا، ازیل ہائم میں رہنے والے لڑکے منشیات کا دھندہ کرتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں۔ یہ بات وہ پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا تھا لیکن آج اس کا انداز عجیب و غریب تھا۔ میں نے کہا، اگر ازیل ہائم کے لڑکے منشیات کا کاروبار کرتے ہیں تو خریدار ہونے کی وجہ سے ہی بیچ پاتے ہیں۔ سوئس لوگ منشیات کا استعمال چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اس کو میری اس بات پہ بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا تم لوگ یہ کاروبار بند کیوں نہیں کر دیتے۔ شیفر نے میرا ہاتھ دبایا۔ اس دوران وہ جارجیا کا لڑکا بولا، کل ہم لوگ بس میں آ رہے تھے ہم نے بس ڈرائیور کو بس روکنے کو کہا۔ اس نے بس نہیں روکی ہمیں اگلے سٹاپ پہ اُتار دیا۔ ہم لوگوں کو وہاں سے چل کے واپس آنا پڑا۔ شنائیڈر بولا، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی کیوں کہ مجھے یہ بات سمجھ آ چکی تھی کہ شنائیڈر کس انداز میں سوچتا ہے۔

میں پابندی سے لائبریری جاتا تھا۔ اپنی ای میل دیکھتا تھا۔ کوئی نہ کوئی کتاب بھی لے آیا کرتا۔ پڑھ کے واپس کر دیا کرتا۔ جم بھی جایا کرتا۔ میں نے جرمن زبان سیکھنے کے لیے سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ ہماری کلاسیں اگست کے آخر میں شروع ہوئی تھیں۔ میں نے جم میں کام کی درخواست بھی

دے دی تھی۔اب ونٹرتھور میں لوگ مجھے جاننے لگے تھے۔ایک دن میں لائبریری سے نکل کے انٹرگرابن (Untergraben) پہ چلا جار ہا تھا۔وہاں دودن پہلے تک کچھ نہیں تھا۔لیکن آج وہاں لال رنگ کی باڑ لگی ہوئی تھی اور اندر چند لوگ کھدائی کر رہے تھے۔میں نے باڑ کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا ''تم لوگ کیا کر رہے ہو؟'' مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا یہاں سے کوئی چیز دریافت ہوئی ہے۔ان میں سے ایک سنہرے بالوں والی عورت بولی''یہاں سوئس شہر کی پرانی دیوار کے آثار ملے ہیں۔''

میں نے کہا''یہ دیوار کتنی پرانی ہے۔''

وہ کہنے لگی''چھ سو سال پرانی ہے۔''

میں نے کہا'' میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔وہاں تو چار ہزار سال پُرانے آثار بھی دریافت ہوئے ہیں۔جواب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔''

وہ عورت کپڑے جھاڑ کے اس آرکیالوجیکل سائیٹ سے باہر آگئی۔اپنے دستانے اتارے۔مجھ سے ہاتھ ملایا۔کہنے لگی'' میں نے ٹیکسلا اور تخت بائی میں کام کیا ہے۔ہمارا مقابلہ پاکستان سے تو نہیں ہوسکتا۔وہ تو بہت خوبصورت ملک ہے۔''

میں نے کہا''سوئس بھی تو بہت خوبصورت ملک ہے۔''

کہنے لگی''سوئس میں سبزہ ہے۔قدرتی مناظر ہیں۔ہمارے پاس اس خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لیے اچھا خاصہ بجٹ ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اس کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے بجٹ نہیں ہے ورنہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ وہاں سوئس سے زیادہ خوبصورت اور متاثر کن قدرتی مناظر پائے جاتے ہیں۔''

پاکستان کے بارے تعریف سن کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوا کرتی تھی لیکن جب سے میں نے قومی حوالے سے اپنی تہذیبی،سماجی،سیاسی،معاشی کوتاہیوں،جہالتوں اور حماقتوں پر غوروخوض شروع کیا تھا۔میری سوچوں پر مایوسی کا غلبہ رہتا۔پاکستان کے حوالے سے ہر اچھی خبر۔ہر اچھی بات اسی یاس کی نذر ہوجایا کرتی۔۔۔میں نے اس سے پوچھا''تمہیں پاکستان کا کون سا علاقہ زیادہ پسند آیا؟''

کہنے لگی''پاکستان کے شمالی علاقہ جات بہت خوبصورت ہیں۔لیکن مجھے سب سے زیادہ حیرت شندور پاس دیکھ کے ہوئی۔یہ جگہ دنیا کا عجوبہ ہے۔میں وہاں پولو کا میچ دیکھنے گئی تھی۔''

ابھی ہمارے درمیان گفتگو جاری تھی کہ اسے اس کے ساتھیوں نے بلالیا۔کہنے لگی'' میں

ان سب کی انچارج ہوں۔ میں نے انہیں بتانا ہے کے آگے کیا کرنا ہے۔تم اگر اپنا ای میل یا موبائل نمبر مجھے دے دو تو گپ شپ رہے گی۔''

میں نے کہا''موبائل فون تو نہیں میری ای میل آئی ڈی ہے۔''میں نے کاغذ پہ اس کو اپنی ای میل آئی ڈی لکھ کر دی۔اپنا نام لکھ کے دیا اس کو خدا حافظ کہا اور گھر چلا آیا۔

بلبیر روز کام پہ جاتا اور واپسی پہ کچھ نہ کچھ کھانے کو لے آیا کرتا۔میں رات کو بھی وہی کھالیا کرتا اور دن کو بھی اسی سے گزارہ چلا لیا کرتا۔مجھے صرف ناشتہ تیار کرنا پڑتا۔میں نے بلبیر کو کئی دفعہ منع بھی کیا لیکن وہ میری بات سنتا ہی نہیں تھا۔

ازیل ہائم پہنچا تو میں نے رات کا بچا کھچا کھانا گرم کر کے کھایا،اور اپنے کمرے میں جا کے سو گیا۔شام کو میری آنکھ کھلی تو مجھے ہاؤس ماسٹر نے بتایا کہ تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔باہر جا کے دیکھا تو گلبدین بہت خوبصورت چشمہ لگائے ازیل ہائم کے چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔اس کے ساتھ کرپال اور شاہ جی بھی تھے۔میں نے کہا''تم لوگ کب آئے۔''

گلبدین کہنے لگا''ابھی آئے ہیں۔ہم نے ہاؤس ماسٹر سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ تم سوئے ہوئے ہو۔''

میں نے کہا''صبح نکلا تھا،یونہی آوارگی کرتا رہا۔دوپہر کے قریب لائبریری گیا تھا واپسی پہ کھانا کھا کے سو گیا۔''

گلبدین بولا''میری آنکھ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اور میرا بھائی جو زیورخ میں رہتا ہے اس نے میرے ٹھیک ہونے کی خوشی میں ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کیا ہے۔تم کو بھی بلایا ہے۔''

میں نے کہا''میں نے ایسا کیا کیا ہے جو مجھے بھی بلایا ہے۔''

گلبدین بولا''تم نے وہ کیا ہے جو میرا بھائی دو سال میں نہیں کر سکا تھا۔مجھے سوئس آئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔میں سیاسی پناہ کی درخواست دینے سے پہلے اسی کے پاس رہتا تھا۔میں اس سے روز کہتا تھا مجھے ہسپتال لے جاؤ لیکن وہ مجھے ہمیشہ ٹالتا رہتا تھا۔جب میں ازیل ہائم میں آیا تو یہاں آنے کے بعد بھی وہ میرے ساتھ بہانے بناتا رہا۔میں تو سوئس آیا ہی علاج کروانے تھا۔تم نے ہاؤس ماسٹر سے بات کی،ونٹرتھور کے ڈاکٹر سے بات کی۔اب میں ٹھیک ہوں،میں دونوں آنکھوں

سے دیکھ سکتا ہوں صرف تمہاری وجہ سے۔"

میں نے کہا" یہ تو میرا فرض ہے۔"

وہ کہنے لگا" تو اس کا مطلب ہے تم آؤ گے۔"

میں نے کہا" کب ہے دعوت۔"

وہ کہنے لگا" دعوت تو ستمبر میں ہے۔ لیکن ہم لوگ تمہیں بتانے ابھی آگئے ہیں۔"

میں نے کہا" میں ضرور آؤں گا۔"

وہ بولا" تمہیں پتا ہے مقصود کا کیا حال ہے۔"

میں نے کہا" کون مقصود۔"

وہ بولا" وہی مقصود جس کے ساتھ تم جھیل کے کنارے جایا کرتے تھے۔"

میں نے کہا" ہاں یاد آیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوتی تھی۔"

"ہاں وہی، اس نے شادی کر لی ہے۔ اسی لڑکی کے ساتھ، دو مہینوں میں اس نے خوب رنگ روپ نکالا ہے۔ موٹا تازہ ہو گیا ہے۔ کام بھی کرتا۔ اس نے زیورخ میں اپنا فلیٹ لے لیا ہے۔"

میں نے کہا" یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم بھی کوئی لڑکی ڈھونڈ لو۔"

کہنے لگا" میں شادی شدہ ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ یہاں کوئی انتظام ہو گیا تو ان کو بھی بلالوں گا۔ شادی کی بھی تو کاغذوں کے لیے کروں گا۔"

میں نے کہا" اپنے بھائی سے بات کرو، وہ کسی نہ کسی لڑکی کو جانتا ہوگا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا" باتیں تو چلتی رہیں گی پہلے میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

چائے کے دوران مختلف موضوعات پہ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کرپال کو سکھوں کے لطیفے سنائے اور کرپال نے "مسلوں" کے۔۔۔ شاہ صاحب اور گلبدین لطیفوں کے اس ملاکھڑے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

ooo

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے میرا دل ازیل ہائم سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ اس دوران ایک سری لنکن لڑکا بھی آ گیا تھا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں ڈھت رہتا۔ اس کو جرمن زبان پہ عبور حاصل

تھا۔ وہ سارا دن سوئس حکومت کو گالیاں دیتا رہتا۔ کبھی کپڑے اُتار کے ننگ دھڑنگ میز پہ چڑھ کے ناچنا شروع کر دیتا۔ کبھی ہنستا، کبھی رونے لگتا۔ ہمیں یہی ڈر تھا کہ جس دن ہمیں خیرات ملے گی، (میں سوشل کو خیرات ہی کہتا تھا۔) اس دن کوئی نہ کوئی ڈرامہ ضرور ہوگا۔ ایسا ہی ہوا۔ جمعرات کے دن ہم سارے ان چار مستطیل میزوں کے اردگرد کرسیاں سجائے بیٹھے تھے۔ کچھ نئے لوگ تھے کچھ پرانے، مجھے یہاں رہتے ہوئے قریباً دو ماہ ہو چلے تھے۔ ہمیشہ کی طرح کبھی شیفر بولتا اور کبھی شنائیڈر، جیسے ہی سوشل کا ٹوکن دیا گیا تو اس سری لنکن نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم سارے اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ جرمن زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ کبھی وہ بولتا اور کبھی شنائیڈر۔ بات اتنی بڑھی کہ شنائیڈر کو پولیس بلانی پڑی کیونکہ صاف لگ رہا تھا کہ دونوں میں تُو تُو میں میں ہو رہی ہے گو سوائے شیفر کے کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دونوں باہم کیا گفتگو کر رہے ہیں؟ کس بات پہ جھگڑا ہو رہا ہے؟

خیر اس کو قابو کرنا مشکل ہو گیا۔ پولیس اہلکار آئے اور انہوں نے اُسے قابو کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ شنائیڈر بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ کیا ماجرا ہے۔

میں نے شیفر سے پوچھا "بات کیا ہے؟"

اس نے بتایا کہ "اس سری لنکن لڑکے نے پینتالیس سوئس فرانک لینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بحث کر رہا تھا کہ یہ رقم تو ایک دن کے لیے بھی تھوڑی ہے اور تم لوگ یہ رقم سات دن گزارنے کے لیے دیتے ہو۔"

میں نے کہا "ویسے بات تو اس نے غلط نہیں کی، تمہارا کیا خیال ہے۔"

وہ کہنے لگا "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے مسائل ہیں۔ ہم لوگ تو صرف ملازم ہیں۔ جیسے ہمیں کہا جاتا ہے ہم ویسے کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "چھوڑو پیسوں کو اس سری لنکن کے بارے میں بتاؤ، اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔"

"یہ جب یہاں آیا تو میں نے اس کی فائل پڑھی تھی۔ جو میں نے پڑھا وہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ دس سال پہلے سوئس آیا تھا۔ اس نے جرمن زبان پہ عبور حاصل کیا۔ پھر اس کو سری لنکا واپس جانا پڑا لیکن سیاسی پناہ کے بڑے دفتر کی بیوروکریسی عجیب و غریب ہے۔ انہوں نے اس کا پاسپورٹ نہ دیا اس دوران سری لنکا میں اس کے خاندان کے تمام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ بعد میں اس کا پاسپورٹ دے کے اس کو ڈیپورٹ کر دیا گیا۔ یہ وہاں رہ کر کیا کرتا۔ پھر کسی نہ کسی طریقے سے واپس آ گیا۔ اصل

میں یہ ذہنی مریض ہے۔ پہلے ہسپتال میں تھا۔ جب تھوڑا ٹھیک ہوا تو انہوں نے اسے یہاں بھیج دیا۔ لگتا ہے آج پھر اسے دورہ پڑا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شراب بہت پیتا ہے۔''

''اسے جیل میں بند کر دیں گے۔''

''نہیں اسے ایک دو دن رکھ کے واپس یہاں بھیج دیں گے۔''

''ویسے کام کی اجازت کب تک مل جاتی ہے۔ کام کرنے سے انسان ذہنی و جسمانی طور پر مصروف ہو جاتا ہے اور اس سے ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں سرزد نہیں ہوتیں۔ کام کی اجازت عام طور پر چھ ماہ بعد ملتی ہے یا جس کسی کا کیس کلیئر ہو جائے اس کو کام کی اجازت دے دی جاتی ہے۔''

''مجھے دو ماہ ہو چلے ہیں۔ اس کا مطلب ہے مجھے چار ماہ اور گزارنے پڑیں گے۔''

شیفر میرا تبصرہ ان سنا کرتے ہوئے بولا'' مجھے تمہیں بتانا یاد نہیں رہا کہ تمہارا کوئی پارسل آیا ہے۔ انجیا سے لے لینا۔''

''کہاں سے آیا ہے؟''

''میرا خیال ہے تمہارا انٹرویو ہے، ہو سکتا ہے تمہارے کیس کے سلسلے میں ہی ہو۔۔۔ کیونکہ پارسل پہ سیاسی پناہ کے بڑے دفتر کا ایڈریس ہے۔''

''یہ بڑا دفتر کہاں ہے؟''

''زیورخ میں ہے۔ اس میں سب کچھ لکھا ہوگا، کہ انٹرویو کب اور کہاں ہوگا!''

''اس انٹرویو کے بعد کیا ہوگا؟''

''اس کے بعد ہو سکتا ہے تمہاری کرائس بدل جائے کیونکہ یہاں تم تین ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکتے۔''

''اس کا مطلب ہے میں یہاں مہمان ہوں۔''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''مجھے کہاں بھیجیں گے۔''

''جہاں کہیں زیورخ کے آس پاس جگہ خالی ہوئی۔ خیر تم انجیا سے پارسل لے لینا، مجھے اب اجازت دو۔'' اس نے جرمن زبان میں چاؤ چس کہا اور چلا گیا۔

ہفتے کے دن ثقلین ہمارے ہاں منتقل ہو گیا۔ اس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بیگ میں کپڑے تھے۔ میں نیائش اور ثقلین سارا دن چیزیں ادھر سے اُدھر کرتے رہے۔ اس نے سوموار کو آنا تھا لیکن نیائش اور میرے بھرپور اصرار پہ ہفتے کو ہی اپنا سامان لے آیا۔ ہم نے بار ہا اس سے کہا کہ کمرے میں اپنا بستر سجا لے لیکن اس نے کمرے میں صرف اپنا سامان رکھا اور ڈرائنگ میں جو صوفہ کم بیڈ تھا اس کو اپنا بستر بنانا پسند کیا۔ وہ انیسواں باب ساتھ لایا تھا۔ میں نے اسے بیسواں باب دیا اور وہ کہنے لگا۔ "آج رات کو پڑھوں گا۔"

میں نے کہا "اب تک جو کچھ پڑھا کیسا لگا۔"

وہ کہنے لگا "ایک بات سمجھ آئی ہے کہ میں نے صحافت میں جو وقت گزارا، اس میں میں نے اتنا کچھ نہیں سیکھا جتنا میں نے انیس ابواب سے سیکھا ہے۔"

میں نے کہا "ثقلین مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے تم مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کو کتابی شکل دینی چاہیے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"پچی بات تو یہ ہے ثقلین کہ اس تحریر کی صورت میں، میں نے اپنا کیتھارسس کیا ہے۔ کتابی شکل دینے کا تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

نیائش بیچ میں بول پڑا" چھوڑو ماڑا کوئی فلم دیکھتے ہیں۔ سارا دن بور گزرا۔"
نیائش نے فلم لگا دی اور ہم سب فلم دیکھنے لگے۔

○○○

شیفر مجھے کہہ کر گیا تھا کہ انیتا سے اپنا پارسل لے لینا۔ شام کو انیتا آئی تو میں نے اس سے اپنے پارسل کے بارے میں پوچھا۔ وہ کہنے لگی، پارسل نہیں ایک رسید ہے۔ میں تمہیں وہ رسید دیتی ہوں۔ تم یہ رسید جا کر کے ڈاکخانے میں دکھانا تو وہاں سے پارسل ملے گا۔ پارسل نہیں بلکہ رجسٹرڈ لیٹر ملے گا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے رسید لی۔ اس پہ زیورخ کا پتا درج تھا اور خط کی تفصیل تھی اس کے ساتھ ڈاکخانے کا پتہ تھا۔ میں رقعہ لے کے ڈاکخانے گیا۔ وہاں پہ دستخط کر کے اپنا خط لیا۔ اس کو کھولا۔ تو اندر جرمن زبان کی تحریر پر مشتمل بہت سے صفحات تھے۔ میں خط لے کے ازیل ہائم آ گیا۔ انیتا کو یہ تمام صفحات دکھائے تو کہنے لگی، سوموار کو تمہارا انٹرویو ہے۔ صبح ساڑھے سات بجے تمہیں زیورخ ہونا چاہیے۔ میں نے کہا، میرے پاس تو زیورخ کا ٹکٹ ہی نہیں۔ تو کہنے لگی ٹکٹ ہم دیں گے اور تمہیں صبح چھ بجے یہاں سے جانا ہوگا۔
یہ محض اتفاق تھا کہ مجھے انیتا شروع سے پسند نہیں تھی لیکن میرا ہمیشہ اس سے واسطہ پڑتا تھا۔

○○○

سوموار کے دن صبح ساڑھے پانچ بجے مجھے انیتا ہی جگانے آئی اور غصے سے کہنے لگی" تمہیں پتا نہیں آج تمہارا انٹرویو ہے اور تم اب تک سو رہے ہو۔"
میں نے کہا" میں نے الارم تو لگایا تھا لیکن شاید گھڑی کے سیل ختم ہو گئے ہیں اس لیے الارم بجا ہی نہیں۔"
وہ کہنے لگی" جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اگر کچھ کھانا ہے کھا لو۔ یہاں پاس ہی ایک اور ریلوے سٹیشن ہے وہاں سے تیز رفتار ٹرین گزرتی ہے۔ اگر تم اس پہ بیٹھنے پہ کامیاب ہو گئے تو تم سات بجے زیورخ پہنچ جاؤ گے۔"
میں نے جلدی سے ایک کپ چائے کے ساتھ ایک دو بسکٹ لیے اور سٹیشن کی راہ لی۔
میرے پیچھے پیچھے ایک افریقی لڑکا بھی آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا" مجھے بھی زیورخ جانا ہے۔ مجھے بھی ساتھ

لے چلو آج میرا بھی انٹرویو ہے۔''

میں نے کہا ''تو چلو، کون سا میرے کندھوں پہ بیٹھ کے جاؤ گے، ٹرین پہ ہی تو جانا ہے۔''

وہ کہنے لگا ''میرا مطلب یہ نہیں، اصل میں مجھے ٹرین سٹیشن کی بابت نہیں پتا۔''

میں نے کہا ''میرے ساتھ چلو۔'' متعلقہ ریلوے سٹیشن کا جہاں سے ٹرین پہ بیٹھنا تھا مجھے بھی نہیں پتا تھا لیکن میں لوگوں سے پوچھتا اسے ساتھ لیے سٹیشن پہ پہنچ گیا۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن پہ پہنچے تو ٹرین کے آنے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں خوش تھا کہ ہم دونوں ٹھیک وقت پہ سٹیشن پہنچ چکے ہیں۔ میں سٹیشن پہ پہنچتے ہی ریلوے سٹیشن کا معائنہ کرنے لگا۔ بالکل ویران تھا، گو کہ پلیٹ فارم صاف ستھرے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ نئے بنائے گئے ہیں۔ میرا یہ معائنہ تھوڑی دیر تک ہی جاری رہ سکا کیونکہ کسی ٹرین کے آنے کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ جرمن، انگریزی، فرنچ اور اٹالین میں کچھ کہا گیا، مجھے انگریزی والا سمجھ آیا۔ میں نے ٹکٹ پہ ٹرین کا نمبر دیکھا۔ ٹرین آ کے پلیٹ فارم پہ رکی اور میں نے اس افریقی سے کہا'' چلو چلیں، سوئس کی ٹرینیں وقت کی بہت پابند ہوتی ہیں۔ اگر ذرا سی بھی دیر کی تو چلی جائے گی۔'' اس نے نائیجرین انداز کی ڈھاڈھا والی انگریزی میں کہا'' او کے او کے۔'' ٹرین میں سوار ہوتے ہی میں کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔ صبح سویرے باہر کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ راستے کے اطراف میں درخت، پھول اور کھیت بہت بھلے لگ رہے تھے۔ یہ ٹرین کسی نئے روٹ سے زیورخ جا رہی تھی کیونکہ میں پہلے بھی دو دفعہ زیورخ جا چکا تھا لیکن اس دوران میں اس طرح کے مناظر دیکھنے کو نہ ملے تھے۔ میرے سامنے بیٹھا افریقی لڑکا جس نے اپنی قومیت نائیجیرین بتائی تھی، مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں کبھی کھڑکی سے باہر دیکھتا کبھی اس کی طرف اور اس کے خراٹوں کی ہیبت ناک آواز سنتا جو گھر گھر چس چس کر کے سنائی دے رہی تھی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ بڑی بڑی عمارتیں نظر آنی شروع ہو گئیں اور آخرش ٹرین زیورخ ریلوے سٹیشن پہ آ کے رُک گئی۔ جیسے ہی ٹرین رُکی میں نے اس نائیجرین لڑکے کو کندھے سے پکڑ کے ہلایا اور اونچی آواز میں کہا'' اُٹھو۔'' وہ ہڑ بڑا کے اُٹھا۔ میں نے کہا'' زیورخ آ گیا ہے۔'' میں سوچنے لگا، امیتا ٹھیک کہتی تھی۔ یہ ٹرین بہت جلدی پہنچے گی۔ ہم دونوں سٹیشن سے باہر نکلے۔ یہاں سے ہمیں بس پکڑ کے سیاسی پناہ کے دفتر جانا تھا۔ میں نے سٹیشن سے باہر ایک ٹورسٹ انفارمیشن ڈیسک سے ساری انفارمیشن لی اور مطلوبہ جگہ پہ آ گیا جہاں سے بس پکڑنی تھی۔ بس سٹاپ پہ ہمارے سٹاپ کے لیے ہر دس منٹ بعد بس کی روانگی طے تھی۔ ہمیں

تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ بس آئی اور میں نے ڈرائیور کو سیاسی پناہ کے دفتر کا پتہ دکھایا اور اسے بتایا کہ ہم نے یہاں اُترنا ہے۔ جب یہ سٹاپ آئے تو ہمیں بتا دے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ زیادہ تر سوئس بس ڈرائیور بہت اچھے ہوتے ہیں اور مسافروں کی بہت مدد کرتے ہیں۔ میں نے بس میں ایک دو ہمسفروں سے باتیں شروع کر دیں۔ انہیں اپنے زیورخ آنے کا مقصد بتایا۔ ایک لڑکی جس سے میں نے سیاسی پناہ کے دفتر کے بارے میں پوچھا تھا وہ کہنے لگی میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ اس لیے اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میری یہی عادت رضا کو بہت پسند تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں نے میری اس عادت کو پسند کیا تھا کہ میں لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے ہچکچاتا نہیں تھا۔ بس کا تیسرا اسٹاپ ہمارا تھا۔ تیسرے سٹاپ پہ نہ صرف ڈرائیور نے مجھے اشارے سے بتایا بلکہ وہ لڑکی جس نے ہمارے ساتھ اترنا تھا اس نے بھی میرا ہاتھ کھینچا اور کہنے لگی ''چلو۔'' میں نے بس سے اُترتے ہوئے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا۔

بس سٹاپ کے پچھلی طرف ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ یہ عمارت شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یہ عمارت چوکور تھی اور اس کی دو منازل تھیں۔ سامنے کی طرف بڑے بڑے تنذ گلاس لگے ہوئے تھے اور ان میں آس پاس کی عمارتوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے ہوں گے۔ ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کے عمارت کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ باہر بہت سے اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ دروازے پہ ایک سیکورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے وہی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ جو کرائس لنگن میں سیکورٹی گارڈز پہنتے تھے۔ اس کی قمیض کے پیچھے بھی سیکوریتاس لکھا ہوا تھا۔ ابھی صرف اندر کام کرنے والے اندر جا رہے تھے۔ ہمارے لیے آٹھ بجے دروازہ کھلا۔ وہ سیکیورٹی گارڈ ہمارے کاغذات دیکھتا اور اندر جانے کو کہتا۔ اندر داخل ہوئے تو اندر کئی کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ ایک کاؤنٹر کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور باقی دو کے پیچھے دو لڑکیاں۔ جب میری باری آئی تو میں ان دو میں سے ایک لڑکی کے کاؤنٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شیشے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے اس کھڑکی کے اندر بنے ہوئے گول سے سوراخ سے اپنے کاغذات پیش کیے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، جو بھی کہنا ہے مائیک میں کہو۔ میں نے کیا کہنا تھا لیکن باہر کی طرف ایک مائیک بنا ہوا تھا۔ اسی طرح کا مائیک اندر کی طرف بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹوکن دیا اور کہا کہ اندر کمرے میں جا کے انتظار کرو۔ اب ہم سب ایک کمرے میں انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پہ تین گول میزیں پڑی تھیں،

لیکن بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی نہیں تھی ،ایک گول میز کے پاس ایک آدمی کھڑا تھا۔لباس اور تراش خراش سے پاکستانی یا انڈین لگتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اور نہ ہی میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میں نے یہاں کھڑے کھڑے گھنٹہ گزار دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں یہاں کئی دنوں سے کھڑا ہوں۔ پھر سکیورٹی گارڈ نے مجھے کہا کہ تمہارا نمبر آ گیا ہے۔ وہ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کے آیا جہاں میرا انٹرویو تھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک میز، اس پہ بہت ساری فائلیں، ایک کونے میں کمپیوٹر اور اس کے ساتھ پرنٹر پڑا ہوا تھا۔ میز کے ایک طرف ایک گھومنے والی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور کرسی رکھی تھی۔ جس کرسی پہ میں بیٹھا تھا وہ میز کے سامنے تھی۔ سامنے دیوار پہ گھڑی لگی ہوئی تھی۔ ایک منرل واٹر کی بوتل اور اس کے ساتھ چند پلاسٹک کے گلاس پڑے تھے۔ کمرے میں دو افراد داخل ہوئے۔

ایک خاتون تھی اور دوسرا وہی آدمی جو باہر کھڑا تھا اور شکل وصورت سے پاکستانی یا انڈین لگتا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ عورت تو انٹرویو کرنے آئی تھی اور یہ موصوف ترجمانی کے فرائض انجام دینے آئے تھے۔ پہلے اس عورت نے اپنا تعارف کروایا، پھر اس آدمی نے اپنا تعارف کروایا۔ میں نے کہا" میں انگریزی میں انٹرویو دوں گا۔"

وہ عورت کہنے لگی" تم نے پہلی دفعہ جس زبان میں فارم بھرا ہے وہ اردو زبان میں تھا اس لیے تمہارا سارا کیس اب اُردو میں ہی زیرِ عمل لایا جائے گا ،ترجمان کی مدد سے۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ خیر میں اس عورت کو دیکھنے لگا۔ کچھ تو اس کا چہرہ لمبوترا تھا، اور کچھ اس نے بالوں کا انداز اس طرح کا اپنایا ہوا تھا کہ زیادہ ہی لمبا نظر آ رہا تھا۔ بال بالکل چھوٹے تھے۔ اس طرح کٹے ہوئے تھے جیسے پاکستان میں بکروں کے بال مونڈھ دیئے جاتے ہیں۔ شکل وصورت کی پیاری تھی اور جب اس نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا تھا تو دودھ کی طرح سفید ایک قطار میں جڑے ہوئے دانت ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے سفید موتی ایک لڑی میں پرو دیے ہوں۔ ہونٹوں پہ گہرے رنگ کی لپ سٹک لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گالوں پہ کچھ مسکارا وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے گالوں کا رنگ بہت مختلف لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے اوپر بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ آئی شیڈ استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی قمیض پہنی ہوئی تھی جس کے کالر اور کف سفید تھے۔ سامنے والے تین بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں خوبصورت منکوں کا ہار آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ وہ پاکستانی جس نے ترجمان کے فرائض انجام دینے تھے اس نے چیک دار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس طرح

کی قمیضوں کا آج کل فیشن نہیں تھا لیکن نہ جانے وہ کیوں پہن کے آیا تھا۔ جیسے ہی گھڑی پہ دس بجے، میرا انٹرویو شروع ہوا۔ وہ عورت سوال کرتی جاتی اور ترجمان اس کی بات سن کے مجھے اردو میں بتاتا اور میرا جواب سن کے اسے جرمن میں بتاتا۔ وہی سوالات دوبارہ کیے گئے۔ وہ ساتھ ساتھ کمپیوٹر پہ لکھتی بھی جارہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد میں نے انگریزی میں کہا "مجھے واش روم جانا ہے۔"

وہ کہنے لگی "جب تک انٹرویو ختم نہیں ہوتا تم باہر نہیں جاسکتے۔"

میں نے کہا "میں جب تک واش روم نہیں جاؤں گا میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

وہ میری شکل دیکھنے لگی۔ پھر بولی "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

وہ میرے ساتھ واش روم تک آئی۔ میں اپنی حاجت رفع کرنے کے لیے اندر جانے لگا تو میں نے کہا "اگر اندر آنا چاہو تو اندر بھی آجاؤ۔"

وہ کہنے لگی "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

میں نے جلدی سے اپنا مسئلہ حل کیا اور باہر آگیا۔ وہ ابھی تک باہر کھڑی تھی میں یہی سمجھ رہا تھا کہ چلی گئی ہوگی۔ مجھے اس کے باہر رہنے کی منطق سمجھ نہ آئی۔ ہم دونوں دوبارہ اسی کمرے میں آگئے جہاں میرا انٹرویو ہو رہا تھا۔ وہ پاکستانی ترجمان وہیں بیٹھا تھا۔ چند سوال اور کیے گئے۔ اس کے بعد انٹرویو ختم ہوگیا، اس عورت نے مجھ سے میری ہاؤس وائس مانگی۔ میں نے اپنی ہاؤس وائس اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے ایک اور ہاؤس وائس مجھے دی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا میرے پاس جو پہلے تھی اس پہ این لکھا ہوا تھا اب جو اس نے مجھے دی تھی اس پہ بھی این لکھا ہوا تھا۔ میں نے ہاؤس وائس جیب میں رکھی۔ وہ عورت کہنے لگی، "اب تمہارا انٹرویو مکمل ہو چکا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا میں اب جا سکتا ہوں؟"

کہنے لگی "ہاں۔"

میں اُٹھا، اس عورت کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اس ترجمان کے ساتھ بھی اور کمرے سے باہر آگیا۔

ooo

اگست کے مہینے کا اختتام تھا، نیاش مجھے تقریباً روز فون کرتا تھا اور روز یہی بات وہ ہمیشہ

زور دے کر کہتا کہ امیگریشن بند ہونے والی ہے اس لیے جلدی آجاؤ۔ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے۔ میرا اٹلی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اس دوران میری ''واز بیلے'' اور نواز شریف سے ملتی جلتی شکل کے ایک لڑکے سے کافی دوستی ہوگئی۔ وہ لڑکا میری کوئی بات نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ اسے اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان آتی ہی نہیں تھی۔ ہم دونوں اشارے کنائے میں بات کرتے۔

کبھی کبھی ایروِن شانسمین بھی آجاتا۔ اگست کا مہینہ ختم ہوا تو نیائش کا فون آنا بھی بند ہوگیا۔ ستمبر کی آمد کے ساتھ فضا میں نمی بڑھ گئی اور جب میں بس پکڑنے کے لیے بس سٹاپ پہ جاتا تو راستے میں بیشمار سلگز (slugs) (ایک قسم کا گھونگھا) نظر آتے۔ وہ سڑک کے کنارے اپنے دو سینگ اٹھائے رینگتے ہوئے جا رہے ہوتے۔ جیسے ہی کوئی قریب سے گزرتا وہ اپنے خول میں گھس جاتے۔ ایسا لگتا جیسے کچھ بھی نہیں ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا ہے۔ میں نے اتنی تعداد میں سلگز پہلے کبھی نہیں دیکھتے تھے۔

۴ ستمبر ۲۰۰۲ء کو جمعرات کا دن تھا۔ ہمیں ہر جمعرات کو پیسے ملتے۔ وہی پینتالیس سوئس فرانک۔ یہ دن بڑا عجیب و غریب تھا۔ اس دن دو واقعات ہوئے۔ پہلا تو نیائش کا فون تھا۔ جس میں اس نے یہ خبر سنائی کہ امیگریشن کے لیے ایک مہینے کی مدت بڑھا دی گئی ہے۔ تم اگر آنا چاہو تو تمہارے پاس ۳۰ ستمبر تک کا وقت ہے۔ دوسرا واقعہ میری ازیل ہائم کی تبدیلی تھا۔ مجھے ہمیشہ کی طرح یہ خبر بھی انیتا نے سنائی۔ اس نے مجھے ٹرانسفر لیٹر لا کے دیا۔ اور کہنے لگی ''آج تمہارا یہاں آخری دن ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا میں ایک دن اور یہاں رہ سکتا ہوں۔''

انیتا نے انتہائی غصے سے کہا ''تم اپنی مرضی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہاں پہ سوئس حکومت کا قانون چلتا ہے۔ تم خود کو کچھ زیادہ ہی تیز سمجھتے ہو۔''

مجھے انیتا پہلے ہی بری لگتی تھی لیکن اس کا آج کی گفتگو کا انداز بہت ہی ترش تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا اور میری آواز سب نے سنی۔ حتیٰ کہ شیفر اور شنائیڈر نے بھی سنی۔ میں نے کہا ''تم ہوتی کون ہو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے والی۔ تمہارا کام ہے یہاں کی چوکیداری کرنا۔ لوگوں کو دیکھنا۔ مجھے کیا کرنا ہے یہ مجھے پتا ہے۔ تم مجھے کمانڈ نہ کرو۔''

وہ حیران ہو کے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے غصے میں اسے بہت برا بھلا کہا، مجھے شنائیڈر نے

بلایا اور باہر لے گیا۔ ہم دونوں باہر کھڑے تھے۔ شنائیڈر کہنے لگا "تم یہاں تقریباً ڈھائی مہینے سے رہ رہے ہو۔ تمہاری فائل بہت شاندار ہے۔ آج کی گفتگو سے تمہارے ریکارڈ میں ایک بری بات شامل ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "جو لکھتا ہے لکھو۔ یہ چند جماعتیں پڑھی ہوئی لڑکی۔ اس کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ اس کو حکومت نے نشہ چھوڑنے کے لیے یہاں کام دیا ہے اور یہ مجھ پر رعب جما رہی ہے۔"

شنائیڈر بولا "یہ درست نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اس کی شکل بتاتی ہے۔ تم مانو یا نہ مانو۔"

وہ کہنے لگا "تمہیں اور لیکون (Orlekon) بھیجا جا رہا ہے۔ کل تم اور لیکون (Orlekon) جا کے ازیل ہائم دیکھ لینا۔ تم چاہو تو کل کی رات بھی یہاں رہ سکتے ہو لیکن قانوناً اس کی اجازت نہیں ہے۔"

میں اندر آیا تو مجھے دو تین افراد نے یکے بعد دیگرے نے کہا کہ "تم نے ٹھیک کیا ہے۔"

میں نے واز لیلے سے کہا "میں اٹلی جانا چاہتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا "اس میں ایسا کیا مسئلہ ہے۔۔۔ وہاں تمہیں کوستانسو چھوڑ آئے گا۔"

میں نے کہا "کتنے پیسے لے گا۔"

وہ کہنے لگا "کوئی پیسے نہیں لے گا۔ اس کو میں کہہ دوں گا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "آج ہی۔"

اس نے ستانسو کو بلایا اور مالدووی زبان میں کچھ کہا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی۔ کوستانسو مجھے اشارے سے کہنے لگا کہ تم اٹلی کیوں جانا چاہتے ہو۔ لوگ تو انگلینڈ اور کینیڈا کے خواب دیکھتے ہیں۔

میں اسے کیسے سمجھاتا کہ میرا انیتا کے ساتھ گفتگو کے بعد یہاں سے دل بالکل اچاٹ ہو گیا ہے۔

واز لیلے کہنے لگا "آج تو نہیں یہ تمہیں کل چھوڑ آئے گا اور ہاں ٹرین کا ٹکٹ ضرور لینا کیونکہ راستے میں اگر ٹکٹ چیک ہوا تو ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسی سٹاپ پہ اُتار دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "اور کوستانسو کا ٹکٹ۔"

وہ بولا" اس کے پاس پورے سوئس کا فری پاس ہے۔ یہ بڑی خاص چیز ہے۔ اسے اگر جرمن زبان آ گئی تو یہ بہت پیسے کمائے گا۔"

میری ازیل ہائم بدل گئی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا گھر اجڑ گیا ہو۔ مجھے واڈ ملے نے تسلی دی تھی کہ تمہیں کوستانسو چھوڑ آئے گا لیکن مجھے اس بات پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اور لیکون میں سوزی بھی رہتی تھی۔ اس کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں بہت ہی بیوقوف ہوں۔ مجھے سوزی کا وعدے کے باوجود سٹیشن پہ نہ آنا اب معمولی سا واقعہ لگتا تھا لیکن اور لیکون جانا محسوساتی سطح پر میرے لیے اب بھی ایسے ہی تھا، جیسے میں اُسی سے ملنے جا رہا ہوں۔

شام کو میں ونٹر تھور گیا۔ وہاں سے ٹرین پہ بیٹھ کے اور لیکون چلا گیا۔ سٹیشن سے باہر نکلا اور اپنے نئے گھر کو ڈھونڈنے لگا۔ یہاں کی زبان میں یہ میری دوسری کرائس تھی۔ دوسری ازیل ہائم تھی۔ عجیب وغریب ویران سا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا۔ ریلوے لائن پار کی۔ لوگوں سے پوچھتا پوچھتا اپنی ازیل ہائم کے پاس پہنچا۔ سامنے ایک باڑ لگی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جیل ہے۔ ایک طرف ایک کیراوان کھڑا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ کیراوان کے سامنے ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور کمرے کے اندر ایک میز، چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک دیوار پہ نوٹس بورڈ آویزاں تھا جس پر مختلف لوگوں کی پولورائیڈ کیمرے سے کھینچی ہوئی تصاویر لگی تھی۔ میز کی پچھلی طرف ایک موٹی سی عورت اپنی دونوں کُہنیاں میز پہ ٹکائے بیٹھی تھی اور وہ کسی کاغذ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کاغذ سے نظر ہٹا کے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ تو اس نے پوچھا" تم اپنا سامان لائے ہو؟"

میں نے کہا" سامان کیسا۔ یہ بیگ ہے اس میں سب کچھ ہے۔ چند کاغذ ہیں۔ ایک پین ہے۔"

وہ کہنے لگی" تم نے آج رات یہاں سونا ہے۔ آج سے یہ تمہارے رہنے کی جگہ ہے۔"

میں نے کہا" لیکن مجھے تو کل آنا ہے۔ آج تو میں دیکھنے آیا ہوں۔"

کہنے لگی" اس پہ ستمبر کی پانچ تاریخ لکھی ہوئی ہے اور آج پانچ تاریخ ہے۔"

میں نے کہا" آج تو چار تاریخ ہے۔"

اس نے مجھے کیلنڈر دکھایا۔ اس پہ پانچ تاریخ تھی اور میں سارا دن یہی سوچتا رہا کہ آج

چار تاریخ ہے۔ خدا جانے تاریخ پہ غور کیا تھا نہ ہی شنا خت کرنے۔ میں نے کہا: "میں تو ساتھ کچھ نہیں لایا۔"

کہنے لگی "ابھی وقت ہے جا کے اپنا سامان لے آؤ۔ لیکن اس سے پہلے یہاں اندراج کروا لو، اور اپنا کمرہ دیکھ لو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

اس نے مجھ سے میری باؤس واٹس لی اور اس پہ میرا نام، تاریخ پیدائش اور دیگر چیزیں لکھنے لگی۔ پھر مجھے باؤس واپس کر دی اور کہنے لگی: "میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ مجھے کیراوان میں لے گئی۔ میں سوچ رہا تھا نہ جانے کیا کرنے جا رہی ہے۔ کیراوان کیا تھا کباڑ خانہ تھا۔ مجھے کہنے لگی "تم پاکستانی ہو اس لیے اپنا کھانا علیحدہ پکاؤ گے کیونکہ تم لوگ کھانے میں مصالحے ایسے استعمال کرتے ہو جن کی بو دوسروں کو ناگوار محسوس ہوتی ہے اس لیے میں تمہیں علیحدہ برتن دے رہی ہوں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

اس نے مجھے ایک پلیٹ، ایک دیگچی، چمچ، کانٹا اور چھری دی۔ کہنے لگی "تم مجھے ان سب چیزوں کے پانچ سوئس فرانک دے دو۔"

میں نے کہا "وہ کیوں۔"

کہنے لگی "کیونکہ یہ چیزیں مفت نہیں آتیں۔"

میں نے اسے جیب سے پانچ سوئس فرانک کا سکہ نکال کر دیا، پھر وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر میں لے آئی۔ پہلے اس نے پولورائیڈ کیمرے سے تصویر اتاری اور سوکھنے کے بعد نوٹس بورڈ پہ چپکا دی اور اس کے نیچے میرا نام لکھ دیا۔ پھر کہنے لگی "تمہیں جرمن زبان آتی ہے۔"

میں نے کہا "بہت کم لیکن سیکھنا چاہتا ہوں۔"

کہنے لگی "تمہاری سوشل سے ہر مہینے پندرہ سوئس فرانک کٹا کریں گے کیونکہ جو ٹیچر جرمن زبان پڑھانے آتی ہے اس کو فیس دینی پڑتی ہے۔ وہ ہفتے میں تین دن آتی ہے۔"

میں نے کہا "میں سوچ کر بتاؤں گا۔" پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ کہنے لگی "یہاں دو افغانی رہتے ہیں۔ تیسرا بستر تمہارا ہے۔ اگر تمہیں چادر اور تکیہ چاہیے تو اس کے پیسے علیحدہ دینے ہوں گے۔"

میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا، پھر اس نے مجھے ٹی وی والا کمرہ دکھایا۔ باتھ روم دکھایا۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد کہنے لگی "اب تم اپنا سامان لے آؤ۔ دس بجے سے پہلے آ جانا۔ اس کے بعد نہ باہر جانے کی اجازت ہے نہ ہی باہر سے اندر آنے کی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

میں ازیل ہائم سے نکلا۔ دل میں سوچنے لگا، برے پھنسے۔ میں دوبارہ اور لیکون کے اس ویران ریلوے سٹیشن پہ آیا۔ وہاں سے ونٹرتھور کی ٹرین پہ بیٹھ کے ونٹرتھور آ گیا۔ میں نے ٹرین میں پکا ارادہ کر لیا کہ واپس اٹلی چلا جاؤں گا، اور لیکون کی ازیل ہائم میں واپس نہیں جاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں جب بس پہ بیٹھ کے اور بیول پہنچا تو شام کے سات بج چکے تھے۔ میں جیسے ہی ازیل ہائم میں داخل ہوا تو سامنے ایرون شاسمین بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گلے لگایا اور کہنے لگا "مجھے پتا چلا ہے کہ تمہیں اور لیکون بھیج دیا گیا ہے۔ کل سے تم وہاں رہو گے۔"

میں نے کہا "کل سے نہیں بلکہ آج سے ہی۔ میں آج چار تاریخ سمجھ رہا تھا لیکن آج پانچ تاریخ ہے اور مجھے آج کی رات وہاں ہونا چاہیے۔ میں اپنا سامان لینے آیا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے اب تم جا رہے ہو۔"

میں نے کہا "نہیں آج رات میں یہیں رُکوں گا۔ جب کہ کل میں اٹلی جا رہا ہوں۔ وہاں کی امیگریشن کھلی ہے۔ اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

وہ بولا "کیسے جاؤ گے۔"

میں نے کہا "جیسے آیا تھا۔"

"بارڈر پار کرو گے۔"

میں نے کہا "ہاں ٹرین میں بیٹھ کے چلا جاؤں گا۔"

وہ بولا "میرے لائق کوئی خدمت؟"

میں نے کہا "مجھے پچاس سوئس فرانک کی ضرورت ہے۔"

وہ کہنے لگا "میں تمہیں پچاس یورو دے سکتا ہوں۔"

جب اس نے یہ کہا تو میں نے اسے شگون کے طور پر لیتے ہی اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میں اٹلی ضرور جاؤں۔ اور یہ کہ خدا نے اسے پچاس یورو دے کر میرے مدد کے لیے بھیجا ہے۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے دے دو۔ میں تمہیں اٹلی سے واپس بھیج دوں گا۔"

اس نے اپنے چغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس یورو کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور کہنے لگا "اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا کہ تم مجھے واپس دو گے۔ پہلے تم اٹلی تو پہنچ جاؤ۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا جس پہ اس کا نام پتا، فون نمبر، موبائل نمبر، ای میل ایڈریس اور اس کے کام کی ویب سائیٹ لکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگا "جب اٹلی پہنچ جاؤ تو مجھے فون کر کے بتانا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ضرور بتانا۔ جب تمہیں لگے کہ تم ٹھیک طریقے سے رہ رہے ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں تم سے ملنے آؤں گا۔"

میں نے کہا "ضرور، کیوں نہیں۔"

وہ کہنے لگا "میں اب چلتا ہوں کیوں کہ کافی دیر ہوگئی ہے۔ ایک پراجیکٹ پہ کام جاری ہے، اُسے ختم کرنا ہے۔"

میں اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔

رات کو ظہیر کام سے آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں اٹلی جا رہا ہوں۔ کچھ اپنے بارے میں بتایا کہ جو اسے پہلے نہیں بتایا تھا۔ وہ کہنے لگا ٹھیک ہے اگر کام بن گیا تو میں بھی آ جاؤں گا۔ میں نے اسے نیائش کا فون نمبر دیا۔ میں نے کہا "آج رات مجھے اور لیکون ہونا چاہیے تھا لیکن میں یہاں آ گیا ہوں۔ کل کسی وقت بھی چلا جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگا "جاؤ گے کیسے۔"

میں نے کہا "یہاں ازیل ہائم میں ایک لڑکا ہے وہ چھوڑ کے آئے گا۔ اسے بارڈر کا پتا ہے۔"

"پیسے کتنے لے گا۔"

"کچھ نہیں لے گا۔"

ظہیر نے کہا "میری طرف سے خدا حافظ کیونکہ میں نے صبح جلدی اُٹھنا ہے۔"

ظہیر جا کے کمرے میں سو گیا اور میں کوستانسو کو ڈھونڈنے لگا لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کیونکہ میں اب جلد از جلد سوئس چھوڑنے کے لیے ذہنی طور پہ تیار تھا۔ میں ابھی اس ذہنی خلفشار سے گزر رہا تھا کہ ازیل ہائم کا فون بجنے لگا۔ میں نے کہا، یہ رات کے گیارہ بجے کس کا فون آ گیا۔ اس ایمرجنسی اگزٹ میں

جہاں فون پڑا ہوا تھا جا کے فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے نیائش بول رہا تھا۔ کہنے لگا "شکر ہے ماؤ اتم مل گئے۔ جتنی جلدی ہو سکے آ جاؤ۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "میں ہفتے کی شام اریزو پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے کہا "یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اسے تفصیل سمجھائی کہ کیسے آ رہا ہوں اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ کوستانسو موجود نہیں تھا اور میں نے نیائش کو کہہ دیا تھا کہ میں ہفتے کی شام اریزو پہنچ جاؤں گا۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں سو گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو انیتا سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے پہلا سوال یہی کیا "تم ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے شنائیڈر نے اجازت دی ہے۔ اس لیے میں یہیں سو گیا تھا۔"

وہ کہنے لگی "اور لیکون سے فون آیا تھا۔ تمہیں رات کو وہاں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے ریکارڈ میں تمہارے بارے میں پہلا دن بہت برا لکھا گیا ہو گا۔"

میں کوستانسو کی وجہ سے پریشان تھا کیونکہ اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ واز ملے بھی کام پہ تھا۔ اس نے شام کو آنا تھا۔ میں کس سے پوچھتا کہ کوستانسو کہاں ہے۔ میں نے اس پر انحصار کرتے ہوئے اپنی کشتیاں جلانے کا سوچ لیا تھا۔ ناشتہ زہر مار کیا۔ بڑی مشکل سے دن گزارا۔ دوپہر کو رات کا بچا ہوا سالن اور دو چپاتا بریڈ گرم کر کے کھائیں۔ کوستانسو کو کوستا رہا۔ اگر آج کوستانسو نہیں آیا تو مجھے اور لیکون جانا پڑے گا اور وہاں اس ویرانے میں سونا پڑے گا۔ جہاں میں کسی کو نہیں جانتا۔ شام کے چار بجے ہوں گے۔ میں ازیل ہائم کے باہر چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھا چائے پیتے ہوئے مایوسی کا شکار ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مبہم سی اُمید بھی باندھے ہوئے تھا کہ وہ آ جائے گا۔ دور سے نواز شریف کا ہم شکل، گورا چٹا، سر سے گنجا شخص آتا دکھائی دیا تو میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ کوستانسو آ گیا۔ وہ آتے ہی اشارے میں پوچھنے لگا "تیار ہو؟"

میں اور وہ اشاروں سے بات کرتے تھے کیونکہ اسے اپنی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی۔ اگر واز ملے ہوتا تو وہ ترجمہ کر دیا کرتا۔ میں نے اسے اشاروں سے اُسے سمجھایا کہ میں صبح سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ وہ میرے سلسلے میں ہی گیا ہوا تھا۔

پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ ایک جینز اور ٹی شرٹ رکھ لو۔ میں نے کہا وہ کس لیے تو مجھے اشارے سے سمجھانے لگا کہ ایک تو تم نے پہنی ہوئی ہے اور دوسری تمہیں راستے میں

ضرورت پڑے گی۔ میں نے کہا جانا کب ہے۔ تو کہنے لگا، ابھی جانا ہے۔ پہلے ہم ونٹرتھور جائیں گے۔ وہاں سے زیورخ اور زیورخ سے لوگانو۔ ہم لوگ زیورخ سے شام سات بجے والی ٹرین پہ بیٹھیں گے۔ میں نے کہا اور وہ ٹرین ہمیں تین گھنٹے میں لوگانو پہنچادے گی۔ وہ کہنے لگا، تمھیں کیسے پتا ہے۔ میں نے کہا کیونکہ میں پہلے بھی اس ٹرین پہ سفر کر چکا ہوں۔ وہ کہنے لگا دیر نہ کرو۔ کسی بیگ میں ایک جینز، ٹی شرٹ اور اگر چاہو تو ٹوتھ برش رکھ لو۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے اپنا کالا بیگ اُٹھایا۔ اس میں ایک جینز رکھی۔ یہ وہی جینز تھی جو میں اریزو سے کراس کنٹری تک پہن کے آیا تھا البتہ میری ٹی شرٹ جو مجھے بہت پسند تھی وہ اس سری لنکن لڑکی کی نذر ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ بیگ میں ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور چند کاغذات رکھے۔ جن میں ویرانڈ بونے میں میرے انٹرویو کی کٹنگ بھی تھی۔ ایک نوٹ بک تھی جس پہ میں نے چند ایک نظمیں لکھی تھیں۔ یہ سب کچھ لے کے میں باہر آیا۔ ہاؤس ماسٹر کو میں نے بتایا کہ میں جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے چاؤ چس کہا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اور لیکون جا رہا ہوں۔ میں اور کوستانسو ازیل ہائم سے نکلے۔ میں نے مڑ کے ازیل ہائم پہ ایک نظر ڈالی۔ یہاں میں نے تقریباً ڈھائی مہینے گزارے تھے۔ اس جگہ سے مجھے ایک عجیب قسم کا لگاؤ ہوگیا تھا لیکن مجھے جانا تھا۔ سوئس آنے کی بھی مجھے بہت جلدی تھی اور اٹلی واپس جانے کا فیصلہ بھی میں نے بہت عجلت میں کیا۔ ہم دونوں بس پہ بیٹھ کے ونٹرتھور آئے۔ جمعے کی شام کو ویک اینڈ شروع ہوجاتا ہے اس لیے سوئس میں بڑے شہروں کے لیے ٹرینیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور ٹکٹ بھی سستا ہوتا ہے۔ اگر آپ فیملی کے ساتھ سفر کریں تو ٹکٹ کی قیمت میں زیادہ کمی ہوجاتی ہے۔ مجھے کوستانسو نے اشارہ کیا کہ تم ٹکٹ لے لو۔ میں نے کہا تمہارا ابھی ٹکٹ لے لوں تو کہنے لگا میری پاس پورے سوئس کا پاس ہے۔ میں پچیس سال سے کم ہوں۔ ویک اینڈ پہ میں مفت سفر کرتا ہوں۔ میں نے کہا، کہاں تک ٹکٹ لوں۔ تو کہنے لگا ونٹرتھور سے لوگانو تک کا۔۔۔ اس سے ٹائم کی بچت ہوگی کیونکہ زیورخ میں بہت رش ہوتا اور اس وجہ سے ٹرین کے نکل جانے کا خدشہ بھی۔۔۔ میں نے کھڑکی پہ جا کے لوگانو تک کا ٹکٹ لیا۔ اس نے ایک ٹکٹ تو مجھے ونٹرتھور سے زیورخ تک کا دیا اور دوسرا ٹکٹ زیورخ سے لوگانو تک کا ونٹرتھور سے زیورخ کے لیے کئی ٹرینیں تھیں۔ چند منٹ میں ہماری ٹرین آگئی اور ہم دونوں ٹرین میں سوار ہوگئے، مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں واقعی کوستانسو کے ساتھ اٹلی جا رہا ہوں راستے میں وہ میری طرف مسکرا مسکرا کے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی اشارے سے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کرتا۔ ہماری ٹرین پینتالیس

منٹ میں زیورخ پہنچ گئی۔ چار بجے میں اوور ہیول ازیل ہائم کے باہر کوستانسو کو کوس رہا تھا اور میرے یعنی فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں شام ساڑھے چھ بجے زیورخ ریلوے سٹیشن پہ لوگانو جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ میں زیورخ ریلوے سٹیشن کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اٹلی سے سوئس آنا مجھے کل کا واقعہ لگ رہا تھا میں پندرہ جون کو رات کے شاید دس بجے اس زیورخ اسٹیشن پہ آیا تھا۔ میں یہاں سے ونٹرتھور گیا تھا اور وہاں سے کرائس لنگن۔ مجھے اتنا بھی نہیں پتہ تھا کہ میں رات کو سوؤں گا کہاں۔ وہ چھوٹی سی سینڈوچ شاپ ابھی بھی وہیں تھی۔ میں نے وہاں سے دو سینڈوچ اور دو کوک کے ٹن لیے۔ ایک ٹن اور سینڈوچ کوستانسو کو دیا اور دوسرا خود کھانے لگا۔ کافی سخت تھا۔ ابھی ہم کھا ہی رہے تھے کہ ٹرین آ گئی۔ ہم دونوں ٹرین میں سوار ہوئے۔ مجھے اب بھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اٹلی واپس جا رہا ہوں کیونکہ ابھی تک ہم دونوں سوئس میں ہی تھے۔ ٹرین جیسے ہی چلی میرے پاس بیٹھا ہوا ایک موٹا سا آدمی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا" آج بہت گرمی ہے۔" وہ مجھے ایسے کہہ رہا تھا جیسے گرمی میری وجہ سے ہوئی ہے۔ میں نے جواب دیا" ہاں بہت گرمی ہے لیکن جب ٹرین تھوڑی دیر چلے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کوستانسو مجھے اور اس کو باتیں کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس موٹے آدمی نے مجھے بتایا کہ وہ امریکہ کا رہنے والا ہے اور وہ بش کے سخت خلاف ہے۔ پھر اس نے یہ بھی کہا کہ بش دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے اور اسامہ بن لادن بہت اچھا انسان ہے۔ میں اس سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ کسی پرائیویٹ ٹی وی چینل کے لیے سوئس کی ڈاکومینٹری بنانے آیا تھا۔ وہ میرے سامنے بش کی برائی اور اسامہ بن لادن کی تعریف اس لیے کر رہا تھا کیونکہ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں رضا سے بہت کچھ جان چکا تھا اس لیے اب مجھے اس طرح کی باتوں پہ ہنسی آتی تھی۔ وہ سارے راستے میرے کان کھاتا رہا۔ وہ اٹلی جا رہا تھا اور مجھے لوگانو اترنا تھا۔ جاتا تو مجھے بھی اٹلی تھا لیکن میں اس کی طرح امریکی نہیں تھا۔ نہ ہی یورپی یونین کا رہنے والا تھا۔ رات کے سوا دس بجے ہماری ٹرین لوگانو ریلوے سٹیشن پہ رکی۔ گو کہ میں اس سٹیشن پہ تین مہینے پہلے بھی رکا تھا لیکن پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ اُس وقت مجھے اپنی منزل مقصود کا پتا ہی نہیں تھا۔ اب بھی مجھے پتا نہیں تھا کہ میں اٹلی جا سکوں گا یا نہیں؟ اور بالآخر مجھے اور لیکون واپس جانا پڑے گا۔ کوستانسو نہیں جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ نہ ہی اسے کوئی زبان آتی تھی جو وہ مجھ سے پوچھتا۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن سے باہر نکلے۔ اس نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ ہم اس کے دوست کے گھر جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ہم لوگ

اٹلی نہیں جا رہے تو مجھے اس نے سمجھایا کہ آج رات کو یہاں لوگانو رکیں گے اور صبح چھ بجے اٹلی کے لیے نکلیں گے۔ میں خاموش ہو گیا۔ میں نے زیرِ لب کہا" یا قسمت یا نصیب۔" اب مقدر پہ ہے۔۔۔ جدھر بھی لے جائے۔ میں کوستانسو کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ لوگانو کی گلیاں، سڑکیں سائن بورڈ، دوکانیں سب کچھ اٹلی جیسا تھا۔ ایسا لگتا تھا اٹلی کا کوئی چھوٹا سا قصبہ ہے۔ دوکانوں اور مکانوں کی تعمیر بھی اٹلی کے سے انداز کی تھی۔ سوئس کی یہ کنٹون ٹیشینو (Ticino) کہلاتی ہے۔ لوگانو ٹیشینو (Ticino) کنٹون کا ایک شہر ہے۔ یہاں پہ اٹالین زبان بولی جاتی ہے۔ میں اپنے خیالات میں گُم اس کے پیچھے چل رہا تھا اور وہ سر جھکائے مختلف گلیوں سے مجھے ایسے لے کے جا رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے یہاں کا باسی ہے۔ پھر وہ ایک بہت اُونچی عمارت کے سامنے رک گیا۔ شاید دس منزلہ ہوگی۔ اس نے اس عمارت کی بہت سی گھنٹیوں میں سے ایک کو دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ اس عمارت کی پہلی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ کوستانسو نے اسے جا کے بتایا کہ وہ کس سے ملنے آیا ہے۔ اس نے انٹرکام پہ مطلوبہ آدمی سے رابطہ کیا اور اُسے بتایا کہ اُس سے کوئی ملنے آیا ہے۔ جواباً یہی کہا گیا کہ ان کو آنے دو۔ اس بلڈنگ کے رہائشی ضوابط کے مطابق ویک اینڈ پہ اس شخص کے دوستوں کو آکے ملنے کی اجازت تھی۔ وہ رات بھی یہاں رہ سکتے تھے لیکن پہلے کونسیرج (Concierge) یعنی چوکیدار کو بتانا پڑتا تھا۔ کوستانسو نے مجھے اشارے سے بتایا کہ میں نے پہلے فون کر دیا تھا کہ میرے ساتھ مہمان بھی ہے لیکن انہیں یہ نہیں بتایا کہ تم اٹلی جا رہے ہو۔ میں نے کہا تم فکر نہ کرو۔ میں بھی ایسی کسی بات کا ذکر نہیں کروں گا۔ جب چوکیدار نے اوکے کیا تو ہم دونوں لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پہ پہنچ گئے۔ کوستانسو کا دوست دروازے پہ انتظار کر رہا تھا۔ کوستانسو نے اسے بتایا کہ یہ پاکستانی ہے۔ میرا دوست ہے اور اوور ہیول از یل ہائم میں میرے ساتھ ہوتا ہے۔ کوستانسو کے دوست کو اٹالین زبان آتی تھی اس لیے ہمیں بات چیت میں آسانی ہوگی۔ اسے اٹالین اس لیے آتی تھی کیونکہ وہ جس کنٹون میں تھا یہاں کی زبان ہی اٹالین تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک کمرے کا گھر تھا۔ یعنی ون بیڈ روم فلیٹ۔ اس میں دو بستر لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں میز پہ ٹی وی، وی سی آر اور ایک عدد ڈی وی ڈی پلیئر بھی پڑا تھا۔ ساتھ بہت سی انڈین فلمیں پڑی تھیں۔ میں بڑا حیران ہوا۔ ایک کونے میں کچن بنا ہوا تھا اور کچن کے ساتھ باتھ روم تھا۔ کمرے کی ایک ہی کھڑکی تھی جو پوری دیوار جتنی بڑی تھی۔ جہاں سے باہر کا منظر بخوبی نظر آ رہا تھا۔ کوستانسو کے

دوست نے انالین میں پوچھا کہ کھانا کھایا ہے تو میں نے کہا، کچھ نہیں کھایا اور بھوک بھی بہت لگ رہی ہے۔ وہ کہنے لگا میں مرغی پکاتا ہوں لیکن تم مسلمان ہو۔ ہم سٹور سے مرغی لاتے ہیں۔ حلال نہیں ہوتی۔ میں نے کہا، اسلام میں اتنی سختی نہیں۔ مجبوری کی حالت میں کھا سکتے ہیں اور جب بھوک اس شدت کی ہو کہ جان کو خطرہ لاحق ہو جائے۔۔۔ پھر تو ضرور کھا سکتے ہیں۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر میں نے کہا۔ لیکن مرغی میں پکاؤں گا۔ کوستانسو بہت حیران ہوا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے چند لمحے ہوئے ہیں اور میں اس کے دوست سے ایسے باتیں کر رہا ہوں جیسے میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ میری عادت ہی ایسی ہے۔ میں تکلفات کا قائل ہی نہیں ہوں۔ خیر اس نے مجھے مرغی کا یک پیکٹ دیا۔ اس کی کھال نہیں اتری تھی۔ میں نے دیگچی میں پانی ڈال کے اس کو اس میں ڈال دیا اور خود اس سے پیاز اور ٹماٹر لے کر مصالحہ بنانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم لوگ مصالحے دار کھانا کھاؤ گے تو وہ کہنے لگے کیوں نہیں۔ ان کے پاس مصالحے ہی کتنے تھے۔ کالی مرچیں وہ بھی پسی ہوئی اور نمک۔ میں نے آدھے گھنٹے میں مرغی تیار کر لی۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک پیکٹ نکالا اور ہم تینوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کوستانسو کا دوست کہنے لگا۔ کھانا بہت کھایا ہے اس لیے باہر چہل قدمی کے لیے چلتے ہیں۔ میں نے کہا" کہاں جائیں گے؟"

وہ کہنے لگا" یہاں لوگانو کی جھیل بہت خوبصورت ہے۔ ہم لوگ تو رات دیر تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ جھیل کے اس طرف اونچی پہاڑی ہے۔ اس پہ لوگوں کے گھروں کی بتیاں جلتی بجھتی ہیں اور ان کا عکس جب پانی میں پڑتا ہے تو یہ منظر بہت بھلا لگتا ہے۔"

میں نے کہا" پھر تو ضرور جانا چاہیے۔" ہم تینوں اس سٹوڈیو فلیٹ سے باہر نکلے۔ لفٹ کے ذریعے نیچے آئے اس لڑکے نے چوکیدار کو دور سے ہاتھ ہلایا اور ہم تینوں دوبارہ لوگانو کی گلیوں میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں لوگانو کی جھیل آ گئی۔ کوستانسو کے دوست نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جھیل کا منظر واقعی بڑا دلفریب تھا۔ آج تھی بھی چاندنی چودھویں۔ سفید دودھیا چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پہلے تو ہم جھیل کے کنارے چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر ایک بنچ پہ بیٹھ گئے۔ جب ہم دونوں زیورخ سے چلے تھے تو کافی گرمی تھی لیکن یہاں جھیل کے کنارے مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ جھیل کے پانی سے جب یہ ہوا ٹکرا کے میرے جسم سے چھوتی تو عجیب سی فرحت محسوس ہوتی۔ کوستانسو کا دوست کہنے لگا" کیسا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا" میں تو خوابوں کی دنیا میں چلا گیا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دور پہاڑی پہ لوگوں کے مکانوں کی جلتی بجھتی بتیوں کا عکس پانی میں بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

ابھی ہم دونوں اس موضوع پہ ہی بات کر رہے تھے کہ چاند کا عکس پانی میں دکھائی دیا۔ پورے چاند کا عکس، کبھی دکھائی دیتا کبھی پانی میں چھپ جاتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمیں دیکھ کے شرما رہا ہے۔ مجھے ایک فلمی گیت کے یہ بول یاد آ گئے۔

چاند جب جھیل کے پانی میں نہانے اُترے

مجھ کو بانہوں میں تری، دیکھ کے شرما جائے

میں شاعر کے تخیل پہ حیران رہ گیا۔ دنیا میں کتنے لوگ جھیل کے پانی میں چاند کے عکس کو دیکھتے ہیں لیکن کسی کا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ چاند تو پانی کی لہروں کی وجہ سے چھپ جاتا اور سامنے بھی آ جاتا لیکن شاعر کے لیے یہ آنکھ مچولی، چاند کا شرمانا ہے۔ وہ بھی محبوب کی بانہوں میں دیکھ کے۔

کوستانسو کا دوست کہنے لگا" تم کیا سوچ رہے ہو۔"

میں نے کہا" کچھ نہیں۔"

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں لوگاؤ کی یہ جھیل نہ دیکھتا تو شاید میرا سوئس آنا بے کار جاتا۔

رات بہت دیر تک ہم جھیل کے کنارے بیٹھے رہے۔ پھر ہم نے واپسی کی راہ لی۔ گھر پہنچے تو میں نے کوستانسو سے پوچھا کہ ہم لوگ لوگاؤ سے اگلی کب جائیں گے تو کہنے لگا صبح۔ اب تھوڑا سا آرام کرلو کیونکہ صبح سویرے نکلنا ہے۔ میں نے کیا کہنا تھا جیسے وہ کہہ رہا تھا ویسے کرتا جا رہا تھا۔ ایک چارپائی پہ کوستانسو کا دوست لیٹ گیا اور دوسری پہ بڑی مشکل سے میں اور کوستانسو۔ میں جن کپڑوں میں اوور دیول سے چلا تھا انہی میں ملبوس تھا، پھر مجھے خیال آیا سونے سے پہلے دانت صاف کرلوں معلوم نہیں موقع ملے یا نہ ملے میں نے باتھ میں دانت صاف کیے اور آ کے پھر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

کسی نے میرے کندھے کو زور سے ہلایا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ کوستانسو کہنے لگا صبح کے چھ بج رہے ہیں۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔ ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔ دیر ہوگئی ہے۔ میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور اپنا کالا بیگ اٹھایا جس میں ایک جینز اور ٹی شرٹ تھی۔ چند نظمیں اور سوئس اخبار دیر لانڈ بوتے کے انٹرویو کی کٹنگ تھی۔ یہ ساری چیزیں میں نے کوستانسو کے دوست کو دیں اور اس سے کہا کہ یہ سامان اس پتے پہ ڈاک کے ذریعے بھیج دے۔ اس کو میں نے نیائش کا ایڈریس لکھ کے دیا۔ وہ

کاغذات کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ان کو ایک کونے میں رکھ دیا اور کہنے لگا" میں انہیں پوسٹ کر دوں گا۔ میں اور کوستانسو نے اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے رات کے کھانے کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہم اس ایک کمرے پر مشتمل "سٹوڈیو فلیٹ" سے نکل کے نیچے آئے۔ اب بھی ایک چوکیدار اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے وہ تھوڑی دیر کے لیے جاگا پھر اُونگھنے لگا۔ مجھے کوستانسو کہنے لگا جلدی کرو۔ جتنی جلدی لوگا ڈسے کیا سوپہنچ جائیں اچھا ہے۔ میں نے کہا، ہم اٹلی نہیں جار ہے؟ وہ کہنے لگا، کیا سو سے اٹلی جائیں گے۔ ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے لوگا نو ریلوے سٹیشن پہ پہنچے۔ ٹکٹ گھر کھل گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے میں چند ماہ پہلے گزرا تھا۔ یہاں سے میں نے نیاٹش کو فون کیا تھا۔ یہاں سے میں نے سوزی کو فون کیا تھا۔ یہیں سے ایک خوبصورت سی لڑکی نے مجھے ٹکٹ دیا تھا اور سارا نقشہ دیا تھا۔ کہ کیسے ٹرین بدلنی ہے۔ کون سا ٹکٹ کس ٹرین کے لیے ہے۔ اب ٹکٹ گھر میں ایک زیادہ عمر کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کیا سو تک کا ٹکٹ لیا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند کی خماری تھی۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ ٹکٹ لے کے ہم دونوں پلیٹ فارم پہ انتظار کرنے لگے۔ سامنے نیلے رنگ سے بڑے حروف میں لوگا ڈ لکھا ہوا تھا۔ ٹرین آئی اور وہ بڑے حروف میں لکھا ہوا لوگا نو ٹرین کے پیچھے چھپ گیا۔ ہم دونوں پینتالیس منٹ میں کیا سو پہنچ گئے۔ ٹرین سے جیسے ہی اُترے، ریلوے سٹیشن کی حدود سے باہر آ گئے۔ میں نے کوستانسو سے پوچھا کہ کیا ہم لوگ اٹلی نہیں جار ہے؟ وہ کہنے لگا یہاں سے ہم پیدل اٹلی جائیں گے۔ مجھے راستہ پتا ہے۔ صبح صبح لوگ نہیں ہوتے اور پولیس بھی نہیں ہوتی۔ میں اب سمجھا کہ کوستانسو نے مجھے کس طریقے سے اٹلی لے کر جانا تھا۔ ہم دونوں ایک چھوٹے سے محلے سے گزرے۔ پھر ہم کیا سو جو کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرح لگ رہا تھا سے باہر نکلے۔ ایک طرف بڑی سڑک جا رہی تھی۔ وہ کہنے لگا یہ سڑک اٹلی جاتی ہے لیکن ہم جنگل سے گزر کے جائیں گے۔ ہم دونوں روڈ کے کنارے پہ ایک کونے میں چھپ کے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھی۔ جیسے ہی یہ گاڑیاں گزریں ہم دونوں نے سڑک پار کی اور جنگل میں گھس گئے۔

جیسے ہی میں چند قدم چلا درختوں کے جھنڈ میں مجھے پرانی پتلونیں، جرابیں، جوتے، سویٹر، کئی قسم کے پہناوے بکھرے نظر آئے۔ مجھے مائیکل جیکسن کا گانا تھرلر یاد آ گیا۔ اس میں مُردے زمین سے باہر نکلتے ہیں۔ مجھے لگا کہ ابھی زمین سے نکل کر مُردے ان کپڑوں میں داخل ہو جائیں گے اور

واپس شروع کر دیں گے۔ ہم دونوں اس جنگل میں چلتے رہے۔ میرے پاس میرا کالا بیگ تھا جس میں ایک جینز اور ٹی شرٹ تھی۔ کوستانسو کہنے لگا جب اٹلی میں داخل ہو نے لگو تو یہ پہن لینا۔ یہ بیگ اور یہ کپڑے وہیں پھینک دینا۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کوستانسو کہنے لگا۔ مجھے پیٹ میں گڑ بڑ محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے کہا تو اب کیا کریں؟ کہنے لگا تم ایک کونے میں کھڑے ہو جاؤ میں اپنا مسئلہ حل کر کے آتا ہوں۔ وہ جنگل میں ہی اپنی پتلون اتار کے بیٹھ گیا۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ جنگل تمام قسم کی آلائشوں سے پاک تھا لیکن اب کوستانسو کے دکھائے ہوئے کام کی وجہ سے فضا میں عجیب قسم کی بو پھیل گئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا تو اس کی پتلون بھی پھٹ گئی۔ میں نے کہا اب کیا کرو گے۔ وہ کہنے لگا۔ میں کسی طریقے سے کام چلا لوں گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں نے کہا۔ اٹلی کب آئے گا۔ وہ اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا تم سامنے وہ پُل دیکھ رہے ہو۔ وہ سیمنٹ کا پُل جو اوپر سے گزر رہا ہے۔ یہ اٹلی میں ہے۔ یہ نشانی ہے۔ میں نے دیکھا دور کافی اونچائی پہ ایک سیمنٹ کا پل تھا یا شاید فولاد کا بنا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ تم اس کھیت میں گھس جاؤ۔ اس باڑ کو پار کرو گے تو اٹلی میں داخل ہو جاؤ گے۔ میں نے پوچھا اور تم؟ وہ کہنے لگا میں واپس جا رہا ہوں اور ہاں اپنی جیب سے ایسی تمام چیزیں جو سوئس کی ہیں وہ مجھے دے دو۔ اگر تم پکڑے گئے تو تمہیں واپس سوئس بھیج دیا جائے گا اور اس صورت میں تمہارے لیے بہت مسئلہ ہوگا۔ میں نے ہاؤس واٹس اُسے سونپ کر اس کے ہوتے ہوئے باڑ پار کی، باڑ کیا تھی کانٹے دار تار تھی۔ اس کا ایک کونا میری پیٹھ میں گھسا اور خون کی ایک دھار میری جینز پہ بہہ گئی۔ میں نے جیسے تیسے باڑ پار کی آس پاس دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے جینز بدلی، ٹی شرٹ بدلی بیگ کو وہیں پھینکا۔ اور اس کھیت کے کنارے پہ چلنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے نیچے گہرائی میں ایک آدمی کام کرتا دکھائی دیا۔ میں اس ڈھلوان سے نیچے اتر گیا۔ میرے بازوؤں پہ خراشیں آ گئیں لیکن میں گرتا پڑتا سڑک تک آ گیا۔ ایک گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو کے کپڑے جھاڑے۔ وہاں میں کچھ دیر بیٹھا تا کہ میرا خون رُک جائے۔ اسی اثنا میں ایک گاڑی کے پاس دو لڑکے آ کے رکے۔ میں نے اطالین زبان میں ان سے پوچھا یہاں کوئی بار ہے۔ تو وہ کہنے لگے کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا مجھے بس کا ٹکٹ خریدنا ہے۔ مجھے کوستانسو نے بتایا تھا کہ یہاں سے نیچے جو سڑک جاتی ہے وہ اٹلی ہے اس لیے میں نے بہت زیادہ خود اعتمادی سے پوچھا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں اٹلی میں ہوں۔ انہوں نے کہا، یہاں پہ کوئی نہیں نہ ہی کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے تم بس کا ٹکٹ خرید

سکو لیکن وہ کونے میں بس سٹاپ ہے وہاں سے کومو ریلوے سٹیشن کے لیے بس جاتی ہے۔ میں اللہ کا نام لے کے بس سٹاپ پہ جا کے کھڑا ہو گیا۔ وہاں پہ ایک عورت آ کے رکی میں نے کہا میرے پاس بس کا ٹکٹ نہیں کیا بس کے اندر ٹکٹ مل جائے گا۔ وہ کہنے لگی۔ بس سے تو نہیں ملے گا لیکن میرے پاس ایک ٹکٹ ہے۔ اس نے مجھے ایک ٹکٹ نکال کے دیا۔ میں نے پیسوں کا پوچھا تو کہنے لگی رہنے دو۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ گھاٹی سے نیچے اترنا، ٹکٹ کا مل جانا مجھے معجزے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے جب ایراون شاسمین نے پچاس یورو دیے تھے مجھے اسی وقت محسوس ہونے لگا تھا کہ اب میں اٹلی چلا جاؤں گا۔ اب اس عورت کے پاس اضافی ٹکٹ ہونا، یہاں سے گزرنا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے اسے خدا نے میرے لیے بھیجا تھا۔ خیر بس آئی اور ہم دونوں بس میں سوار ہو گئے۔ میں نے بس ڈرائیور سے کہا۔ مجھے کومو ریلوے سٹیشن اترنا ہے تو اس نے کہا یہ سٹیشن پہ تو نہیں جا رہی ہے لیکن اس کے پاس سے ضرور گزرے گی۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔ میں آگے کو چل دیا۔ مجھے ڈرائیور نے بلایا۔ میں ڈر گیا شاید اس کو شک ہو گیا ہے۔ میں واپس مڑا تو کہنے لگا ٹکٹ تو پنچ کرو۔ میں نے جلدی سے ٹکٹ پنچ کیا اور آگے سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں بس ڈرائیور نے مجھے پھر آواز دی۔ میں نے کہا، اب کیا ہے تو کہنے لگا، تمہارا اسٹاپ آ گیا ہے۔ وہ سامنے جو سڑک ہے وہ سیدھی کومو ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی ہے۔ میں نے بس سے اترنے سے پہلے اس عورت کا شکریہ ادا کیا اور سڑک پہ چلنے لگا۔ سامنے کومو ریلوے سٹیشن کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں جعفر اور مغل صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کومو سے کیاسو تک چھوڑنے کے دو سو یورو لیے تھے اور ٹرین میں صرف دو تین چکر لگائے تھے۔ وہ کوستانسو میرا ہم وطن بھی نہیں تھا اور اپنی جان پہ کھیل کے مجھے بارڈر تک چھوڑنے آیا تھا۔ میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اور مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں جب باڑ پہ گرا تھا تو مری پیٹھ پہ چھوٹا سا زخم بھی آ گیا تھا۔ اب درد محسوس ہونے لگا تھا۔ میں ان تمام چیزوں کی پرواہ کیے بغیر کومو ریلوے سٹیشن میں داخل ہوا۔ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب میں ہفتے کی شام یہاں آیا تھا۔ میرے ساتھ مغل صاحب اور جعفر تھے۔ آج بھی ہفتہ ہی تھا۔ میں نے جون کے مہینے میں اٹلی چھوڑا اور ستمبر میں واپس آ گیا۔ آج ستمبر ۲۰۰۲ کی سات تاریخ تھی۔ آج سے سال پہلے نیو یارک کے علاقے مین ہٹن میں ٹون ٹاور گرے تھے۔ جن کے گرنے کی وجہ سے میں یہاں رُک گیا تھا۔ چار دن بعد اس

واقعے کو سال ہونے والا تھا۔ میں نے خود کو ان سوچوں سے آزاد کیا اور کومو ریلوے سٹیشن ٹکٹ لینے کے لیے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ دو مسافر مجھ سے پہلے کھڑے تھے۔ وہ جلدی فارغ ہو گئے۔ جب میری باری آئی تو میں نے شیشے کے پیچھے جو عجیب و غریب سا آدمی بیٹھا تھا اس سے اریزو تک کا ٹکٹ مانگا۔ وہ میری شکل دیکھنے لگا۔ کہ یہ شخص کومو سے اریزو جا رہا ہے۔ خیر اس نے مجھے تین ٹکٹ نکال کے دیئے۔ ایک ٹکٹ ریجنل ٹرین کا تھا جو کومو سے میلانو سنٹرل ریلوے سٹیشن تک تھا۔ دوسرا ٹکٹ میلانو سنٹرل سے فیرنزے ریلوے سٹیشن (فلورنس ریلوے سٹیشن) تک تھا اور تیسرا ٹکٹ بھی ریجنل ٹرین کا تھا جو فیرنزے (فلورنس) سے اریزو تک کا تھا۔ میں نے اسے مطلوبہ رقم دی۔ یہ وہی پچاس یورو تھے جو مجھے ایرون شانسمین نے دیئے تھے۔ ایرون شانسمین کے پچاس یورو اور اس عورت کا بس کا ٹکٹ دینا میرے لیے ایسے تھا جیسے خدا نے میری غیبی مدد کی ہے۔ خاص طور پہ اس عورت کا اس وقت وہاں سے گزرنا معجزہ تھا۔ میرے سر میں درد تھا لیکن میں کومو سے میلانو پہنچ کے کچھ کھانا چاہتا تھا کیونکہ یہ شہر بارڈر کے پاس تھا یہاں پولیس کا کنٹرول بہت تھا۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ میرے "دراندازی" ہونے میں شک کی گنجائش نہیں تھی یوں بھی برے وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ میں نے کومو سے میلانو کا ٹکٹ لے لیا اور جیسے ہی ٹرین آئی اس میں بیٹھ گیا۔ ٹرین کی حالت بہت خراب تھی۔ لوکل ٹرین تھی۔ سیٹیں مجھے کچھ زیادہ ہی گندی لگ رہی تھیں کیونکہ میں سوئس سے آ رہا تھا۔ ٹرین میں کام پہ جانے والے لوگ زیادہ تھے۔ یہ ٹرین تمام چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پہ رکی۔ راستے میں دیز کا سٹیشن بھی آیا۔ اریزو سے کئی لوگ یہاں کام کی تلاش میں آئے تھے۔ اس لیے مجھے اس شہر کا نام یاد تھا۔

میلانو سے پہلے ٹرین ایک دو سٹیشنوں پہ رکی۔ ان کے سائن بورڈ پہ بھی میلانو لکھا ہوا تھا لیکن میلانو سنٹرل نہیں لکھا ہوا تھا، اور جب میلانو سنٹرل آیا تو میں اتر گیا۔ میری اگلی ٹرین انٹرسٹی تھی۔ اس کے جانے میں ابھی وقت تھا۔ میں میلانو ریلوے سٹیشن کی ایک بار میں گھس گیا۔ بار کے اندر بہت رش تھا۔ میں نے ایک کواساں، کیپوچینو کے پیسے دیئے اور کاؤنٹر پہ آ گیا۔ بار میں کافی مشینوں، پیالیوں، چمچوں کی آواز آ رہی تھی۔ بہت شور تھا۔ میں نے ویٹر کو اپنی رسید دکھائی اور اس سے کواساں اور کیپوچینو کے لیے کہا۔ وہ جانے لگا تو میں نے سر درد کی گولی کے لیے کہا تو کہنے لگا "اسپرینا" ہے۔ میں نے کہا چلے گی۔ اس نے ٹشو پیپر میں لپیٹ کے مجھے ایک کواساں دیا اور جلدی سے ایک کیپوچینو کاؤنٹر پہ رکھی۔ کیپوچینو کی پرچ میں ایک اسپرین بھی پڑی تھی۔ میرا پیٹ خالی تھا۔ پہلے میں نے

کواساں کھایا پھر کپوچینو تین چمچ چینی کے ڈال کے پی۔ اس کے بعد ویٹر سے پانی کا گلاس مانگا تو کہنے لگا منرل واٹر یا نلکے کا۔ میں کہا منرل۔ تو اس نے مجھ سے تیس سینٹ اور مانگے۔ میں نے کاؤنٹر پہ پچاس سینٹ رکھ دیئے۔ ٹیبلٹ کے پیسے اس نے نہ لیے۔ اس کے بعد میں نے اسپرین کھائی اور پانی کا گلاس گلے میں انڈیل لیا۔ بار کے اس ویٹر کا شکریہ ادا کیا اور پلیٹ فارم پہ آ کے اپنی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ دن کے دس بجے ہوں گے۔ میں نے پلیٹ فارم پہ لگے ہوئے ایک فون باکس میں سکے ڈالے اور نیائش کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ کئی دفعہ گھنٹی بجی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس دوران ٹرین بھی آ گئی اور میں ٹرین کی وہ بوگی ڈھونڈنے لگا جہاں میری سیٹ تھی۔ ٹرین کی بوگی ڈھونڈی اندر داخل ہوا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ ٹرین میں بہت سے غیر ملکی تھے۔ میرے پاس ٹرین کے ٹکٹ کے علاوہ دس یورو تھے اور حافظے میں سوئس کی یادیں تھیں۔ ٹرین چلی تو میرے سر کا درد بھی جاتا رہا کیونکہ اسپرین نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو بلونیا ریلوے سٹیشن تھا۔ یہ وہی ریلوے سٹیشن تھا جس کے بارے میں مجھے رضا نے بتایا تھا کہ اس کے ویٹنگ روم میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک دہشت گرد نے بریف کیس میں بم رکھ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے پچاسی ہلاکتیں ہوئیں تھیں اور دو سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے اور اس واقعے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ لوگوں نے جہاں دہشت پھیلی تھی وہاں "بریگاتے روسے" کے کارکن فرانس بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے وہاں جا کے سیاسی پناہ لے لی تھی۔ پہلے مجھے پتا نہیں تھا۔ اس واقعے کو بائیس سال گزر چکے ہیں لیکن میں ٹرین میں بیٹھے بیٹھے اس قیامت خیز منظر کا تصور ذہن میں لا کے کانپ گیا۔ بلونیا ریلوے سٹیشن پہ ٹرین سے کافی مسافر اُتر گئے۔ جس کمپارٹمنٹ میں میں بیٹھا تھا وہ قریباً خالی تھا۔ میں نے پاس پڑا ہوا ایک اخبار اُٹھایا۔ اتفاق سے یہ اخبار انگریزی میں تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تا کہ تھوڑا سا وقت گزر جائے۔ میں اندر کے صفحات میں ایک مضمون دیکھ کے حیران رہ گیا۔ گیارہ ستمبر کے حوالے سے تھا۔ مجھے رضا نے اتنا کچھ بتایا تھا کہ اب اس بارے میں مزید پڑھنے یا جاننے میں دلچسپی نہیں رہی تھی پھر بھی میں نے اس پہ ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ مضمون نگار نے کرونولوجیکل (chronological) انداز اپنایا تھا۔

۱) ۱۹۹۸ء میں امریکہ پورٹ اتھارٹی (Pot authority) نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو پرائیویٹائز کرنے کا سوچا۔

۲) ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو لیز پہ دینے کا سوچا گیا۔اس کی بڈ کے لیے دو کمپنیوں نے حصہ لیا۔

۳) ۱۵ فروری کو ۲۰۰۱ء میں پورٹ اتھارٹی نے اعلان کیا کہ وورناڈو کمپنی (Vornado) کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر ۹۹ سال کی لیز پہ دیئے جاتے ہیں۔اس کے لیے وورناڈو (Vornado) کمپنی نے ۳.۲۵ بلین ڈالر کی بولی لگائی تھی۔ بعد میں پورٹ اتھارٹی نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر وورناڈو کے بجائے دوسری کمپنی کو ۹۹ سال کی لیز پہ دے دیا۔

۴) اس طرح ۲۶ اپریل ۲۰۰۱ء کو سلور سٹائن کمپنی (Silverstein Company) کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر لیز پہ مل گئے۔

۵) ۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ سلور سٹائن کمپنی (Silverstein company) کے حوالے کر دیا گیا ۹۹ سال کی لیز پہ۔

۶) احمد شاہ مسعود کو ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دو صحافیوں نے ایک خودکش حملے میں ہلاک کر دیا۔اس کے بارے میں دو باتیں سامنے آئیں۔ایک طرف تو یہ خبر جاری کی گئی کہ اس کو طالبان نے مارا ہے۔دوسری خبر یہ تھی کہ اس کو مارنے والے دو امریکن صحافی تھے جو طالبان کا روپ دھارے ہوئے تھے۔

۷) ۲۰۰۱ء گیارہ ستمبر کو منگل کا دن تھا۔منگل کا دن اور صبح کے وقت کو اس لیے ترجیح دی گئی کیونکہ پوری دنیا میں سوموار کے دن کاروبار اپنے عروج پہ ہوتا ہے۔جمعہ مسلمانوں کے لیے ہفتہ یہودیوں کے لیے اور اتوار عیسائیوں کے لیے مقدس دن ہے۔اس لیے پوری دنیا میں کاروبار ان تین دنوں میں کم ہوتا ہے۔یعنی ان دنوں میں لوگ عموماً چھٹی کرتے ہیں۔منگل کو گہما گہمی کم نہیں ہوتی تاہم صبح کے وقت زیادہ رش نہیں ہوتا اس لیے کم سے کم انسانی جانوں کے نقصان کے ذہن میں رکھ کے یہ وقت مقرر کیا گیا۔

میں نے رضا سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا لیکن لیز والی بات نہ اس نے مجھے بتائی تھی نہ ہی میں نے پہلے کہیں پڑھی تھی۔اسی طرح احمد شاہ مسعود پنج شیر کا ہیرو ۹ ستمبر کو اس دنیا سے رخصت ہوا یہ مجھے نہیں پتا تھا۔اس انگریزی اخبار میں اس صحافی کا نام نہیں لکھا تھا بس مضمون کے آخر میں (ایف۔ایس لکھا ہوا تھا اور اس کی ای میل آئی ڈی تھی۔) اس نے لیز والی بات پہ بھی روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ لیز پہ دینے سے پورٹ اتھارٹی کی سیکورٹی کی ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ اس لیے سلور سٹائن کمپنی کو اس عمارت کے لیے اپنی پرائیویٹ سیکورٹی کا انتظام کرنا پڑا ہوگا۔عجیب

بات ہے جولائی میں لیزان کے نام ہوئی اور ستمبر میں یہ عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔

میں ٹرین میں بیٹھا ان ساری کڑیوں کو جوڑنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا سوئس جانا، واپس آنا اور ان سارے واقعات کا ہونا میرے نصیب میں لکھا تھا۔ میں سوئس گیا تو سالوا تورے مولی تیر نو کو میری وجہ سے کافی مالی مدد ملتی رہی۔ ٹلمیدین یہی سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں کا آپریشن میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں جب سوئس گیا تھا تو یہی سمجھتا تھا کہ بطور مسلمان شاید ہم پہ دہشت گرد ہونے کا الزام بجا ہے، مگر اب مطمئن تھا کہ اس الزام کی حیثیت بہتان سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر اس سوئس آدمی کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میرا موبائل فون اتنے دن تک بحفاظت رکھا اور کیتھرین کے کہنے پہ اسے دے دیا اور کیتھرین نے وہ موبائل مجھے کراس لنکن سے اوور ینول بھجوا دیا۔ مجھے یاد ونے چھو جان بھی یاد آیا جس نے مجھے موبائل مینوفیکچرنگ کے ساتھ ساتھ سیرالیون کے زمینی حقائق کے بارے میں آگاہی دی تھی۔ ایرون شاسمین کے پچاس یورو میرے بہت کام آئے۔ کوستانسو کا مجھے جنگل تک چھوڑ کے جانا اور اٹلی کا بارڈر پار کروانے میں مدد کرنا میں کیسے بھول سکتا تھا۔ کومو میں اس عورت کا بس ٹکٹ دینا۔ یہ تمام باتیں ساری زندگی یاد رہنے والی تھیں۔

پھر میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں۔ گو کہ میرا باپ ایک بہت امیر آدمی ہے لیکن میری پرورش میرے دادا جی نے کی گو کہ دادی بھی ساتھ ہی ہوتی تھیں لیکن میرے دادا جی نے میرے علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو میرے لیے کتابیں چھوڑ گئے۔ میں اپنی ماں کے بارے میں کوئی بات نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ میری ماں کسی زمانے میں پاکستان کی مشہور ماڈل تھی۔ کسی تقریب میں میرے باپ کو پسند آ گئی اور پھر دونوں میں دوستی ہو گئی۔ جب میرے باپ کو پتا چلا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے تو اس کا منہ پیسوں سے بند کرنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی اس لیے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے میرے باپ کو مجبوراً نکاح کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ماں کی خیال تھا بیٹی ہوگی تو اس کو شوبز میں لے جائے گی لیکن لڑکا ہوا۔ میرے والد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے آئے اور مجھے اپنے باپ کے حوالے کر دیا۔ یعنی میرے دادا جی کے حوالے! میری ماں مجھ سے ملنے کبھی نہ آئی، نہ ہی میرا باپ مجھ سے ملنا پسند کرتا تھا۔ ان دونوں کے نزدیک میں ایک بائیولوجیکل عمل کے ذریعے اس دنیا میں آیا تھا۔ پیسے کی کمی نہ تھی اس لیے میری پرورش اچھے طریقے سے کی گئی۔ میرے دادا جی کہتے تھے اس میں اس

بچے کا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن میرے بھائیوں نے میری حصے کی ساری جائیداد ہڑپ کرلی۔ میں ٹرین میں جب یہ سب کچھ سوچ رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن میرے حاصل حصول میں جو کچھ تھا۔ وہ کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھایا جاتا، کوئی کتاب اس کا سبق نہیں دیتی۔ سو میرے اطمینان قلب کے لیے یہ سب کچھ کافی کیوں نہ ہوتا مقدر نے میرے نام اگر کچھ محرومیاں کردی تھیں تو میں نے زندگی سے حاصل بھی بہت کچھ کیا تھا۔ میری آنکھوں کے یہ آنسو درحقیقت ذات باری تعالیٰ کی مجھ پر بے پایاں نوازشوں کے تشکر کے لیے تھے۔

شام کے چار بجے میری ٹرین فیرنزے (فلورنس) ریلوے سٹیشن پہ آ کے رکی، مجھے تھوڑی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں ٹرین سے اُترا، او رسیدھا سنتا ماریا نوویلا (Santa Maria Nouvella) نام کے مرکزی ریلوے سٹیشن کے اندر پائے جانے والے میکڈونلڈ میں چلا گیا۔ وہاں سے ایک برگر، چپس اور کوک لی اور آ کے ایزو جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ میں نے سولہ نمبر پلیٹ فارم۔۔۔ جہاں پہ اس ٹرین کو آنا تھا، کے پاس ہی لگے ہوئے ایک فون بوتھ میں چند سکے ڈالے اور نیائش کا نمبر ملا دیا۔ ایک دو گھنٹیاں بجنے کے بعد نیائش نے فون اُٹھالیا۔ دوسری طرف سے آواز" پرونتو یعنی ہیلو۔"

میں نے کہا" نیائش بھائی میں فرشتہ بول رہا ہوں۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے ایزو پہنچ جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگا" ماڑا مبارک ہو تم خیر خیریت سے پہنچ گئے۔ مجھے بڑی فکر تھی۔ تم نے کہا تھا کہ میں سات تاریخ کو پہنچ جاؤں گا۔ مجھے تمہارا شدت سے انتظار ہے۔"

میں نے کہا" ٹرین آ گئی ہے اور اب میں اس میں بیٹھنے کی تیاری میں ہوں۔"

نیائش بولا" ٹھیک ہے خیر راغلے، میں سٹیشن پہ تمہیں لینے آؤں گا۔"

میں نے فون بند کر دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس ٹرین کو روم جانا تھا۔ میں ٹھیک سوا پانچ بجے ایزو ریلوے سٹیشن پہ تھا اور سٹیشن پہ نیائش اپنی گاڑی میں مجھے لینے آیا ہوا تھا۔